

دل گداز تحریریں، • زندگی کی تصویریں
کراچی
ماہنامہ
سچی کہانیاں
March
2014
پراسرار نمبر
WWW.PAKISTANIPOINT.COM
پاکستانی پوائنٹ

ماہنامہ سچی کہانیاں کراچی

E-mail.pearlpublications@hotmail.com

بانی سہام مرزا



خط وکتابت کا پتا: 110' آدم آرکیڈ
شہید ملت روڈ/ بہادر شاہ ظفر روڈ۔ کراچی

قیمت فی شمارہ: 60 روپے ☼ جلد: 31 ۔ شمارہ: 03 ☼ مارچ: 2014ء

ایڈیٹر، پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔







فون: 34930470 - 021-34939823 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی، سٹی پریس، OB-7 تالپور روڈ، کراچی





سالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 720 روپے افریقہ 65 ڈالر کینیڈا آسٹریلیا 65 ڈالر ایشیا یورپ 55 ڈالر قانونی مشیر جی ایم جھنڈو ایڈووکیٹ ہائی کورٹ۔ رابطہ نمبر: 34939823

احترام

آج موسموں کی بات کرتے ہیں، محبت کو یاد کرتے ہیں۔ رنگوں، خوشبوؤں، تتلیوں کی باتیں کرتے ہیں۔ آج دھنک کے ساتوں رنگوں کو اپنے آس پاس محسوس کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شوخ ہنسی، معصوم کِلکاریوں کو اپنے دل میں اُترتا محسوس کرتے ہیں۔ آج صرف دوستوں! اور پیاروں کو یاد کرتے ہیں۔ ہر شام گھر کے آنگنوں سے اُٹھتی تازہ روٹی کی مہک، اپنائیت میں گندھے رشتوں کو مسرور اور شاداں دیکھنے کی سعی کرتے ہیں۔ سمندر کی جانب سے چلنے والی ٹھنڈی ہوا کو آج اپنے بالوں سے کھیلنے دیتے ہیں۔ گلاب، موتیے کے گجروں کی طراوت محسوس کر کے دیکھتے ہیں۔ شبنم سے بھیگی گھاس پر ننگے پاؤں چل کر دیکھتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ آنکھیں پتھرا جائیں، سانس کا رشتہ ٹوٹ جائے! آؤ ایک بار پھر سے جی کر دیکھتے ہیں، مگر کیا یہ زندگی عورت کے بغیر ممکن ہو سکتی ہے؟

عورت کی عزت کریں کیوں کہ

"ہم مائیں، ہم بہنیں، ہم بیٹیاں
قوموں کی عزت ہم سے ہے۔"

منزہ سہام

کچھ اپنی باتیں

میں نے بچپن میں ایک کہانی سنی تھی، شیر اور بہادر سپاہی کی۔ قصہ یوں تھا کہ ایک سپاہی اور شیر کی دوستی ہوگئی۔ یہ دوستی بہت گہری ہوتی چلی گئی۔ سپاہی کا زیادہ تر وقت جنگل میں شیر کے ساتھ گزرتا۔ دونوں شکار بھی ساتھ ساتھ کرتے۔ کبھی سپاہی اپنی تلوارِ غزال کش سے آہو کے ٹکڑے کررکھتا تو کبھی شیر نیل گائے کے نمکین گوشت سے سپاہی کی ضیافت کرتا۔ شیر کچے گوشت ہی کو بھنبھوڑ کھاتا جبکہ سپاہی لکڑیاں وغیرہ جمع کر کے الاؤ دہکاتا اور گوشت بھون کر کھاتا۔ ایک دن شیر نے کہا کہ ذرا مجھے بھی چکھاؤ کہ آگ میں جل کر گوشت کیسا ہوجاتا ہے۔ سپاہی نے ہرن کی بھنی ہوئی ران شیر کے شکم گزار کردی۔ شیر نے بھنے ہوئے گوشت کا ایک لقمہ ہی لیا تھا کہ اُس کا مزہ کرکرہ ہوگیا۔ اس نے کھایا ہوا لقمہ اُگل دیا۔ سپاہی فوراً بولا: اے جاہل جنگلی درندے، تہذیب سے تیرا کیا واسطہ۔ یہ تہذیب انسان ہی کا خاصہ ہے کہ وہ کھانا پکا کر کھاتا ہے، اور اپنا ذائقہ خود بناتا ہے۔ شیر اُس وقت کچھ نہ بولا اور خاموشی سے اپنی کچھار کی طرف چلا گیا۔ کچھ دن بعد سپاہی پھر جنگل گیا تو شیر خاصا بجھا بجھا سا رنجیدہ خاطر دکھائی دیتا تھا۔ شیر نے سپاہی سے کہا کہ تلوار سے ایک وار مجھ پر کرو تا کہ ایک گہرا زخم مجھے آئے۔ سپاہی سٹپٹا گیا کہ یہ شیر کو کیا ہوگیا ہے۔ سپاہی نے ایسا کرنے سے صاف انکار کردیا۔ شیر بھی کچھ سوچ سمجھ کر آیا تھا، بولا اگر تم نے وار نہ کیا تو میں دوستی کا ذرا بھی لحاظ نہیں کروں گا اور تمھیں یہیں چیر پھاڑ کر رکھ دوں گا۔ سو طوہاً کرہاً سپاہی نے شیر کی ران پر تلوار سے ایک گھاؤ لگا دیا۔ اُس کے بعد شیر لنگڑاتا ہوا اپنی راہ چلا گیا اور سپاہی اپنے دیار کی طرف۔ کافی عرصہ گزر گیا نہ سپاہی جنگل گیا اور نہ اُس کی شیر سے ملاقات ہوئی۔ آخر کار ایک دن سپاہی جنگل میں لکڑیاں کاٹ رہا تھا کہ اُس کی شیر سے ملاقات ہوگئی۔ شیر بہت گرمجوشی سے ملا۔ دونوں نے بیٹھ کر خوب گپیں لگائیں۔

جب رخصت ہونے لگے تو شیر نے کہا، ''اے میرے انسان دوست! تمھیں یاد ہوگا کہ جب ہم آخری بار ملے تھے تو تمھاری تلوار کا ایک گھاؤ میری ران پر تھا، ذرا اُسے دیکھو وہ گھاؤ تمھیں کہیں نظر آتا ہے؟'' سپاہی نے کہا، ''نہیں۔ وہ گھاؤ پوری طرح بھر چکا ہے بلکہ اب تو اُس کا نام ونشان تک نہیں ہے''

شیر بولا، ''ہاں میرے دوست تیری تلوار کا دیا ہوا زخم تو کب کا بھر چکا ہے، مگر اُس روز تُو نے مجھے جاہل جنگلی درندہ کہہ کر زبان سے جو زخم لگایا تھا وہ آج تک میرے دل میں ہرا ہے۔ اسی زبان نے تجھے میرا دوست بنایا تھا اور اسی نے ہمارے بیچ دشمنی کی فصیل کھڑی کردی ہے۔ اس سے پہلے کہ میری

ذات سے تجھے کوئی نقصان پہنچے تُو یہاں سے چلتا بن۔“

کہتے ہیں اُس دن کے بعد سپاہی اور شیر کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ مگر سپاہی نے شیر کی بات کا ایسا اثر لیا کہ اُس نے تلوار ہی پھینک دی اور پیشۂ سپاہ گری کو خیر آباد کہہ دیا۔ اب میدان میں اُس کی تلوار کی بجائے زبان چلنے لگی تھی، زخم گر بن کر نہیں بلکہ گل خیز بن کر۔ سپاہی نے شاعری شروع کر دی، سپاہی محبت کا خطیب بن گیا۔ اُس کی زبانِ بلاخیز سے محبت کی ایسی ایسی انمول داستانیں ادا ہونے لگیں کہ جو سنتا وہ مسحور ہو جاتا۔ یعنی وہ حال ہوا کہ کچھ عرصے میں سپاہی جو جنگل سے اپنی لکڑیاں [illegible] چن کر لاتا تھا، اب اُس کے گرد ارادت مندوں، بہی خواہوں، طالبانِ علم کا ہجوم پروانہ وار رقص کیا [illegible]تا تھا۔ اُس کے لب سے معمولی سی خواہش بھی ظہور پذیر ہوتی، سب کے سب اُسے پورا کرنے [illegible] اور سپاہی بے اختیار کہہ اُٹھتا کہ بے شک لوگ تلوار سے نہیں زبان سے فتح ہوتے ہیں۔

[illegible] نے باتوں ہی باتوں میں پوری کہانی ہی آپ کو سنا دی...... نہ جانے یہ کہانی مجھے [illegible] کیا کوئی زخم ہے میرے سینے میں؟...... ہاں میرے سینے میں پورے [illegible] کم بخت بھرنے نہیں دیتا...... ایک ایسے معاشرے کا جو میٹھے بول سے عاری ہو چکا ہے۔ جہاں زبانوں پر تلواریں ہیں، سان پر چڑھی ہوئی۔ کسی کی زبان پر مذہبی نفرت ہے، کسی کی زبان پر مسلکی نفرت، کسی کی زبان پر لسانی نفرت ہے تو کسی کی زبان پر ملکی نفرت، کوئی بہن بھائیوں کے گلے شکوے لیے پھر رہا ہے تو کوئی اپنی اولاد کے...... جس سے ملو اُس کے پاس شکایت ہے نفرت ہے، سب کچھ روند کر، گزر جانے کی سلگتی ہوئی آگ ہے۔ جس طرف دل لے جاتا ہوں وہاں نفرت کے دہکتے ہوئے الاؤ منتظر ملتے ہیں۔ لوگ کیوں نہیں سمجھتے کہ محبت فاتح عالم ہے، محبت کا ایک میٹھا بول معاشرے کی ساخت ہی بدل کر رکھ دے گا۔ ذرا سوچیے کہ اگر ہر آدمی روزانہ دوسرے لوگوں سے دس میٹھے بول یا دس محبت کی باتیں کرے گا، تو آن کی آن میں ہمارا معاشرہ چمن زار میں تبدیل نہیں ہو جائے گا۔

میں آج عہد کرتا ہوں کہ مجھ سے جس جس آدمی کو شکایت ہے اُسے دور کروں گا، جو مجھ سے نفرت کرنا چاہتا ہے اُسے محبت کرنے پر مجبور کروں گا، جو لوگ مجھ سے دور ہونا چاہتے ہیں میں اُن کے قریب ہو جاؤں گا، کیونکہ میں جانتا ہوں محبت فاتح عالم ہے، محبت کرنے والوں کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ مجھے واثق یقین ہے کہ میری تحریر پڑھنے والا ہر ہر آدمی آج سے صرف محبت پر یقین رکھے گا۔ معاف کر دو ان سب کو جو تمہارے قصوروار ہیں، کوئی تمہیں گالی دے، تو ہنس کر ٹال دو، ایک دو مرتبہ کے بعد وہ خود شرمندہ ہو جائے گا، کیونکہ ”محبت ہے فاتح عالم“

آپ کا اپنا
کاشی چوہان

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب



پیارے احوالی ساتھیو!

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ ماہِ مارچ کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ”پُر اسرار نمبر“ سچی کہانیاں کا بہت خاص شمارہ ہوتا ہے، جس کا قارئین کو بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ شمارہ پڑھیے اور دل سے اپنی آراء کا اظہار کیجیے۔ ساتھیو، سجنو، مترو، بس ایک چیز کا خیال رکھیے گا۔ تبصرہ مختصر اور جامع ہوں تاکہ زیادہ سے زیادہ دوستوں کو ان صفحات پر جگہ مل سکے۔ امید ہے میری چھوٹی سی گزارش پر آپ ضرور عمل پیرا ہوں گے۔

آیئے ساتھیو! آتے ہیں خطوط کی جانب۔ احوال میں یہ سب سے پہلی حاضری ہے رانا محمد شاہد کی بُورے والا سے۔ لکھتے ہیں، فروری کا شمارہ 30 جنوری کو ملا۔ 30 جنوری کو ہی ہم سب گھر والوں کی جان میں جان آئی۔ 26 جنوری سے ابو لاہور میں پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی میں ایڈمٹ تھے۔ وہ گزشتہ ایک ماہ میں 3-4 بار گر گئے تھے۔ ہم سمجھے لو یا ہائی بلڈ پریشر کا مسئلہ ہوگا۔ ڈاکٹروں نے مکمل تشخیص



کی اور کہا کہ ان کا دل بہت کمزور ہے اور گرنے کی وجہ بھی یہی ہے۔ پیس میکر (بیٹری) ڈالی جائے گی۔ ابو نے زندگی بھر انجکشن بمشکل لگوایا تھا۔ اب ایک دم آپریشن، ڈاکٹروں نے دل کی دھڑکن زیادہ ہونے کی وجہ سے پہلے 29 اور پھر 30 جنوری کی تاریخ دی تھی۔ ہم آپریشن سے پہلے کی پریشانی آپ کو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتے۔ اللہ کے فضل سے آپریشن کامیاب ہوا۔ اپنے پڑھنے والوں سے دُعائے صحت کی درخواست ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر کسی پر باپ کا سایہ تادیر قائم رکھے۔ (آمین)

فروری کے شمارے کا سرورق پاکستان کے دو قابلِ فخر سپوتوں، کراچی کے قابلِ فخر پولیس افسر چوہدری اسلم خان اور ہنگو کے بہادر طالب علم اعتزاز حسن سے سجا ہوا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پاکستان کو ایسے ہی نڈر اور جراٴت مند لوگوں کی ضرورت ہے۔ منزہ صاحبہ نے صحیح لکھا کہ اعتزاز جیسے نوجوان ہی اس ملک کا اعزاز اور فخر ہیں۔ کاشی بھائی! آپ نے ''کچھ اپنی باتیں'' میں اپنی محبوبہ یعنی کہانی کے بارے میں تو بتا دیا، مگر ہماری خواہش ہے کہ جسے اپنی محبوبہ کہتے ہیں، اُس کے ساتھ ہر ماہ آیا کریں کہ جو محبوب ہو، اس کا اگر ہر ماہ ذکر نہ ہو تو بات بنتی نہیں، تو پھر ہر ماہ آپ کی کہانی کا بھی انتظار رہے گا۔ احوال میں تصاویر کا سلسلہ اچھا ہے۔ محمد عزیز مئے! خوش قسمت ہیں کہ اللہ نے آپ کو چھ بیٹیوں سے نوازا، کیوں کہ میں نے پڑھا تھا کہ ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ ''جس نے اپنی دو بیٹیوں کی اچھی طرح پرورش کی، انہیں اچھی تعلیم دی اور پھر اچھی جگہ شادی کر دی۔ وہ جنت میں میرے ساتھ یوں ہوگا جیسے ہاتھ کی دو انگلیاں۔'' نازیہ بتول! نئے گھر کی مبارک باد۔ اس دفعہ کسی شخصیت پر سیر حاصل مضمون نہ تھا، تشنگی رہی، مضمون کی شمولیت کا سلسلہ مستقل کریں تا کہ ہر ماہ کسی نہ کسی تاریخی یا حالیہ شخصیت کے کارناموں سے آگاہی ہو۔ اس کی وجہ سے انفرادیت بھی ہے۔ اب اگر ایک ایک کہانی پر تبصرہ کرنے لگے تو تبصرہ بھیج چکے وقت پر۔ ایک بات پوچھنی تھی۔ صفحہ 170 پر زاہدہ حنا کی کہانی تھی۔ کیا یہ وہی زاہدہ حنا ہیں جو ایکسپریس میں عرصۂ دراز سے کالم لکھ رہی ہیں اور جو معروف شاعر جون ایلیا کی اہلیہ تھیں۔ کاشی بھائی! اپنی کہانیوں کی اشاعت کا انتظار رہے گا۔ اس دُعا کے ساتھ اجازت کہ اللہ ہمیں آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ (آمین)

☆ پیارے شاید، تمہاری تجاویز پر عمل درآمد کر لیا گیا ہے۔ ان شاء اللہ جلد ہی تبدیلی ملے گی۔ زاہدہ حنا کے بارے میں آپ نے ٹھیک لکھا۔



✉ لڈن ضلع وہاڑی سے یہ آمد ہے ہمارے دوست لکھاری منشی محمد عزیز مئے کی۔ لکھتے ہیں ایک طویل اور صبر آزما انتظار کے بعد اکتیس جنوری کی سہ پہر کو ''سچی کہانیاں'' کا دیدار نصیب ہوا۔ سب سے پہلے تو اپنا خط تلاش کیا اور جب اپنے نام و خط پر نظر پڑی تو خوش گوار قسم کی حیرت ہوئی۔ کاشی بھیا! جس محبت اور خلوص سے آپ قارئین کے خطوط کے جواب دیتے ہیں اور جس طرح سے آپ کا یہ اخلاق ہے، یقیناً اس کے سبب ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' ان شاء اللہ ہر لحاظ سے ترقی کرے گا۔ اب چلتے ہیں تازہ شمارے کی طرف۔ ماہ فروری کا سرورق مجھے تو بہت پسند آیا۔ صد فیصد نمبر لیے ہیں آپ نے، اشتہارات پر سرسری نظر دوڑاتے ہوئے ایڈیٹوریل پیج پر پہنچے، جہاں پر مرحوم انکل سہام مرزا ''سچی کہانیاں'' کے ساتھ موجود تھے۔ کاشی بھیا! آپ کی کارکردگی پر یقیناً انکل مرحوم بہت خوش ہوں گے۔ خدا

انہیں غریقِ رحمت کرے۔ (آمین) فہرست سے گزرتے ہوئے باجی منزہ سہام کے اداریے اعزاز تک پہنچے۔ ایسا اعزاز ہر کسی کے نصیب میں کہاں جیسا اعتزاز کو ملا۔ اندرونی صفحات میں اعتزاز حسن کی مختصر کہانی بھی پڑھنے کو ملی۔ قوم کے ایسے ہونہار سپوتوں کے متعلق ایک بار نہیں بار بار لکھتے جانا چاہیے۔ ''کچھ اپنی باتیں'' میں کاشی جی اپنی محبوبہ سے ملوا رہے تھے ہمیں۔ بہت خوشی ہوئی آپ کی محبوبہ سے مل کر۔ اللہ سلامت رکھے آپ کو اپنی ''محبوبہ'' کے ساتھ۔ احوال ہمارا پسندیدہ ترین سلسلہ ہے اور اب تو اس کو مزید نکھارنے کتنے اَن گنت چاند لگ رہے ہیں۔ خطوط کے ساتھ تصویروں کی صورت میں۔ احوال کے ابتدا میں لکھی آپ کی بات پر یقیناً عمل ہونا چاہیے، کوشش کرنی چاہیے کہ ہم کوئی ایسا اچھا کام کر کے جائیں کہ مر کے بھی امر ہو جائیں۔ ویلکم ثانیہ بھٹی صاحبہ! تصویر میں آپ کا مشرقی انداز دل کو بہت بھایا۔ ثمینہ ناز! آپ کا تبصرہ بہت زبردست تھا۔ لگتا ہے بھائی صاحب کو دو دن خود روٹیاں پکانی پڑی ہوں گی، کیوں کہ آپ تو سچی کہانیاں پڑھنے میں مصروف تھیں۔ عبدالعزیز جی آ! ارے یہ آپ ہیں! تصویر زیادہ پرانی تو نہیں ہے ناں؟ مبارک ہو کہ آپ کے دو خطوط شائع ہوئے۔ ویلکم عامر زمان عامر! بڑا زبردست تبصرہ کیا ہے آپ نے۔ آپ نے مجھے ویلکم نہیں کہا تو میں نے سوچا، میں ہی آپ کو ویلکم کہہ لوں۔ آ گلے لگ جا یار۔ ویسے آپ کی شکل وصورت میرے دوست سلیم خان پٹھان سے بہت ملتی جلتی ہے۔ مور شاہد حسین! بھیا، آپ کیوں شرما رہے ہیں، سیدھے ہو کر بیٹھیے ناں محفل میں۔ رانا محمد شاہد! مرضی یار تہاڈی، کدی یاد وی کیتا بادشاہ! کیہڑی غلطی ہوئی اے.....؟ تحسین جونیجو بہن! شاباش، مشاغل کے ساتھ ساتھ گھریلو ذمے داریاں بھی وقت پر پوری کرنی چاہییں۔ ویسے آپ اور زرینہ جونیجو بہن کے خطوط پڑھ کر مجھے ٹنڈو سومرو کی نظامانی سسٹرز یاد آ گئیں، کرن نظامانی، آیات نظامانی، جھنگ سے بہن سدرہ انور علی! آپ کا نام میرے ذہن کے کسی کونے میں اٹکا ہوا ہے، کم از کم آپ ہی مجھے ویلکم کہہ دیتیں تو آپ کا کون سا خرچہ ہو جانا تھا؟ نازیہ بتول رضا! نئے گھر کی مبارک باد قبول فرمائیے، کاشی صاحب نے سچ کہا ہے کہ آج کل نیا گھر بنانا (یا مکان بنانا) ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کے مترادف ہے۔ آپ خالی ہاتھ ہی چلی آئیں؟ کاشی بھیا جی! ایک اور مزے کی بات بتاؤں آپ کو؟ یہ جو احوال کے آخر میں آپ وارننگ کے طور پر لکھتے ہیں کہ خط پانچ تاریخ تک مل جانا چاہیے، اس بات سے مجھے ہنسی آتی ہے۔ آپ پوچھیں گے کیوں؟ تو میں آپ کو وجہ بتا ہی دوں۔ دراصل آپ کا انداز ایسا ہی ہوتا ہے گویا ایک ماں اپنے ڈھیر سارے بچوں سے مخاطب ہو کر کہے ''دیکھو بچو! جو پڑھائی میں اوّل آئے گا، اُسے انعام ملے گا باقی سب کو شاباشی ملے گی۔'' ہاں ایک اور بات ذاتی طور پر آپ سے کہ اگر 2013ء سے پہلے کے ''سچی کہانیاں'' کے شمارے اگر کوئی بھی فرد قیمتاً مجھے دینا چاہے تو میں وہ تمام رسالے خریدنے کو تیار ہوں، پلیز کاشی بھیا! میری یہ درخواست قارئین کے گوش گزار کر دیں، اس بات کے لیے میں ڈھائی تین سو کلومیٹر کا سفر کرنے کو بھی تیار ہوں۔ جوریہ سلیم کی برسات، محمد فہیم کی زندگی پنجرہ چاند کا، محمد اسلم آزاد کی ابھاگن ایسی ہی ایک داستان میرے پاس بھی ہے، میرے احمق دوست کی جوان شاء اللہ عنقریب آپ کی میز پر ہوگی۔ سکینہ صدف کی زنجیر ٹوٹ گئی، نسیم سکینہ صدف کی ساس مرحومہ کے لیے دعائے مغفرت، اللہ انہیں اپنی جوارِ رحمت میں رکھے اور سوگواران کو صبر عطا فرمائے۔ (آمین) ''اُٹھ باندھ کمر'' ویلڈن محمد مدنی فدا صاحب! مایوسی کفر ہے اور ہمتِ مرداں مددِ خدا۔ ''میرے آنگن کا تحفہ'' شیخ معظم الٰہی کی یہ تحریر کم از کم مجھے تو ڑ گئی۔

☆عزیز بھیا! اب تو گلہ نہیں ہے نا کوئی۔ احوال تو آپ سب کی آمد سے ہی سجتا ہے۔ تو یہ خوشی ہمیں ہر ماہ چاہیے۔



✉ فریدہ فری یوسف زئی کی احوال میں آمد ہے، السلام علیکم! کاشی بھائی۔ فروری کا سچی کہانیاں پیارے سے ٹائٹل کے ساتھ ملا۔ سب سے پہلے منزہ سہام کا اعزاز پڑھا، بہت اچھا تھا۔ کچھ اپنی باتیں، کیسا بہترین لکھتے ہو، کمال کر دیا۔ تین مرد تین کہانیاں نیا سلسلہ اچھا لگا۔ سچی کہانیاں میں بہت ہی منفرد تبدیلیاں آئی ہیں جو کہ بے حد اچھی لگیں، کاشی بھائی میں نے تبصرہ بھیجا تھا اور شاعری بھی اس کا کیا ہوا۔ اس مرتبہ تمام کہانیاں بہترین تھیں۔ خوشبو، ناگن، واحد حل، باز اور ابابیل، عمر کی نقدی، سڑک چھاپ تصاویر کے ساتھ بھی تحریریں پسند آئیں، اس مرتبہ میرا تبصرہ اور شاعری ضرور لگائیے گا، شکریہ۔

☆ لیجیے فریدہ جی! آپ کا تبصرہ بھی لگ گیا اور شاعری بھی۔ اب تو خوش ہیں نا آپ۔



✉ مور شاہد حسین! حب چوکی بلوچستان سے۔ بہت محبت سے ہر ماہ ریگولر ہمارے احوال میں شرکت کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں کاشی چوہان بھیا کیسے ہیں آپ؟ خدا آپ کو سدا خوش سلامت کامیاب رکھے (آمین) آپ کا بے حد شکریہ کہ آپ نے ہماری ہمت افزائی کی۔ بھیا جی پرچہ ابھی تک نہیں ملا۔ میں چند دنوں کے لیے قمبر (لاڑکانہ) جا رہا ہوں۔ امید ہے پرچہ پہلے سے کافی بہتر ہوگا۔ ویسے آپ کی محنت اور لگن ''سچی کہانیاں'' کے دسمبر اور جنوری کے شماروں میں ہی منہ بولتا ثبوت ہے، لیکن فروری کا پرچہ بہت ہی عمدہ ہوگا، میں یہ بات پورے یقین سے کہتا ہوں، جس پرچے کا آپ جیسا مدیر ہو، اس پرچے کو ہر ماہ چار، چھ، آٹھ، دس، بیس نہیں بے شمار چاند لگ سکتے ہیں۔ آپ کی محنت کو سلام۔ خدا آپ کو ہمیشہ بے پناہ محبتوں، چاہتوں، نعمتوں، رحمتوں، کامیابیوں سے نوازے۔ (آمین) اب اجازت اپنا بہت بہت خیال رکھیے گا۔

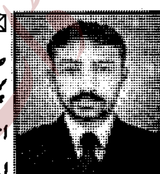
☆ پیارے شاہد۔ بس بھئی تمہاری محبتوں کے تو ہم مقروض ہیں۔ سلامت رہو مگر بھرپور تبصرے کے ساتھ۔



✉ کراچی سے یہ احوال میں شرکت ہے ہماری مستقل قاری اور لکھاری ثمینہ ناز کی، لکھتی ہیں، امید ہے کہ آپ اور آپ کا تمام اسٹاف اور قارئین خیر و عافیت سے ہوں گے۔ پروردگار سے دعا ہے کہ ہر صبح کا سورج زندگی کی تمام خوشیاں سمیٹ کر ہمارے اور آپ کے آنگن میں اُترے۔ بڑی جستجو کے بعد پرچہ 31 تاریخ کو ہاتھ آیا، سرورق کی شخصیت خوب صورتی کا مرقع اس پر بیوٹی پارلر کے دھنک رنگوں نے سونے پر سہاگا کر دکھایا۔ منزہ آپی کا ''اداریہ'' اس میں کوئی شک نہیں کہ پاک سرزمین کا مستقبل محفوظ ہاتھوں میں ہے، بس ہمیں احساسِ ذمے داری سے کام لینا ہوگا۔ ''کچھ اپنی باتیں'' کاشی بھائی آپ کی ''محبوبہ'' کہانی نے تو ہمارے چودہ طبق روشن کر دیے۔ آپ کا عشق لازوال، بے مثال اور بے نظیر ہے جو رگِ جاں سے بھی نزدیک تر ہے۔ یقیناً یہ ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے، اس سے ہمیں بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ احوال کی محفل اپنے عروج پر تھی، پہلی کہانی ''یہ رشتہ و پیوند'' پڑھی بہت خوب، لاجواب۔ بانو قدسیہ کو قارئین کو فن میں منہمک رکھنے کا فن خوب آتا ہے۔ بہن بھائی کی لازوال محبت کی کہانی۔ ''سرفروشی ہے زندگی'' ایسی نادر و نایاب شخصیت جو اپنی مثال آپ تھے۔ ایس پی چوہدری اسلم اور 15 سالہ اعتزاز حسن جیسے ہیرو اس ملک میں جنم لیتے رہیں گے تب

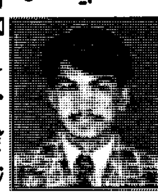
تک ملک دشمن عناصر کی کمر ٹوٹتی رہے گی۔ ''واحد حل'' لوگوں کو لوٹنے کی ٹیکنک بہت اچھی تھی۔ جویریہ سلیم کی ''برسات'' بہت شاندار تھی۔ ''سر آئینہ پسِ آئینہ'' پہلی مرد کہانی متبول جلیس کی معاشرے کے پوشیدہ اور نازک پہلو پر مبنی تحریر، بہت متاثر کن تھی۔ ''عمر کی نقدی'' دل سوز تحریر تھی۔ ''باز اور ابابیل'' آزاد خیال اور رنگین مزاج مردوں کی وجہ سے نا جانے کتنی ہی لڑکیاں موت کی میٹھی نیند سو جاتی ہیں۔ خیر اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا، دیر آید درست آید۔ محمد اسلم آزاد کی ''ابھاگن'' بہت سبق آموز تحریر تھی۔ ''زنجیر ٹوٹ گئی'' ریشماں اپنے ہنستے بستے گھر کو چھوڑ کر اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ جاتی ہے، لعنت ہے ایسی عورتوں پر جو خود ہی اپنے لیے جہنم کی آگ تیار کر رہی ہیں۔ ''اُجالوں کا ماتم'' بہت بہت...... نصیحت آموز کہانی تھی۔ ''سڑک چھاپ'' اچھے برے لوگ ہر مذہب اور ہر قوم میں پائے جاتے ہیں، پروردگار ہم سب کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی ہدایت دے۔ گربچن سنگھ کی ''خوشبو'' کملا کو سمجھداری اور اشوک کو تھوڑا درگزر سے کام لینا چاہیے تھا۔ کچھ فیصلے وقت کرتا ہے اور کچھ انسان۔ لیلاالعل بکی کی ''چاند'' وہ دونوں ہی اس جذبے سے عاری تھے کہ اللہ تعالیٰ دل کی ٹھنڈک کے لیے اولاد جیسی نعمت عطا کرتا ہے۔ تب ہی تیسرے پھول کی آمد سے لرزاں تھے۔ ''سخن آباد'' میں انکل عبدالعزیز کی نظم ہمارے سوئے ضمیر کو خوابِ غفلت سے جگانے کا اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ غزلوں میں علی رضا عمرانی، عامر زمان اور شاعرہ رضوانہ کوثر کی شاعری لاجواب۔ من پسند ''ملکنی'' ابھی زیرِ مطالعہ ہے، بہت جلدی ہے احوال میں شرکت بھی کرنی ہے۔ کاشی بھائی، انکل عبدالعزیز کا کہنا بجا ہے، قاری اس قلیل مدت میں کیا پڑھے اور کیا تبصرہ لکھے۔ اس مرتبہ تمام کہانیاں جتنی پڑھیں بے حد شاندار، آپ کی مہارت اور ادارت پرچے کو دوبارہ اسی مقام پر پہنچا دے گی جہاں سچی کہانیاں کچھ عرصے پیش تر تھا۔

☆ ثمینہ جی! خوش رہیے۔ تبصرہ اچھا کیا آپ نے، اگلے ماہ انتظار رہے گا۔



✉ غلام رسول گل، جیکب آباد سے شاملِ احوال ہیں، لکھتے ہیں۔ السلام علیکم، بھائی صاحب کیسے ہیں آپ؟ دل کش ٹائٹل کے ساتھ سچی کہانیاں انتظار کی سولی پر لٹکتے آخر پہلی فروری کی صبح کو تب موصول ہوا جب میں آفس جا رہا تھا۔ سب سے پہلے میں نے احوال کی جانب دوڑ لگائی، اس دوڑ کی High Speed تھی۔ ورق پلٹتے پلٹتے ہم اپنے خط پر رک گئے، اپنی تصویر دیکھ کر دل خوشی سے سرشار ہوا۔ ہمیشہ آپ کا مشکور اور ممنون ہوں، کسی کا دل جیتنا کوئی آپ سے سیکھے۔ میری حوصلہ افزائی پر تہہ دل سے آپ کا اور مور شاہد حسین کا شکریہ۔ آپ سوچ رہے ہوں گے میں اپنی سنانے آیا ہوں اور چلا جاؤں گا، بالکل آپ کی سوچ درست ہے۔ بھائی صاحب پرچہ ہی جب لیٹ ملتا ہے تو ہم کیا کریں، ہم اپنی سنانے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اس بار بغیر تبصرے کے حاضر ہوں۔ اگر مارچ کا شمارہ بروقت ملا تو ان شاء اللہ مکمل تبصرہ کروں گا، تب تک اللہ نگہبان۔

☆ پیارے گل! تم نے ہائی جمپ لگائی مگر تبصرہ...... چلو بھائی اگلے ماہ کا انتظار کر لیتے ہیں۔



✉ المعراج بھٹہ خشت لڈن سے منشی خورشید احمد کنول کی احوال میں اولین آمد ہے، لکھتے ہیں۔ محترم جناب مدیر صاحب! السلام علیکم، کسی بھی رسالے میں یہ میرا پہلا خط ہے اور اس کا سبب میرے دوست نما اُستاد منشی محمد عزیز مئے صاحب ہیں۔ ان کے ساتھ اور بھی رشتے ہیں، میں نے اُن سے وعدہ لیا ہے کہ وہ میری زندگی کی کہانی آپ کو بھیجیں گے۔ میں انشاء اللہ مارچ میں مسقط جا رہا ہوں اور

ماہنامہ سچی کہانیاں کی ایک عظیم الشان اور فخریہ پیش کش

روحانی کہانی نمبر

اس بار سچی کہانیاں آپ کے لیے لا رہا ہے ایک ایسا شمارہ جو اپنی مثال آپ ہوگا۔

☆ روحانیت سے جڑے وہ واقعات جو اکثر ہمارے ساتھ پیش آتے ہیں اور جو اس رشتۂ خاص کو سمجھ جاتے ہیں وہ ان کے راز تک پہنچ جاتے ہیں اور جو سمجھ نہیں پاتے وہ اپنی ہی ذات کے صحرا میں بھٹک جاتے ہیں۔

[illegible] لینے والی کہانیاں

ماہنامہ سچی کہانیاں کے روحانی کہانی نمبر میں ملاحظہ فرمائیے۔

ہمارے لکھاریوں کا تعاون، ہمیشہ ہمیں کچھ الگ کر دکھانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

قلم اٹھائیے اور اپنی زندگی سے جڑے، اپنی آنکھوں سے دیکھے یا کانوں سے سنے، وہ واقعات جو اپنے اندر ایک اسرار رکھتے ہیں۔ ہمیں لکھ بھیجیں۔

اپنی تحریریں اس طرح ارسال کریں کہ ہمیں 20 مارچ تک موصول ہو جائیں۔

اپنی تحریر آپ ہمیں Email کے ذریعے بھی ارسال کر سکتے ہیں

ڈاک سے بھیجنے کے لیے ہمارا پتا:

110۔ آدم آرکیڈ۔ شہید ملت روڈ/ بہادر شاہ ظفر روڈ۔ کراچی

E:mail Pearlpublications@hotmail.com

نوٹ: تحریر کے ساتھ آپ کی تصویر لازمی آنا چاہیے

اُن کا وعدہ ہے کہ گرمیوں کے موسم میں میری کہانی ''سچی کہانیاں'' میں ضرور شائع ہوگی۔ اب میں نے تو اپنی ساری زندگی کھول کر عزیز مئے کے سامنے رکھ دی ہے، آگے اب اُن کی اور پھر آپ کی مرضی کی بات ہے کہ کب مجھے اپنی ''آپ بیتی'' سچی کہانیاں میں پڑھنے کو ملے گی۔ پچھلے ماہ کا شمارہ عزیز صاحب سے لے کر پڑھا، اچھا لگا تو سوچا کہ دوستوں کی محفل میں حصّہ لینا چاہیے۔ سو حاضر ہیں اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ کے ساتھ۔ اداریے میں محترمہ منزہ سہام صاحبہ نے خوب لکھا۔ پاکستان کا فیوچر ان شاء اللہ محفوظ رہے گا۔ اعتزاز حسن کی شجاعت پر عش عش کر اُٹھے، یقیناً جس قوم میں اعتزاز جیسے بچے پیدا ہوتے ہیں، اُس قوم کا مستقبل تاب ناک ہی ہوگا۔ کچھ اپنی باتیں میں کاشی چوہان صاحب اپنی محبوبہ کا تذکرہ لیے بیٹھے تھے۔ احوال میں محترمہ ثمینہ ناز، عامر زمان عامر، تحسین جونیجو، منشی محمد عزیز مئے اور نصرت سرفراز کے خطوط تبصرے سے بھرپور تھے۔ کہانیوں میں سے ابھی تین چار کہانیاں ہی پڑھی ہیں۔ یہ رشتہ و پیوند بانو قدسیہ کی یہ تحریر محبت کا ایک نیا ہی پہلو لیے ہوئے تھی۔ باز اور ابابیل ایک عیاش امیرزادے کی داستان تھی جس کے جھوٹے وعدوں اور سہانے سپنوں نے ایک لڑکی کی جان لے لی۔ ویسے رائٹر کا اندازِ بیاں ذرا مزاحیہ قسم کا تھا۔ ''پھر بہار آئی ہے'' ممتاز احمد کی یہ کہانی رانگ نمبر کے فون سے شروع ہوئی اور بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ سخن آباد بہت اچھا سلسلہ ہے۔ جس میں شہزاد کنول کی کوشش، عامر زمان عامر کی غزل اور مور شاہد حسین کی ''منی کو نہلیں'' پسند آئیں۔ ان شاء اللہ پھر ملیں گے، اگر خدا لایا۔

☆ خورشید کنول صاحب! خوش آمدید۔ خدا آپ کو آپ کے نیک مقاصد میں کامیاب کرے، آپ کی کہانی کا انتظار رہے گا۔



✉ یہ آمد ہے احوال میں شارجہ، دبئی سے محمد شہزاد کنول کی، لکھتے ہیں۔ ماہ فروری کا شمارہ موصول ہوگیا۔ یقین کریں اپنی تحریر، خط اور نظم دیکھ کر آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ کاشی بھائی شکریہ کا لفظ مجھے بہت چھوٹا لگ رہا ہے۔ امید ہے میرے جذبات آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ شمارہ بہت پسند آیا، برسات، برسات، پنجرہ چاندی کا، ابھاگن، اُجالوں کا ماتم، زنجیر ٹوٹ گئی اور پھر بہار آئی، سچ بیانیوں میں اپنی مثال آپ رہیں۔ بدیسی سات سمندر کی کہانیوں میں چاند زبردست رہی، زیردست اور بردا بھی خوب تھیں۔ سرحد پار سے منتر نے واقعی ہمیں بے خود کردیا۔ کیا کمال تحریر تھی، جبکہ گربچن سنگھ کی خوشبو بھی بہت اچھی لگی۔ زاہدہ حنا کی شعلہ ساماں تحریر ''تم کون ہو؟'' ایک لازوال تحریر تھی، جب کہ دوسرا شعلہ حمیرا خان کی طرف سے واحد حل بھی زبردست رہی۔ اقبال زمان کی سرفروشی ہے زندگی بھی اچھی لگی۔ تین مرد تین کہانیاں میں مقبول جلیس صاحب کی کہانی بے حد وحساب کمال کی تھی، جب کہ دستگیر شہزاد کی باز اور ابابیل حقیقت سے قریب ترین لگی۔ خصوصی کہانی کے طور پر بانو قدسیہ صاحبہ کی کہانی ''یہ رشتہ و پیوند'' زبردست اور خاص الخاص کہانی تھی۔ ایسی کہانیاں کم ہی پڑھی ہیں۔ سخن آباد بھی ایک اعلیٰ پائے کا سلسلہ ہے، باقی تینوں سلسلے وار ناول آتشِ جنوں، مکھنی اور ناگن بہت اچھے ہیں، مگر آتشِ جنوں کو کھاڑی سے نکال دیں (ہاہا) اور ایک بار پھر آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھے شائع کیا۔

☆ پیارے شہزاد! تم خوش ہوئے، پرچہ پسند آیا، ہماری محنت وصول ہوگئی۔ خوش رہو۔

✉ چک نمبر 58 شمالی سرگودھا سے یہ آمد ہے فیصل ندیم بھٹی کی، لکھتے ہیں۔ السلام علیکم! محترمہ

آنٹی منزہ سہام صاحبہ، کاشی بھیا و دیگر اسٹاف سچی کہانیاں فروری کا شمارہ میرے سامنے ہے۔ شمارے کے شروع میں ماڈل کا بناؤ سنگھار قابل دید تھا۔ منزہ سہام صاحبہ نے اعتراز حسن کو اعلیٰ الفاظ سے خراج تحسین پیش کیا ہے۔ کاشی بھیا کی کچھ اپنی باتیں، پڑھ کر یوں محسوس ہو رہا ہے کہ کہانی کاشی بھیا کے خون میں پیوست ہو گئی ہے۔ اب کچھ تبصرہ کہانیوں کا کرتے ہیں جویریہ سلیم کی کہانی ''برسات'' میں بیلوں کی رسم تو بہت پسند آئی، لیکن دوسری طرف سردار حکیم اور پیر جی تو انسان کے روپ میں درندے ہیں۔ محمد فہیم کی کہانی ''زندگی پنجرہ چاندی کا'' محمد اسلم آزاد کی کہانی ''ابھاگن، زنجیر ٹوٹ گئی'' میں سکینہ صدف کی محمد مدنی فدا کی کہانی ''اُٹھ باندھ کمر'' بھی سبق آموز کہانی ہے، ارشد وفا کی کہانی ''اُجالوں کا ماتم'' غلام مصطفیٰ کی ''امر نامہ'' الماس فاطمہ ارمان کی کہانی ''سُرک چھاپ'' سرگودھا سے جناب ممتاز احمد صاحب نے جو سوکنوں کی محبت بھری کہانی کو لکھا ہے، انتہائی قابل ستائش ہے ویسے بہت کم ایسا ہوتا ہے، سوکنوں کا آپس میں محبت کرنا، بہر کیف انتہائی پسندیدہ کہانی ہے۔ ''میرے آنگن کا تحفہ'' باپ بیٹی کی محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ آتش جنوں، سلیم فاروقی صاحب کا سلسلہ بہت ہی پسندیدہ ہے، کہانی چاند تو پڑھ کر ایسے لگا کہ جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ منشی پریم چند کی ''منتر'' واقعی معرکتہ الآراء کہانی ہے۔ بوڑھے کا ڈاکٹر چڈھا کے بیٹے پر منتر پڑھنا اور اس کا ٹھیک ہونا انسانی خدمت کی عظیم مثال ہے۔ سدرہ انور علی صاحبہ چند ماہ سے کن خیالوں میں گم ہیں آپ۔ اب تو کچھ لکھ ہی دیں۔ حافظہ مون صاحبہ کہاں غائب ہیں آپ؟ اس ماہ میں 19 اپریل کو اپنی 22 ویں سالگرہ منا رہا ہوں، انہی الفاظ کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں، تمام قارئین اور اسٹاف کو سلام

☆فیصل ڈیئر، خوش رہو۔ یہ سب تو خیر فارم میں آ ہی جائیں گے۔ تم کہاں گم ہو بھائی، کچھ تو ادھر عنایت کرو تبصرے کے علاوہ بھی......



✉یہ احوال میں پہلی بار آمد ہے ہمارے نئے ساتھی شہریار احمد کی بہاول پور سے، لکھتے ہیں۔ جناب کاشی چوہان صاحب! میں بی ایس سی کا اسٹوڈنٹ ہوں، تعلیمی مصروفیات نے ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' سے طویل عرصے سے دُور رکھا ہوا تھا۔ ماہ فروری کے خوب صورت شمارے کو دیکھ کر ایک خوش گوار مسرت کا احساس ہوا، جیسے کہ کسی ہمدم دیرینہ سے اچانک کہیں کسی غیر متوقع طور پر ملاقات ہو جائے۔ سچی کہانیاں میں بہت ساری تبدیلیاں دیکھ کر بھی خوشی ہوئی، میں نے جب آنکھ کھولی، اپنے آس پاس سچی کہانیاں دوشیزہ کو ہی پایا۔ رُخسانہ سہام مرزا، سہام مرزا، منزہ سہام، سلیم فاروقی جناب پرویز بلگرامی، دانش دیروی کا ہمارے گھر میں اس تواتر سے ذکر ہوتا تھا، جیسے کہ قریبی عزیزوں، رشتے داروں اور پیاروں کا ذکر ہوتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا تھا، اس کا سبب کیا تھا، پھر کبھی بتا دوں گا۔ اب تازہ شمارے پر کچھ بات ہو جائے۔ کہانیوں میں جناب محمد فہیم کی کہانی زندگی پنجرہ چاندی کا اس شمارے کی بہترین کہانی قرار دیا جا سکتا ہے۔ باقی کہانیاں بھی اچھی ہیں، ابھی رسالہ زیر مطالعہ ہے، اس لیے بھرپور تبصرہ ظاہر ہے کہ کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ بہت سارے مانوس لکھاریوں کے نام دیکھنے کو آنکھیں ترستی رہیں۔ جناب کاشی چوہان کی محنتوں کو داد دیے بغیر نہ رہ سکوں گا۔ احوال میں جگہ ملی تو حاضری دیتا رہوں گا۔

☆شہریار، آپ کا خط لگا دیا، اب دوستی پکی! اگلے ماہ کے لیے فوراً اپنی نگارشات روانہ کر دو۔



✉ عادل حسین، کراچی سے شاملِ احوال ہیں، لکھتے ہیں۔ محترم کاشی جی! السلام علیکم، امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ اللہ آپ کو اور ''سچی کہانیاں'' کو مزید ترقی عطا فرمائے۔ فروری کا ڈائجسٹ دیکھا۔ انتہائی خوب صورت، ٹائٹل کی دلہن بالکل ہمارے خوابوں میں بسی حسینہ جیسی ہے۔ مجھ کنوارے کے لیے آئیڈیل دلہن جیسی! منزہ سہام صاحبہ نے ٹھیک لکھا ہے۔ اللہ پاک اعتزاز جیسا جذبہ ہم سب کے دلوں میں پیدا فرمادے اور پاک سرزمین کی حفاظت فرمائے۔ کاشی جی آپ کی محبوبہ بھی بہت خوب ہے۔ بالکل ہمارے خوابوں کی دلہن جیسی، نہیں، شاید اُس سے بھی پیاری۔ احوال دیکھ کر اندازہ ہوا کہ لوگ آپ سے اور سچی کہانیاں سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ 22 صفحات کوئی کم ہیں اور خطوط بھی سب ہی اچھے۔ جویریہ سلیم کی برسات اچھی تھی، محمد فہیم صاحب نے بھی بہت خوب صورت انداز میں کہانی کو پیش کیا ہے۔ محمد اسلم آزاد کی ابھاگن بھی اچھی ہے۔ نائس......نسیم سکینہ جی۔ اُٹھ باندھ کمر محمد مدنی فدا، اُجالوں کا ماتم ایم ارشد وفا صاحب کی اچھی لگیں۔ محبت اندھی ہوجاتی ہے یا محبت میں لوگ اندھے ہوجاتے ہیں۔ شاید لوگ، اگر اندھے نہ ہوں تو امر نامہ جیسی کہانیاں جنم ہی نہ لیں۔ اچھا لکھا ہے غلام مصطفیٰ صاحب نے۔ سڑک چھاپ پڑھ کر دِل دُکھی ہوا۔ الماس فاطمہ جی۔ پھر بہار آئی ہے پڑھ کر بہت مزا آیا۔ ممتاز احمد صاحب۔ مرے آنگن کا تحفہ بھی شیخ معظم الٰہی نے بہت اچھی لکھی ہے۔ تینوں بدیسی کہانیاں ٹھیک ہیں۔ سرحد پار سے دونوں کہانیاں خوبصورت۔ میں کیا اور میرا تبصرہ کیا۔ دونوں کا اپنا مقام ہے۔ زاہدہ حنا صاحبہ کا نام کسی تعریف کا محتاج نہیں ہے، یہ تحریر واقعی شعلہ ساماں ہے۔ بہت لاجواب اندازِ بیاں، اعلیٰ پائے کی تحریر پڑھ کر دِل خوش ہوگیا۔ واحد حل بھی خوب صورت ہے حمیرا خان کی۔ لوٹنے والے کو کیا خبر کہ لٹنے والا کن مصائب میں گھرا ہوا ہے۔ چوہدری اسلم صاحب اور اعتزاز کو دعا کے سوا ہم دے بھی کیا سکتے ہیں۔ مقبول جلیس صاحب کا اندازِ بیاں بہت خوب صورت ہے، پڑھ کر بہت مزا آیا۔ عمر کی نقدی، باز اور ابابیل بھی پسند آئیں۔ بانو قدسیہ صاحبہ کی ہر تحریر ہی خاص ہوتی ہے۔ یہ بھی خاص ہے۔ سخن آباد میں سب ہی نے اچھا کلام پیش کیا ہے۔ آتشِ جنوں، ناگن اور ملکھنی ابھی پڑھ نہ سکا۔ سوچا 5 تاریخ سے پہلے اپنی حاضری لگوادیں۔

☆ پیارے عادل۔ تمہارا کلام اور تحریریں موصول ہوگئی ہیں، جلد ہی تم بھی اِن ہی صفحات پر جگمگاتے ہوئے نظر آؤ گے۔



✉ عظیم الدین انصاری قلات سے رقم طراز ہیں۔ پیارے کاشی بھائی! فروری کا شمارہ خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ ملا، دیکھتے ہی واہ نکلا۔ بائیوگرافی کی کمی محسوس ہوئی، مگر آگے آگے پڑھتے گئے تو تشنگی دور ہوتی گئی۔ اس بار زاہدہ حنا کی ''تم کون ہو؟'' بانو قدسیہ کی ''یہ رشتہ و پیوند'' حمیرا خان کی واحد حل، مقبول جلیس کی سرِ آئینہ پس آئینہ، دستگیر شہزاد کی باز اور ابابیل، شہزاد کنول کی عمر کی نقدی، پریم چند کی منتر، گربچن سنگھ کی خوشبو کے علاوہ تینوں بدیسی کہانیاں اے ون رہیں، جب کہ سچ بیانیاں بھی اچھی لگیں۔ احوال کے صفحات زیادہ تھے مزہ آیا تبصرے پڑھ کر۔ کاشی بھائی ایک اور کہانی آپ کی نذر کررہا ہوں، اس امید کے ساتھ کہ جلد شائع کرکے شکریہ کا موقع دیں گے، باقی سارے احوالیوں کو میرا بہت بہت سلام۔

☆ عظیم! ہمارے لیے باعثِ فخر بات احوال میں تمہاری باقاعدہ حاضری ہے۔ اسے برقرار رکھنا۔

کو پسند کرنے کا شکریہ، تمہاری پسندیدگی تمام مصنفین تک پہنچ گئی ہے۔



✉ یہ ہیں احوال میں ہمارے ساتھ لاہور سے بشریٰ سعید احمد صاحبہ، لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! میری طرف سے سچی کہانیاں اور دوشیزہ میں سب کو سلام۔ سب سے پہلے نئے سال کی بہت بہت مبارک باد قبول ہو۔ خدا سے دُعا ہے کہ وہ اس نئے سال میں سب کو بہت سی خوشیاں عطا کرے۔ (آمین) اِس بار کا سچی کہانیاں نیا نیا اور زبردست لگا۔ ہر ورق سے کاشی کا اسٹائل جھلک رہا تھا۔ دیکھ کر جتنا اچھا لگا پڑھ کر اُتنا ہی مزہ آیا۔ تمام کہانیاں لاجواب ہیں، مگر مجھے ایڈیسن ادریس کی ''کالک'' اور سید قاسم محمود کی ''وصیت نامہ'' سب سے زیادہ پسند آئیں۔ دونوں کمال کی تحریریں ہیں۔ سلسلے وار ناول ''ناگن'' بہت خوب صورت تحریر ہے۔ اب اجازت دیں خدا حافظ۔

☆ بشریٰ جی! آپ کی آمد خوش گوار لگی، امید ہے آئندہ ماہ بھرپور تبصرے کے ساتھ آپ کی آمد ہوگی۔

✉ یہ آمد ہے جودھالہ، سیالکوٹ سے تمثیلہ لطیف صاحبہ کی، لکھتی ہیں۔ محترم جناب کاشی چوہان، السلام علیکم! تمام تر دعاؤں کے ساتھ آپ کی خیریت کے لیے خدا سے دعا گو ہوں، مولا کریم ہر خوشی سے نوازے، صحت زندگی اور تندرستی عطا کرے۔ (آمین) عرض احوال یوں ہے کہ میں آپ کو دو کہانیاں اور غزلیں ارسال کر رہی ہوں، شاملِ اشاعت کریں۔ سچی کہانیاں کے لیے کہانی آپ کی نذر۔ جس کے لیے آپ کا خلوص یقینی شامل ہوگا، اُمید کرتی ہوں کہ اپنے خلوص سے، اپنی دعاؤں میں آپ ضرور یاد رکھو گے۔

☆ اچھی تمثیلہ جی! سلامت رہیے، کہانیاں جلد اشاعت پذیر ہوں گی، شاعری تو آپ کی گاہے بگاہے لگتی ہی رہتی ہے۔

✉ حافظہ مون شاہ، 103 شمالی سلانوالی روڈ، سرگودھا سے لکھتی ہیں۔ اچھے بھائی کاشی چوہا، السلام علیکم! سچی کہانیاں میں آپ کی آمد بہار کا جھونکا ثابت ہو رہی ہے۔ اب یہ بہار کا جھونکا عارضی نہ ہو بلکہ مستقل بہار بن جائے، اپنے پیارے رسالے کی تبدیلیاں زبردست لگیں۔ جدید و قدیم کا حسین امتزاج۔ کاشی بھائی آپ کے ساتھ بات ہونے سے پہلے میں سمجھتی تھی کہ آپ مغرور ہوں گے۔ لیکن میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ آپ سے بات کر کے بے حد اپنائیت کا احساس ہوا۔ آپ نے پراسرار کہانی لکھنے کو کہا۔ میں نے کوشش

قارئین سچی کہانیاں کا SMS سیل کارنر

ہمارے نئے سلسلے سچی کہانیاں SMS سیل کارنر میں ہمارے قارئین اپنی رائے کا اظہار بذریعہ SMS کر سکتے ہیں۔ پیارے قارئین آپ کو اس ماہ کا سچی کہانیاں کیسا لگا؟

اِس ماہ کا سچی کہانیاں پڑھیے اور SMS پر فوراً اپنی رائے کا اظہار کر دیجیے۔ سب سے زیادہ SMS بھیجنے والا قاری پائے گا ایک خوبصورت گفٹ۔

(نوٹ): آپ اِس ماہ کے سچی کہانیاں کے بارے میں اپنے پیغامات کا اظہار ایک SMS کے ذریعے درج ذیل نمبر پر کر سکتے ہیں۔ **0333-2269932**

کر کے لکھ دی۔ حالاں کہ میرا یہ مزاج نہیں ہے، اس لیے اس میں کمی بھی ہو سکتی ہے۔ کاشی بھائی یہ محترمہ تو بہت ڈرپوک ہیں۔ اگر کسی سے کوئی پراسرار بات سن لے تو ساری رات سوتی نہیں، آپ نے اسے کہانی لکھنے کو کہا تو مجھے بہت زور کی ہنسی آئی تھی۔ چلو جی اب مون بی بی کی راتوں کی نیند اُڑی اُڑی، ہاہاہا مریم شاہ یہ خیالات بھی آپ تک پہنچانے ضروری تھے۔ مور شاہد بھیا ہماری دعائیں سب مسلمانوں کے ساتھ ہیں اور یقیناً آپ بھی انہی میں شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی ہر مشکل کو آسان کرے اور ہر جائز حاجت کو پورا فرمائے۔ (آمین) آخر میں کاشی بھیا ہمیں یاد آیا کہ میری تحریر ''آئینہ خانے میں'' کا کیا بنا؟ ضرور بتایئے گا......خوش رہیں، سب قارئین کرام کو ڈھیروں دعائیں اور بے حد سلام۔

☆ اچھی بہن! تمہاری کہانی مل گئی ہے، ان شاء اللہ جلد ہی شائع ہو جائے گی اور ہاں تبصرہ اچھا کیا، اگلے ماہ بھی تبصرہ ہمیں موصول ہو رہا ہے نا......؟



✉ ملک صفدر عباس اعوان، جہانیاں، خانیوال سے تحریر کرتے ہیں۔ جناب محترم کاشی چوہان صاحب آداب، امید کرتا ہوں کہ آپ بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں گے، فروری کا رسالہ ابھی تک نہیں مل سکا، اس لیے کسی بھی تبصرے سے قاصر ہوں۔ رسالے کا یوں لیٹ ہو جانا پتا نہیں کراچی کے خراب حالات کا پیش خیمہ ہے یا کوئی اور بات ہے۔ جنوری کا شمارا بھی تھوڑا لیٹ ملا تھا، جس سے رسالہ پڑھنے میں خاصی دشواری پیش آئی، اب آپ سے کیا چھپانا، بات دراصل یہ ہوئی کہ جس وقت رسالہ مجھے ملا، اسی وقت میں لذیذ کڑاہی گوشت تناول فرما رہا تھا، اب کھانے کو چھوڑا نہیں جا سکتا۔ ہم کچھ پیٹو واقع ہوئے ہیں اور پھر رسالے کو تو کسی قیمت پر بھی نہیں چھوڑ سکتے۔ اس کا حل ایک یہ نکالا کہ ایک ہاتھ سے رسالے کو پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے کھانا کھانے کی کوشش میں لگ گیا، جو کہ مشکل امر تھا۔ کھانا تو جیسے تیسے ختم کیا مگر کھانے کے نشانات سرورق پر براجمان حسینہ پر کچھ ایسے نقش ہوئے کہ ابھی کچھ دیر تعریف کے قابل سرورق کی حسینہ اب قابلِ رحم شکل اختیار کر چکی تھی۔ مارچ کے رسالے کا تو بڑی ہی شدت سے انتظار ہے۔ ایک اور کہانی کے ساتھ حاضرِ خدمت ہوں، کسی قریبی اشاعت کا ممنون ہوں۔

☆ پیارے صفدر، امید اچھی رکھو، جلد ہی باقی کہانیوں کی بھی باری آ جائے گی، اکیلے اکیلے کڑاہی گوشت...... مجھے اب غصہ آ رہا ہے، تم پر...... ہاہاہا...... جیو۔

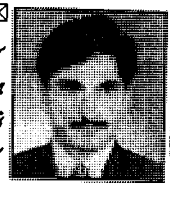
✉ ایم اشفاق بٹ، لالہ موسیٰ سے شاملِ احوال ہیں۔ سب سے پہلے میرا مدیرہ اعلیٰ منزہ سہام اور مدیر کاشی چوہان اور سچی کہانیاں کے سبھی اسٹاف کو بہت بہت سلام قبول ہو۔ سالِ نو کا ٹائٹل واقعی تہلکہ انگیز تھا۔ میڈم منزہ سہام کا کاش پڑھا، کچھ اپنی باتیں میں کاشی چوہان بھائی نے جو کہا وہ بالکل ٹھیک کہا، کبھی کبھی میرا بھی دل کرتا ہے کہ اس ساری دنیا کو آگ لگا دوں۔ جنوری کے احوال میں کچھ چہرے جانے پہچانے نظر آئے تو کچھ اجنبی، چلو کوئی بات نہیں ان سے بھی واقفیت ہو جائے گی آہستہ آہستہ۔ جو میرے جانے پہچانے چہرے تھے، ان میں جناب محمد سلیم اختر، ملک عاشق حسین ساجد، روبینہ شاہین، رابعہ منظور باقی جو چہرے تھے، ان سب نے بھی بہت اچھا احوال میں تبصرہ کیا، سب کو مبارک باد۔ 30 جنوری کو ڈاکیا فروری کا سچی کہانیاں دے گیا، دیکھ کر دل بہت خوش ہوا ایک ہوش رُبا حسینہ نظر آئی سرورق پر۔ سچی کہانیاں کے بانی سہام مرزا نظر آئے، اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین...... منزہ سہام کا اعزاز قابلِ تعریف تھا۔ واقعی اعتزاز اور ان جیسے سب لوگوں کی قربانی

رائیگاں نہیں جائے گی۔ کاشی بھائی آپ تو چھپے رستم نکلے۔ آپ نے تو اپنی محبوبہ کی کمال کی تعریف کر دی، ایک دفعہ تو بندہ سحر میں کھو سا جاتا ہے۔ احوال میں ثمینہ ناز صاحبہ نے میری کہانی کے لیے دو بول خلوص کے بول دیے اور پیاس کی تشریح بھی کر دی کہ ماں کے دودھ کی کیا خصوصیت ہے۔ انسان جو مرضی پی لے اس کی پیاس نہیں بجھے گی۔ عامر زمان عامر صاحب آپ کا بھی شکریہ کہ آپ نے میرے تبصرے کو پسند کیا اور قہقہہ لگا کے ہنسے بھی، پر آپ کو پیاس کی سمجھ نہیں آئی کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ آپ ایسا کریں کہ ثمینہ ناز صاحبہ کراچی کا تبصرہ پڑھ لیں، ذرا غور سے آپ کو سمجھ آ جائے گی۔ منشی محمد عزیز نے پیاس کا ذکر کیا، آپ کا شکریہ۔ باقی بھی تبصرے بڑے ہی جاندار قسم کے تھے، سب کو بہت بہت مبارکاں۔ محمد اسلم آزاد کی ابھاگن، نسیم سکینہ صدف کی زنجیر ٹوٹ گئی، محمد مدنی فدا کی اُٹھ باندھ کمر، ایم ارشد وفا اجالوں کا ماتم لے کے آئے۔ غلام مصطفیٰ کی امر نامہ، الماس فاطمہ ارمان کی تحریر سڑک چھاپ، ممتاز احمد کی تحریر پھر بہار آئی ہے، ممتاز بھائی آپ کے قلم کا بھی جواب نہیں، شیخ معظم الٰہی کی تحریر مرے آنگن کا تحفہ بہت اچھی تحریریں تھیں۔ حمیرا خان کا دوسرا شعلہ، واحد حل، نوسر بازی کا انوکھا واقعہ تھا۔ ایس پی چوہدری اسلم یوسف زئی شہید اور 15 سالہ اعتزاز کے بارے میں پڑھا تو بے اختیار ان کی مغفرت کے لیے ہاتھ دُعا کے لیے اُٹھ گئے۔ تین مرد تین کہانیاں میں سر آئینہ پسِ آئینہ، مقبول جلیس، محمد شہزاد کنول کی عمر کی نقدی، دستگیر شہزاد کی باز اور ابابیل تینوں کہانیاں اچھی تھیں۔ خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے ''مسئلہ یہ ہے'' بہت اچھا کالم ہے۔ کہانیوں اور احوال کی محفل کے بعد سخن آباد کی محفل میں جا نکلا تو سپاس گل، عمارہ جاوید، ثانیہ بھٹی، محمد آصف ریاض، شعبان کھوسہ، محمد شہزاد کنول کی کوشش، رضوانہ کوثر ان سب نے محفل سجائی ہوئی تھی۔ پیارے کاشی بھائی اگلے تبصرے تک کے لیے اجازت دیں سب کو سلام۔

☆ پیارے اشفاق۔ دیکھ لو۔ آپ کا تبصرہ احوال کی زینت بن گیا۔ یار کچھ احوال میں اِدھر اُدھر بھی دیکھ لیا کرو۔ ہاہاہا۔

☒ یہ پہلی آمد ہے احوال میں عینی شاہ نواز کی گھوکی سے، لکھتی ہیں۔ ایڈیٹر صاحب آداب، بس جی رسالہ خرید لیا، پڑھ لیا اور رٹ لیا اور بیٹھ گئے قلم کاغذ لے کر، قلم کاغذ سے بہت پُرانا رشتہ ہے، سوچا کیوں نا! سچی کہانیاں میں ہم بھی کچھ سچائیاں لکھ کر بھیجیں، ہوسکتا ہے جگہ پالیں، امید پر دنیا قائم ہے۔ سو انتظار کرتے رہیں گے کہ تحریر شائع ہو اور آپ کو فوراً ایک عدد شکریے کا خط تحریر کر دیا جائے گا۔ اب کچھ سچی کہانیاں کی طرف قدم بڑھاتے ہیں اُف! زبردست، واقعی قسم سے میں سچ کہہ رہی ہوں، نمبر ون رسالہ ہے، یہ مکھن وکھن نہیں ہے، سچ ہے۔ بالکل سچی کہانیوں کی طرح۔ اب تک کے لیے اتنا ہی، باقی باتیں اگلے خط میں لکھوں گی۔ سچی کہانیاں کی ساری ٹیم کو میری ڈھیر ساری دعائیں پیار۔

☆ عینی صاحبہ! آپ کی آمد اچھی لگی، مگر یہ کیا کہ آپ نے پرچے پر تبصرہ بھی نہیں کیا، اگلے ماہ آپ کا بھرپور تبصرہ چاہیے۔



☒ احوال میں یہ آمد ہے ہمارے بہت پیارے لکھاری ساتھی ممتاز احمد کی سرگودھا سے، لکھتے ہیں۔ اللہ پاک کے فضل و کرم سے آپ یقیناً خیریت سے ہوں گے۔ ماہ فروری کا شمارہ 30 جنوری کو موصول ہوا، سرورق خوب صورت تھا۔ اداریہ میں محبت کے مفہوم کو بہت ہی خوب صورت پیرائے میں سمو دیا گیا۔ کاشی چوہان کی اپنی باتیں دل کش الفاظ کی خوشبو بکھیر رہی تھیں۔ اس دفعہ

احوال میں احوالیوں کی تعداد پہلے کی نسبت زیادہ دیکھ کر خوشی ہوئی اور سب دوستوں نے اپنے خوب صورت سندیسوں سے خوب محفل کو سجایا۔ ثمینہ ناز عبدالقیوم ناز صاحبہ نے بہت سیر حاصل تبصرہ کیا۔ بھائی عبدالعزیز جی آصاحب، سرگودھا والا ممتاز وعلیکم السلام عرض کرتا ہے۔ مور شاہد حسین بھیا وعلیکم السلام، اللہ کا شکر ہے، ٹھیک ہوں آپ کیسے ہیں......؟ میرا اسلام بھی قبول فرمائیں۔ محترمہ عظمیٰ شکور صاحبہ پہلی مرتبہ احوال میں آئیں، ویلکم جی۔ سدرہ انور علی کی سالگرہ 19 فروری کو ہوتی ہے تو پیاری بہنا سالگرہ مبارک ہو۔ دعا ہے اللہ کریم آپ کو زندگی کے ہر قدم پر خوشیاں عطا فرمائے، صحت تندرستی جیسی نعمت اور دولت سے ہمیشہ مالا مال رکھے۔ (آمین) آزاد کشمیر سے بھائی نور خان کی آمد بہت اچھی لگی تو بھائی ویلکم، کاشی بھیا آپ خود بتائیں اگر 30 تاریخ کو شمارہ ملے تو یہ کیسے ممکن ہے پورا شمارہ پڑھ کر خط آپ تک 5 تاریخ کو پہنچ جائے؟ پلیز پانچ تاریخ میں کچھ دنوں کی توسیع فرمادیں۔ اب مکمل شمارے پر تبصرہ کرنا تو ناممکن ہے بس جتنا پڑھ سکا ہوں اس کے متعلق اپنی ناقص رائے دینے کی جسارت کرتا ہوں۔ جویریہ سلیم کی ''برسات'' محمد فہیم کی ''زندگی پنجرہ چاندی کا'' تسیم سکینہ صدف کی ''زنجیر ٹوٹ گئی'' محمد مدنی فدا کی ''اُٹھ باندھ کمر'' اچھی کاوشیں تھیں۔ ایم ارشد وفا کی ''اجالوں کا ماتم'' انگلینڈ کی چکا چوند اور اُس ماحول میں پلی بڑھی اولاد کے سیاہ کرتوتوں اور بداعمالیوں کی تصویر سے خوب پردہ اُٹھایا گیا۔ امر نامہ اور سڑک چھاپ بھی اچھی تھیں۔ محمد شہزاد کنول کی ''عمر کی نقدی'' ایک باپ کی اپنے بیٹے سے انمول محبت کی ایک خوب صورت مختصر کہانی تھی۔ شیخ معظم الٰہی کی ''میرے آنگن کا تحفہ'' پڑھ کر پنجابی کی ایک کہاوت کہ ٹُردی پھردی نال ویاہ نہ کرو۔ بھاویں جنت دی حور ہووے۔ (چلتی پھرتی عورت سے کبھی شادی نہ کریں خواہ وہ جنت کی حور جیسی خوب صورت ہی کیوں نہ ہو) یاد آ گئی۔ علاوہ ازیں ایثار کا درس دیتی ایک عمدہ کہانی تھی۔ حمیرا خان کی ''واحد حل'' آج کے ترقی یافتہ دور میں ایک انوکھی اور نوسر بازی کی نئی واردات کو عیاں کرنے والے منفرد کہانی تھی۔ ''سرفروشی ہے زندگی'' میں اقبال زمان نے چوہدری اسلم ایس پی شہید کے بارے میں نہ صرف بہت عمدہ لکھا بلکہ خوب صورت خراج عقیدت پیش کیا۔ سخن آباد میں عبدالعزیز جی آ کی نظم نے دل موہ لیا۔ میری لکھی ہوئی کہانی ''پھر بہار آئی'' شائع کرنے کا بہت شکریہ۔ اب محترم قارئین کرام کی رائے کا منتظر ہوں۔ اب اجازت چاہوں گا اس پیغام کے ساتھ کہ اپنے کردار کو اچھا رکھو، کیوں کہ موت انسان کو مار سکتی ہے، مگر اچھے کردار والے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں دلوں میں بھی اور لفظوں میں بھی۔ سدا مسکراتے رہیں اور خوشیاں بانٹیں، ان شاء اللہ اگلے ماہ حاضری ہوگی اگر روح کا جسم سے ناتا جُڑا رہا تو......

☆ ممتاز بھائی۔ آپ کا تبصرہ ہمیں بہت حوصلہ دیتا ہے۔ ہماری خوشی اُس وقت مکمل ہوتی ہے جب آپ سب اپنا فیڈ بیک دیتے ہیں۔

✉ نزہت ناز احوال میں کراچی سے شریک ہیں۔ لکھتی ہیں۔ ایڈیٹر سچی کہانیاں! السلام علیکم، آپ کا رسالہ پڑھا، بہت اچھا لگا۔ میں نزہت ناز بنت غلام خواجہ ایم اے اردو اینڈ ایجوکیشن، پہلی مرتبہ آپ کے رسالے کے لیے ایک سچی کہانی بھیجنے کی جسارت کر رہی ہوں جو کہ پراسرار بھی ہے، امید ہے کہ پسند آئے گی۔

☆ نزہت جی! خوش آمدید آپ کا تبصرہ احوال کی زینت بنا۔ امید ہے اب ہم سے ناتا نہیں ٹوٹے گا۔



✉ کاشف عبید کاوش بٹہ موری بٹگرام سے احوال میں شامل ہیں، لکھتے ہیں۔ مدیر صاحب، السلام علیکم! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ میں نے یہ خط احوال کے لیے ارسال نہیں کیا ہے، یہ خط تو بس میری کچھ فرمائشیں تھیں، ان کے لیے ارسال کیا ہے۔ دراصل ایک دن پہلے میں نے آپ کو رجسٹری ڈاک سے ایک لفافہ بھیجا تھا جس میں، میں نے دو مسئلے ارسال کیے تھے، اور ساتھ ان کے تین (تحریریں) تھی، جو اصل میں کہانیاں نہیں تھیں، بلکہ ایک کالم سروی کے حساب سے تھا، دوسرا بولی وڈ کے لحاظ سے تھا جب کہ تیسرا کالم لولی وڈ پر تھا، پلیز آپ وہ سب تحریریں رسالے میں شائع کر دیں۔

☆ پیارے کاشف۔ احوال میں شرکت کو یقینی بناؤ، باقی محنت کرو، جو سلسلے ہمارے پاس نہیں ہیں، اُس پہ تم نے محنت کیوں کی۔ کہانی بھیجو جلدی۔ ایک کہانی پہ تمہاری ہم نے کام کر دیا ہے۔



✉ شفقت حسین، حب چوکی بلوچستان سے، لکھتے ہیں۔ بہت اچھے اور پیارے بھائی کاشی چوہان السلام علیکم! امید ہے کہ خیریت سے ہوں گے۔ بھائی واقعی آپ بہت اچھے ہیں۔ جب میں نے مور شاہد حسین کے اصرار پر پہلا خط لکھا تھا تو میرا خیال تھا کہ آپ اسے بالکل نہیں دیکھیں گے اور ردی کی ٹوکری کی نظر کر دیں گے، مگر ایسا نہیں ہوا بلکہ خط کے ساتھ مجھ ناچیز کی تصویر بھی لگا دی۔ بے حد شکریہ، فروری کا شمارہ 3 تاریخ کو ملا، اپنا خط اور تصویر دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ آپ کے لیے دل و زباں سے دعائیں نکلیں خدا آپ کو بہت کامیاب کرے اور سچی کہانیاں دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے۔ سب سے پہلے پسندیدہ قسط وار کہانیاں پڑھیں، اچھی جا رہی ہیں۔ وقت کی کمی اور مصروفیات کے باعث کہانیوں کا مطالعہ تو نہ کر سکا، ہاں البتہ شاعری کی دنیا بے حد پسند آئی۔ اگر مطالعہ کرتا تو مقررتاریخ گزر جاتی۔ میری ایک گزارش ہے کہ پلیز کوشش کریں شمارہ 25 سے پہلے مل جائے، تاکہ مکمل مطالعہ کر کے تبصرہ کیا جائے۔

☆ پیارے شفقت! خوش رہو، امید ہے اب ڈبل خوشی مل جائے گی کہ دوبارہ تبصرہ لگا دیا۔ بھائی تھوڑا بہت تبصرہ تو کرو۔



✉ سدرہ انور علی جھنگ صدر سے احوال میں شریک ہیں لکھتی ہیں۔ محترم بھیا کاشی چوہان السلام علیکم! خدا آپ کو ہمیشہ ہنستا مسکراتا خوش باش رکھے۔ ثم آمین۔ لیڈیز اینڈ جینٹل مین کیسے کیسے ہیں سب؟ تمام سچی کہانیاں پڑھنے والوں کو سلام، فروری کا شمارہ اس بار جلد مل گیا، ہنستے مسکراتے ٹائٹل کے ساتھ، بس ایسے ہی ٹائٹل اچھے لگتے ہیں۔ اس ماہ جن کی سالگرہ ہے بھئی بہت سی نیک تمنائیں دعائیں آپ کے نام، جن کی ہوئی ہے شادی بہت مبارک ہو اور جو لوگ اس دنیا کو چھوڑ چکے یہ دنیا اتنی سرسبز اور رنگین ہے کہ اسے چھوڑنے کو دل نہیں کرتا لیکن...... اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ اس ماہ احوال میں کچھ نئے چہرے دکھائی دیے۔ غلام رسول گل، شفقت حسین، گل باز خان، نور خان، ان سب کو سچی کہانیاں میں خوش آمدید مرحبا۔ ممتاز احمد بھیا! کیا حال ہیں، آپ مسلسل احوال سے غیر حاضر ہیں خیریت تو ہے سب؟ فیصل ندیم بھٹی، السلام علیکم یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ کو مجھ ناچیز کی تحریریں پسند آتی ہیں۔ ہمیشہ خوش رہیں، مور شاہد حسین بھیا آپ کیسے ہیں؟ تحسین جونیجو، زرینہ جونیجو، کیسی ہو پیاری بہنا؟ احوال میں

ثمینہ ناز، عامر زمان کے خطوط پسند آئے، اداریے میں منزہ آنٹی نے اعزاز لکھا، ہمیں سب کو فخر کرنا چاہیے کہ ہمارے ملک کے بچے اپنے ملک کے لیے باعث فخر ہیں۔ اللہ ہم سب کو سعادت کی زندگی اور شہادت کی موت عطا فرمائے۔ کچھ اپنی باتیں میں آپ نے کہانی کے بارے میں اچھا لکھا۔ جویریہ سلیم کی برسات، انکل محمد فہیم کی زندگی پنجرہ چاندنی کا، محمد اسلم آزاد کی تحریر ابھاگن، نسیم سکینہ صدف کی زنجیر ٹوٹ گئی، محمد مدنی فدا کی اُٹھ باندھ کمر، ایم ارشد وفا کی اجالوں کا ماتم، غلام مصطفیٰ کی امرنامہ، ممتاز بھیا کی پھر بہار آئی بہت پسند آئیں۔ سلیم انکل کی آتشِ جنوں بہت اچھی جا رہی ہے۔ اعجاز احمد ایوب کی ناگن بہت دل چسپ موڑ لے کر رہی ہے۔ حمیرا خان کی واحد حل، محمد اقبال زمان کی سرفروشی ہے زندگی، بانو قدسیہ کی یہ رشتہ پیوند وغیرہ بھی کمال تحریریں تھیں۔ سخن آباد میں سب کی شاعری پسند آئی۔ کاشی بھیا! پچھلے ماہ آپ نے تصویر کیوں شائع نہیں کی تھی، خیر اس دفعہ نئی تصویر ارسال کر رہی ہوں، آپ میرے خط کی کٹنگ بہت کرتے ہیں آہ میرا خط...... بے چارہ، اس شعر کے ساتھ اجازت چاہوں گی کہ......

تم لوٹ کے آنے کا تکلف نہیں کرنا
ہم ایک محبت کو دوبارہ نہیں کرتے

اپنا خیال رکھیے گا۔ زندگی نے ساتھ دیا اور سانسوں کا تسلسل اسی طرح قائم رہا تو پھر ہو گی ملاقات، تب تک کے لیے اللہ نگہبان۔

☆ سدرہ جی! کٹنگ تو اب بھی ہو گئی اب کیا کریں۔ امید ہے اگلی بار جہاں جہاں کٹنگ ہوئی ہے آپ خیال رکھیں گی۔

✉ احوال میں یہ آمد ہے محمد حفیظ اللہ خان نیازی کی خانوال سے، لکھتے ہیں۔ سچی کہانیاں کے ایڈیٹر اور اسٹاف کو السلام علیکم! میں پہلی بار ملک ضیاء الرحمٰن اعوان کے اصرار پر محفل میں آیا ہوں، امید ہے سب دوست خوش آمدید کہیں گے۔ میں اپنی کچھ شاعری بھیج رہا ہوں، اگر معیار پر پوری اُترے تو ضرور شاملِ اشاعت کریں۔

☆ حفیظ اللہ صاحب آپ کی شاعری شامل اشاعت ہے، امید ہے اب آپ ہمیں ہر ماہ اپنے تبصرے سے سرفراز کریں گے، وعدہ کریں۔



✉ ذیشان ریاض، فیصل آباد سے لکھتے ہیں۔ السلام علیکم کے بعد عرض ہے کہ امید ہے خیریت سے ہوں گے۔ میرا نام ذیشان ریاض ہے، ہوزری فیبرک کا کام کرتا ہوں، لکھنے کا بھی شوق ہے۔ شاہجہاں مغل لاہور سے آپ کی تعریف سنی تھی، جن دنوں وہ U.K میں تھا کہ کاشی چوہان دوشیزہ کے ایڈیٹر ہیں۔ اب فروری کا شمارہ دیکھا تو یقین نہ آیا کہ کاشی چوہان اب سچی کہانیاں کے بھی ایڈیٹر بن گئے ہیں بہت بہت مبارک ہو۔ خیر ویلنٹائن ڈے کی مناسبت سے سرورق اچھا لگا۔ احوال میں تصویریں...... بہت خوب، خواب سا لگ رہا ہے کہ یہ وہی سچی کہانیاں ہے جسے پڑھنے کو دل نہیں کرتا تھا۔ عبدالعزیز جی آ آپ بہت ہینڈسم ہو، واہ کیا پرسنالٹی ہے۔ باجی حنا کیسی ہیں، علیبہ زاہرہ لاہور آپ بھی اپنی تصویر شائع کروائیں، پانچ سال پہلے آپ کو دیکھا تھا اب پھر رابطے میں رہیے گا۔ اچھے دوست تو زندگی کا سرمایہ ہوتے ہیں، زندگی کے جس موڑ پہ ملیں، ہاتھ تھام لینا چاہیے۔ کہانیاں سبھی اچھی ہیں۔ ارشد علی ارشد کی ملکنی زبردستی جا رہی ہے۔ اقبال زمان صاحب نے چوہدری اسلم واعتزاز حسن کے بارے میں معلومات دی، بہت شکریہ۔ آنٹی نگہت غفار کیسی ہیں

اب، اللہ آپ کو جلد صحت یاب کرے۔ سخن آباد میں غزلیں بھی اچھی لگیں۔ شعبان کھوسہ کی آخری خواہش بہت زبردست۔ آخر میں تمام قارئین واسٹاف کو سلام۔

☆ ذیشان! خوش آمدید۔ کہانی کا انتظار ہے۔ شاہجہان! کہاں غائب ہوگیا ہے۔ آپ کی تجاویز پر عمل کریں گے۔



✉ بھائی اسلم آزاد لہڑی شہر بلوچستان سے تشریف فرما ہیں، لکھتے ہیں۔ ماہ فروری 2014ء کا شمارہ میرے سامنے ہے۔ ٹائٹل کچھ شوخ اور گہرے رنگ کا ہے جس میں محبت اور قربانی کے جذبے شامل ہیں اور ان جذبوں میں شہید اعتزاز کی قربانی کو جس طرح باجی منزہ سہام نے سراہا ہے، یہ اعزاز پوری قوم کے لیے باعثِ مسرت ہے۔ باجی منزہ کے اعزاز کے بعد ''کچھ اپنی باتیں'' میں آپ کی محبت اور محبوبہ، کہانی سے ملاقات ہوگئی۔ اپنی بات سے کچھ آگے بڑھے تو حال احوال میں بہت سے رائٹرز حضرات محفل جمائے بیٹھے تھے۔ سب سے پہلی نظر بہن ثانیہ بھٹی اور ثمینہ ناز عبدالقیوم پر پڑی، مگر نہ جانے کیوں وہ جناب محمد سلیم اختر صاحب اور عبدالعزیز جی آ کو تلاش کر رہی تھیں۔ آخر بڑی مشکل سے عبدالعزیز جی آ پر نظر پڑی اور ہم ان کے قریب جا کر بیٹھے تو وہ ہمیشہ کی طرح کھلے دل سے اپنے دل کی بات کہہ رہے تھے مگر ان کی آواز کوئی بھی نہیں سن رہا تھا جو شاید پچھلے کئی مہینوں سے یہ دہرا رہے ہیں کہ سچی کہانیاں ایوارڈ کی تقریب فوراً کرائیں۔ اس سے پہلے میں نے بھی ان کی اس رائے کو سراہا تھا اور ان کی آواز کے ساتھ آواز ملائی تھی۔ اس حوالے سے کاشی صاحب آپ نے بھائی جی آ کو مناسب جواب دیا ہے، مگر ایسے جواب پہلے بھی ملتے رہے ہیں جن سے کوئی خاطر خواہ بات آگے نہیں بڑھی۔ اس بار ایک نظم اور خط ارسال خدمت کر رہا ہوں، کیوں کہ پچھلے ماہ تحریر دل کا چور روانہ کی تھی، امید ہے کہ باری آنے پر ضرور شائع کریں گے۔

☆ لیجیے بھائی۔ ان شاء اللہ پوری کوشش ہے کہ دوشیزہ کے بعد سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ کی تقریب بھی اسی سال 2014ء میں منعقد کرادی جائے۔ تسلی کرلیں۔

✉ تحسین جونیجو، بورڑی شریف خیر پور ناتھن شاہ سے عرض کرتی ہیں، مخلص و پیارے بھیا السلام علیکم، شاد رہیں آباد رہیں (آمین) سرورق پیارا تھا۔ منزہ آپی کا اداریہ ''اعزاز'' خوب رہا۔ مالک اپنے وطن پہ رحم فرمائے (آمین) دل کش، دل چسپ کہانیاں نکھارتی ہوئی ''کاشی کہانی'' نے خوب صورت پھول کی پنکھڑیاں بکھیر دیں کہ دل باغ باغ ہوگیا۔ بڑی نوازش بھائی مان بڑھانے کے لیے ممنون ہوں۔ فہیم انکل آپ کو بیٹی سحر کی شادی کی بہت بہت مبارک باد، دعوت نامہ موصول ہو چکا ہے۔ ثمینہ ناز بس جی دیکھ لو! مایوس تو نہیں ہوں، کاشی بھائی بہتر انداز میں ذمے داری نبھا رہے ہیں، ویسے ثمینہ آپ اپنی سناؤ کیا حال ہیں؟ خط آپ کا محفل کی رونق میں اضافہ کرگیا۔ خوش رہو۔ سدرہ انور جی اتنی خاموشی!! بھائی مور شاہد حسین الحمدللہ ہم اچھے ہیں، آپ کیسے ہیں؟ رضوانہ کوثر آپی احوال میں آیا کریں جناب دعائیں آپی جانی۔ ہماری پیاری کوثر سعید آپی دکھائی نہیں دے رہیں، مکان بھی کب کا تعمیر پا چکا۔ نئے چہرے بھی نظر آئے سبھی کو خوش آمدید۔ کہانیوں میں ''امر نامہ'' غلام مصطفیٰ کی، ''زندگی پنجرہ چاندی کا'' فہیم انکل کی

، جویریہ سلیم کی ''برسات'' نسیم سکینہ صدف کی ''زنجیر ٹوٹ گئی'' الماس فاطمہ ارمان کی ''سڑک چھاپ'' شیخ معظم الٰہی کی ''عمر کی نقدی'' محمد شہزاد کنول کی ''تم کون ہو'' زاہدہ حنا کی ان تمام نے خوب صورت جامع انداز میں سبق آموز اچھی تحریریں پڑھنے کو دیں۔ ارشد علی ارشد بھائی کی مکمنی پر رائے مکمل ہونے تک انتظار فرمائیں تو مکمل تبصرہ رہے گا۔ سخن آباد میں ''صلح'' سپاس گل انا، وقاص حسین آخری خواہش، شعبان کھوسہ بھائی نئی کونپلیں، مور شاہد حسین اور غزل رضوانہ کوثر آپی اور سب نے خوب کہا۔

☆لو جی تحسین، آپ کا تبصرہ پورا لگا دیا۔ اب تو خوش ہونا۔

✉ عظمٰی شکور صاحبہ نے سرگودھا سے تحریر کیا ہے ایڈیٹر صاحب، آداب، فروری کا شمارہ میرے ہاتھوں میں ہنس رہا ہے۔ سرورق پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ ہے۔ دوشیزہ جیسے زندگی کا استعارہ ہے، جیسے بہاروں کی آمد کی اطلاع ہو۔ چند کمرشلز کے بعد رسالے میں شائع ہونے والوں کے نام کی فہرست ہے۔ پھر منزہ سہام کا لکھا اعزاز، موتیوں سے لفظ صاف، شفاف جذبوں کی مالک منزہ سہام کی کہی باتیں جیسے سیدھی دِل میں اُترتی محسوس ہوتی ہیں۔ ملک کی محبت میں اُن کے جذبات قابلِ قدر ہیں، پھر آتے ہیں کاشی چوہان صاحب کا ایک الگ انداز بیاں ہے۔ لفظوں میں جیسے اُن کے جذبے بولتے ہیں، یوں محسوس ہوتا ہے اُن کو پڑھ کر ہم جیسے کھو سے جاتے ہیں اور اُس طلسم سے نکلنا نہیں چاہتے، مگر بہرحال ہمیں اس رسالے کو آگے بھی تو بغور پڑھنا ہے۔ صفحہ پلٹنے پر قارئین کی محفل جمی ہے، کوئی الگ رائے رکھتا ہے اس رسالے کے بارے میں، مگر ہر تحریر کا مقصد یہی ہے کہ رسالہ پسند کیا جا رہا ہے۔ قارئین نہ صرف اِس رسالے کو پڑھنا چاہتے ہیں بلکہ اِس میں شائع بھی ہونا چاہتے ہیں۔ مزے مزے کی باتوں کے یہ صفحات توجہ کا مرکز ہیں۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف محمد فہیم کی لکھی تحریر نے شروع سے لے کر آخر تک حیران کر دیا کہ کیسے اپنا ہی خون پرایوں سا سلوک کرتا ہے۔ لفظوں کی ادائیگی بھی بہت خوب تھی، سچ پوچھیں تو اُن کا آخری سوال آنکھوں میں نمی دے گیا۔ سخن آباد میں پہنچے تو بھی بہت سے رنگ دیکھے۔ عامر زمان کی غزل پیاری لگی، مطلب دُکھوں کا جو ذکر تھا۔ اس دور میں دُکھ آج کل ارزاں جو ہیں، بہرحال عامر صاحب اچھی کوشش تھی۔ شاہد فراز نے بھی اچھا لکھا، ہنستی مسکراتی لڑکی پیاری تھی، کوشش محمد شہزاد کنول کی نظم بہت اچھی لگی۔ کہانیوں میں بانو قدسیہ نمبر لے گئیں، بے ساختہ پن ہے اُن کے لکھنے کے انداز میں۔ غلام مصطفیٰ صاحب زندگی بہت حسین ہے۔ کچھ حسین گلاب چُن کر آپ نے سچی کہانیوں میں سجا دیے۔ دُکھ لکھنا آسان ہے دُکھ پڑھ کر ہنسنا ذرا مشکل ہے۔ کوشش کریں خوشبو، بارش، بادل، جگنو، آبشاروں کے شفاف پانی لکھیں اور ان کو محسوس کریں، ہمیں آپ کی کچھ حسین سی خوشیوں کی تحریر چاہیے، خدارا پہلے ہی بہت دُکھ ہیں ''امر'' کا دُکھ آنسو بہانے کو کافی تھا، رحم کریں ہم پر۔ کچھ کہانیوں پر تبصرہ رہ گیا وہ کچھ یوں کہ جو مجھے متاثر کریں میں بس وہی پڑھا کرتی ہوں اور تو اور کمرشلز پر بھی خوب غور کر لیا میں نے۔ بس جی گولڈ بیوٹی اب خریدنا ہی پڑے گی۔ سچ بتاؤں کاشی جی! آپ کی تحریر نے مجھے بہت متاثر کیا۔ کہاں سے لاتے ہیں لفظ، پرستان سے یا مریخ سے یا پھر

چاند پہ بیٹھ کر لکھا کرتے ہیں۔خوب لکھتے ہیں۔

☆ عظمیٰ جی! لفظ تو لفظ ہیں، کبھی یہ پھول بن جاتے ہیں تو کبھی سنگ، مگر آپ کا بھی کمال نہیں۔تبصرہ شاندار ہے آپ کا۔مکمل شمارے پر ہوتا تو مزہ آ جاتا۔



✉ احوال میں مجید احمد جائی ملتان سے تحریر کرتے ہیں۔امید واثق ہے کہ آپ، سچی کہانیاں کی پوری ٹیم ،لکھاری اور قارئین بفضل خدا ٹھیک ٹھاک، ہنستے مسکراتے، پھولوں کی طرح خوشبو پھیلاتے ہوں گے۔سدا صحت کی بادشاہی، ایمان کی سلامتی رہے۔دکھوں سے دور، خوشیوں کے آنگن میں پھولوں کی طرح کھلتے ، جگمگاتے رہیں۔رب تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے رہیں۔اللہ تعالیٰ اپنی رحمتوں، نعمتوں کا ہمیشہ نزول فرماتا ہے، آمین ثم آمین۔ماشااللہ! "سچی کہانیاں ٹیم، لکھاریوں، قارئین کو سال نو کا عہدہ سنبھالتے ہی "سچی کہانیاں" جگ مگا اٹھا ہے۔ سال نو کی مبارک باد قبول ہو۔سال نو کے سچی کہانیاں کی خبر ہمیشہ کی طرح صفدر علی حیدری نے دی کہ ہمیں مل چکا ہے، میں نے ان کے کہنے پر بھاگم بھاگ مارکیٹ سے پتا کیا لیکن جلوہ نہ ہو سکا پھر اپنے کزن محمد یونس جائی کو فون کیا کہ مہربانی کر کے "سچی کہانیاں" لیتے آنا، بیچارہ 25 کلومیٹر کی مسافت کرنے کے بعد سچی کہانیاں میرے لیے لے کر آیا۔محمد یونس جائی سچی کہانیاں سال نو کا شمارہ میری کمپیوٹر ٹیبل پر چھوڑ کر اپنے گھر چلا گیا۔میں جب ڈیوٹی کرنے کے بعد آفس سے گھر آیا "سچی کہانیاں" بند لفافے میں پڑا پھڑ پھڑا رہا تھا۔میں کھانا کھانا بھول گیا۔پہلے اسے آزاد کیا، اس کے جلوے دیکھے۔واہ جی واہ، ماشاء اللہ! کیا اسٹائل ہے۔سرورق پر بیٹھی زلفوں کا جال بچھائے حسینہ غبارے لیے نشیلی آنکھوں کے ساتھ کسی کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔کونے میں ایک ناگن ڈانس کرنے میں مشغول تھی۔منزہ سہام، "کاش" اور کاشی چوہان کی "کچھ اپنی باتیں" پڑھیں، جو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر گئیں۔کاشی برادر ویلڈن! لو جی احوال میں پھر کاشی صاحب ہمیں ہی دیکھ رہے ہیں، اچھا اچھا حال احوال پوچھ رہے ہیں۔کاشی چوہان کی آمد نئی امنگیں، نئے جذبے پیدا ضرور کرتی ہے۔محمد سرفراز، مور شاہد حسین، ملک عاشق حسین ساجد، میجر امتیاز حسین، وقاص حسین، جنجیل متیلو، فیصل اقبال، بشیر احمد بھٹی، محمد سلیم اختر، عائشہ رشید انور، تحسین جونیجو، عروبہ عدنان، روبینہ شاہین، عامر زمان عامر کے احوال زبردست تھے۔واہ جی واہ مجید احمد جائی کا احوال بھی شامل ہے لیکن یہ کیا۔؟ لگتا ہے میرے احوال کے لیے نئی قینچی منگوائی گئی تھی، جس کی تیز دھار نے میرے احوال کا برا حال کر دیا، بیچارے کا دل زخمی زخمی کر دیا۔اُف دیکھو تو! کتنا لہو بہہ گیا ہے۔خیر...... جو ہوا بہتر ہی ہوا ہوگا۔ساحل ابڑو صاحب ہو سکے تو رابطہ کیجیے۔رابعہ منظور کا مختصر احوال اور آخر میں سدرہ انور کا جامع، جاندار احوال پڑھ کر خوب سیر ہوئے۔ارے ارے ادارے نے ای میل کا کہہ کر میری طرح بہت سے دوستوں کی مشکل ہی آسان کر دی۔ویلڈن! شکریہ (ادارہ) باقی میں تین کہانیاں بھیج چکا ہوں ان کی رسید دے دیں کہ قابل اشاعت ہیں کہ نہیں تا کہ بندہ انتظار کی سولی پر نہ لٹکا رہے اور کہانی بھیج سکے۔لو جی اب نیند آ رہی ہے میں سوتا ہوں آپ بھی آرام کریں، باقی اگلے احوال میں انشااللہ! اللہ حافظ!

☆ پیارے مجید امید ہے اگلے ماہ جلد برقی نامہ آئے گا۔خوش رہو۔کہانیاں انشاء اللہ بہت جلد شائع ہونا شروع ہو جائیں گی۔



✉ نصرت سرفراز، اسلام آباد سے احوال میں حاضر ہیں۔ لکھتی ہیں مدیرِ اعلیٰ منزہ سہام مرزا اور مدیر سچی کہانیاں السلام علیکم! ماہ فروری کا سچی کہانیاں ہاتھوں میں ہے۔ دل گداز تحریروں کا ایک ایسا مجموعہ جو زندگی کی حقیقی تصویریں قاری کے سامنے بکھیر کر زندگی کے سارے رنگوں خوشی، غمی، نفرت، محبت، انتقام، ظلم، صبر، برداشت، عفو ودرگزر، کینہ پروری، حسد، جلن کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ منزہ سہام کے قلم سے بکھرنے والے الفاظ کی سچی محبت لفظوں کی محتاج نہیں ہوتی، انسان کا عمل خود ثابت کر دیتا ہے کہ وہ اپنے جذبوں میں کس قدر کھرا ہے۔ اعتزاز کا اعزاز واقعی قابلِ افتخار ہے۔ کتنے گھروں کا چراغ بجھنے سے بچالیا اُس نے۔ کچھ اپنی باتیں۔ کاشی چوہان کے قلم سے بکھرے موتی! اُف اُن کی محبوبہ کے کیا کہنے۔ ایک کہانی کار اپنی کہانی سے اتنی ہی محبت کرتا ہے جتنی ماں اولاد سے۔ احوال قارئین کے درمیان رابطے کا ایک ایسا پل ہے جس کے اُس پار دوستی کا دریا بہتا ہے جہاں اورنگی ٹاون سے لے کر سیالکوٹ اور اسلام آباد سے لے کر چکوال، بورے والا، جہلم، کراچی، لاہور، وہاڑی، جھنگ، بنوں، آزاد کشمیر، قلات اور پاکستان کے دیگر گوشوں سے قاری احوال میں شرکت کرتے ہیں اور دوستی کے کینوس پر طرح طرح کے رنگ بکھیرتے ہیں جو قوس قزح کے رنگوں سے بھی حسین لگتے ہیں۔ قارئین ایک دوسرے کے دکھ درد میں بھی شریک ہوتے ہیں۔ دعائیں دیتے بھی ہیں اور طلب گار بھی ہوتے ہیں، ساتھ ساتھ وطنِ عزیز کے لیے بھی دعا گو رہتے ہیں... سچ بیانی برسات میں جویریہ سلیم نے ایک عبرت بھری مختلف انجام کی کہانی سنائی۔ محمد فہیم کی ''زندگی پنجرہ چاندی کا''، محمد اسلم آزاد کی ''ابھاگن''، نسیم سکینہ صدف کی ''زنجیر ٹوٹ گئی''، محمد مدنی کی ''اٹھ باندھ کمر'' تمام کی تمام بہت اچھے انجام کی خوبصورت تخلیقات تھیں۔ ایم ارشد کی کہانی ''اجالوں کا ماتم'' دیارِ غیر میں مقیم ہم وطنوں کا المیہ بیان کر رہی تھی مگر ضروری نہیں کہ ہر ایک کا انجام ایک سا ہو۔ دیارِ غیر سے وابستہ کئی خوش کن انجام کے واقعات بھی عام ہیں۔ ''امر ناسہ'' کے غلام مصطفیٰ صاحب کی کتھا کا پہلا جملہ ''دل میں اُتر جانا'' اور ''دل سے اُتر جانا'' شاہکار جملہ ہے۔ ''سڑک چھاپ'' کی الماس فاطمہ ارمان کے قلم سے ایک سوال یہ ہے کہ:

ظلم ہوگا نہ کسی پر یہ کہا ہے اُس نے
یہ سچ ہے تو اس سچ کی حمایت کیا ہے

سچی کہانیاں کا نیا انداز بہت منفرد اور خوبصورت ہے۔ بانو قدسیہ، منشی پریم چند اور زاہدہ حنا جیسے مصنفوں کی تحریریں قارئین اور ہم جیسے نئے لکھاریوں کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ ان کہانیوں کے انتخاب نے ڈائجسٹ کی خوبصورتی اور ندرت میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ ''آتشِ جنوں'' اور ''مکھنی'' کی اگلی قسطوں کا انتظار رہتا ہے۔ مدیر اور مدیرِ اعلیٰ سے ایک سوال یہ کرنا ہے کہ سرورق کا حصہ بننے کے لیے کیا میں اپنی شادی کی تصویر ای میل کر سکتی ہوں۔ بہت خوب صورت اور دل کش نہ سہی بہرحال اپنی شادی والی تصویر دیکھ کر مجھے اکثر یہ خیال آتا ہے میری تصویر یہاں نہیں لگ سکتی، یہاں تو کسی ماڈل کی تصویر ہی لگ سکتی ہے، لیکن میرا یہ خیال محض خام خیال بھی ہو سکتا ہے۔ جواب کی طلب گار رہوں گی۔ پاکستان بالخصوص کراچی میں امن کے لیے بہت شدت سے دعا گو۔ اللہ تعالیٰ تمام قارئین اور ان کے تمام چاہنے والوں کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

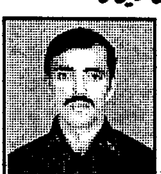
☆ نصرت جی! سرورق کے سلسلے میں ہمارے زین صاحب اور طاہر صاحب سے رابطہ کیجیے، باقی آپ کے تعاون کا دلی شکر گزار ہوں۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

✉ ظفر اللہ رند صاحب ڈیرہ مراد جمالی سے تحریر کرتے ہیں۔ السلام علیکم، جناب مدیر اعلیٰ باجی منزہ سہام اور مدیر کاشی چوہان صاحب اور پورے ادارے کو سلام قبول ہو۔ بھائی ہمارے اور سچی کہانیاں کا سلسلہ تو بہت پرانا ہے۔ یعنی 2009ء سے، لیکن ہر ماہ ڈائجسٹ پڑھنے اور لکھنے کا ارادہ کرنے میں گزر جاتا تھا، مگر آج بڑی ہمت کر کے لکھنے بیٹھ گیا۔ برائے مہربانی ہماری اس چھوٹی سی کوشش کو اپنے رسالے میں جگہ دیں، تاکہ ہم غریب لوگوں کا حوصلہ مزید بڑھ جائے۔ چوہان صاحب ہمارے شہر میں ڈائجسٹ لیٹ آتا ہے یعنی 06.04.03 تاریخ تک پہنچ جاتا ہے۔ اور پہلے تو آتا بھی نہیں تھا۔ یہی کچھ چار ماہ پہلے میں نے سر محمد اقبال زمان سے بات کی جس کی وجہ سے اب ہر ماہ ڈائجسٹ مل جاتا ہے لیکن لیٹ...... برائے مہربانی اس مسئلے کو حل کریں شکریہ اور اب آتے ہیں اس ماہ کے تازہ شمارے کی طرف۔ سب سے پہلے تو سہام مرزا کی تصویر دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ منزہ باجی کا اعزاز پڑھ کر تو پتا چلا واقعی ہمارے پاک وطن میں دلیر اور بہادر موجود ہیں۔ ہم اللہ پاک سے دعا گو ہیں کہ اللہ پاک ہم سب کو وطن عزیز پر جان قربان کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین) اور اس سے آگے بڑھے تو احوال میں پہنچ گئے اور یہ کیا پھر احوال میں تصویروں والا سلسلہ شروع ہو گیا تو بہت اچھا لگا۔ ہم اپنی تصویر اگلے ماہ میں بھیجیں گے اور باقی سب احوالیوں کو سلام قبول ہو۔ ٹائم کی کمی کی وجہ سے مزید آگے پڑھ نہ سکا ہمیں امید ہے ہمارے اس چھوٹے سے نذرانے کو شمارے میں جگہ مل جائے گی۔

☆ بہت عزیز ظفر اللہ رند صاحب۔ اب آئے ہیں تو آتے رہیے گا۔ اگلے ماہ تبصرے کا انتظار رہے گا۔

✉ کنول عمران خان کراچی سے تحریر کرتی ہیں۔ السلام علیکم، کیسے ہیں کاشی بھائی۔ امید ہے سب خیریت سے ہوں گے اس بار کا شمارہ بھی ہمیشہ کی طرح بہت زبردست ہے۔ اس بار کہانیاں اچھی اور مختصر ہیں میں نے فی الحال جو کہانیاں پڑھی ہیں، ان میں ناگن نمبر ایک ہے۔ اس کے علاوہ جویریہ سلیم کی ''برسات'' بہت زبردست ہے۔ ''زندگی پنجرہ چاندی کا'' ایک عام موضوع پر کہانی ہے اور آج کل یہ ہر گھر میں ہو رہا ہے۔ ''ابھاگن'' بھی اچھی تھی، ''اجالوں کا ماتم'' بھی ہر اس پاکستانی کی کہانی ہے جو اپنے ملک کو چھوڑ کر باہر جاتا ہے اور آخر سب کا انجام ایک ہی ہوتا ہے۔ ''سڑک چھاپ'' اچھی تحریر تھی۔ ''پھر بہار آئی ہے'' بہت اچھی لگی۔ یہ محبت کی ایک الگ داستان ہے، جس میں محبوب کے بجائے اس کی بہن کو اپنایا گیا ہے۔ بس فی الحال اتنا ہی پڑھ سکی ہوں۔ امید ہے باقی کی کہانیاں بھی زبردست ہوں گی اور پلیز یہ سرورق کی فولڈنگ والا سسٹم تو ختم کر دیں، رسالہ آتے ہی سب سے پہلے سرورق پھٹتا ہے، بچے ایسے پکڑتے ہیں کہ لاکھ بچاؤ وہ پھٹ ہی جاتا ہے۔ اچھا اب اجازت دیں، سب کو سلام۔

☆ اچھی بہن کنول! پراسرار نمبر کی پیسٹنگ کے وقت آپ کی کہانی موصول ہوئی۔ خط کو ایڈجسٹ کر لیا، مگر کہانی...... امید ہے آئندہ آپ تاخیر سے کچھ ارسال نہیں کریں گی۔



✉ شاہد سلیم آف کچہ موڑ، حسن ابدال سے لکھتے ہیں۔ السلام علیکم! کے بعد عرض یہ ہے کہ میں خیریت سے ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ بھی خیریت سے ہوں گے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ ہنستا اور مسکراتا ہوا رکھے۔ سچی کہانیاں کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی دے اور اسے ترقی کی راہوں پر گامزن کرے۔ میری دعائیں اور نیک تمنائیں ہمیشہ آپ کے ساتھ ہیں۔ ان نیک خواہشات کے ساتھ صورت احوال یہ ہے کہ اس وقت فروری 2014ء نئے سال کا دوسرا شمارہ ''سچی کہانیاں'' اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ملا، اسے پڑھ کر دل کو راحت نصب ہوئی۔

تمام قارئین اور پورے اسٹاف کو میرا سلام اور تمام ساتھیو! کو نیا سال دِل کی گہرائیوں سے مبارک ہو۔ میں کافی عرصے کے بعد دوبارہ آپ کی محفل میں حاضر ہو رہا ہوں۔ غیر حاضری کے لیے کاشی بھائی! بہت زیادہ معذرت خواہ ہوں۔ آپ سے رابطہ برقرار نہ رکھ سکا۔ اب اللہ تعالیٰ کے کرم سے کچھ بہتر ہوں۔ کاشی بھائی! نئی ذمے داری اور نیا سیٹ اپ بہت مبارک ہو۔ یہ ہمارے لیے بہت قابلِ فخر بات ہے۔ "سچی کہانیاں" نے مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا ہے۔ جب بھی "سچی کہانیاں" خریدتا ہوں تو سب سے پہلے "کچھ باتیں اپنی" نہایت شوق سے پڑھتا ہوں، میری تنہائی کا بہترین ساتھی "سچی کہانیاں" ہے۔ اس مرتبہ تمام اسٹوریاں بہت زبردست تھیں۔ سلسلے وار دونوں کہانیاں ارشد علی ارشد کی "منگنی" اور اعجاز احمد نواب کی "ناگن" بہت ہی زیادہ پسند آئیں، اس کے علاوہ "اُجالوں کا ماتم" ایم ارشد وفا کی، محمد اقبال زمان کی "سرفروشی ہے زندگی، زنجیر ٹوٹ گئی، تسیم سکینہ صدف کی اور سلیم فاروقی کی "آتش جنون" بے حد پسند آئیں۔ ہر ماہ سچی کہانیوں میں الگ الگ اسٹائل کی اسٹوریاں پڑھنے کو ملتی ہیں جو ہمیں سلجھانے کے ساتھ ساتھ ہماری بوریت کو بھی ختم کر دیتی ہے۔ بہت سے قارئین اس کی بدولت آپس میں ملتے ہیں اور بہت سی باتیں جو ہمارے دِل میں مٹھی کی طرح بند ہوتی ہے وہ ایک تحریر کی شکل میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ ماشاءاللہ! تمام رائٹر اچھا لکھ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو مزید اچھا لکھنے کی ہمت دے، کیوں کہ ان کی وجہ سے ہی "سچی کہانیاں" کو ترقی مل رہی ہے۔ اچھا اب آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔ انشاءاللہ! زندگی رہی تو اگلے خط میں ضرور ملاقات ہوگی تب تک کے لیے اجازت دیں خدا حافظ!

☆ شاہد! ہمیں بھی آپ اور آپ کی محبت یاد ہے۔ اب آئے ہو تو آتے ضرور رہنا۔ احوال میں شرکت باقاعدہ بناؤ۔



✉ رضوانہ کوثر لاہور سے لکھتی ہیں فروری کا سچی کہانیاں پوری رعنائیوں کے ساتھ ملا سچی کہانیاں کا یہ رنگ بہت پسند آ رہا ہے اس بار بھی ٹائٹل خوب صورت رہا شوخ مسکراہٹ والی حسینہ سے مل کر من پسند، جام شیریں، ہیڈ اینڈ شولڈر، میڈورا، انگلش ابٹن کریم اور بیک پارلر کے بعد کریڈٹ پیج تک پہنچے واہ جی کیا رنگ نکالا ہے آپ نے سچی کہانیاں میں، سہام مرزا صاحب کی تصویر دیکھ کر پھر سے گزرا زمانہ پوری تابناکیوں کے ساتھ سامنے آ جاتا ہے۔ چلیے جی ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں، منزہ سہام کا "اعزاز" زبردست تھا تو کاشی کی "کچھ اپنی باتیں" بھی مزہ دے گئیں۔ اس کے بعد سچ بیانیوں میں جویریہ سلیم، فہیم بھائی، اسلم آزاد، تسیم سکینہ صدف، محمد مدنی فدا، ایم ارشد وفا، غلام مصطفیٰ، الماس فاطمہ ارمان، ممتاز احمد اور شیخ معظم الٰہی کی سچ بیانیاں واقعی زبردست تھیں پڑھ کر دُکھ بھی ہوا مگر کیا کیا جائے سچ تو سچ ہوتا ہے۔ اگر نوکِ قلم کے ذریعے صفحہ قرطاس پر بکھیر دیا جائے تو رنگ واقعی اپنی الگ شناخت دکھاتے ہیں۔ سات سمندر پار کی کہانیوں میں چاند زبردست اور بردا بہت خوب تھیں۔ سرحد پار سے منتر اور خوشبو نے خوب رنگ جمایا۔ زاہدہ حنا نے "تم کون ہو" جیسی شعلہ ساماں تحریر دے کر اپنا غلام کر لیا۔ واحد حل میں حمیرا خان جو ہمارے ہی شہر کی ہیں آگ لگانے میں کامیاب رہیں۔ محمد اقبال زمان نے مانسہرہ کے شیر اور ہنگو کے دلیر کو زبردست طریقے سے خراجِ تحسین پیش کیا۔ تین مرد تین کہانیاں بہت اچھا سلسلہ ہے، سرِ آئینہ پسِ آئینہ میں مقبول جلیس صاحب نے کیا خوب صورت تحریر پیش کی جبکہ محمد شہزاد کنول کی "عمر کی نقدی" اور دستگیر شہزاد کی "باز اور ابابیل بھی نئے رنگ کی تحریریں تھیں۔ لیجیے جی تبصرہ پورا ہوا امید ہے کاشی کو آپ مجھ سے شکایت نہ ہوگی۔ رخسانہ سہام مرزا اور منزہ سہام کو بہت سلام، اب اجازت دیں اگلے ماہ ملاقات ہوگی اگر خدا لایا۔

☆ بہت پیاری رضوانہ آپی! بس ایسی ہی خوشی ہر ماہ چاہیے تو آپ کا بھرپور تبصرہ اگلے ماہ بھی آ رہا ہے نا......

ایم اے راحت کے قلم سے تخلیق پانے والا ایک لافانی سلسلہ

ناہم شکل

ایک نوجوان کی سرگزشت، جسے بچپن کی ایک بات یاد تھی
جب اُس کی دادی اماں نے کہا تھا۔
''اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ہر انسان کے سات ہم شکل بنائے ہیں......''
''کہاں ہیں وہ......؟''
''لو...... یہ تو اللہ ہی جانے بیٹا۔''
''ٹھیک ہے...... میں انہیں تلاش کروں گا۔''
کیا یہ روایت دُرست ہے؟
اسی روایت کی کھوج میں نکلے اُس نوجوان کی کتھا......
جب ایک ڈاکٹر نے اُس کے جذبہ جستجو کو ہوا دی
ڈاکٹر نے کہا
''تمہیں برین کینسر ہے...... تمہاری عمر مختصر ہے......''
''نہیں ڈاکٹر...... مجھے کینسر نہیں ہے...... اور اگر ہے تو بھی میں نہیں مروں گا...... میں بہت لمبی عمر جیوں گا......''
موت سے پنجہ کش ایک سرکش نوجوان کی ناقابلِ فراموش داستان
کیا اُسے ساتوں ہم شکل ملے؟
کیا اُس نے موت سے جنگ کی؟

[illegible]



ساتھیو! یہ تو تھے وہ خطوط جواب تک ہمیں موصول ہوئے، اگر خدا نے چاہا تو اگلے ماہ ان ہی صفحات پر ملاقات ہوگی، اپنا بہت خیال رکھیے گا۔ پُر اسرار نمبر کیسا لگا؟ آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

تاخیر سے موصول ہونے والے خطوط

☆ فہد نور خان، کراچی ☆ شمیلہ انور، کھاریاں ☆ تنویر فاطمہ، ٹنڈو آدم ☆ شبانہ زمان، کراچی ☆ رفعت سلطانہ، پرانا سکھر ☆ فہیم طیب، دادو ☆ شاعر عتیق، کراچی ☆ عارش عتیق، اورنگی ٹاؤن، کراچی ☆ عارف خان، بنجرہ پول، حیدرآباد ☆ اریشہ کنول، صادق آباد ☆ جہاں آراء بیگم، کوٹری ☆ فیصل طالب، چک شہزاد، اسلام آباد ☆ کوثر اسلم، نیو امر پورہ راولپنڈی ☆ شازیہ ظہیر، ساہیوال ☆ نادیہ طارق، جاتی، سندھ ☆ علی رضا عمرانی، سجاول

SMS کے ذریعے موصول ہونے والے پیغامات



☆ فیض الحسن، شاہ فیصل کالونی، کراچی سے لکھتے ہیں سچی کہانیاں نے اس ماہ پولیس پولیس کے شیر چوہدری اسلم شہید کی کہانی میں پولیس کا مورال جس طرح آپ لوگوں نے بلند کیا ہے اس کے لیے ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ امید ہے آئندہ بھی اس طرح کی مثبت تبدیلیاں پرچے میں نظر آتی رہیں گی۔



☆ سلیم خان نے ڈرگ روڈ، کراچی سے SMS کیا ہے
، سچی کہانیاں فروری کا شمارہ بہت پسند آیا۔ سرفروشی ہے زندگی کہانی میں پولیس کو جس طرح ہائی لائٹ کیا گیا ہے یہ وقت کی ضرورت ہے۔ امید ہے سچی کہانیاں ڈائجسٹ میں اس طرح کی مثبت تبدیلیاں خوش گوار اثر ڈالیں گی۔



☆ ہارون زمان، آزاد کشمیر سے لکھتے ہیں فروری کا سچی کہانیاں خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ ملا پرچہ بہت اچھا ہے، تمام کہانیاں پسند آئیں۔ سلسلے وار ناول بھی اچھے ہیں۔ ان شاء اللہ اگلے ماہ پھر اپنی رائے سے آگاہ کریں گے۔

آپ کی دُعاؤں کا طالب

کاشی چوہان

توجہ طلب

اپنی نگارشات کے حوالے سے بات کرنے کے لیے آپ 0307-2089080 پر رابطہ کر کے معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ پیارے ساتھیو! آپ اپنی نگارشات ہمیں ای میل کے ذریعے بھی روانہ کر سکتے ہیں

ای میل: pearlpublications@hotmail.com

ڈاک سے بھیجنے کے لیے: 110۔ آدم آرکیڈ۔ شہید ملت روڈ ر بہادر شاہ ظفر روڈ، کراچی

نوٹ: قارئین اور لکھاری دوستوں سے گزارش ہے کہ آپ اپنی تحریر کاغذ کے ایک طرف، ایک سطر چھوڑ کر لکھیں اور اپنا نام، پتا اور مقام واضح طور پر تحریر کیا کریں۔ (شکریہ)

ایڈیٹر

جہانِ حیرت واسرار میں لپٹی پراسرار کہانیاں

14 مارچ ...... نصرت سرفراز

اسلام آباد سے ایک نا قابلِ فہم سچی کہانی، جو یقیناً آپ کو چونکنے پر مجبور کردے گی

محافظ ...... بشریٰ سعید احمد

لاہور سے ایک ان دیکھے محافظ کی، کرم فرمائیاں، جس نے نادیدہ ہو کر بھی اُس ماں، بیٹی کی حفاظت کی

ہم زاد ...... خلیل احمد انجم

کھاریاں، ضلع گجرات سے ایک ہم زاد کی اسرار بھری، بہت خاص آپ بیتی

الہام ...... ندا ہاشمی

کراچی سے، نادیدہ قوتوں سے کوئی بھی فائدہ نہ اٹھا سکنے والی دوشیزہ کی خاص کہانی

زندہ لاش ...... ارم ناز

لاہور سے پرانے وقتوں کی ایک حکایت، جو سچ ثابت ہو گئی

سِکھ سنتری ...... شیخ معظم الٰہی

حیدر آباد سے خدا کی شان عیاں کرتی ایک پراسرار کتھا

آسیب ...... صفدر علی حیدری

اُچ شریف، بہاول پور سے ایک نوجوان کے ساتھ پیش آنے والا انہونا واقعہ





14 مارچ

نصرت سرفراز

اسلام آباد سے، ایک ناقابلِ فہم سچی کہانی، جو یقیناً آپ کو چونکنے پر مجبور کردے گی

پہلی دفعہ وہ مجھے نیو یارک جاتے ہوئے کنکٹنگ فلائٹ کے لاؤنج میں نظر آئی۔ سرخ و سفید رنگت، ملیح چہرہ، ستواں ناک، بے بی پنک باریک ہونٹ، چہرے کے گرد بلیک اسکارف لپیٹا ہوا جس کے دائیں سائیڈ میں سے نکلتی ہوئی گولڈن بالوں کی لٹیں جو بار باراُس کے چہرے پر آجاتیں اور وہ انہیں اپنے کان کے پیچھے اُڑس لیتی، سوں سوں کرتی ناک کے ساتھ وہ مجھے بہت دل کش پُرکشش لگی۔ وہ مشرق و مغرب کا حسین امتزاج تھی۔ یہ لڑکی تھی تو غیر ملکی مگر لباس، اسکارف اور اُس کا مسکرا کر السلام علیکم، کہنا مجھے حیران کرگیا۔ دراصل اُس کے پاسپورٹ پر ایک اسٹیمپ لگنے سے رہ گیا تھا اور وہ السلام علیکم کے بعد مجھ سے وہی معلومات لینا چاہ رہی تھی۔ میں نے اُسے کاؤنٹر نمبر بتا کر گائیڈ کیا اور وہ جزاک اللہ کہہ کر آگے کاونٹر کی طرف بڑھ گئی اور میں حیرانی کے سمندر میں غوطے لگانے لگی کہ یا اللہ آج کل کے دور میں یہاں ہم پیدائشی مسلمان بھی بجائے جزاک اللہ کے Thank you اور شکریہ کہنا ہی پسند کرتے ہیں، کجا یہ غیر ملکی لڑکی...... یقیناً یہ دائرہ اسلام میں داخل ہوچکی ہوگی جبھی تو اسکارف، مکمل اسلامی لباس اور انداز میں تھی۔ بہرحال میں نے اس لڑکی کا خیال دماغ سے جھٹکا اور ڈیپارچر لاؤنج سے فلائٹ کی طرف بڑھ گئی کہ جہاں اناؤنسر نیو یارک کی فلائٹ کے پیسنجرز کے لیے اناؤنسمنٹ کررہی تھی۔ اصل میں مجھے اسلام آباد سے نیو یارک جانا تھا جہاں میرا بھائی، امی اور ابو پہلے سے موجود تھے۔ میں یہاں پاکستان اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھی۔ میرا بھائی نیو یارک میں شادی کررہا تھا اور مجھے اُس نے خصوصی طور پر بلایا تھا، تاکہ میں، اُس کی اکلوتی بہن اُس کی شادی میں ضرور آؤں۔ میری شادی کو ابھی چھ ماہ ہی ہوئے تھے اور میرے شوہر ایک سیمینار میں شرکت کرنے نیوجرسی گئے ہوئے تھے۔ وہ سیمینار میں شرکت کرکے سیدھا بھائی کے پاس نیو یارک پہنچتے اور میں پاکستان سے، اس طرح ہم سب لوگ بھائی کی خوشیوں میں شرکت کرلیتے۔ میرا اس طرح سے کنکٹنگ فلائٹ کا پہلا اکیلا تجربہ تھا اور میں دُعا کررہی تھی کہ میری سیٹ کے برابر کوئی اچھا ہم سفر بیٹھا ہو، تاکہ یہ طویل فلائٹ بوریت کا شکار نہ ہو۔ میں نے اپنا سامان شولڈر سے اُتار کر اوپری کیبنٹ میں سیٹ کیا اور کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ پر براجمان ہوگئی۔ ابھی میں لمبی دُعا سے فارغ ہی ہوئی تھی کہ برابر والی سیٹ پر کوئی کٹکھنی سی آنٹی نہ بیٹھیں کہ کانوں میں مانوس سی آواز گونجی ''السلام علیکم Can you please hold

"it for a while"

"yes why not"۔" میں نے جواب دیتے ہوئے اُس کا ہینڈ بیگ پکڑ لیا۔ اپنا دستی سامان کیبنٹ میں سیٹ کر کے وہ اب میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھ چکی تھی۔ "جزاک اللہ" کہتے ہوئے اُس نے اپنا بیگ میرے ہاتھ سے لے کر اپنی گود میں رکھ لیا اور میں سوچ رہی تھی کہ یقیناً آج کا سفر اچھا گزرے گا۔ اتنی سوبر اور دل کش سی لڑکی کے ساتھ جو مسلمان بھی تھی اور غیر ملکی بھی، میں اُس سے ضرور پوچھوں گی کہ وہ کس طرح دائرہ اسلام میں داخل ہوئی وغیرہ وغیرہ، مگر وہ لڑکی تو کچھ ہی دیر میں آنکھیں موند کر جیسے سو ہی گئی، مگر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ سو نہیں رہی، بلکہ رو رہی ہے۔ سوں سوں کرتی ناک کے ساتھ وہ ہر تھوڑی دیر کے بعد اپنی آنکھوں کے گوشے ٹشو پیپر سے صاف کرتی، بظاہر لگتا تھا وہ مجھ سے بات کرنے



پر آمادہ نہیں، مگر کچھ وقت گزرنے کے بعد میں اُس سے بات چیت کرنے لگی۔ وہ اپنے شوہر کا ماضی تلاش کرنے پاکستان آئی تھی اور واپس نیویارک جا رہی تھی اور اُس نے جو حیرت ناک اور پراسرار کہانی مجھے سنائی، آج میں وہی آپ سے شیئر کرنے لگی ہوں۔ دراصل یہ کہانی نہیں بلکہ اُس کی زندگی کی سچی داستان تھی اور اِس داستان کے اختتام پر جو سوال تھا شاید اس کا جواب کسی کے پاس موجود نہ ہو۔ اُس لڑکی کی زندگی کا احوال اُسی کی زبانی من وعن قارئین سچی کہانیاں کی نذر ہے، جو اُس کیوٹ سی غیر ملکی مسلم لڑکی نے باتوں کے دوران مجھے بتائیں۔ اُس کی اُردو بڑی محدود تھی، بیش تر انگلش میں کی گئی باتوں کو اُردو کے قالب میں ڈھالا ہے اور قارئین کی دل چسپی کے لیے میں نے اس کی غیر ضروری باتوں کو حذف کرکے ایک تسلسل کے ساتھ قلم بند کیا ہے، مثلاً واش روم جانے کے ٹائم کا واقعہ یا ایئر ہوسٹس کے چائے، کافی اور دیگر لوازمات سرو کرنے کا ٹائم وغیرہ۔

اس کا نام نینسی تھا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اس کے شوہر نے اس کا نام نین تارہ رکھا تھا۔ مغربی معاشرے کی بے حجابی، عریانیت، بے باکی اور بولڈنس کے برخلاف شروع ہی سے وہ ریزرو اور لیے دیے رہنے والی لڑکی تھی، دیگر ہم جماعتوں کی طرح Date پر جانا، کھلے عام بوس و کنار اور بانہوں میں بانہیں ڈال کر بار کے چکر لگانا، بے حجابی اور جسمانی نشیب و فراز کی ایسی نمائش کہ لڑکے تو لڑکے لڑکیاں بھی شرما جائیں، اُسے بالکل پسند نہ تھا۔ اسی وجہ سے اپنے ہم جماعتوں میں وہ ایک معتبر معروف حیثیت رکھتی تھی۔ پڑھائی میں بھی واجبی سی تھی اور اس کے دوستوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی، بس ہائے ہیلو پر ہی گزارا تھا۔

یونیورسٹی میں نئے سیشن کے آغاز پر اس کی کلاس میں ایک نئے لڑکے کا اضافہ ہوا جو مسلم تھا، مشرقی تھا۔ سیاہ بالوں کے ساتھ اس کی اونچی اُٹھان اسے دوسرے لڑکوں سے ممتاز حیثیت عطا کرتی تھی۔ یہ نوجوان کم گو بھی تھا اور پڑھا کو بھی، جلد ہی اُستادوں کی نظروں میں آ گیا اور اکثر Presentation وغیرہ بھی دینے لگا۔ نینسی کی طرح یہ بھی مغربی رنگ میں رنگنے کے بجائے اپنے کام سے کام رکھتا اور بے باکی اور بولڈنس سے کوسوں دور رہتا۔ لڑکیوں کے ساتھ Dating بھی نہ کرتا اور جیسا کہ اکثر ہوا ہے کہ دو کم گو اور ریزرو لوگ دھیرے دھیرے ایک دوسرے کے قریب آ جاتے ہیں، یہاں بھی یہی ہوا۔ نینسی کو معلوم ہوا کہ اس کا نام حسنین بن محمد ہے، جس کا تعلق پاکستان سے ہے اور اُس نے تعلیم حاصل کرنے کے لیے یہاں کی یونیورسٹی میں داخلہ لیا ہے۔ نینسی تعلیم حاصل کرنے کی واجبی کوشش میں تھی، جب کہ حسنین بہت جلد مضامین کو سمجھ لیتا اور کلاس میں اساتذہ کو جواب دے کر حیران کر دیتا۔ شروع میں وہ سارے مضامین جو نینسی کی سمجھ میں نہ آتے تھے، سمجھا دیا کرتا، کچھ نوٹس شیئر کر دیا کرتا۔ امتحان کے دنوں میں اس کا حوصلہ بڑھایا کرتا، مگر ان سب باتوں کے باوجود انہوں نے کبھی اپنی حدود کراس کرنا تو در کنار، وہ بوس و کنار تک بھی نہ کرتے تھے، بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ وہ ایک دوسرے سے ہاتھ بھی نہ ملاتے، بلکہ دور سے ہی ہائے ہیلو کرتے۔ حسنین اکثر نینسی سے کہتا۔ تم دوسری مغربی لڑکیوں سے بہت مختلف ہو، بہت معصوم اور پاکیزہ اور نینسی مشرقی لڑکیوں کی طرح شرما جاتی اور کہتی Leave this topic اور حسنین بن محمد کا دل ایک آدھ بیٹ مس کر دیتا اور نینسی کا دل دھڑکنا بھول جاتا۔ جب حسنین بن محمد نماز کے لیے گھڑی کے الارم بجنے کے ساتھ ہی چاہیے کتنا ہی ضروری کام کیوں نہ کر رہا ہو، یوں کھڑا ہو جاتا، جیسے سخت گرمی میں گھنٹوں کا پیاسا پانی دیکھ کر کھڑا ہو جائے اور جب اللہ اکبر کہتے ہوئے حسنین سجدے میں سر رکھتا تو نینسی کا دل خود بخود ہی دین اسلام کی طرف راغب ہو جاتا۔“

نینسی کی بات سن کر میرا دل واقعی یہ سوچنے لگا کہ کس قدر سچائی ہے نین تارہ (نینسی) کی بات میں۔ دراصل اسلام خنجروں، ڈنڈوں بندوقوں اور خودکش حملوں کے ذریعے نہیں نافذ کرایا گیا، بلکہ یہ آقائے دو جہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت ہی کی روشنی ہے، جس نے اہلِ عرب کو جوق در جوق دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کی رغبت دی۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دین اسلام کی حقانیت اپنے عمل اور کردار کے ذریعے ثابت کی، ایسا نہیں کہ سادگی کی تلقین کرکے خود ریشم و کمخواب پہنا اور دوسروں کو کم خوراکی کی نصیحت کرکے خود مرغ

تنجن کھانے بیٹھ گئے۔ آج کل کے ہمارے حکمرانوں اور امراء طبقے سے لے کر ہر ایک کا حال یہ ہے کہ دوسروں کو نصیحت خود میاں فضیحت، جنت میں جانے کا آسان اور سہل راستہ براستہ خودکش حملہ سیدھا جنت الفردوس میں لینڈ کرتا ہے۔ بات کہاں سے کہاں نکل گئی، میں تو آپ کو نینسی کی کہانی سنا رہی تھی کہ جب حسنین نماز پڑھتا تو اس کے دل کے دھڑکن رُکنا شروع ہو جاتی۔

''اُس نے حسنین سے پوچھا تمھیں نماز پڑھنے سے کیا ملتا ہے؟'' حسنین کے جواب نے اِسے لاجواب کر دیا۔

اُس نے کہا۔ ''نماز میں کیا ملتا ہے، یہ اُسی کو معلوم ہوتا ہے جو اپنے رب کے حضور سجدہ کرتا ہے۔''

ایک مرتبہ نینسی صبح سویرے کسی کام کے سلسلے میں حسنین کے اپارٹمنٹ گئی۔ دروازے کی بیل بجانے ہی والی تھی کہ اندر سے حسنین کی آواز آئی، شاید وہ کچھ گا رہا تھا۔ This is not a song اُس نے سوچا پھر؟؟ حسنین با آواز بلند حسب معمول صبح صبح انتہائی خوش الحانی کے ساتھ تلاوت قرآنِ پاک کر رہا تھا۔ نینسی کا دل اس آواز کی طرف اس قدر مائل ہوا کہ وہ وہیں دروازے پر کھڑی اُس کی آواز سنتی رہی۔ جب یہ آواز ختم ہو گئی تو اُس نے بیل بجائی۔

حسنین باہر آیا، سفید ٹوپی پہنے، قرآن کو سینے سے لگائے، حسنین بن محمد اُس کے دل کی گہرائیوں میں اُترتا چلا گیا۔ اُس نے مردوں کو اس قدر نورانی اور پاکیزہ حالت میں کب دیکھا۔ وہ تو نشے میں ڈوبے اپنے آپ سے بے خبر، مدہوش اور بے باک ابنِ آدم کو دیکھنے کی عادی تھی۔ کہاں یہ روحانیت، پاکیزگی اور سچائی وہ دم بخود رہ گئی تھی۔ حسنین نے اُسے اندر آنے کا راستہ دیا اور خود شیلف کی طرف بڑھ گیا۔ قرآن کو چوم کر اوپر رکھا اور نینسی کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔

''خیریت تو ہے اتنی صبح صبح تم یہاں کیسے آئیں۔''

اس طرح دھیرے دھیرے دونوں کے خیالات واحساسات ایک دوسرے سے ملتے چلے گئے۔ نینسی کے والدین تو تھے نہیں کہ کوئی روک ٹوک ہوتی۔ وہ دینِ اسلام کی طرف راغب ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ ایک دن اسلامک سینٹر جا کر اسلام قبول کر لیا۔ اسکارف سے سر ڈھانکے قبولِ اسلام کے بعد جب وہ حسنین سے ملی اور اُسے بتایا تو اُس نے کہا۔ مجھے معلوم ہے'' اور وہ یہ بات سن کر حیران رہ گئی۔

حسنین نے ہی اس کا اسلامی نام نین تارہ چنا۔ وہ روز اسلامک سینٹر جا کر درسِ قرآن اور طریقہ نماز و دیگر عبادات پر عبور حاصل کرتی رہی، اب وہ ایک مکمل باشعور اور خود مختار مسلم لڑکی تھی جو سر تا پیر اسلامی سانچے میں ڈھل چکی تھی۔ ایک دن حسنین نے اُسے شادی کے لیے پرپوز کیا تو اُس کی آنکھیں دھنک رنگ قوس قزح کی طرح جگ مگانے لگیں، جلد ہی دونوں شادی جیسے مقدس اور پاکیزہ بندھن میں بندھ گئے۔ یہاں تک اپنی داستان سنا کر نین تارہ خاموش ہو گئی اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

میں نے ایئر ہوسٹس سے پانی منگایا اور ٹشو پیپر اُس کی طرف بڑھایا۔ آنکھوں کے نم گوشے صاف کرتے ہوئے اس نے کہا۔ کاش میں حسنین سے اُس کے ماضی کے بارے میں کچھ نہ پوچھتی۔ کاش میرے دل میں اُس کے بچپن اور جوانی کے ایام کے بارے میں کرید نہ ہوتی۔

میں نے اُسے دلاسا دیا۔ ''نین تارہ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا یہ ایمان ہے کہ ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر پتا بھی نہیں ہلتا۔''

''ہاں یہ بات تو آپ کی سچ ہے، بہرحال ہم دونوں (حسنین اور نین تارہ) ایک خوشگوار ازدواجی زندگی کی بھرپور خوشیاں انجوائے کر رہے تھے، حسنین یونیورسٹی میں اسلامیات اور انگلش پڑھاتے تھے، جب کہ میں گھر پر قرآنِ پاک حفظ کر رہی تھی۔ ہاں یہ بات تو میں آپ کو بتانا ہی بھول گئی کہ حسنین خود بھی حافظ قرآن تھے۔ اُن ہی دنوں جب کہ میں قرآن حفظ کر رہی تھی تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اُس خوشی کی نوید دی جس کے بنا عورت ادھوری ہے، جو عورت کی معراج ہے، اس کی تکمیل ہے۔ حسنین بھی بے حد خوش تھے۔ میرا خوب خیال رکھتے، گھماتے پھراتے کہتے۔ نین تارہ تم ان دنوں زیادہ سے زیادہ قرآن پڑھا کرو، تمہاری کوکھ میں پلنے والا یہ ننھا مہمان اس کی آواز سنتا ہے۔ وہ اپنے رب کی ثناء جتنا زیادہ سنے اتنا ہی اچھا

ہے۔ خوشی کے ہنڈولے میں جھولتے وقت پر لگا کر اُڑتا
چلا گیا اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں دو جڑواں نعمتیں علی اور
مریم کی صورت میں عطا کیں۔ حسنین خوشی سے پھولے
نہ سماتے۔ دیکھا اللہ تعالیٰ نے کس طرح ہماری خواہش
پوری کی۔ دونوں کو بامراد کیا۔ تم بیٹا چاہتی تھیں، تم کو دیا
اور میں تمہاری طرح پاکیزہ اور معصوم بیٹی کا خواہش مند
تھا تو اللہ نے میری دُعا کو بھی رد نہیں کیا۔ دن
ہفتوں، ہفتے مہینوں اور مہینے سالوں میں تبدیل ہوتے
چلے گئے۔ دونوں ننھے بچے اب اسکول جانے لگے
تھے۔ ہم نے انہیں اسلامی اسکول میں داخل کیا تھا،
تاکہ وہ شروع ہی سے صحیح اسلامی تربیت کے مراحل
طے کرسکیں، مگر اس قدر مادر پدر آزاد معاشرے میں یہ
کام قدرے کٹھن تھا۔ بے حجابی، عریانیت اور فحش گوئی
یہاں عام تھی، اسی لیے میں نے حسنین سے پاکستان
جانے کی ضد کرنی شروع کردی اور اُس کا ماضی
کریدنے کی کوشش کرنے لگی، جس کو وہ نہیں کہہ کر ٹال
دیتا۔ میں نے اپنے والدین، اپنے بہن بھائیوں،
ماضی کی ایک ایک یاد، ایک ایک واقعے کو اس کے
ساتھ شیئر کیا تھا۔ ایک ایک خوشی، غم اور احساس اُس
کے ساتھ ڈسکس کیے تھے۔ وہ میرا مونس و غمخوار، ہمدم و
ہمراز تھا، مگر میرے لیے وہ ابھی تک ایک سربستہ راز
تھا۔ اکثر رات کو میری آنکھ کھلتی تو دیکھتی وہ راکنگ
چیئر پر بیٹھا آنکھ بند کرکے تلاوت کررہا ہوتا، ایسے
وقتوں میں مجھے لگتا راکنگ چیئر پر جھولتے ہوئے اس کا
وجود کہیں سفید دھوئیں کی مانند غائب ہوجاتا، بس ایک
خوش الحان دھیمی تلاوت کی آواز کانوں میں رس گھولتی
تو میرے رونگٹے کھڑے ہوجاتے۔ میں پسینے سے
شرابور ہوجاتی، مگر کچھ دیر بعد وہ مجسم وجود میرے
سامنے موجود ہوتا۔

ایک بار ہم ساحلِ سمندر پر گئے۔ علی چھ ماہ کا تھا۔
وہ گھٹنوں کے بل چلتا چلتا پانی کی لہروں کی طرف بڑھتا
چلا گیا۔ میں اور حسنین دوسری طرف متوجہ تھے، اچانک
ساحل پر کھڑے لوگ چلائے۔ Hey little kid is
sinking۔ ہم دونوں مڑے۔ علی بہت دور لہروں کے
اُوپر تھا۔ اُس کے ننھے ہاتھ پانی سے باہر تھے، وہ ڈوب
چکا تھا۔ میرا ذہن ماؤف ہوتا جارہا تھا، اچانک مجھے
محسوس ہوا کہ حسنین کا وجود دبیز سفید مرغولے نما دھوئیں
میں تحلیل ہوا اور سمندر کی بپھری موجوں کے اوپر سے
گزرا۔ دھوئیں کے مرغولے نے علی کو بے رحم لہروں کے
چنگل سے چھڑا کر میری گود میں ڈال دیا۔ میرا ڈوبتا ذہن
مائل بہ ہوش ہوا تو حسنین مجسم میرے سامنے موجود تھا۔
حسنین علی کو کس نے سمندر کے بیچ سے نکال کر میری گود
میں ڈالا تو وہ بولے، لہروں نے خود اسے ساحل پر پہنچایا
ہے، تم بے ہوش تھیں، مگر میرا ذہن اسے قبول کرنے کے
لیے تیار نہ تھا۔ میں نے خود حسنین کو دھندلے ہیولے نما
مرغولے میں تبدیل ہوتے، لہروں پر اڑتے اور علی کو پانی
کی موجوں سے آزاد کراتے دیکھا تھا۔ وہ سب کیا تھا؟
شاید میں واقعی بے ہوش ہوگئی تھی۔ میں نے اپنے دل کو
تسلی دی...... کئی ماہ اور گزر گئے۔ اب میرا دل حسنین کا
ماضی جاننے کے لیے مزید بے چین و بے قرار ہوتا چلا
گیا۔ ایک دن میں غصے سے بے قابو ہوکر بولی۔ حسنین
آج تم کو اپنے ماضی کے بارے میں مجھے بتانا ہی ہوگا۔
یہ تو مجھے معلوم ہے کہ تم پاکستان سے تعلق رکھتے ہو، مگر
تمہارا کوئی شہر، کوئی گاؤں محلّہ تو ہوگا۔ تمہارے پرائمری
اسکول کا نام، کالج کا پتا، تمہارے ماں باپ، بہن بھائی
کوئی تو ہوگا۔ میں چاہتی ہوں جس طرح میرا ماضی
تمہارے سامنے کھلی کتاب کی مانند ہے، میں بھی تمہارا
ماضی جانوں۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا، تم کسی غیر شادی
شدہ ماں باپ کی ناجائز اولاد ہوگے؟؟؟ یہ سوال کرتے
ہی مجھے محسوس ہوا کہ میرا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا
اور سامنے بیٹھا حسنین دھوئیں کا ہیولہ بن گیا۔ دھند کا یہ
وقفہ چند ساعتوں پر محیط تھا، پھر میں نے حسنین کو تیز
قدموں سے دروازے کی جانب جاتے دیکھا۔ دروازہ
اندر سے لاک تھا۔ حسنین دبیز مرغولے نما سفید دھوئیں
میں لپٹا بند دروازے تک جاکر غائب ہوگیا تھا۔ خوف کی
ایک لہر میری رگ رگ میں سرایت کرگئی۔ میں نے
جکڑے ذہن کے ساتھ اُٹھ کر دروازہ اَن لاک کیا تو باہر
حسنین مجسم کرسی پر بیٹھا تلاوت کررہا تھا۔ میں دم بخود رہ
گئی، یا اللہ ایسا کیا تھا۔؟

مگر آج میں نے اُس کا ماضی جاننے کی ضد پکڑ لی
تھی، دوبارہ اُس سے اس کا پتا پوچھا تو وہ مسکرا کر بولا نین
تارہ میں تمہیں بتا تو دوں گا، مگر شاید میرا ماضی جان کر تم

مجھے کھو دو گی۔ مجھ پر تو ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ حسنین بہانے نہ بناؤ، مجھے سچ سچ بتاؤ، تم کون ہو؟ کہاں سے تعلق ہے تمہارا؟ تمہارے ماں باپ کا نام کیا ہے اور وہ ایک ایک کر کے میرے تمام سوالوں کا جواب دیتا رہا۔

نین تارہ میں راولپنڈی کے علاقے لال کرتی کے معروف تاجر میر محمد سربازی کے گھر پیدا ہوا۔ تین بہنوں کے بعد۔ بڑی منتوں مرادوں کے بعد جب میں پیدا ہوا تو خاندان بھر میں خوب خوشیاں منائی گئیں۔ میرے والد مشہدی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے جو نسلاً افریقی تھے۔ میرے پردادا کے دادا حبشہ کے غلاموں کے ساتھ عرب کے مختلف ممالک میں فروخت کے لیے لائے گئے تھے۔ سالہا سال گزرنے کے بعد اب قدیم پنڈی کے مقیم تھے۔ میں نے ڈاویسزن بورڈ کے تحت ایک کرسچین اسکول سے میٹرک کیا اور پھر یہاں نیویارک آ گیا، پھر کئی سالوں بعد تم میری زندگی میں آگئیں اور میں سب کچھ بھول کر اپنی خوبصورت دنیا میں مگن ہو گیا۔ میں پیدائشی مسلمان تو تھا، مگر شریعت کے بتائے گئے اصول وضوابط اور حدود وقیود سے خود کو آزاد سمجھتا تھا۔ میں نے نیویارک آنے کے بعد قرآن حفظ کیا اور اسلامی شعائر اپنائے۔ مجھے یہ سب بتاتے بتاتے لگا کہ وہ کہیں گم سا ہو گیا ہے، ایسا محسوس ہوتا تھا وہ کوئی معصوم فرشتہ ہے۔

تمہارے بہن بھائی، ماں باپ حسنین تمہیں کوئی یاد نہیں آتا؟ کیوں نہیں یاد آتا نین تارہ، سب یاد آتے ہیں مگر میں اُن کے پاس لوٹ کر جا نہیں سکتا، میں مجبور ہوں اور اپنی مجبوری میں تمہیں بتا بھی نہیں سکتا۔ میرے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ کسی طرح سہی حسنین نے کسی حد تک تو اپنا ماضی میرے سامنے آشکار کیا۔

اگلے چند برس بہت تیزی سے گزر گئے۔ حصولِ معاش اور بچوں کی صحیح اسلامی تربیت ہم دونوں کا مطمح نظر تھی، مگر اس معاشرے میں بچوں کی صحیح اسلامی تربیت جوئے شیر لانے سے کم نہ تھی، لہٰذا کئی سالوں بعد میں نے بھی حسنین سے پاکستان اُن کے والدین اور بہنوں کے پاس جانے کی ضد کرنا شروع کر دی۔ نجانے کیوں مجھے لگتا تھا کہ حسنین جیسے فرشتہ صفت انسان کو ضرور اپنے ماں باپ سے ملنا چاہیے۔ کیا ہوا اگر وہ برسوں سے اُن سے ملا نہیں، ماں باپ تو اپنی اولاد کا بڑے سے بڑا قصور معاف کر دیتے ہیں۔ ان ہی دنوں ایک بار پھر رات کو میں نے محسوس کیا کہ حسنین بستر سے غائب ہے۔ میں نے باہر نکل کر کاریڈور میں جھانکا، پھر وہی میری حالتِ غنودگی، سفید مرغولے نما دبیز دھواں، خوف کا رگ رگ میں سرایت ہونا۔ میں بستر پر آکر لیٹ گئی، شاید سو گئی، صبح پھر میرے دماغ نے اسے واہمہ سمجھ کر بھلا دیا۔

اور اس دن کی شام میرے آنگن میں اس طرح اُتری کہ اس نے میری تمام زندگی رات کی تاریکی کی نذر کردی۔ حسنین یونیورسٹی سے واپس گھر آرہے تھے کہ اُن کا ایکسڈنٹ ہوگیا 14 مارچ 2013ء حسنین انسانوں کے اس جنگل میں مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔ ہمارے دونوں بچے چودہ سال کے تھے۔ کچھ دن مجھے ایڈجسٹ کرنے میں لگے، پھر زندگی ایک ڈگر پر چل نکلی۔ مجھے حسنین کی جگہ یونیورسٹی میں اپائنٹ کرلیا گیا۔ حسنین کی موت کے بعد سوشل سیکورٹی سیونگز اور لائف انسورنش پالیسی کی رقم سے ہماری زندگی بڑی ہموار گزرنے لگی تھی، کسی قسم کا کوئی معاشی مسئلہ نہ ہوا۔

ایک دن میں اپنے پرانے شیلف میں کتابیں صاف کررہی تھی کہ مجھے حسنین کا اسکول کے زمانے کا ایک رجسٹر ملا، اس پر اس کا نام درج تھا۔ کلاس، والد کا نام اور گھر کا پتا، جسے حسنین اپنی ساری زندگی مجھ سے چھپاتے رہے۔ میں نے فوراً ایک فیصلہ کیا، اس کے آبائی گھر جانے کا، اس کے والدین سے ملنے کا، اس کی بہنوں سے ملاقات کرنے کا اور اس طرح میں پاکستان آگئی۔ راولپنڈی کے علاقے لال کرتی کی تنگ گلی کا ایک بوسیدہ سا گھر، مجھے یہ گھر تلاش کرنے میں کچھ دیر تو ہوئی مگر میں نے اسے ڈھونڈ ہی لیا۔ کپکپاتے ہاتھوں سے میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک ضعیف خاتون نے دروازہ کھولا، اُن کے پیچھے ایک سال خوردہ آدمی کھانستا ہوا آیا۔ کون آیا ہے؟ اُنہوں نے پوچھا۔ ماں جی میں نیویارک سے آئی ہوں آپ سے ملنے۔ آپ حسنین بن محمد کو جانتے ہیں۔ وہ جو تین بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا، ہاں ہاں وہ میرا بیٹا تھا، مگر تم اُس کو کیسے جانتی ہو؟؟

وہ میرا شوہر تھا، نیویارک میں ہم نے شادی کی تھی۔ باباجی خاموش ہوگئے، پھر کچھ دیر بعد بولے۔ بیٹا تم کو کچھ غلط فہمی ہوگئی ہوگی، وہ کوئی اور حسنین بن محمد ہوگا۔ نہیں بابا یہی پتا ہے۔ میر محمد سرپازی اس کے والد کا نام ہے۔ ہاں یہ سب باتیں تو تم ٹھیک بتارہی ہو۔ تم اُس سے کب ملیں۔ بابا ہم پہلی بار چودہ مارچ 1994ء کو ملے تھے اور چودہ مارچ 1998ء کو ہم نے شادی کرلی تھی۔ حسنین کے مجھ سے دو جڑواں بچے بھی ہیں، علی اور مریم۔ بابا ساکت تھے۔ وہ بولے آؤ، میرے ساتھ آؤ، وہ دھیرے دھیرے آگے چلتے رہے اور ہم دو عورتیں اُن کے پیچھے، میں اور حسنین کی ماں۔ بابا آگے بڑھتے رہے۔ ہم ایک چار دیواری کے اندر داخل ہوئے۔ میں نے اندر قدم رکھا تو میری رگ رگ میں وہی خوف اور ڈر سرایت کرتا چلا گیا، جو کئی بار حسنین کو دھند کا سفید ہیولا بنتے دیکھ کر مجھ پر طاری ہوتا رہا تھا۔ میرا دماغ ماؤف لگ رہا تھا۔ پراسراریت کی لہر خوف میں اپنے احساسات صحیح طرح سمجھ نہیں پارہی تھی۔

بابا مجھے (قبرستان) لے آئے تھے۔ وہ آگے آگے بڑھتے رہے۔ ایک قبر پر رُکے۔ میری آنکھیں خوف اور حیرت سے پھٹ گئیں، ایک قبر کے کتبے پر موٹے موٹے کالے الفاظ میں لکھا تھا۔

ابدی آرام گاہ: حسنین بن محمد

تاریخ پیدائش: چودہ مارچ 1974

تاریخ وفات: چودہ مارچ 1994

چودہ مارچ 1994ء کو وہ مجھ سے نیویارک کی یونیورسٹی میں ملا، چار سال بعد چودہ مارچ 1998ء کو ہم نے شادی کرلی اور چودہ سال کے دو بچے چھوڑ کر وہ چودہ مارچ 2013ء کو ہمیں اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔ ایک سفید دبیز دھوئیں کا مرغولہ کتبے کے اوپر لہرایا اور پوری قبر کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ خوف کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں دوڑتی چلی گئی اور میں غش کھا کر گر پڑی۔

ہوش میں آنے پر حسنین کا رجسٹر میں نے اس کے ماں باپ کے حوالے کیا، جس کو لے کر وہ رو پڑے اور خود اسلام آباد ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہوگئی۔ یہاں میری آپ سے ملاقات ہوئی۔

قارئین سچی کہانیاں نین تارہ (نینسی) نے مجھ سے کچھ سوالات کیے۔

میرا شوہر کون تھا؟؟

وہ جو میرے ساتھ نیویارک میں رہتا رہا تھا؟

یا پھر وہ جو یہاں لال کرتی کے قبرستان میں مدفون تھا؟

وہ سفید دھند کا دبیز ہیولا کیوں بن جایا کرتا تھا؟

اُس کے ساتھ رہتے ہوئے کئی بار خوف اور ڈر کے مراحل سے کیوں گزرتی رہی؟

کیا کسی قاری کے پاس ان سوالات کے جوابات ہیں؟

☆......☆





محافظ

بشریٰ سعید احمد

لاہور سے، ایک اَن دیکھے محافظ کی کرم فرمائیاں جس نے نادیدہ ہو کر بھی اُس ماں بیٹی کی حفاظت کی

”تمہارے امتحانات میں کتنے دن باقی رہ گئے ہیں۔“ امّاں نے زینب سے پوچھا۔

”بس دو ماہ“ زینب نے کتابیں بیگ میں رکھتے ہوئے کہا۔



"تم اپنے امتحان کے بعد کسی اکیڈمی میں جاب کرلینا یا پھر کہیں داخلہ لے کر کوئی کورس وورس کر لینا۔" امّاں نے کپڑے تہہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں امّاں کیا ہوا؟" زینب نے امّاں سے لپٹ کر پوچھا۔

"رزلٹ آنے میں تو تین، چار ماہ لگ ہی جائیں گے۔ تم اتنے عرصے اِس ماحول میں رہ کر پریشان ہو جاؤ گی۔" امّاں نے آنسو بھری آنکھوں سے زینب کو دیکھتے ہوئے کہا تو زینب کی بھی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے دل میں سوچا، باہر کا ماحول کون سا اچھا ہے۔

"چل اب رونے نہ لگ جانا، جلدی سے تیار ہو جا، میں ناشتا بناتی ہوں۔" امّاں نے پیار سے اُس کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا اور کچن میں آ کر ناشتا بنانے لگیں۔ کچھ دیر بعد بلقیس بیگم جمائیاں لیتی ہوئی کچن میں داخل ہوئیں۔

"ارے فاطمہ! تم اکیلی لگی ہوئی ہو کام میں، زینب کو بلا لیتی اپنے ساتھ۔" انہوں نے احسانِ عظیم کرتے ہوئے کہا۔

"بھابی وہ تو کالج جا رہی ہے۔" امّاں نے دھیرے سے کہا۔

"تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے فاطمہ! اب اُس کی پڑھائی چھڑوا دو۔ ریاض گھر کا بچہ ہے، اُسے خوش رکھے گا۔ مگر تم نے تو اُسے ڈگریاں دلوا کر ہی دم لینا ہے، نا جانے کب اُس کی پڑھائی ختم ہو گی اور کب تم زینب کی شادی ریاض سے کرو گی۔ اتنا بھی خیال نہیں ہے تم ماں بیٹی کو، ہم اپنا گھر بار سب تم دونوں کے لیے چھوڑ کر آئے ہیں، ورنہ اکیلی عورت کو تو معاشرہ مفت کا مال سمجھ کر نگل جاتا ہے۔" بلقیس بیگم نے نخوت سے کہا اور کچن سے باہر نکل گئیں۔ زینب نے ان کی یہ تمام باتیں سن لی تھیں، اس نے روتے ہوئے دل میں اپنے رب سے گلہ کیا۔

"یا میرے مولا! کیا تیری اتنی بڑی دنیا میں ہم ماں بیٹی کی حفاظت کرنے والا کوئی نہیں ہے۔" یہ دعا کر کے وہ بے دلی سے اپنے آنسو صاف کر کے باہر صحن میں واش بیسن سے منہ دھونے آئی تو ریاض تولیے سے بال خشک کرتا ہوا باتھ روم سے باہر نکلا۔

"کیوں پڑھ، پڑھ کر اپنی اِن حسین آنکھوں اور میرے دل پر ظلم ڈھا رہی ہو۔ ایک بار میری بن جاؤ، پھر دیکھنا میں تمہیں عیش کروا دوں گا۔" ریاض نے بے حیائی سے ہنستے ہوئے سر سے پاؤں تک اُس کا ایکسرے کرتے ہوئے کہا۔ زینب نے اس کی طرف دیکھے بغیر نفرت سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

☆......☆

زینب کالج جانے کے لیے گھر سے باہر نکلی تو سامنے ہی پان کی دکان والا لوفر فیقا اُسے دیکھ کر دانت نکالنے لگا۔ "کیا بات ہے، آج میری جان لیٹ ہو گئی ہے۔" اس نے اپنے پیلے پیلے دانت نکال کر خباثت سے ہنستے ہوئے کہا تو زینب نے اپنی چادر کو اپنے جسم اور چہرے کے گرد اور بھی اچھی طرح سے لپیٹ لیا۔

جب وہ بس اسٹاپ پر آ گئی تو اُس کے دل نے کہا کہ یا تو وہ اپنی جان لے لے یا پھر اس خبیث کی، کیوں کہ زمانے بھر کی ذلالت چہرے پہ سجائے ہوئے ایک اور بدمعاش یہاں بھی اُس کا منتظر تھا۔ اتنی دیر میں بس آ گئی۔ زینب کے ساتھ ہی وہ بدمعاش بھی اسی بس میں سوار ہو گیا اور کالج کے سامنے زینب کے ساتھ ہی اُترا۔ یہ اُس کا روز کا معمول تھا۔ وہ ہر روز زینب کو کالج تک چھوڑتا اور واپسی پر لینے بھی آتا تھا۔ اب تو لوگ بھی اِس بات کا نوٹس لینے لگے تھے، کوئی ہنس کر اور کوئی حیرانگی سے زینب کی طرف دیکھتا تھا۔

گھر سے نکلتے ہوئے جو آنسو اُس کی آنکھوں میں ٹھہر گئے تھے، وہ کالج میں داخل ہونے تک گالوں پر بہنے لگے تھے، اوپر سے دیر سے آنے کی وجہ سے اس کا پہلا پیریڈ بھی مِس ہو گیا تھا۔ زینب غم زدہ دل کے ساتھ روتے ہوئے کالج کے اسٹیڈیم کی سیڑھیوں پر جا بیٹھی۔ اسٹیڈیم کالج کے ایک سنسان حصّے میں واقع تھا، یہاں اس وقت ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔

زینب گھٹنوں پر سر رکھ کر زار زار رونے لگی۔ یا اللہ

کیا تیری اس دنیا میں ایک بھی شخص ایسا نہیں ہے جو ہم بے بس عورتوں کی مدد کرے، جو ہماری عصمتوں کا محافظ بنے۔'' ناجانے کتنی دیر تک وہ تڑپ تڑپ کر روتے ہوئے اپنے رب سے یہ شکایت کرتی رہی۔

☆......☆

بشیر احمد اپنی زندگی سے مطمئن ہی نہیں بلکہ بہت خوش تھے۔ اپنی محنت سے انہوں نے چھوٹے سے کھوکھے کو ایک جنرل اسٹور کی شکل دی تھی۔ ان کا ایک چھوٹا سا گھر تھا، جو ان کے لیے بھی جنت تھا، جس میں ان کی ایک نیک بیوی اور ایک پیاری سی بیٹی تھی۔ وہ خدا کا دن رات شکر ادا کرتے اور دُعا کرتے کہ اُن کی بیٹی اُن کی آنکھوں کے سامنے اپنے گھر کی ہو جائے، مگر خدا کو یہ منظور نہ تھا، ایک دن اسٹور ہی میں انہیں دل کا دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا۔

بشیر صاحب کی موت کے بعد اُن کی بیوی اور بیٹی کے لیے زندگی کی مشکلات کا ایک تکلیف دہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ جب بشیر صاحب کا بڑا بھائی چھوٹے بھائی کی موت پر ان کے گھر آیا تو بھائی کا سجا سجایا گھر اور بنا بنایا اسٹور دیکھ کر اُس کا دل بے ایمان ہو گیا۔

بیوہ بھابی اور یتیم بھتیجی کو سہارا دینے کا بہانہ بنا کر انہوں نے گھر اور اسٹور پر قبضہ کر لیا اور اس قبضے کو مستقل قائم رکھنے کے لیے انہوں نے زینب کی شادی اپنے اَن پڑھ، جاہل، آوارہ بیٹے سے کرنے کا فیصلہ کیا، مگر یہ فیصلہ زینب اور فاطمہ کے لیے قبول کرنا بہت مشکل تھا، اسی لیے دونوں ماں بیٹی پڑھائی کی آڑ لے کر حتی الامکان اِس مشکل کو ٹال رہی تھیں۔

☆......☆

روتے روتے اچانک ایک سرد ہوا کا تیز جھونکا زینب کے وجود سے ٹکرایا تو زینب نے خوف زدہ ہو کر سر اُٹھایا اور ڈر کر کلاس روم کی طرف دوڑ لگا دی۔ کالج سے واپس آتے ہوئے اُسے محسوس ہوا کہ جیسے کوئی اور بھی اُس کے ہم قدم ہے۔ اُسے اپنے قدموں کی چاپ کے ساتھ ساتھ ایک اور چاپ بھی سُنائی دیتی تھی، مگر جیسے ہی وہ رُکتی تو وہ چاپ بھی سُنائی دینا بند ہو جاتی۔

اب بھی بس اسٹاپ پر وہ موجود تھا، جو اس کے ساتھ ہی بس میں سوار ہو گیا تھا۔ زینب نے بے بسی کے احساس سے آنکھیں بند کیں اور سیٹ کی پُشت سے سر ٹکا دیا جب وہ اپنے گھر کے سامنے بس سے اُتری تو اُس مکروہ پان والے پر نظر پڑی، جو اُسے دیکھ کر بے ہودہ فلمی گانے گایا کرتا تھا۔ زینب نے اپنے دل کو سمجھایا اور اُسے ایک اور خبیث کا سامنا کرنے کے لیے تیار کیا۔

☆......☆

آج جب زینب کی آنکھ کھلی، تو یہ صبح روز کی طرح نہیں تھی۔ کچھ تو تھا جو اسے بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔ زینب باتھ روم جانے کے لیے صحن میں آئی تو ریاض لکڑی کی سیڑھی پر کھڑا برآمدے کا بلب لگا رہا تھا۔

''اُٹھ گئی میری جان!'' بے شرمی سے آنکھ مار کر ریاض نے کہا، مگر اس سے پہلے کہ زینب نفرت سے منہ موڑتی، اچانک لکڑی کی سیڑھی فضا میں بلند ہوئی اور ریاض بھی اُس کے ساتھ ہی فضا میں بلند ہوا اور زوردار آواز کے ساتھ دھڑام سے زمین پر آ گیا۔ پورے گھر میں شور مچ گیا۔

''ارے کیا ہوا۔''

''کیسے ہوا۔''

''کوئی میرے لعل کو اٹھائے۔ ارے کوئی ایمبولینس منگوائے۔'' زینب اس ہنگامے میں چپکے سے کالج کے لیے نکل گئی۔

سامنے پان والا لوفر فیقا اُسے دیکھ کر اپنے گندے گندے دانت نکال کر گانے لگا۔ ''دھوپ میں نکلا نہ کرو......'' اس سے پہلے کہ وہ اپنا مصرع پورا کرتا، تڑخ کی آواز سے ایک اَن دیکھے ہاتھ کا زناٹے دار تھپڑ اُس کے گال پر پڑا اور اُس کے منہ سے خون کا فوارہ چھوٹ گیا۔ وہ اپنے دونوں گالوں پر ہاتھ رکھ کر چلّانے لگا۔ سامنے کھڑی زینب کو یہ تو صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ بہت تکلیف میں ہے، مگر ہوا کیا ہے، یہ کوئی نہیں جان سکا تھا۔ اس کی چیخ پکار سے فیقا کے اِرد گرد لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔

☆......☆

زینب حیران و پریشان بس اسٹاپ پر جا کھڑی ہوئی، جہاں پہلے ہی وہ لمبے بالوں والا بدمعاش اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ زینب کو دیکھ کر اُس نے آنکھ ماری تو زینب نے نفرت سے منہ پھیر لیا، مگر عجیب بات یہ تھی کہ آج زینب کو اُس کی موجودگی نے خوف زدہ نہیں کیا تھا، بلکہ ایک حیران کُن احساس نے اُسے اپنے حصار میں جکڑ لیا تھا۔

زینب کے دل و دماغ اُسے سگنل دے رہے تھے کہ اب اس بدمعاش کی باری ہے۔ اتنے میں بس آئی اور زینب اس میں سوار ہوگئی، اُس کے پیچھے ہی لمبے بالوں والے نے بس میں سوار ہونے کی کوشش کی، مگر اچانک ہی وہ پیچھے کی طرف گر گیا۔ سب لوگ سمجھے کہ شاید اُس کا پاؤں پھسل گیا ہے، لیکن زینب نے واضح طور پر دیکھا تھا کہ کسی انجان طاقت نے اُس کے بال پیچھے سے کھینچ کر اُسے بس سے زمین پر پٹخا تھا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس کے سر سے بے تحاشا خون بہہ رہا تھا اور لوگ اُس کے ارد گرد جمع تھے۔ کالج جا کر زینب سارا دن سکتے کی حالت میں رہی، اسے کبھی خوف اور کبھی طاقت کا احساس ہوتا تو کبھی اُن تینوں کی دُرگت یاد کر کے اُسے خوشی ہوتی اور کبھی اسے کسی اَن دیکھی شے کی موجودگی کا احساس کر کے ڈر لگنے لگتا۔

☆......☆

آنے والے دس دنوں نے زینب کی زندگی اور گھر میں مکمل ہلچل مچا دی تھی۔ تایا جی کی لاکھ کوشش کے باوجود اس روز انہیں اسٹور کی چابی نہ ملی تو انہوں نے تالا توڑنے کی کوشش کی اور پھر ہتھوڑا اُن کے ہاتھ سے چھوٹ کر سر پر جا لگا اور ان کا سر پھٹ گیا۔

ڈاکٹر بھی زخم دیکھ کر حیران تھے کہ لگتا تھا ہتھوڑے کی ضرب جان بوجھ کر پوری طاقت سے ماری گئی ہے۔

ریاض کی پہلے ہی ایک ٹانگ اور بازو ٹوٹ چکے تھے۔ وہ بستر پہ پڑا ہائے ہائے کر رہا تھا۔ پان والا فیقا بھی کسی ڈر سے اپنا کھوکھا اُٹھا کر نا جانے کہاں بھاگ گیا تھا۔ راستے کا وہ بدمعاش بھی اُس دن کے بعد سے غائب ہو گیا تھا۔ زندہ بھی تھا یا مر گیا تھا، یہ پتا ہی نہ چل سکا اور ایک دن اچانک تائی کو کسی اَن دیکھی طاقت نے سیڑھیوں سے دھکا دے دیا، بس اسی دن تائی جی نے شور مچا دیا کہ اِس گھر میں آسیب ہے۔ اِس خوف سے ایک ہفتے کے اندر اندر ہی انہوں نے اپنا بوریا بستر سمیٹا اور اپنے گھر جسے وہ کرائے پر دے آئے تھے، خالی کروا کر واپس چلے گئے۔

بشیر صاحب کے ایک دوست عثمان احمد نے اسٹور کرائے پر لے لیا۔ چلتا ہوا اسٹور تھا، اس سے اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔ وہ ہر ماہ کرائے کی مد میں ایک معقول رقم فاطمہ اور زینب کو دے دیتے، جس سے ان دونوں کا اچھا گزارا ہو جاتا تھا۔

اِن سب واقعات کے دوران زینب یہ بات اچھی طرح جان گئی تھی کہ کوئی ہے جو ہر وقت اُس کی حفاظت کرتا ہے اور اُسے ہر خطرے سے بچاتا ہے۔ زینب کو محفل میں جب تحفظ کا احساس ہوتا تو تنہائی میں ایک بھینی بھینی خوشبو اُسے اپنے اطراف محسوس ہوتی ۔ پہلے پہل تو زینب کو اِس خوشبو سے تحفظ کا احساس ہوا، پھر اپنائیت کا اور پھر یہ اپنائیت کب محبت میں بدل گئی، اُسے پتا ہی نہ چلا۔ وہ اَن دیکھا وجود دھیرے دھیرے اب اُس کے لیے بہت اہم ہو گیا تھا۔ اب وہ اپنے آپ کو بھی خوب سجانے سنوارنے لگی تھی، پھر اِس نرالی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ تنہائی میں اُس اَن دیکھے وجود سے باتیں بھی کرنے لگی تھی۔ اب زینب اُسے دیکھنا چاہتی تھی، مگر ہزار بار مخاطب کرنے کے باوجود بھی وہ کبھی اُس کے سامنے نہ آیا تھا۔

☆......☆

پھر اچانک انہی دنوں ایک روز عثمان صاحب زینب کے لیے اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر آئے، جو ایم بی اے کر کے کسی فرم میں ملازم تھا۔ عثمان صاحب کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ ان کے سب بچے شادی شدہ تھے۔ علی اُن کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ اُنہیں اِس بات پر کوئی اعتراض نہ تھا کہ شادی کے بعد علی اور زینب، فاطمہ کے ساتھ ہی رہیں۔ یہ رشتہ ہر لحاظ سے زینب کے مطابق تھا۔ لڑکا خوب صورت،

پڑھا لکھا اور برسرِ روزگار تھا اور فاطمہ کو بھی بیٹی کی شادی کے بعد تنہائی کا ڈر نہ تھا، مگر زینب اس رشتے کے لیے کسی صورت راضی نہ تھی۔ فاطمہ نے ہاتھ جوڑ کر، رو کر اور پھر پیار سے کئی بار اُسے سمجھایا، مگر اُس کی نہ، ہاں میں نا بدلی۔

فاطمہ کی زندگی سے اگرچہ اب تمام پریشانیاں ختم ہوگئی تھیں، لیکن یہ پریشانی کیا کم تھی کہ جوان بیٹی ایک اَن دیکھی مخلوق سے محبت کرنے لگی تھی۔ ایک دن جب عثمان صاحب فاطمہ کا جواب لینے آئے تو اُن کے جانے کے بعد فاطمہ گھنٹوں زینب کو سمجھاتی رہی، مگر زینب کا ایک ہی جواب تھا...... ''نہیں......''

فاطمہ روتی ہوئی عشاء کی نماز پڑھنے چلی گئی۔ نماز کے بعد وہ رو رو کر اپنے مالک سے دُعا مانگنے لگی۔ جب دِل کا غبار کچھ کم ہوا تو فاطمہ نے اُس اَن دیکھے وجود کو مخاطب کر کے کہا۔

''میں جانتی ہوں کہ تم نے ہر مسئلے میں ہماری مدد کی ہے اور ہر موقع پر تم نے زینب کی حفاظت کی ہے، لیکن اگر واقعی تم ہمارے ہمدرد اور محافظ ہو تو اِس بار بھی میری مدد کرو۔'' دل کی بات کہہ کر نا جانے کیوں فاطمہ کو اپنا آپ ہلکا سا محسوس ہونے لگا تھا۔

☆......☆

رات کے پچھلے پہر تیز خوشبو سے اچانک زینب کی آنکھ کھل گئی۔ اُسے اپنے سامنے روشنی کا ایک ہالہ سا دکھائی دیا، پھر آہستہ آہستہ اُس ہالے نے باقاعدہ ایک جسم کی شکل اختیار کر لی اور پھر دھیرے دھیرے وہ ایک نوجوان کے روپ میں ڈھل گیا۔

روشن بڑی بڑی آنکھیں، سرخ و سفید رنگ اور دراز قد کا ایک نوجوان اُس کے سامنے تھا۔ کچھ دیر تک تو زینب کی آواز اس کے حلق سے نہ نکلی، پھر ڈرتے ڈرتے اس نے دھیرے سے کہا۔ ''تم کون ہو؟''

''محافظ'' نوجوان نے مسکرا کر کہا۔ ''اُس دن تم کالج کے اسٹیڈیم کی سیڑھیوں پہ بیٹھی رو رہی تھیں، اسٹیڈیم کی سیڑھیوں کے پیچھے جو برگد کا درخت ہے۔ میں اُس درخت پر رہتا ہوں، میرا تعلق قومِ جنات سے ہے۔ اُس دن تم رو رو کر خدا سے شکوہ کر رہی تھیں کہ اُس نے تمہاری مدد اور حفاظت کے لیے کسی کو نہیں بھیجا۔ تب میرا دل تمہارے آنسوؤں سے دُکھی ہوگیا اور میں نے تمہاری حفاظت کرنے کا فیصلہ کیا اور پھر اُسی دن سے میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اُس دن کے بعد تمہاری زندگی میں کیا، کیا ہوا یہ تو تم جانتی ہو، مگر تم یہ نہیں جانتیں کہ قومِ جنات انسانوں پر صرف عاشق ہی نہیں ہوتے، بلکہ ہم انسانوں سے دوستی بھی کرتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر اُن کی مدد بھی کرتے ہیں۔ تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں تمہیں اپناؤں گا یا تم میری زندگی میں شامل ہو سکتی ہو۔ بے وقوف لڑکی میں صرف تمہاری حفاظت کروں گا، جیسے ایک باپ یا بھائی کرتا ہے۔'' محافظ نے مسکرا کر زینب کی طرف دیکھا تو اُس نے حیرت سے لفظ ''بھائی'' کو دہرایا اور پھر ایک دم زینب کی آنکھوں میں آنسو اور ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

☆......☆

چند دن بعد زینب اور علی کی شادی ہوگئی۔ شادی کے بعد کمپنی والوں نے علی کو قطر بھیج دیا اور زینب بھی اُس کے ساتھ ہی چلی گئی۔ اگرچہ فاطمہ کی تنہائی کے خیال سے علی اور عثمان صاحب دونوں پریشان تھے، مگر زینب اور فاطمہ بالکل پریشان نہ تھیں، کیوں کہ وہ جانتی تھیں کہ فاطمہ اکیلی نہیں ہے۔ ''محافظ'' اُس کے ساتھ ہے، پھر زینب کے جانے کے بعد محافظ نے ایک بیٹے کی طرح فاطمہ کا خیال رکھا۔ اب وہ باقاعدہ انسانی شکل میں فاطمہ کے ساتھ رہنے لگا تھا اور فاطمہ اُسے اپنا بھتیجا کہتی تھی۔ چار سال بعد فاطمہ کا انتقال ہوگیا تو محافظ نے فاطمہ کی بیماری سے اُس کے جنازے تک ہر موقع پر بھرپور ساتھ دیا۔ چالیسویں کے بعد جب زینب قطر واپس جانے لگی تو محافظ اُسے خدا حافظ کہنے آیا اور اُسے گھر کی چابیاں دے کر بولا۔

''زینب بہن مجھے اجازت دو۔ اب یہاں میرا کام ختم ہوگیا ہے۔'' زینب نے آنسو برساتی آنکھوں سے محافظ کو خدا حافظ کہا اور سوچنے لگی کہ اللہ ہر حال میں اپنے بے بس بندوں کی حفاظت کرتا ہے، مگر محافظ کون ہوگا؟ یہ کوئی نہیں جانتا۔

☆......☆



ہم زاد

خلیل احمد انجم

کھاریاں، ضلع گجرات سے، ایک ہم زاد کی اسرار بھری، بہت خاص آپ بیتی

''عاصم ...... عاصم ...... میں ...... میں تمہیں حاصل کر کے ہی رہوں گی۔'' فروزینہ غصے اور بے بسی کی ملی جلی کیفیت میں چلاّئے جا رہی تھی۔ ''تم میرے ہو، صرف اور صرف میرے...... میرے علاوہ تم کسی کے نہیں ہو سکتے...... قطعاً نہیں، ایسا میں ہونے ہی نہیں دوں گی۔'' وہ ہاتھوں میں تھمی تصویر سے محوِ گفتگو تھی۔ وہ تصویر اس کی تھی جسے وہ اپنا بنانے کے خواب سجائے جا رہی تھی۔ وہ خواب جو گزشتہ ڈیڑھ سال سے اس کی آنکھوں کی منڈیروں پر پھول کی صورت اٹکا ہوا تھا، مگر صد حیف کہ وہ خود اس کی خوشبو سے نا آشنا تھی۔

صدیوں کے مسافر نے جب ڈیڑھ سال قبل فروزینہ کو عاصم کے روبرو کرایا تھا تو وہ پہلے پَل میں ہی اس پر دل و جان ہار چکی تھی۔ وجیہ و شکیل عاصم مردانہ شخصیت کا ایک بے مثال نمونہ تھا۔ وہ ہی نہیں، یونیورسٹی کی اور بھی نجانے کتنی ہی لڑکیاں عاصم کی نام وری پر ٹھنڈی آہیں بھرتی تھیں۔ وہ ذہین بھی تھا اور خوب صورت بھی...... اور ہر میدان میں پیش پیش رہنا بھی وہ اپنا اولین فریضہ سمجھتا تھا...... یہی وجہ تھی کہ وہ ہر نظر میں سمایا ہوا تھا اور ہر نظر صرف اس کی ایک نظر ہی کی منتظر تھی، مگر وہ تھا کہ اپنی ہری طبیعت کو کسی کی جانب مبذول ہی نہیں کرتا تھا، بس اپنی ہی ٹھٹھول مزاجی میں غرقاب رہنا اسے پسند تھا۔ ایک وہ تھا کہ اس کی منتظر ہزار ہا نظریں تھیں اور ایک اس کی نظر تھی کہ اس میں اپنا کوئی دِکھتا ہی نہیں تھا۔

ہزاروں کی طرح فروزینہ بھی اس کی دیوانی تھی۔ وہ ہر چارے سے اسے اپنی طرف راغب کرنے کے گر اپنا چکی تھی، مگر عاصم کی کم اختلاطی میں کسی صورت بھی کمی واقع نہ ہوئی تھی۔ وہی کم توجہی، کم مائیگی اور بے بضاعتی اس کی فطرت میں ہنوز قائم تھی۔

آہستہ آہستہ نجانے کتنی ہی نگار نگاہیں اس کی کم نگاہی کی وجہ سے بدظن ہوئیں اور پھر خاموشی کھڑدلی کے ساتھ ایک طرف ہوگئیں، مگر فروزینہ کی ازبس و انتہائی دل آوری میں کسی طور پر بھی خفگی واقع نہ ہوئی۔ وہ کم حوصلگی اور بے ہمتی کا شکار تو نہیں تھی، مگر اب عاصم اس کی ضد بن چکا تھا۔ اس کی تمام ہم عصر اس بات سے واقف ہو چکی تھیں کہ اس کے من مندر میں جس کی تصویر ہے وہ موڈی عاصم ہے۔ بسا اوقات وہ اسے سوجھ بوجھ سے کام لینے کا مشورہ بھی دیتیں، مگر وہ کسی کے آڑے ہی نہ آتی، اسے اپنی خوب صورتی پر مان بھی تھا اور اعتماد بھی...... اور وہ سب سے یہ عہد بھی کر چکی تھی کہ وہ اس سنگ کو ضرور توڑے گی۔ یہی بات تھی کہ وہ اب پیچھے ہٹنا اپنا مقصدِ

حیات ہی نہیں گردانتی تھی، وہ خود کو کسی صورت بھی تھرڈ کلاس کہلانا پسند نہیں کر سکتی تھی، کیوں کہ وہ جلالی باپ کی جلالی صاحب زادی تھی۔

اس کا باپ صاحبزادہ افضل اللہ خان جلالی شہر کا رئیس ترین آدمی تھا۔ وہ کروڑوں کی جائیداد کا مالک تھا۔ اور ہزار ہا ایکڑ اراضی اس کی وراثت میں شامل تھی۔ ہزاروں مزارع اس کی زمینوں کی نگہداشت پر مامور تھے اور ٹیکسٹائل ملز اس کی آمدن کو راتوں رات بڑھائے جا رہی تھیں۔ اُس کی پیڑھی میں ہتک برداشت کرنے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

فروزینہ بھی ایسی سوچ نہیں رکھتی تھی۔ وہ تو تزک و احتشام کی مالکہ تھی اور اکلوتی ہونے کی وجہ سے وہ ہر شے کی بلا شرکت غیرے مالک بھی تھی۔ ایسی صورت میں کون ہے جو اپنی ناموس پر حرف آنے دے گا۔ وہ بھی اپنے تزک واحتشام کی رسوائی وہتک سے آتش فشاں بنی ہوئی تھی اور خود کو ناکوں چنے چبوانے والے کی تصویر سے نبرد آزما تھی اور اسے یہ باور کرا رہی تھی کہ وہ کون ہے؟ اور کس کی صاحبزادی ہے؟



ایسے میں اس کی خدمت گار اس کے سر پر پہنچ گئی جو روز و شب اس کی بے بہکی باتیں سنتی اور سمجھتی رہتی تھی اور اس کی کبیدہ خاطر طبیعت کو بھی پرکھتی رہتی تھی۔ نام تھا اس کا کبیسہ..... مگر حویلی میں وہ کبس کے نام سے ایسی مشہور ہوئی کہ اصل نام سے ہی سب ناواقف رہ گئے۔

"تم..... تم پھر میرے سر پر سوار ہونے کے لیے آدھمکی ہو..... دفع ہو جاؤ" فروزینہ اسے دیکھ کر چیخی۔

"صاحبہ" (وہ اسے پکارتی ہی اسی نام سے تھی) "میں آپ کی لونڈی ہوں، مجھ سے آپ کی یہ حالت نہیں دیکھی جاتی" وہ کذابی نیر بہانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

فروزینہ رنجیدہ نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

"صاحبہ! میں آپ کے لیے کچھ کروں۔ مجھے اس انداز سے کام کر کے بہت خوشی ہوگی" کبس لپک کر بولی۔

"تم میرے لیے کیا کر سکتی ہو؟ عاصم تو کسی کی سنتا تک نہیں۔" وہ بھرّائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"یہ آپ کی خام خیالی ہے صاحبہ! وہ آپ کی سنے گا بھی..... اور کہے گا بھی۔"

"سچ" فروزینہ لپکی "مگر کیسے.....؟"

"یہ ہو سکتا ہے، اگر آپ میری مانیں اور مجھے فرسودہ کہہ کر دھتکار نہ دیں، لعنت ملامت نہ کر دیں۔"

"تم..... تم کچھ بکو گی یا نہیں.....!!" فروزینہ آپے سے باہر ہونے لگی۔

"صاحبہ! بات یہ ہے کہ جو گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلتا اسے ٹیڑھی کر کے بھی نکالا جا سکتا۔"

"تم کہانیاں کیوں بجھوا رہی ہو" فروزینہ تند ہوئے لہجے میں بولی۔

"صاحبہ! میرے شعور میں ایک ایسا آدمی ہے جو ہزاروں عملیات کا ماہر ہے۔ عامل بھی ہے اور جادو ٹونا بھی جانتا ہے۔ پھونک مارتا ہے، جلا کے بھسم کر دیتا ہے۔ کئی کام جو ناممکن ہوں، ممکن بنا دیتا ہے۔ پتھر دلوں کو بھی موم کر دیتا ہے۔ وہ آپ کے عاصم کو بھی آپ کا گرویدہ بنا دے گا..... اس کا کام ہی یہی ہے۔" کبیسہ کہہ کر رک گئی، مگر صاحبزادی فروزینہ کی شعوری حرکات میں بتدریج تیزی آ گئی۔

وہ سوچنے لگی کہ واقعی اس نے تا حال ایسا کوئی گر، ایسا کوئی بھی ٹونا عاصم کو حاصل کرنے کے لیے استعمال نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس کے ذہن میں ایسا کوئی خیال کوندا تھا۔ اس کا مقصد عاصم کو پا کر اپنی خاندانی عزت و ناموس کو ارفع مقام پر قائم رکھنا تھا اور اُن تمام کو یہ باور کرا دینا تھا جو کام کوئی نہیں کر سکتا، وہ فروزینہ جلالی کر سکتی ہے۔

وہ ایک ضدی اور اڑوت لڑکی تھی اور عاصم اس کی ضد تھا، سو وہ بلا کسی دھکم پیل کے اس ایماء پر بھی رضامند ہو گئی۔

☆.....☆

کالے کلوٹے اس سادھو کی آنکھوں میں نجانے کون سی ایسی وحشت تھی کہ فروزینہ اسے دیکھتے ہی دہشت سے لرز اُٹھی، اس کے ہمراہ کبیسہ بھی تھی۔

وہ عجیب طرز کا ایک معبد نما کمرہ تھا۔ جس کی ہر شئے پر عجیب سی نحوست چھائی ہوئی تھی۔ دیواروں پر عجیب طرز کی مورتیاں تراشی ہوئی تھیں۔ اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی عہد قدیم میں داخل ہو گئی ہو۔ جس کی ہر شئے قدیمی دور پر منتج تھی۔ معبد نما کمرے کے عین وسط میں ایک چبوترا سا بنا ہوا تھا، جس پر وہ کالا سادھو آنکھیں بند کیے اپنے بھدّے ہونٹوں کو بڑبڑا رہا تھا۔ اس کے سامنے انگیٹھی میں آگ کا الاؤ روشن تھا، جس کے اوپر وہ وقتاً فوقتاً اس زور کی پھونک مارتا تھا کہ الاؤ متزلزل انداز میں پھڑ پھڑانے لگتا تھا۔ چھت کے اوپر ایک فانوس لٹک رہا تھا، معاً ہی وہ دہشت ناک انداز میں کانپ اُٹھی۔ فانوس میں انسانی ہڈیوں اور کھوپڑیوں کا اس انداز سے امتزاج کیا ہوا تھا، جیسے قیمتی موتی فانوس کی زینت بنے ہوئے ہوں۔ اس کا جی متلا اُٹھا۔ وہ وہاں سے فوراً بھاگ جانے کا سوچنے لگی، مگر اس میں اتنی ہمت ہی نہ تھی کہ وہ ایسا کر سکتی۔

وہ دیواروں پر تراشی مورتیوں پر غور کرنے لگی، وہ اس درمیانی مورتی کو دیکھ کر حقیقتاً ڈر گئی جو سب کے درمیان میں تھی اور بڑی بھی..... وہ مورتی اپنے لانبے لانبے بازو بکھیرے کھڑی تھی۔ اس کا قد چھوٹا تھا، مگر چہرہ بہت بڑا اور چوڑا تھا۔ اس کی آنکھیں غیر معمولی حد تک روشن اور چمکدار تھیں اور سب سے زیادہ خوفناک ہیت اس کی

زبان سے محسوس ہوتی تھی جو سرخ ترین تھی اور کتے کی طرح باہر لٹکی ہوئی تھی، باقی مورتیاں ایسی تھیں جیسے اس کی غلام ہوں یا پھر جیسے اس کو پوجنے والی ہوں۔

کافی دیر وہ سادھو قسم کا آدمی اپنے بھدے ہونٹوں کو بڑبڑاتا رہا، پھر ایک زوردار پھونک مار کر جھٹ سے آنکھیں کھول دیں، وہی وحشت بدرجۂ اتم اس کی آنکھوں میں برس رہی تھی، نحس ترین وحشت......

اچانک وہ بھیانک انداز میں قہقہے لگانے لگا۔ اس کے بے ڈھنگے قہقہوں کی آواز اس کی قوتِ سماعت پر ہتھوڑے برسانے لگی۔

قہقہے لگاتے لگاتے یکدم ہی وہ رُکا اور اس ہولناک انداز میں فروزینہ کو گھورا کہ خوف سے اس کی گھگی بندھ گئی۔

اس کی وحشت ناک آنکھوں میں سرخ الاؤ دہک رہے تھے۔ فروزینہ کا جی چاہا کہ وہ چیخے چلائے اور اس عجیب وغریب مخلوق کے سامنے سے بھاگ جائے، مگر وہ یہ سب چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کرسکتی تھی۔

"اے ناری! کیوں چنتا کرتی ہے؟ کیوں اپنے یورن روپ کو ہلکا کرتی ہے؟ مل جائے گا تیرا موہن تجھے...... مل جائے گا...... پرنتو تُو سادھو کی داسی بنے گی تو...... سادھو کی سیوا کرے گی تو......" کالا سادھو ایسے دھیمے لہجے میں بولا جیسے ہزاروں سانپ سرسرا رہے ہوں۔ اس کے مکروہ چہرے پر مکروہ عزائم ناچ رہے تھے۔

وہ اس مکروہ صورت سادھو کی بات سُن کر دم بخود سی رہ گئی۔

"سُندری! تو بات کو پرکھ تو گئی نا......!" کالا سادھو مکروہ انداز میں مسکرایا۔

فروزینہ چپ چاپ دم سادھے اس کی ہر اول فول سُن اور سمجھ رہی تھی، مگر کہہ کچھ نہیں پا رہی تھی، اس نے محتاج نگاہوں سے کیسہ کو دیکھا، وہ بس آنکھیں بند کیے اپنی ہی مست سوچوں میں مستغرق تھی، جیسے وہ وہاں سرے سے موجود ہی نہ ہو...... معاً ہی وہ اُٹھی اور فروزینہ کو تنہا چھوڑ کر بیرونی راستے کی طرف مڑ گئی۔

"کیسہ...... کیسہ" فروزینہ لرز کر رہ گئی۔ اس نے فوراً ہی اس کی پیروی کرنے کی کوشش کی، مگر اسے ایسے محسوس ہوا جیسے اس کے پاؤں بھاری آہنی بیڑیوں میں آ گئے ہوں۔ وہ چلانا چاہتی تھی مگر ایسا کر نہیں پا رہی تھی۔ اس کی تمام ضدیں اس طاغوتی قید میں شکست زدہ ہوچکی تھیں۔ آخری منظر جو اس کی خوف زدہ آنکھوں میں سمایا تھا، وہ اس کالے سادھو کا اس کی طرف بڑھتا ہوا گھناؤنا وجود تھا، اس کے بعد اسے کچھ محسوس نہ ہوا کہ اس کے ساتھ کیا برتاؤ کیا گیا تھا۔

جب وہ باحواس ہوئی تو اس کے من مندر کی تمام ضدیں ٹوٹ چکی تھیں۔ وہ شعلے سے راکھ میں ڈھل چکی تھی، اس کے نازک بدن پر سیاہ گھنیری کالک چپک چکی تھی...... وہ رونا چاہتی تھی، مگر ایسا کر نہیں پا رہی تھی۔ چیخنا چاہتی تھی، مگر اس کا وجود اس کا ساتھ ہی نہیں دے رہا تھا، بس وہ ایک پتھر تن میں ڈھل چکی تھی، صرف ایک پتھر تن میں......

سادھو نے اسے جو کچھ بتایا تھا، وہ اس کے لیے ازحد مشکل تھا، مگر سب کچھ لٹانے کے بعد سب کچھ پانے کی ہوس ابھی بھی اس کے خیالات میں باقی تھی، وہ سب کچھ کرنا چاہتی تھی۔

☆......☆

سب سے پہلے اسے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جس چیز کی ضرورت تھی، وہ تھی ایک ایسی لاش جسے بنا کفن ودعا ہی زمیں بوس کیا گیا ہو۔ وہ سوچنے لگی کہ ایسی لاش اسے کس طرح مل سکتی ہے؟ اس طرح کا مردہ تو وہی ہوسکتا ہے جو کسی طرح قتل ہوا اور اسے زمین میں گاڑ دیا جائے۔ گڑے مردے اُکھاڑ کر تو یہ کام کرنا بہت مشکل ہے۔ وہ اپنی سوچوں میں گم تھی کہ معاً اس کے ذہن میں کیسہ کا خیال آیا...... اور پھر اس کا ہر کام آسان ہوتا چلا گیا۔

حویلی کے عقبی باغیچے میں اس نے ایک گہرا گڑھا کھودا اور رات کو آنے والا دودھ اس نے بڑے پیار سے کیسہ کو پلا دیا، دودھ میں زہر اس نے خود ہی ملایا تھا...... گہری رات کو اس نے کیسہ کی لاش کھڑکی سے باہر پھینکی اور اسے اُٹھا کر اس گڑھے میں گاڑ دیا۔

اس نے کمال مہارت سے وہ گڑھا زمین کے برابر بھی کر دیا۔ ویسے بھی عقب میں باغیچہ تھا اور روشنی بھی

رات کے اس وقت موقوف ہوتی تھی۔ فروزینہ یہ کام خاصی تشفی اور تحمل کے ساتھ کر کے بیڈروم میں آ گئی......
اب اسے اگلی رات کا انتظار تھا جب اس نے کبیسہ کا ہمزاد اس کی لاش سے نکالنا تھا۔
اس رات گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ فروزینہ عقبی باغیچے میں اس جگہ موجود تھی، جس جگہ اس نے کبیسہ کو گاڑا تھا۔ اس کے عمل کا آغاز وقتِ زوال سے ہونا تھا۔ بالآخر وہ وقت بھی آن پہنچا۔ اس نے سادھو کی ہدایات کے مطابق اپنے آپ کو ہر قسم کے ملبوس سے آزاد کیا اور اور اس جگہ کے اوپر آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئی، جہاں کبیسہ دفن تھی۔
کافی دیر وہ اسی طرح بیٹھی منہ ہی منہ میں کچھ بدبداتی اور بڑبڑاتی رہی، پھر وہ اُٹھی اور اس کے گرد چکر لگانے لگی۔ کبھی کبھی وہ رُکتی اور زور سے ہاتھوں کو اس جگہ کی طرف جھٹکا دیتی جہاں کبیسہ کی لاش دفن تھی۔
اس کا تمام بدن پسینے میں شرابور تھا، مگر وہ ہر قسم کے خوف سے آزاد اپنے آپ میں مشغول تھی۔ کافی دیر تک وہ اپنے عمل میں مشغول رہی اور پھر یکدم ہی وہاں ایک عجوبہ رونما ہو گیا۔ کبیسہ کا حلیہ لیے ایک ہیولا سا وہاں کھڑا تھا، بالکل اس جگہ سے اوپر جہاں کبیسہ دفن تھی۔ وہ ہیولا ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی روح ہو، پھر وہ بول پڑا۔ اس کی آواز ایسے محسوس ہو رہی تھی جیسے گہرے گڑھے کے اندر سے آ رہی ہو۔
''کیا چاہتی ہے تو......؟ کیوں مجھے بیدار کیا ہے تو نے۔''
فروزینہ اولاً تو خوف زدہ ہوئی، مگر بعد ازاں وہ اس بات کی جانچ تک پہنچ گئی کہ یہ اپنے قتل کی وجہ سے غصّے میں ہے۔
''تو میرا غلام ہے...... تجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تو مجھ سے سوال جواب کرے......'' فروزینہ زہر خند لہجے میں سرسرائی۔
''مگر......؟؟''
''اگر مگر کچھ نہیں...... خاموش!'' فروزینہ چیخی اور اپنے آپ کو ملبوسات اوڑھا کے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ ہیولا بھی اس کے عقب میں تھا، اور اس طرح چل رہا تھا جیسے غلام ہاتھ باندھ کر چلتے ہیں۔

☆......☆

اس کا مقصدِ حیات صرف ایک تھا۔ اس کی آرزو ایک تھی اور لگن بھی ایک ہی تھی اور وہ تھا عاصم...... جسے گزشتہ ڈیڑھ سال سے وہ اپنے من مندر میں بٹھائے ہوئے تھی...... اس کی اُمیدوں کی بر آوری کا وقت قریب آن پہنچا تھا۔ اس کی آرزو پوری ہونے والی تھی اور مقصدِ حیات بھی اسے حاصل ہونے والا تھا۔ وہ نہایت غیور لہجے میں اس ہیولے سے مخاطب تھی، جو انتہائی مؤدبانہ انداز میں سر بہ خم کھڑا تھا۔
''اے ہمزاد! تجھے معلوم ہے کہ میں نے تمہیں جاوداں کیا ہے، تمہیں مادّے سے باہر نکالا ہے...... تجھے سراپا روح عطا کیا ہے...... تو میرا غلام ہے...... میں تیری آقا ہوں...... میرے سوا تجھے نہ کوئی دیکھ سکتا ہے نہ کوئی چھو سکتا ہے...... اگر تو غلط کرے گا تو میں تجھے سزا دوں گی اور اگر تو حکم عدولی کرے گا تو غضب ناک سزا پائے گا...... لیکن تجھے میں ایک شرط پر آزاد بھی کر سکتی ہوں۔''
پہلی بار ہمزاد نے گردن کو تھوڑا سا اوپر اٹھایا پھر جھکا لیا۔
''تو جس بدن کا عکس ہے، اسی نے مجھے تیری راہ سجھائی تھی۔'' فروزینہ نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اسی نے کہا تھا کہ میں جو چاہوں گی وہ سب ہوگا، لیکن مجھے صرف اس کے علاوہ کچھ نہیں چاہیے کہ عاصم میرا ہو جائے...... عاصم کو میرا بنا دے...... جا! تیرے سر یہی میرا کام ہے۔ پہلا اور آخری......!''
ہمزاد محوِ حرکت ہوا اور پھر وہاں سے غائب ہو گیا۔
فروزینہ کے لبوں پر ایک طائرانہ تمسخر دوڑا اور پھر اس کی آنکھوں میں ایک روشنی سی عود کر آئی۔ ایک پُراسراری روشنی...... جیسے راہی بے منزل کو منزل کا پتا معلوم ہوا ہو اور وہ اسی منزل پہ ٹھہرا ہوا ہو۔
وہ ملن کی سرور آگیں روشنی تھی، جسے پانے کے لیے اس نے اپنا تن، من دھن وارنے سے بھی دریغ نہیں کیا تھا۔ اس کے پیے اس نے اتنے جتن کیے تھے، اتنے مراحل سے گزری تھی کہ بس...... وہ روشنی اس کے حسن کو بالا کیے دے رہی تھی۔ اس کے یاقوتی رخساروں پر مدھر سی لالی بکھر گئی تھی اور گلابی پتیوں جیسے ہونٹ سرخ گلاب

ی مانند مل گئے تھے...... آنکھیں جوبن کی سیج پر چمک
پُرنور تھیں اور جوبن جوگی کی بین پر لچکیلے چمکیلے بل
کھاتے، انگڑاتے ناگ کی طرح انگڑائی پہ انگڑائی لے رہا
تھا۔ وہ چشمِ تصور میں اپنے محبوب کے لمس معطر سے
سرشار ہوئی تو غیرارادی طور پر اس کے سرخ ہونٹوں سے
سسکاری سی نکل گئی، ایسے ہی وقت میں اسے محسوس ہوا
کہ کوئی اس کے آس پاس موجود ہے۔ اس نے خوابوں
کے سراب کو چکنا چور کرتے ہوئے جھٹ سے آنکھیں
کھول دیں۔ اس کے سامنے اس کے مسیحا کو لانے والا
پریشان حال کھڑا تھا......! وہ اپنے عاصم کو اِدھر اُدھر،
یہاں وہاں تکنے لگی...... اس کی تلاش میں آنکھیں گول
مٹول انداز میں گھمانے لگی، مگر نہ وہ وہاں تھا اور نہ ہی
ادھر اس نے آنا تھا۔ وہ غضب و خوف سے کپکپاتے
ہوئے لہجے میں بولی۔ ''ہمزاد! کہاں ہے عاصم۔''

''صاحبہ! اسے حاصل کرنا بہت کٹھن
ہے...... میرے بس میں نہیں کہ میں اسے آپ کا بنا کے
لاسکوں...... وہ بہت بڑے مقام پر فائز ہے۔ نور کی
طاقتیں اس کی محافظ ہیں...... اور وہ اسے کبھی بھی، کوئی
بھی گزند پہنچنے نہیں دیں گے...... اس کے ساتھ اس کی
نیک پروین ماں کی دعائیں ہیں صاحبہ......! اور طاغوتی
طلسم میں ان کا کوئی توڑ نہیں...... وہ اٹوٹ ہیں...... پختہ
دیوار کی مانند......''

وہ غیظ و غضب اور غم و دکھ کی کیفیت سے روتے
ہوئے بولی۔ ''اس کی ماں کو ملیا میٹ کردو، جس نے
عاصم کے گرد آہنی دیواریں بنادی ہیں۔'' ہمزاد نفی میں
گردن ہلاتے ہوئے بولا ''صاحبہ! وہ ہستی جس کی
دعائیں ایک انسان کی محافظ ہیں، اس کا بال بھی بیکا نہیں
کیا جاسکتا۔''

''تم ایک نامراد و ناکام لڑکی تھیں اور ابھی بھی تم
ویسے ہی ہو......'' وہ بولا۔

''جاؤ جس جس کے دل میں میرے عاصم کا خیال
ہے...... اسے خیال سمیت زندہ درگور کردو...... جاؤ دفع
ہو جاؤ...... قلع قمع کردو ان سب کا......'' وہ غصے سے
چنگھاڑی۔

ہمزاد نے سرِ تسلیم خم کیا اور وہاں سے غائب ہوگیا۔

☆......☆

لائبہ کے دل پر بھی اسی عاصم کی تصویر سجی ہوئی تھی، جس
کی اک نظر پر فدا ہونے کے انتظار میں سبھی جی رہی تھیں۔

سرِ شام وہ چائے کا مگ تھامے اوپر بالکونی میں
آ ٹھہری تھی...... اور اس وقت ٹیرس پر کہنیاں ٹکائے
حیات کے راہیوں کے سفر کو روکھے انداز میں دیکھ رہی
تھی...... اور چائے کی چھوٹی چھوٹی۔ چسکیاں لے رہی
تھی، اس کے دل کی وادیوں میں دُور تلک عاصم کے نام
کی گونج، گونج رہی تھی...... کہتے ہیں کہ جب دل کا موسم
ویران ہو تو ہر سمت ویرانی ہی نظر آتی ہے...... اس کے بھی
دل کا موسم ویران تھا اور وہ ویرانیوں کے شہر میں پس
پس کر جی رہی تھی۔ اس کے گیسو شمال کی سمت سے آنے
والی سُریلی ہواؤں کے دوش پر لہرا رہے تھے۔

معاً ہی اسے محسوس ہوا کہ اس کے پاس کوئی دوسرا
وجود بھی ہے...... ابھی وہ اسی کشمکش و پیچ میں مبتلا تھی، کہ
ایک اَن ہونی ہوگئی۔ کسی ان دیکھی شئے نے اسے اپنے
دونوں ہاتھوں میں دبوچ لیا۔ چائے کا مگ اس کے
ہاتھوں سے چھوٹ کر دُور فرش پر گرا اور چکنا چور ہوگیا۔

خوف و ڈر کی زیادتی سے اس کی آنکھیں اُبل
پڑیں اور دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔ کوئی ان دیکھی
شئے اسے ٹیرس سے دھکا دینے کی کوشش کررہی تھی......

''کک...... کک...... کون...... ہو...... تم......
چھچھ...... چھوڑو مجھے......'' وہ اپنے گھٹتے دم کو بحال
کرتے ہوئے بولی۔

''ب...... ب...... بچاؤ...... بچاؤ...... کک......
کوئی...... مجھے...... مار......'' وہ چیخی، مگر اسی اثناء میں
اسے اس اَن دیکھی شئے نے باہر روڈ کی طرف اُچھال دیا
تھا...... ''بچاؤ'' کی ایک گونج فضا میں پیدا ہوئی...... اور
وہ ماہی بے آب کی مانند ہاتھ پاؤں چلاتی اوندھے بل
زمین پر گری...... ٹھیک اسی وقت ایک تیز رفتار جیپ آئی
اور اس کے اوپر سے گزر گئی...... ڈرائیور کے قابو پانے
تک اس کی آنتیں سڑک سے چپک چکی تھیں اور ہڈیاں
چٹخ جا چکی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں دنیا بھر کا خوف بھرا
ہوا تھا اور وہ اپنے حلقوں سے باہر اُبل آئی تھیں۔

☆......☆

ہمزاد فروزینہ کے رُوبرو سرخم کیے کھڑا تھا......اور تمام واقعہ اسے سُنا چکا تھا۔

''سب کو کیوں نہیں مارا تم نے؟'' وہ غصّے سے چیخی۔

''میں ایک دن میں ایک ہی انسان کا خون پی سکتا ہوں صاحبہ!'' ہمزاد انکسارانہ انداز میں بولا۔

اسی لمحے فروزینہ کی نگاہ اس کی کمر کے نچلے حصّے پر پڑ گئی جو ہلکا سُرخی مائل ہو چکا تھا، باقی وہ اسی طرح ہیولا نما ہی تھا۔

''تم میرے کسی کام کے نہیں۔'' وہ افسوس کن انداز میں بولی۔

''تو مجھے آزاد کر دیں صاحبہ......!'' ہمزاد عاجزی سے بولا، مگر اس کے جواب میں فروزینہ نے چیخ کر اسے بکواس بند کر دینے کا حکم صادر فرمایا اور خود غصّے سے پھنکارتی ہوئی چلی گئی۔

وقت ایک بے تاج بادشاہ ہے۔ صدیوں سے وہ انسانیت و گھمنڈ رکھنے والوں کو نیست و نابود کرتا آیا ہے۔ فروزینہ بھی اپنی اکھل مزاجی اور انا پرستی کی بناء پر وقت جیسے خاقانِ اعظم سے نبرد آزما ہو چکی تھی۔ ابھی اسے اسی کے در پر شکست کا مزا چکھنا تھا۔ جس سے درپردہ وہ پنجہ آزمائی کر رہی تھی۔ وہ وقت کو تسخیر کرنا چاہتی تھی اور وہ مٹھی میں ریت کی مانند آہستہ آہستہ اس کے ہاتھ سے سرک رہا تھا۔

وہ طاغوتی دائرے میں داخل ہو کر نحوست بھری سوچوں میں گھری ہوئی تھی اور اپنے دائرے کو توسیع دینے کے متعلق سوچ رہی تھی۔ ایسے ہی ایک پَل میں اس کے ذہن میں سعدیہ کا نام کوندا۔ سعدیہ میدانِ عمل میں اس کی سب سے بڑی حریف تھی...... کئی مرتبہ ان دونوں کے درمیان اچھی خاصی بحث اور بعد ازاں تو تو، میں میں بھی ہو چکی تھی......وہ بھی اپنے والدین کی لاڈلی اور نک چڑھی لڑکی تھی اور فروزینہ بھی عین اسی کے مقابلے پر تھی۔ دونوں کا مطلوبِ نگاہ بھی ایک ہی تھا۔ اسی بناء پر وہ دونوں ایک دوسرے کی سخت ترین حریف تھیں۔ ابھی فروزینہ کے پاس اپنے تمام کَس بل نکالنے کا بہترین موقع تھا۔ اس نے سوچا اور مکروہ انداز میں قہقہے لگانے لگی......

☆......☆

سعدیہ کی کار نے کبھی آہستہ روی سے کام نہیں لیا تھا۔ وہ روڈ پر چڑھتی تھی تو پھنکارتی جاتی تھی اور نجانے کتنوں کو سائیڈ کراتے ہوئے اوورٹیک کرتی تھی۔ اس نے ہوش سنبھالا تھا تو اسٹیئرنگ سنبھالنے لگی تھی اور اس ہوش رُبا عمر تک تو اسٹیئرنگ اس کی نگاہوں کے اشارے بھی سمجھنے لگا تھا...... دائیں طرف آنکھیں مٹکائیں تو کار دائیں، بائیں جانب آنکھیں پھیریں تو کار بائیں......اور ایکسی لیٹر پیڈل کے ساتھ تو اس کا دائیں پاؤں کا ہل والا جوتا کھیلتا رہتا تھا۔

سردیاں ہوں یا گرمیاں، اس کی کار کا اندرونی موسم یکساں ہی رہتا تھا۔ انتہائی تیز رفتار ڈرائیونگ کے ہمراہ تیز جھنکار موسیقی کی تال پر اس کا بدن پُرحرکت ہی رہتا تھا۔ آنکھوں پر خوب صورت چشمہ اور سُرخ ہونٹوں کی چیونگم کی وجہ سے دِل کش حرکات دیکھنے والوں کے دل چھین لیتی تھیں۔

اس وقت بھی سعدیہ اپنے مخصوص انداز و اطوار کے مطابق سڑک کو اپنے کروڑ پتی باپ کی وراثت بنائے ہوئے تھی۔ ایسے ہی عالم میں وہ معاً ہی لرز کر رہ گئی...... اس نے میوزک آف کر دیا اور رفتار بھی کچھ ہلکی کر لی...... اُسے محسوس ہوا کہ گاڑی میں اس کے علاوہ بھی کوئی موجود ہے...... اس نے ڈرتے ڈرتے عقب میں نگاہ دوڑائی......کوئی بھی نہیں تھا...... وہ اپنے آپ پر جھنجلا کر رہ گئی...... زندگی میں پہلی دفعہ اسے ڈرائیونگ کرتے ہوئے خوف لاحق ہوا تھا۔

ابھی وہ اس واہمے سے صحیح طرح آزاد بھی نہ ہو پائی تھی کہ معاً اسے کسی نے گردن سے دبوچ کر سیٹ سے اوپر اٹھا لیا، کار بے قابو ہو کر سڑک پر جھولنے لگی...... حیرت اور خوف سے اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر اُبل پڑیں......اَن دیکھی گرفت اس قدر قوی و شہ زور تھی کہ وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو اس سے چھڑا نہیں سکتی تھی۔ اس کے خوف و دہشت سے اُبلے ہوئے دیدوں نے اپنی نورانیت میں جو آخری منظر سمویا تھا...... وہ جھولتی ہوئی کار کا تیز رفتاری سے

ڈالر کی طرف بڑھنا تھا جو کچھ فاصلے پر آگے کھڑا تھا...... معاً ہی ایک زوردار دھماکے کے ساتھ اس کار پیٹرول ٹینکر کے عقب میں گھسی چلی گئی...... خطرناک حد تک زوردار دھماکہ ہوا اور ٹینکر مع کار فضا میں اُڑ گیا...... تاحد نگاہ آتش زار بھڑک اٹھی، جیسے آتش فشاں پھٹ گیا ہو۔

☆......☆

ساری بات سننے کے بعد فروزینہ ایک دلربا انداز میں مسکرائی اور سعدیہ کا نام لے کر تھوک دیا۔

ہمزاد بتدریج مؤدبانہ انداز میں کھڑا تھا، مگر اس دفعہ وہ ہلکا سرخی مائل سینے تک ہو چکا...... اس عجیب و غریب تبدیلی کو فروزینہ نے محسوس تک نہیں کیا تھا۔ وہ مکروہ انداز میں مسکراتی رہی، دفعتاً وہ ٹھہری اور اُٹھ کھڑی ہوئی...... اور نہایت سُرعت سے بولی۔

''ہمیں سادھو سے اس بارے میں دریافت کرنا چاہیے کہ آیا عاصم کے حصول میں حائل دیوار کو کس طرح گرایا جاسکتا ہے۔'' ہمزاد نے بھی اس کی تائید کی اور اس کے ہمراہ چل پڑا۔

راستے میں وہ عاصم کو دیکھ کر ٹھٹھکی اور گاڑی روک دی...... وہ ایک خوبرو دوشیزہ کے ہمراہ بڑھتے ہوئے ساون سے لطف اندوز ہو رہا تھا...... اس کا جی چاہا کہ وہ اسے کچا چبا جائے...... مگر اس وقت وہ مجبور تھی...... ہمزاد آج کے دن کا انسان واصلِ اجل کر چکا تھا۔

وہ عاصم جو کسی کو تکتا بھی نہیں تھا، خود کسی کے روبرو کھڑا ہنس رہا تھا، مسکرا رہا تھا، لطف اٹھا رہا تھا۔

معاً ہی عاصم کی نگاہ اس میم کی گاڑی پر پڑ گئی جو اسے خونخوار نظروں سے گھور رہی تھی۔ اس نے اس خوبرو دوشیزہ کو وہاں کھڑا رہنے کا اشارہ کیا اور اس کی گاڑی کی طرف آ گیا۔ کسی رسمی گفتگو کے بغیر وہ تلخ لہجے میں بولا۔

''فروزینہ اپنے غیر انسانی ہتھکنڈوں سے باز آ جا ورنہ وقت تیری کھال تک نوچ لے گا۔'' عاصم اتنا کہہ کر پلٹ گیا اور اس دوشیزہ کو اپنے ساتھ لے کر وہاں سے چلا گیا۔ وہ اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تھا، لیکن وہ کافی دیر اس کی بات کی گہرائی کو ماپتی رہی، بالآخر کسی نتیجے پر نہ پہنچتے ہوئے وہاں سے پلٹ آئی۔ وہ سادھو کی طرف نہیں گئی تھی، بلکہ وہ اس نئی لڑکی کا قلع قمع سادھو سے ملاقات سے پیش تر نہایت ضروری خیال کرنے لگی تھی۔

ہمزاد نے اسے اس لڑکی کا نام روشین بتایا تھا۔ وہ عاصم کی پڑوسن تھی اور طلاق یافتہ تھی۔ روشین اور عاصم بچپن ہی سے ایک دوسرے کو چاہتے تھے، مگر بدقسمتی سے روشین کے نشئی باپ نے اسے ایک دوسرے نشئی سے بیاہ دیا، جس کا کوئی جوڑ ہی نہیں بنتا تھا۔ وہ ایک پُر اخلاق اور سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ نشئی کے ساتھ زبردستی بیاہی تو گئی تھی، مگر بعد ازاں اس نے اپنے شوہر سے خلع کے لیے عدالت کا سہارا لے لیا۔ اس کا گھر والا نشے میں اپنی زندگی سمیت سب کچھ کنگال کر چکا تھا۔ عدالتی چکروں سے بچنے کے لیے اس نے باآسانی اسے طلاق دے دی۔ وہ طلاق لے کر گھر آئی تو اس کا باپ دورۂ قلب پڑنے سے ہلاک ہو گیا...... اور اس کے بعد اس کی بوڑھی ماں اور اس کا سہارا فقط اور فقط عاصم ہی تھا۔

عاصم روشین کو پسند کرتا تھا، یہ فروزینہ کس طور قبول کر سکتی تھی۔

اگلے روز ہمزاد نے فروزینہ کے کہنے پر اسے بھی لقمۂ اجل بنا دیا۔ اس کی موت کا پروانہ پا کر وہ تادیر جھومتی رہی، مسکراتی رہی، خوشی سے گیت گاتی رہی، مگر اس نے اب بھی ہمزاد کی اس ہلکی سرخی مائل رنگت والے جسم پر توجہ نہ دی تھی، جو مکمل طور پر اس رنگ میں رنگ چکا تھا۔

ہمزاد کے چہرے پر ایک گہرا سکوت و سکون طاری تھا۔ وہ گردن اکڑائے فروزینہ کی بچگانہ حرکات سے محظوظ ہو رہا تھا...... اس کے لبوں پر ایک زہر خند تبسم اُبھرا اور دوسرے ہی لمحے اس نے دونوں ہاتھوں سے فروزینہ کو بالوں سے دبوچ لیا...... وہ خوف و غیظ سے چلائی ''ہمزاد! یہ کیا کر رہے ہو تم......؟ میں تمہیں مار دوں گی۔''

ہمزاد نے اسے بالوں سے پکڑ کر گھمایا اور دور پھینک دیا۔

''کتیا! اب میں تیرا غلام نہیں ہوں۔ اب میں تم سے زیادہ طاقتور ہوں۔ میرے بدن میں تین انسانوں کی طاقت ہے...... اور یہ طاقت مجھے تیرے حکم سے ملی ہے...... مجھے تو انسانی قتل کا حکم ہی نہیں تھا...... یہ حکم تو منہ زوری کی بناء پر ملا تھا...... اور اب اس کا خمیازہ تمہیں بھگتنا

ہوگا تمہیں......فروزینہ صاحبہ......''

ہمزاد غیظ وغضب سے پھنکارا......''میں اس عاصم کو بھی نہیں چھوڑوں گا جس کے لیے مجھے اس قدر عتاب و عذاب سے ہمکنار ہونا پڑا...... میں اب طاقتور ہوگیا ہوں......سب سے زیادہ طاقتور۔''

''فروزینہ خوف و استعجاب کی ملی جلی کیفیت میں مبتلا تھی، دریں اثناء ہمزاد نے اس کی سمت پیش قدمی شروع کردی۔ خوفِ اجل سے وہ باہر کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی، اس نے تیزی سے گیراج میں کھڑی گاڑی میں پناہ لی اور گاڑی سادھو کے ڈیرے کی سمت دوڑا دی۔

کالا کلوٹا سادھو اسی معبد نما کمرے کے اندر چبوترے پر بیٹھا اپنے جاپ میں مشغول تھا۔ وہ چیختی چلاتی، دھاڑتی اندر داخل ہوئی اور سادھو کے پاؤں سے لپٹ کر اپنی زندگی کی بھیک مانگنے لگی۔''میں تیری داسی ہوں، مجھے اس قہر سے بچالے...... میں مرنا نہیں چاہتی...... مجھے بچالے۔''

سادھو نے اسے دونوں بازوؤں میں بھرلیا اور چوم کر کہنے لگا۔

''تُو سادھو کی داسی نہیں اس کے دل کی مالکہ ہے۔ ہمیں پتا تھا کہ یہ سب بھی ہوگا، مگر ہم نے تم کو یہ بتانا ضروری ہی نہیں سمجھا تھا کہ ہمزاد کو انسانی خون مت پلانا۔ تیرا کام بھی خون خرابے سے مستثنیٰ تھا، مگر انسانی جبلت کسی کو سکھی نہیں دیکھ سکتی۔'' وہ مکروہ انداز میں قہقہے لگانے لگا۔

''میرے پاس اس کا حل ہے، مگر میں وہ تجھے ہرگز نہیں بتاؤں گا، کیوں کہ جب تک ہمزاد زندہ رہے گا تو میرے دل کی آرزوؤں کو پورا کرتی رہے گی...... جب وہ مار دیا گیا تو ہوسکتا ہے تو ہمیں مار دے'' سادھو منحوس انداز میں مسکرایا اور اسے مزید بھینچ کر چومنے لگا۔

''نہیں......نہیں...... میں تمہاری غلاظت کو اب کبھی بھی برداشت نہیں کرسکتی۔'' اس نے ایک زوردار تھپڑ سادھو کے منہ پر مارا، اسی وقت ہمزاد وہاں پہنچ گیا تھا...... وہ آگے تو نہیں بڑھ رہا تھا، مگر غیظ وغضب سے پھنکار رہا تھا......

سادھو کے منہ پر تھپڑ پڑا تو وہ بھونچکا سا رہ گیا۔ غصے اور طیش سے اس نے اسے گھما کر پرے پھینک دیا، وہ عین اس مورتی کے سامنے گری جو سب سے بڑی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے قدموں میں ایک تیز دھار والا کلہاڑا پڑا ہوا تھا۔ اس نے بڑی تیزی سے وہ کلہاڑا اٹھایا اور سادھو کی طرف دوڑ پڑی۔

سادھو اس سے بے خبر ہمزاد کو اسے کچا چبا دینے کا حکم دے رہا تھا کہ وہ تیز دھار والا کلہاڑا اس کے سر کو تن سے جدا کرتا چلا گیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں اور اس کا سر عین اس مورتی کے قدموں میں جا گرا جو سب سے بڑی تھی۔ چبوترے پر پڑا اس کا دھڑ پھڑپھڑا رہا تھا۔

ہمزاد نے تیزی سے فروزینہ کو گردن سے دبوچ لیا۔ معبد میں اس کی چیخیں گونج رہی تھیں...... وہ ہمزاد کے ایک ہاتھ میں بری طرح جکڑی ہوئی تھی اور فضا میں معلق ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی۔ اس کا گھٹتا سانس مزید گھٹتا جا رہا تھا، بالآخر وہ ٹھنڈی پڑ گئی۔ نہایت بے دردی سے اسے زمین پر گرانے کے بعد ہمزاد عاصم کے گھر کی سمت چل دیا، مگر یہ اس کی خام خیالی تھی کہ وہ اسے مار دے گا۔ وہ بار بار اس اَن دیکھی دیوار سے ٹکراتا رہا جو اس کی راہ میں آہنی فصیل بن کر حائل کھڑی تھی۔ معاً ہی اس کے جسم میں بجلی سی بھڑک اُٹھی۔ عاصم کے گھر کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا اور عین دروازے کے بیچ اس کی ماں کھڑی تھی اور اس کی جلالی نگاہیں ہمزاد کو جلائے دے رہی تھیں۔ ہمزاد نے اپنے آپ کو بچانے کی بہت کوشش کی، مگر ان نوری نگاہوں سے پھوٹنے والا قہر ہمزاد پر قہر بن کر نازل ہوا تھا۔ وہ بھاگ جانے کا چاہ کر بھی بھاگ نہیں پایا تھا اور پھر وہ وہیں واصلِ جہنم ہوگیا۔

دوسرے محلے کی مسجد میں مؤذن انتہائی چاشنی بھری آواز میں اللہ کی بڑائی اور عظمت بیان کر رہا تھا اور ٹھیک اسی لمحے اس کی ماں نے اپنے بیٹے کو نماز کے لیے اُٹھا دیا تھا، کیوں کہ نماز نیند سے بہتر ہے اور جو نماز کی پابندی کرتے ہیں شیطان ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

☆......☆



الہام...

ندا ہاشمی

کراچی سے، نادیدہ قوتوں سے کوئی بھی فائدہ نہ اٹھاسکنے والی ایک دوشیزہ کی خاص کہانی

الہام ایک ایسی غیبی مدد یا قوت ہے کہ جس پر اگر مکمل بھروسا کیا جائے تو کئی معجزات رونما ہوسکتے ہیں اور کئی جانیں بچائی جاسکتی ہیں، لیکن افسوس کہ یہ قوت بہت ہی کم لوگوں کو بہت ہی خاص حالت میں عطا ہوتی ہے۔



مجھے نہیں معلوم کہ مجھے اس بات پر پُر مسرت ہونا چاہیے یا پھر افسردہ، کیوں کہ میں انہی چند ایک لوگوں میں سے ہوں، جنہیں یہ قوت ودیعت ہوئی ہے۔ ایک بہت ہی لمبے پُر آشوب دور سے گزرنے کے بعد مجھے یہ احساس ہوا ہے کہ کوئی چیز ہے میرے اندر جو بہت ہی قوت والی اور پُر اثر ہے، یہ الہامی قوت ہے۔

میں نہیں جانتی کہ خداوند کریم نے یہ قوت کیوں اور کس مقصد کے لیے مجھے عطا کی ہے؟

اس سلسلے کی شروعات بھی کچھ عجیب انداز میں ہوئی تھی۔ میں چوں کہ سدا سے ہی بدترین حالات کا شکار رہی ہوں، اس لیے غیر شعوری طور پر اپنے بچاؤ کے ہتھکنڈوں سے واقف ہوں۔ ایسا کہتے ہیں کہ ہر وہ شئے جو رونما ہونے والی ہو، وہ ہمارے ہی لاشعور میں محفوظ ہوتی ہے۔

لاشعور ہر ایک کا ہوتا ہے، مگر الہامی قوت رکھنے والے وہ خاص لوگ ہوتے ہیں کہ جن پر عرصۂ دراز سے صعوبتیں پڑنے کی وجہ سے ان کا لاشعور جاگ پڑتا ہے اور پھر معجزات کا ایک سلسلہ سا شروع ہو جاتا ہے۔ ویسے تو خدا کی قدرت ہی ایک بہت عظیم کرشمہ ہے، جس میں کہ ہر شے ممکن ہے۔

بہر حال! اس الہامی قوت کا اندازہ مجھے اس وقت ہی ہو چلا تھا، جب میں صرف 19 برس کی تھی۔ اس وقت ایک انوکھے خواب نے مجھے جھنجوڑا کہ اب میں کوئی بے مقصد اور معمولی شخصیت نہیں رہی، بلکہ مجھے وہ قوت عطا کی جا رہی ہے جس کی حفاظت کی ذمے داری بہت ہی کٹھن اور دشوار گزار ہے اور لوگ اس وقت کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیتے، مگر میں نے بہت عرصے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں اپنی اس قوت کی حفاظت کروں گی۔ جب دل نے ایک نیک مقصد کی ٹھان ہی لی تو اللہ نے مجھے اس کی تکمیل کے راستے بھی دکھانے شروع کر دیے اور وہ راستہ ہے، علم کا، بصیرت کا۔

علم سے مراد صرف کتابیں پڑھنا نہیں ہیں، بلکہ چیزوں کی حقیقت اور ان کی اصلیت پہچاننے کا نام ہے۔

جب تک میرا دل اور گمان دنیاوی بکھیڑوں سے دور اور قدرے صاف گو تھا، تب میری یہ قوت اپنے عروج پر تھی اور پھر ایسا بھی وقت آیا کہ جب مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی دنیاوی معاملات میں حصہ لینا پڑا، مگر آہستہ آہستہ میں نے دین و دنیا میں توازن قائم رکھنا سیکھ لیا، لیکن اب بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے قدرت مجھے از خود ہی دنیا سے دور لے جا رہی ہو اور اب میں نے خدا کی اس رضا کے آگے اپنا سر جھکا دیا ہے۔

اس قوت نے مجھے حالات سے لڑنے اور لوگوں کے لیے ہمدردی کے جذبے کو قائم رکھنے کا حوصلہ دیا ہے۔ الہام کی قوت مجھے خوابوں سے ہی ملی۔ میرے لاشعور نے مجھے مستقبل قریب کے واقعات اور واقعات کی اصلی صورتیں دکھانا شروع کر دیں۔

وہ حادثات جن کی کسی کو بھنک بھی نہ تھی، خود حادثے کا شکار ہونے والے بھی مکمل طور پر بے خبر تھے، وہ سب میرے لاشعور نے میرے سامنے ایک فلم کی طرح پیش کر دیے۔ میرے ذہن نے بار بار اس بات کی گواہی دینا شروع کر دی جو کہ رونما ہونے ہی والا تھا، جیسے میرے قریبی عزیزوں کی ناگہانی اموات اور دیگر حادثات وغیرہ۔

اگر ان اوقات میں، میں اپنے دِل کی گواہی پر بھروسا کرتی اور اللہ تعالیٰ کی عنایت کردہ اس قوت پر ایمان لاتی تو شاید ان لوگوں کی جانیں بچ سکتی تھیں، لیکن یہ سب اتنی جلدی رونما ہوتا ہے کہ مجھے سوچنے اور یقین کرنے کی بھی مہلت نہ ملتی اور میں حیرت زدہ سی اپنے ہی لاشعور کی سچائی کو حقیقی روپ دھارتے ہوئے دیکھتی رہ جاتی، لیکن شاید اللہ تعالیٰ مجھ سے کچھ ریاضت چاہتا تھا کہ میں واقعی اس کی مخلوق کی ہمدرد ہوں بھی یا نہیں، اس کی مخلوق کے لیے میرے دل میں رحم ہے یا پھر یہ صرف میری کمزوری ہے جو مجھے پست کیے دیتی ہے۔

میری زندگی کا وہ پہلا حادثہ جس سے مجھے اپنی اس قوت کا اندازہ ہوا، وہ تھا میری ایک عزیز سہیلی کا بے رحمی سے کیا گیا قتل۔ میں اور میری بچپن کی سہیلی ''سائرہ'' ہم دونوں بہت گہری سہیلیاں تھیں، لیکن وہ اور میں بہت ہی مختلف مزاج کی تھیں اس کے باوجود بھی وہ میرا سایہ بن کر رہتی تھی۔

ایک مرتبہ میں جب ان کے گھر گئی اور اس کی ماں

سے ملنا ہوا۔ اس کی ماں بھی ہمہ وقت مجھے اسی بات کی تاکید کرتی جارہی تھیں کہ میں اسے اپنے ساتھ ہی رکھوں۔ شاید یہی وہ شے تھی کہ جس کے بھروسے وہ اپنی لاڈلی بیٹی کو میرے ساتھ آنے جانے کی اجازت دے دیا کرتی تھیں۔ خیر میں نے ان کی بات کو شاید اتنا سنجیدگی سے نہ لیا اور پھر ایک دن آیا، جب ہم سب نے اسکول کے بچوں کو تفریح کے لیے لے جانے کا پروگرام بنایا۔

تمام لڑکیاں تفریح کا نام سن کر جوش میں آگئیں اور طرح طرح کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ کوئی لڑکی کہتی کہ میں تو اپنے نئے کپڑے پہن کر پکنک پر آؤں گی تو دوسری کہتی کہ میں تو جینز، ٹی شرٹ پہن کر چلوں گی۔ سائرہ بھی پکنک کا سن کر بہت ایکسائٹڈ ہوگئی اور کہنے لگی کہ وہ اپنے ساتھ سب کے لیے چپس اور نمکو لے کر جائے گی اور بھی کئی لڑکیوں نے کچھ نہ کچھ لانے کا وعدہ کیا، مگر ہم سب میں سے کسی ایک کو اندازہ بھی نہ تھا کہ یہ پکنک ہم سب کو ایک بھیانک حادثہ بن کر یاد رہ جانے والی ہے۔ مجھے چوں کہ اپنے گھر والوں کی طرف سے ایسی کسی بھی جگہ جانے کی اجازت نہ تھی، لہٰذا میں نے اپنی ٹیچروں اور دیگر ہم جماعتوں سے معذرت کرلی۔ میری اس بات سے تمام لڑکیاں بہت ناراض بھی ہوئیں اور سائرہ تو جیسے آگ بگولہ ہی ہوگئی تھی، لیکن میں اپنے گھر والوں کے فیصلے کے آگے بے بس تھی۔ پھر سب لڑکیاں اور سائرہ بے دلی سے آخر مان ہی گئیں میرے بغیر ہی پکنک پر جانے کے لیے۔ پھر وہ دن بھی آ ہی گیا۔ جب یہ سب لوگ پکنک پر گئے۔ میں اس پکنک سے قبل ہی اپنی بڑی بہن کے گھر کچھ دن کے لیے رہنے چلی گئی تھی، لہٰذا آخری دن بھی میں سائرہ سے نہ مل سکی، پھر جب کچھ دن بعد میں اسکول گئی تو وہاں کا ماحول کچھ بدلا بدلا سا لگتا تھا۔ ہر شخص خاموش اور کچھ سہما ہوا سا لگتا تھا اور سائرہ تو جیسے کہیں غائب ہی ہوگئی تھی۔ سائرہ کے پاس میرے گھر کا نمبر تو تھا ہی، مگر اس نے مجھے کوئی کال نہیں کی تھی۔ جو مجھے اس کی خیریت معلوم ہوسکتی، پھر اسکول کی چھٹی کے بعد میں سیدھی اس کے گھر چلی گئی، تاکہ اس کے اسکول نہ آنے کی وجہ جان سکوں۔ اس کا گھر اسکول کے نزدیک ہی تھا، مگر جب میں اس کے گھر پہنچی تو وہاں تالا پڑا ملا اور میں زچ ہوکر گھر واپس لوٹ آئی۔

دوسرے دن جب میں نے اپنی دوسری دوستوں سے معلوم کیا تو انہوں نے بتایا کہ سائرہ کا تو انتقال ہوگیا۔ میں یہ سب سن کر حیرت اور صدمے کی ملی جلی کیفیت کا شکار ہوگئی۔ مجھے یہ بات ہضم ہی نہیں ہورہی تھی کہ ایک جیتی جاگتی لڑکی یوں اچانک کیسے مرسکتی تھی، پھر یہ معلوم ہوا کہ جس دن سب لوگ پکنک پر گئے تھے، وہاں کوئی حادثہ ہوا جس میں سائرہ جاں بحق ہوگئی۔ حادثے کی تفصیلات سے مجھے سائرہ کے کزن نے آگاہ کیا کہ اگر پکنک پر ساتھ جانے والی لڑکیاں اور ٹیچرز چاہتیں تو سائرہ کو دریا میں ڈوبنے سے بچاسکتی تھیں، مگر شاید اس موقع پر انہوں نے سائرہ سے زیادہ خود کو بچانا ضروری سمجھا۔

سائرہ کا کزن مجھے اس کے گھر بھی لے کر گیا جہاں اس کی ماں اپنی اکلوتی بیٹی کے غم میں مجسمۂ غم بنی بیٹھی تھی۔ طبیعت میں ویرانی سی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی سائرہ کی امی کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہہ نکلا اور وہ رو رو کر مجھ کو دہائی دیتی رہیں کہ اگر میں اس وقت سائرہ کے ساتھ ہوتی تو یقیناً اسے ڈوبنے سے بچالیتی اور میری سہیلی یوں بے وقت موت کی نذر نہ ہوئی ہوتی۔ سائرہ کی لاش دریا کے کنارے تین دن بعد ملی تھی۔

میں دل برداشتہ سی ہوکر گھر واپس لوٹ تو آئی، مگر ہمیشہ کے لیے دل میں ایک کسک سی رہ گئی کہ اگر میں قدرت کے اشارے پر ایمان لائی ہوتی تو آج میری دوست نہ ماری جاتی۔ اس دن میں پہلی مرتبہ اس حقیقت سے اپنی اس قوت سے آگاہ ہوئی تھی جو خدا نے مجھے بخشی تھی۔ اس حادثے سے پہلے مجھے کئی غیبی اشارے ملے تھے کہ میں یہ حادثہ رونما نہ ہونے دوں، مگر میری ناقص العقلی کی وجہ سے بھی بے سود رہا۔ اس حادثے کے بعد بھی کئی اور حادثات کا سلسلہ جاری رہا اور اب بھی جاری ہے۔ میں اب بھی اپنی طرف سے کوششوں میں لگی ہوئی ہوں کہ اپنے عزیزوں کو مستقبل میں رونما ہونے والے حادثات سے بچاسکوں، لیکن ان میں سے کچھ لوگ یقین کرکے خود کو بچالیتے ہیں اور کچھ......

☆......☆



زندہ لاش

ارم ناز

لاہور سے، پرانے وقتوں کی ایک پُراسرار حکایت، جو سچ ثابت ہوگئی

یہ کہانی میری امی کی دادی نے ان کو سنائی تھی، سو ان کی بیان کردہ ہے۔

یہ اس وقت کا قصہ ہے جب آبادی بھی اتنی زیادہ نہ تھی اور نہ ہی آمد و رفت کے لیے سواری کا انتظام تھا، لوگ زیادہ تر پیدل ہی سفر کیا کرتے تھے چاہے ایسا کرنے میں تین چار گھنٹے پیدل چلنا پڑے۔

ہمارے گاؤں کی ایک لڑکی کی شادی یوں تو گاؤں میں ہی ہوئی لیکن اس کا شوہر رشید پاس والے گاؤں میں زمینوں پر کام کیا کرتا تھا۔ اس لیے وہ سسرال میں رہنے کے بجائے اپنے شوہر کے ساتھ دوسرے گاؤں میں رہنے لگی۔

ایک دن اس کے شوہر کی طبیعت خراب ہوئی اور خدا کی کرنی ایسی ہوئی کہ اس کے گھر والوں کو اطلاع دینے کی نوبت بھی نہ آئی اور وہ اللہ کو پیارا ہوگیا۔ دوپہر کا وقت تھا سو لڑکی کو مجبوراً شوہر کی لاش کو اکیلا چھوڑ کر خود ہی گاؤں اپنے میکے اور سسرال والوں کو بتانے جانا پڑا اور وہ روتی ہوئی وہاں سے چل پڑی، کیوں کہ گاؤں کا فاصلہ پیدل پیدل زمینوں سے تین گھنٹے کا تھا اسی دوران ساتھ والے گاؤں سے اس کے شوہر کا ایک دوست غلام رسول اچانک اس سے ملنے آ گیا۔

غلام رسول نے گھر کے دروازے پر پہنچ کر اُسے آواز دی تو رشید اندر سے بولا کہ ''آ جاؤ اندر ہی آ جاؤ، غلام رسول گھر میں داخل ہوا تو دیکھا کہ رشید چارپائی پر چادر اوڑھے لیٹا ہوا تھا۔ غلام رسول نے پوچھا ''کیا بات ہے تو لیٹا ہے خیریت ہے ناں'' تو رشید بولا کہ ''ہاں بس کچھ طبیعت ٹھیک نہیں۔''

غلام رسول نے پوچھا کہ ''بھابی کہاں ہیں مجھے تو بہت بھوک لگی ہے۔'' رشید کہنے لگا۔ ''وہ گاؤں گئی ہے اپنے اور میرے گھر والوں کو ملنے اور روٹی بنا کر گئی ہے، تم بیٹھو میں تمہیں کھانا دیتا ہوں۔'' اس وقت گھروں میں، کمروں میں دیواروں پر کیلیں گاڑ کر اور ان پر لکڑی کے تختے لگا کر برتن سجائے جاتے تھے۔ کھانے پینے کا سامان بھی بلیوں سے بچانے کے لیے وہاں رکھ دیا جاتا تھا۔ وہ بس اتنے اونچے ہوتے تھے کہ آسانی سے ہاتھ اونچا کر کے اُس پر چیزیں رکھ اور اُتار سکتے تھے۔ غلام رسول کے دیکھتے ہی دیکھتے رشید نے لیٹے لیٹے ہی ہاتھ لمبا کر کے اوپر سے پلیٹیں پکڑ کر اپنے دوست کے سامنے رکھیں، جب غلام رسول نے

یہ سب دیکھا تو اس کے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے اور وہ سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو کچھ گڑبڑ ضرور ہے اور یہاں سے فوراً نکل جانا چاہیے۔

یہ سوچ کر اس نے رشید سے کہا کہ اچھا میں چلتا ہوں، مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے، لیکن اُس آدمی نے کہا کہ سن بیٹھ کر کھانا کھاؤ۔ جب اس نے دیکھا کہ اب تو جان مشکل میں پڑی اور یہ جانے نہیں دے گا تو غلام رسول نے کہا کہ اچھا میں ضروریات سے فارغ ہو کے آتا ہوں، رشید نے کہا کہ ٹھیک ہے تو اپنی پگڑی کا ایک سرا اپنے پاؤں سے

کہ وہ لڑکی اپنے میکے اور سسرال والوں [illegible] آ گئی تھی۔

غلام نے جیسے ہی دیکھا فوراً ان لوگوں کی طرف دوڑ لگا دی اور گاؤں والوں کو سارا قصہ سنایا اور ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا لیکن اُن سب کے حوصلہ دلانے پر چل پڑا۔ جب وہ لوگ گھر کے اندر پہنچے تو دیکھا کہ سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تھا جیسے رشید کی بیوی چھوڑ کر گئی تھی۔ کھانے کے برتن اپنی جگہ سجے ہوئے تھے۔ غلام رسول کی پگڑی چارپائی پر موجود تھی، لیکن...... اس کا ایک سرا رشید کے ہاتھ میں اور رشید کی

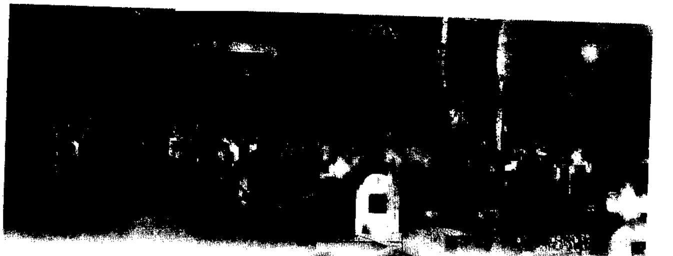


باندھ اور دوسرا میرے ہاتھ میں پکڑا پھر ضروریات سے فارغ ہونے جا، اب تو مجبور اُمرتا کیا نہ کرتا اُس کو ایسا ہی کرنا پڑا۔

جیسے ہی وہ کمرے سے باہر آیا اُس نے پگڑی کا سرا اپنے پاؤں سے کھولا اور باہر کھیتوں کی طرف دوڑ لگا دی۔ کافی فاصلے تک وہ بھاگتا رہا، آخر تھک کر سانس لینے کو ذرا ٹھہرا تو اُسے دور سے رونے دھونے کی آوازیں آنے لگیں کیوں

لاش آدھی چارپائی پر اور آدھی زمین پر لٹکی ہوئی تھی۔ یہ اسرار آج تک نہیں کھلا کہ کیا جب رشید کی بیوی گاؤں جانے کے لیے نکلی تو رشید اس وقت زندہ تھا اور جاں کنی کے عالم میں اس نے چارپائی سے اُترنے کی کوشش کی لیکن موت نے اسے مہلت نہ دی، اگر اس بات کو مان لیا جائے تو پھر سوال یہ ہے کہ غلام رسول کی پگڑی کا سرا رشید کے ہاتھ میں کیسے آیا......

☆......☆



سکھ سنتری

شیخ معظم الٰہی

حیدر آباد سے خدا کی شان عیاں کرتی ایک پُراسرار کتھا

جناب شیخ نقیب الٰہی جو روپڑ (انڈیا) کی اہم شخصیت تھے، وہ رئیس روپڑ اور انجمن حمایت اسلام کے نائب صدر بھی تھے۔ تقسیم ہند کے وقت وہ اپنے گھر میں موجود تھے اور کھانا کھانے کی تیاری کر رہے تھے کہ اچانک گھر کا صدر دروازہ زور زور سے بجا۔ شیخ صاحب فوراً دروازے کی طرف آئے اور پوچھا۔

''باہر کون ہے؟''

تو باہر سے جواب دیا گیا کہ ''ہم گورکھا فوجی ہیں اور آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔'' شیخ صاحب نے دروازہ کھولا تو ان میں سے ایک فوجی نے کہا۔

''شیخ صاحب جتنی جلدی ہو سکے، آپ اپنے تمام اہلِ خانہ اور کچھ ضروری سامان ساتھ لے کر یہ گھر اور محلہ چھوڑ کر کسی محفوظ مقام پر چلے جائیں، کیوں کہ تھوڑی ہی دیر میں ہندو اور سکھ آپ کے محلے پر حملہ کرنے والے ہیں۔ انہوں نے پچھلے علاقوں میں بہت لوٹ مار اور قتل و غارت کی ہے، لہٰذا ہم آپ کو خبردار کرنے آئے ہیں۔'' یہ کہہ گورکھا فوجی وہاں سے چلے گئے۔

شیخ صاحب نے کھانا وہیں پر چھوڑا اور فوراً اپنے تمام اہلِ خانہ کو اکٹھا کیا جو تقریباً سولہ افراد پر مشتمل تھا اور کچھ ضروری سامان ساتھ لیا اور گھر سے باہر نکل گئے۔

کچھ دور جا کر انہیں ایک قافلہ نظر آیا جو پاکستان روانہ ہو رہا تھا، شیخ صاحب بھی اپنے اہلِ خانہ کے ہمراہ اس قافلے سے جا ملے۔ اس قافلے میں کل پانچ ہزار افراد تھے، جن میں بچے، بوڑھے اور عورتیں بھی شامل تھیں۔ یہ قافلہ کئی روز تک پیدل چلتا رہا۔ جگہ جگہ گھروں کو آگ لگائی جا رہی تھی، کہیں خون کی ندیاں بہائی جا رہی تھیں، کہیں نوجوان اور خوب صورت لڑکیوں کو اغوا کیا جا رہا تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ ہندوؤں اور سکھوں نے پکا ارادہ کیا ہوا تھا کہ کوئی بھی قافلہ صحیح سلامت پاکستان پہنچنے نہ پائے۔

شیخ صاحب والا قافلہ ابھی راستے میں ہی تھا کہ سکھوں اور ہندوؤں نے ان کے قافلے پر حملہ کر دیا۔ انہوں نے دل بھر کر مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ عورتوں اور لڑکیوں کو اغوا کیا اور لوٹ مار کرنے کے بعد فرار ہو گئے۔ بچا کھچا قافلہ پھر نئے سرے سے تیار ہوا اور آگے کا سفر طے کرنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک سایہ دار جگہ آئی تو قافلے والوں نے وہیں پر پڑاؤ کرنے کا ارادہ کر لیا۔

☆......☆

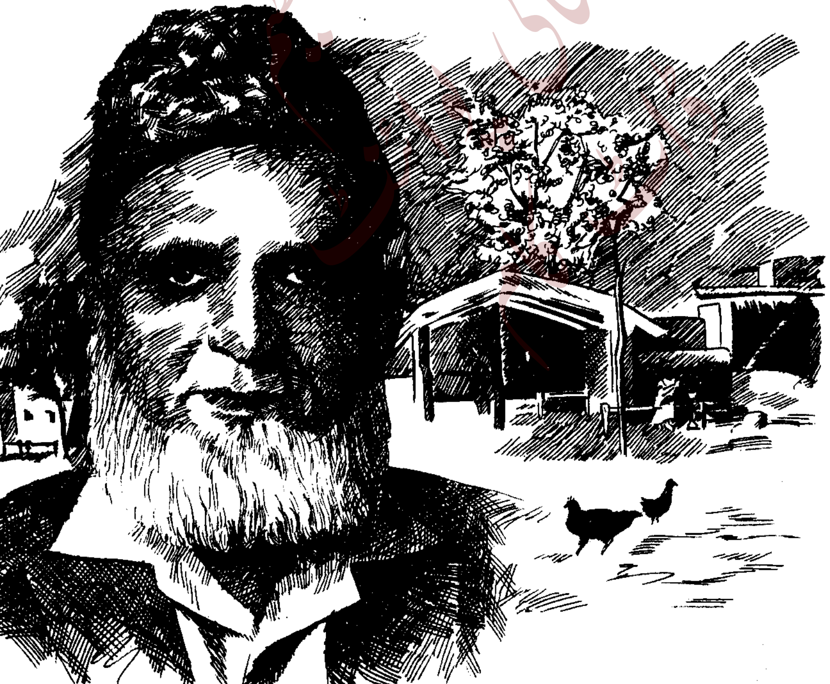
اس قافلے کو پڑاؤ ڈالے ابھی کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ اس علاقے کا تھانیدار پولیس لے کر قافلے تک پہنچا اور انہیں گھیرے میں لے لیا۔ سارے قافلے پر نظر ڈالنے کے بعد اس نے کچھ مسلمانوں کو گرفتار کرلیا۔ گرفتار ہونے والوں میں جناب شیخ نصیب الٰہی بھی شامل تھے۔

تھانیدار نے سب مسلمانوں کو لے جا کر تھانے میں بند کردیا۔ بعد میں سب تھانے والوں نے فیصلہ کیا کہ جیسے ہی رات ہو تو جتنے بھی مسلمانوں کو گرفتار کیا گیا ہے، ان سب کو زہریلا کھانا کھلا کر قتل کردیا جائے اور ان کی لاشوں کو جنگل میں پھینک کر انہیں آگ لگادی جائے۔

جب رات آئی تو تھانے کے انچارج (تھانیدار) نے زہریلا کھانا مسلمان قیدیوں میں تقسیم کیا اور ساتھ یہ بھی کہا کہ کھانا کھاؤ اور صبح تک تم سب پاکستان ضرور پہنچ جاؤ گے، مسـ ویسے بھی کئی دنوں کے بھوکے پیاسے تھے، کھانا دیـ کر وہ اس پر ٹوٹ پڑے، ان میں سے کچھ تو کھانا کھاتے ہی شہید ہوگئے اور کچھ کو تھانے والوں نے خود ہی ہلاک کردیا۔

اس طرح جب یہ کھانا جناب شیخ نصیب الٰہی صاحب کے سامنے لایا گیا تو ان کی بھوک بھی چمک اٹھی، انہوں نے بھی کئی دنوں سے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ وہ نوالہ توڑ کر ابھی منہ میں رکھنے ہی لگے تھے کہ سامنے سلاخوں کے پار کیا دیکھتے ہیں کہ ایک سکھ سنتری ان کو ہاتھ کے اشارے سے کھانا کھانے سے منع کررہا ہے۔ شیخ صاحب نے تین بار نوالہ منہ میں رکھنے کی کوشش کی لیکن سنتری نے تینوں بار انہیں کھانا کھانے سے منع کیا۔ آخر کار انہوں نے نوالہ فوراً ہی واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔

کچھ دیر کے بعد جب تھانے کا سپاہی واپس



برتن لینے آیا تو کھانے کو ویسے کا ویسا پڑا دیکھ کر شیخ
صاحب سے کہنے لگا کہ "کوئی بات نہیں ابھی تھوڑی
ہی دیر بعد صبح ہونے والی ہے، تم صبح ہونے سے پہلے
پاکستان ضرور پہنچ جاؤ گے، تمہارے ساتھ آنے
والے تمام مسلمان پاکستان پہنچا دیے گئے ہیں، یہ کہہ
کر وہ سپاہی برتن اٹھا کر چلا گیا۔

چند منٹ گزرنے کے بعد وہی سکھ سنتری آیا اور
حوالات کا دروازہ کھول کر شیخ صاحب کو ساتھ لے کر
تھانے کے پچھلے دروازے سے نکال کر ان کو اشاروں
سے کہا کہ "یہاں سے جتنا دور تم بھاگ سکتے ہو، بھاگ
جاؤ۔ گرو کی کرپا سے تم بالکل صحیح سلامت اپنے قافلے
تک پہنچ جاؤ گے۔ جاؤ جلدی کرو۔"

اور یوں شیخ صاحب صبح ہونے سے پہلے پہلے
چھپ چھپا کر بغیر کسی تکلیف کے واپس اپنے قافلے
تک آن پہنچے اور اپنے اہل خانہ سے جا ملے۔
راستے میں انہوں نے ان مسلمانوں کی لاشوں کو
آگ سے جلتے دیکھا جو ان ہی کے ساتھ گرفتار
ہوئے تھے۔ اس کے بعد ان کا قافلہ کسی رکاوٹ
کے بغیر پاکستان پہنچ گیا۔

☆......☆

پاکستان بننے کے بعد شیخ صاحب تین بار انڈیا گئے
اور اس جگہ جہاں وہ تھانہ تھا۔ اس سکھ سنتری کے بارے
میں پتا چلانے کی بہت کوشش کی، مگر اس حلیے کا سکھ سنتری
کہیں نہ ملا۔ تھانے والوں کا کہنا تھا کہ پچھلے دس سال
سے آج تک یہاں کبھی بھی کسی سکھ سنتری کی ڈیوٹی نہیں
لگائی گئی۔ نہ جانے وہ کون تھا۔ وہاں کے لوگوں نے بھی
اس حلیے کے سکھ سنتری کو ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی، مگر
تمام سعی بے سود رہی۔

شیخ صاحب کا انتقال یکم مئی بروز منگل 1979
کو ہوا، مگر جب تک وہ زندہ رہے، انہیں معلوم نہ ہو سکا
کہ وہ سکھ سنتری کون تھا؟ اور اس نے ایک مسلمان کی
مدد کیوں کی تھی؟

پتا نہیں وہ انسان تھا یا......؟ کسی نے سچ ہی کہا ہے
کہ "جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے؟"

☆......☆

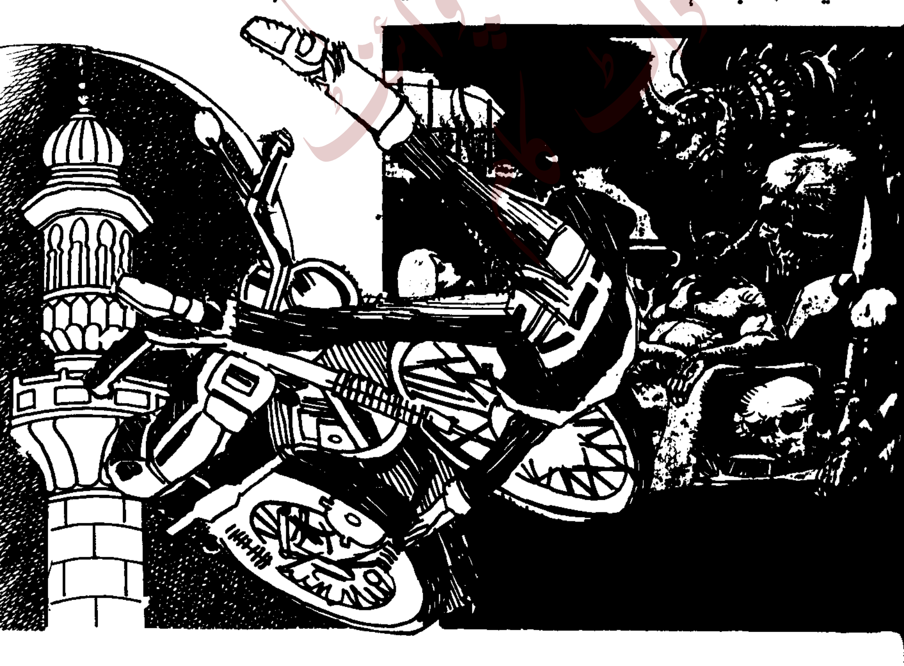


آسیب

صفدر علی حیدری

اُچ شریف، بہاول پور سے، ایک نوجوان کے ساتھ پیش آنے والا انہونا واقعہ

وقت بھی بڑی ظالم شے ہے، کبھی نہیں مرتا۔ گزر کر بھی امر ہو جاتا ہے، جاتے جاتے یادیں بطور یادگار چھوڑ جاتا ہے، جن کے حصار سے نکلنا کارِ دشوار لگتا ہے۔ انسانی زندگی طلسم ہوشربا سے کسی طور کم نہیں۔ انسانی یاداشت کے ذخیروں میں کوئی ایک آدھ یاد ایسی بھی ہوتی ہے جو اسے تادیر سحرزدہ کیے رکھتی



ہے۔آدمی چاہ کر بھی اسے نہ بھلا پاتا ہے، نہ کوئی معقول توجیہ ڈھونڈ پاتا ہے۔میرے بچپن کا یہ واقعہ، جو میں آپ سے شیئر کرنے لگا ہوں، اسی خاصیت کا حامل ہے۔یہ جب جب یاد آتا ہے، خوف کی ایک تیز لہر رگ و پے میں دوڑنے لگتی ہے اور میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔آپ جانتے ہیں کہ اکثر بچوں کو ''بول بستری'' کی بیماری لاحق ہوتی ہے۔میرا شمار بھی انہی بچوں میں ہوتا تھا۔اکثر سوتے میں ایسا ہو جاتا اور مجھے کانوں کان خبر تک نہ ہوتی۔گھر کے بڑے بارہا سمجھاتے کہ سونے سے پہلے واش روم ہو آیا کرو۔جب حاجت محسوس ہو تو اٹھ جایا کرتے ہیں، مگر میرا مسئلہ یہ تھا کہ بچپن کی گہری نیند مجھے اٹھنے ہی نہ دیتی تھی اور ہر روز صبح کے وقت اس حادثے کے سبب مجھے اچھی خاصی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا۔بڑوں کی ڈانٹ ڈپٹ کی تو خیر تھی، لیکن جب میرے بھائی میرا مذاق اڑاتے تو ناقابلِ بیان شرمندگی ہوتی۔ایسے میں دل کرتا تھا کہ میں کہیں ''منہ'' کر جاؤں یا یہ بیماری، لیکن تب یہ دونوں باتیں ناممکن تھیں۔کبھی کبھی یہ بیماری مجھے اچھی بھی لگتی۔ایسا تب ہوتا جب میری نانی جان مجھے ''جن بھوت چمٹ جائیں گے تب تیرے ہوش ٹھکانے آئیں گے'' کہہ کر ڈراتی تھیں۔تب دل سے دعا نکلتی ''اے کاش کل کے چمٹتے آج چمٹ جائیں''۔جنوں بھوتوں کی من گھڑت کہانیاں پڑھ پڑھ کر یہ ''نانے مامے'' مجھے اپنے گھر کے ہی فرد لگتے تھے۔سو ان سے ڈرنے کی بجائے ان سے بھی ایک طرح کا رومان سا ہو چلا تھا۔

ساتویں میں تھا کہ پڑھائی سے جی اچاٹ گیا۔گھر والوں نے بہت سمجھایا مگر میں نے مان کر ہی نہ دیا۔مجبوراً ایک ''ڈاک دار'' کے کلینک بھیج دیا گیا کہ کام وام سیکھ کر جب ''اتائی بھائی'' بن جائے گا تو کسی قریبی دیہات میں اپنا ذاتی ''کلینک'' کھول لے گا اور اپنی زندگی کی گاڑی خود کھینچنے کے قابل ہو جائے گا۔میں پڑھائی سے جان چھوٹ جانے کی خوشی میں پوری دل جمعی سے کلینک پر کام کر رہا تھا۔صبح کلینک کھولنے کی ذمے داری بھی میری ہی تھی۔ڈاکٹر صاحب کے آنے تک میں اپنا کام نمٹا لیا کرتا تھا۔ڈاکٹر صاحب کے پہنچنے پر میں ڈبل روٹی اور لسی سے ناشتا کر لیا کرتا تھا۔ایک دن صبح کے وقت کلینک کھول کر میں اپنے کاموں میں لگا ہوا تھا کہ یکایک میری بائیں کنپٹی پر ایک عجیب طرح کا دباؤ پڑا۔اس سے پہلے کہ میں کچھ سوچتا ایک تیز لہر کی طرح کی نادیدہ ایک گرم گرم چیز (جو مجھے بھاپ کی طرح لگی) کنپٹی کے راستے میری کھوپڑی میں جا گھسی۔بس پھر کیا تھا، مجھے یوں لگا کہ میرے اندر کے سارے نظام کو اس نادیدہ وجود نے اپنے قبضے میں لے لیا ہو۔مجھے واضح طور سے یہ احساس ہوا اب میں وہ پہلے والا آدمی نہیں رہا۔اب میں بظاہر اور صرف باہر سے ''میں'' ہوں لیکن میرے اندر صرف ''وہی'' ہے۔میرا باطن جس نے بڑی صفائی سے ہتھیا لیا تھا۔اس کے اندر گھس جانے سے یہ بھی ہوا کہ مجھے اپنے دماغ پر عجیب طرح کا ایک بوجھ سا محسوس ہوا۔یہ بوجھ اتنا شدید تھا کہ مجھے لگا میرا دماغ کسی بھی لمحے ایک دھماکے سے پھٹ جائے گا۔سر میں اتنا شدید درد اٹھا کہ بتا نہیں سکتا۔میری ٹانگیں لرزنے لگیں اور اپنا بوجھ تک اٹھانا مشکل ہو گیا۔ہوش اڑ چکے تھے، دنیا ومافیہا کی کچھ خبر نہ تھی۔سو قریب پڑی کرسی پر ڈھے سا گیا۔

اس وقت تک کلینک میں کوئی نہیں آیا تھا۔اس تنہائی نے میری تکلیف کی شدت بہت بڑھا دی تھی۔درد کم کرنے کی کئی ایک گولیاں معدے میں اتار لینے کے باوجود کسی پل چین نہ آتا تھا۔خالی پیٹ گولیاں کھانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے شدید ابکائیاں آنے لگیں، پھر ایک دم سے جی الٹ گیا اور الٹیاں شروع ہو گئیں۔منہ سے جھاگ جیسا سفید مواد نکلنے لگا۔میری کرسی کے ارد گرد وہی زہریلا پانی جمع تھا۔نا جانے کتنا وقت گزر گیا۔پھر ڈاکٹر صاحب آ گئے تو انہوں نے گولیاں دینے اور ٹیکہ لگانے کے بعد مجھے آرام کی غرض سے گھر بھجوا دیا۔

گھر آتے ہی مجھے شدید بخار نے آ لیا۔وہ تپ چڑھا کہ الامان۔دس پندرہ دن بستر پر پڑا رہا، ذہنی طور پر غیر حاضر اور بے سدھ۔جانے گھر والوں نے کیسے جان لیا کہ یہ بیماری نہیں ہوائی اثرات ہیں۔پتا نہیں کہاں کہاں سے پانی پڑھوا پڑھوا کر مجھے پلوایا اور مجھ پر برسایا

جاتا رہا۔ جب بھی کبھی مجھے ہوش آتا تو کسی کو خود پر پھونکیں مارتے، پانی برساتے یا پانی پلواتے پاتا۔ اس دوران جب مجھ سے کوئی بات پوچھنے کی کوشش کرتا تو میری آنکھوں سے بے آواز آنسو اس تیزی سے رواں ہوتے کہ مجھے دیکھنے والے کی بھی "خاموش چیخ" نکل جاتی اور وہ روئے بنا نہ رہ پاتا۔ میرے اندر کیا جنگ چھڑی تھی کسی کو کچھ خبر نہ تھی۔ ہوتی بھی کیسے کہ جس پر بیت رہی تھی وہ تو خود بے خبر، بے سدھ، دنیا و مافیہا سے غافل پڑا تھا۔

ان دس پندرہ دنوں میں مجھ پر جو بیتی اس کا خیال آج بھی رگ وپے میں خوف کی تیز لہر دوڑا دیا کرتا ہے۔ اس بدروح نے مجھ پر قبضہ جمانے کے بعد دھونس اور رعب بھی جمانا شروع کر دیا تھا۔ شاید وہ مجھے اس حد تک خوف زدہ کر دینا چاہتا تھا کہ میں اس کے آگے بالکل ہی ڈھیر جاؤں اور دل میں بغاوت کا کبھی خیال تک نہ لاؤں۔ کبھی خود کو سرکش پاتا تو وہ سر میں اس قدر زور زور سے مسلسل مکے برساتا کہ میری کھوپڑی چٹخ جاتی اور دماغ اندر سے پھوڑے کی طرح دکھتا اور کئی کئی دن درد کی بازگشت روح کے دالان میں گونجتی رہتی۔ کبھی اٹھا کر چارپائی سے نیچے کھینچ لیتا اور پھر اتنی پھرتی سے واپس اچھال دیتا کہ میرے جسم کا رواں رواں دیر تک کانپتا رہتا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ اس سارے عمل کے دوران، تماشا بھی میں ہوتا اور تماشائی بھی۔ وہ آ کر مجھے یوں جکڑ لیتا کہ میرا سارا جسم مفلوج ہو جاتا۔ باوجود انتہائی کوشش کے یہ جکڑ بندی دور نہ ہو پاتی۔ وہ جیسے چاہتا میرے ساتھ کھلواڑ کرتا۔ اس کی مار دھاڑ کے خلاف مزاحمت تو رہی ایک طرف، چیخنا تک میرے بس میں نہ رہتا۔ جاگتے ذہن اور بند آنکھوں کے ساتھ اپنے وجود میں برپا قیامت جھیلتا رہتا۔ اس خبیث نے میری شخصیت دہری کر دی تھی۔ اب صرف جسم میرا اپنا تھا لیکن اختیار اس کا۔ رکاوٹ ڈالنے کی بڑی بھاری قیمت ادا کرنا پڑتی۔ رفتہ رفتہ میری مزاحمت سرد ہوتی اور دم توڑتی جا رہی تھی، پھر یہ ہوا کہ دم درود اور جھاڑ پھونک کے زیر اثر میں ہوش کی وادی میں لوٹ آیا، لیکن گھر والوں کی پریشانی بجائے کم ہونے کے اور بڑھ گئی۔ بات بے بات مجھے زاروقطار روتا [illegible] سب کا چین رخصت ہو جاتا۔ اب میرا بخار اتر چکا تھا لیکن وہ بلا بھی تو میرے وجود میں اتر چکی تھی۔ جس سے بچ نکلنے کی ایک ہی صورت تھی کہ میں اپنے وجود سے باہر نکل کر کہیں "منہ" کر جاتا۔ جو ظاہر ہے میرے دائرے اختیار سے باہر تھا۔ اس کے پیدا کردہ غیر توحیدی خیالات نے میری ایمانی دھرتی اجاڑ کر رکھ دی تھی۔

پہلی بار کسی منافق سے میری ملاقات ہوئی جو ہرگز خوش گوار نہ تھی۔ میری زبان کچھ کہتی تھی اور میرے اندر وہ کچھ اور۔ اپنا باطنی اغوا مجھے آٹھ آٹھ آنسو رلاتا تھا۔ بھولے سے کوئی اچھی بات منہ سے نکلتی تو اندر سے وہ خیال پیدا کرتا "بکواس ہے، سب کا سب جھوٹ ہے۔ تم وہ ہو کہاں جو کہہ رہے ہو"۔ میں رو دیتا اور گڑگڑا اپنے رب سے کہتا "اے اللہ تُو خوب جانتا ہے کہ میں وہ نہیں ہوں جو میرے اندر ہے، میں تو وہ ہوں جو میرے من کی گہرائی میں دبا ہے۔ یہ خیالات میرے نہیں اس بہروپیے کے ہیں جس نے مجھے دبا رکھا ہے۔ اے اللہ! ان برے خیالات پر میری گرفت نہ فرمانا۔ میں مسلمان ہوں ایک مومن کا بیٹا ہوں۔"

الفاظ اور آنسو ساتھ ساتھ رواں ہوتے اور میری گھگھی بندھ جاتی۔ ادھر اس کے قہقہے دیر تک میرے اندر گونجتے اور مجھے تلملانے پر مجبور کرتے رہتے۔

"ہاہاہا...... تیری خام خیالی ہے کہ تیری گرفت نہیں ہوگی۔ یہ میرے نہیں تیرے الفاظ ہیں صرف تیرے۔"

اس کی پیدا کردہ سوچیں مجھ پر چھا جایا کرتیں اور میں اس آندھی میں کٹی پتنگ کی طرح اِدھر سے اُدھر ڈولتا رہتا۔ میری بگڑتی حالت کے پیش نظر گھر والوں نے مجھے میری دادی اماں کی طرف بھجوا دیا۔

وہ نماز و قرآن کی پابند ایک پارسا خاتون تھیں (ابھی بھی بقید حیات ہیں)۔ انہوں نے میری حالت دیکھی تو فوراً معاملے کی تہ تک پہنچ گئیں۔

"بیٹا تم مسلمان کی اولاد ہو۔ تمہارا باپ دادا بھی مسلمان ہیں تو کیا ایک "کراڑ" سے ہار مان لو گے؟۔ ایک "مڑیچہ" تمہیں پریشان کر رہا ہے۔ تم اپنے

پیر کو کیوں آواز نہیں دیتے؟

"پیر کو...... کس پیر کو؟"

"تمہارا پیر و مرشد کوئی نہیں ہے کیا؟"

"میرے پیر و مرشد تو مولا علیؓ ہیں۔"

"تو پھر ان کو کبھی آواز دی ہے؟"۔ وہ تو پیروں کے پیر ہیں بیٹا...... جب بھی وہ کراڑ آئے اپنے پیر و مرشد کو آواز دو پھر دیکھو وہ کیسے بھاگتا ہے۔ وسواس سے پریشان مت ہونا۔ ان کا آنا برا نہیں لانا برا ہے"۔ اور مجھے یوں لگا جیسے میری عقل پر پڑے غفلت کے سارے تاریک پردے چاک ہو گئے ہوں۔ میں ایک نیا عزم لے کر اٹھا اور میں نے ہمت کی لنگوٹ کس لی۔

آگے کی کہانی خاصی طویل ہے۔ کم وبیش دس بارہ سال کی تھکا دینے والی ایک جنگ۔ قصہ کوتاہ جب بھی اس کی آمد کے آثار پیدا ہونے لگتے (رونگٹے کھڑے ہونا، جسم پر کسی باریک سی چیز کی مسلسل حرکت وغیرہ ۔۔اور ایسا عموماً سونے اور جاگنے کی درمیانی حالت میں ہوتا، جسے عموماً "اتارا" کہتے ہیں) میں فوراً "علی علی علی" پکارنے لگتا اور پھر کچھ ہی دیر میں میں جکڑ بندی دم توڑتی اور وہ یہ جا وہ جا، لیکن ناپاکی کی حالت میں اس کا داؤ کبھی کبھی چل جایا کرتا۔ میں نے باوضو رہنا شروع کر دیا، لیکن جب جب کوتاہی ہوتی وہ نامراد وار کر جاتا۔ وہ عموماً مجھے پیچھے سے آکر قابو کر لیتا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی کلائیاں کسی بچے کی طرح سے ہیں اور ہاتھ کی انگلیاں دو یا تین، لیکن ہاتھوں میں بلا کی توانائی۔ میرے دونوں ہاتھ تھام لیتا۔ میں اپنے ہاتھ چھڑانے کے لیے کتنا زور بھی لگاتا وہ اس سے زیادہ زور لگا کر میری ہر کوشش ناکام بنا ڈالتا، پھر وہ رفتہ رفتہ کمزور پڑتا گیا۔ جکڑ بندی اب نہیں رہی تھی۔ اس کی بعض حرکتیں اسے "مرد" ثابت کرتی تھیں۔ لیکن اب اس کے قلعے میں شگاف پڑنے لگے تھے۔ میں سالوں اس سے لڑتا رہا۔ دادی اماں نے مسلسل درود شریف پڑھنے کا جو مشورہ دیا تھا اس نے واقعی کام دکھا دیا تھا۔ میرا باطنی وجود اور خیالات پاکیزہ ہوئے جاتے تھے۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ اب وہ اور اس کا جادو دونوں کارگر نہیں رہے۔ اس کی آمد میں وقفہ بڑھتا چلا گیا اور آج کئی سال سے میں نے اس کا خود میں سراغ نہیں پایا۔ یہ کہانی لکھتے ہوئے مجھے اس کی آمد کے کچھ اثرات محسوس ضرور ہوئے اور اب بھی ہو رہے ہیں، لیکن علی علی کے ورد اور درود شریف کی برکت سے اس میں یہ ہمت کہاں کہ میرے قریب آسکے۔ یہ داستان ایک ناول جتنی ضخیم ہے جسے مختصراً لکھ کر میں نے اپنا فرض نبھا دیا ہے۔ اگر کوئی آدمی ایسی ہی کسی مصیبت میں گرفتار ہے تو عاملوں کے پیچھے وقت اور سرمایا برباد کرنے سے بہتر ہے خود "عامل" بن جائے۔ میرے طریقے پر عمل کر کے وہ متاثرہ شخص نارمل حالت میں واپس آسکتا ہے۔ آپ سے کیا پردہ۔ اب بھی میں اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو جان نہیں پاتا کہ وہ "آسیب تھا، سایہ تھا کہ کیا تھا"۔

☆......☆

آتشِ جنوں

سلیم فاروقی

ایک شعلہ صفت نوجوان کی سرگزشت۔ وہ اپنے ملک سے غداروں کا نام ونشان مٹا دینا چاہتا تھا۔ اس معرکے میں اُس نے اپنا سب کچھ ہار دیا لیکن حوصلہ نہیں ہارا

انتقام کے جوالا مکھی میں سب کچھ بھسم کر دینے کا حوصلہ رکھنے والے نوجوان کی رُوداد، 24 ویں کڑی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

تعاقب میں آنے والے کوسٹ گارڈ اہلکاران کی تلاش میں ناکام ہوکر واپس چلے جاتے ہیں۔ عمران تاج بخت کو اپنے ہمراہ گھر لے آتا ہے۔ جان محمد (خبری) عمران کو فون پر اطلاع دیتا ہے کہ مشہدی نے جن کرائے کے قاتلوں کو امریکا سے بلایا ہے، ان میں سے جیک نامی شخص ہوٹل ایئرپورٹ ان میں مقیم ہے۔ عمران ہاشم تیمور اور نادیہ گیٹ اپ بدل کر ہوٹل پہنچ جاتے ہیں۔ مطلوبہ آدمی روم کھول کر جیسے ہی اندر داخل ہونے لگتا ہے، عمران اس کی کمر پر ریوالور رکھ کر اندر چلنے کا کہتا ہے۔ وہ شخص پلٹ کر عمران پر حملہ کر دیتا ہے اور اپنا ریوالور نکال کر عمران کی کنپٹی پر رکھ دیتا ہے اور اس سے پوچھتا ہے کہ تمہارا تعلق کس ایجنسی سے ہے۔ عمران جواب دیتا ہے کہ میرا تعلق جس ایجنسی سے ہے اس کے لوگ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ باتوں کے دوران عمران اندازہ لگاتا ہے کہ اُس آدمی کا تعلق بھارت سے ہے۔ دورانِ مقابلہ وہ شخص عمران کے خنجر کا شکار ہو جاتا ہے اور وہ چاروں واپس گھر آ جاتے ہیں۔ جان محمد عمران کو فون پر بتاتا ہے کہ مشہدی کے ایک اور ساتھی کو قتل کر دیا گیا ہے اور اس سلسلے میں مشہدی بے حد پریشان ہے۔

اخبار میں خبر چھپتی ہے کہ معروف سماجی کارکن اور تاجر عبدالحمید راجپوت کو ہوٹل میں پراسرار طور پر قتل کر دیا گیا ہے۔ عمران اس حقیقت سے واقف ہے کہ قتل ہونے والا دراصل ''را'' کا ایک سفاک اور خونی ایجنٹ ونود تھا، جو گزشتہ بائیس برس سے پاکستان میں مقیم تھا۔ وہ یہ معلومات اخبار کو مہیا کرنا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں ان کے ذہن میں معروف انگلش روزنامے کے چیف ایڈیٹر اور کالم نگار وقارالحسن کا نام آتا ہے۔ عمران انہیں فون کر کے ملاقات کے لیے کہتا ہے اور اپنے ہمراہ ہاشم کو بھی لے جاتا ہے۔ وقار صاحب ونود کا نام سن کر چونک پڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مقتول ایک باشرع مسلمان تھا۔ عمران انہیں کہتا ہے کہ آپ کو اس کی اصلیت پوسٹ مارٹم دیکھ کر معلوم ہو جائے گی۔ ملاقات میں دوران تعارف انکشاف ہوتا ہے کہ عمران وقارالحسن کے دوست احسان کا بیٹا ہے۔ تب عمران انہیں اپنی فیملی پر بیتنے والے تمام حالات سے آگاہ کرتا ہے۔ ایس ایس پی علی ونود کی پوسٹ مارٹم رپورٹ لے کر وقارالحسن کے پاس آتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ راجپوت کے پوسٹ مارٹم کے بعد انکشاف ہوا ہے کہ وہ مسلمان نہیں تھا۔ وقارالحسن عمران

کو بتاتے ہیں کہ وہ مشہدی اور اس کی ملک دشمن سرگرمیوں کے بارے میں جانتے ہیں۔ اس نے پولیس اور بیورو کریسی کے بہت بڑے بڑے افسران کو خرید رکھا ہے۔ عمران کہتا ہے آپ قدوائی صاحب کو جو کہ حیدرآباد میں جلسۂ عام سے خطاب کرنے والے ہیں، کو خطرے سے آگاہ کر دیں۔ انہیں اور ان کی پارٹی کے جنرل سیکریٹری کو ختم کرنے کے لیے مشہدی نے بین الاقوامی دہشت گردوں کی خدمات حاصل کی ہیں۔

وقارالحسن کے دفتر سے واپسی پر انہیں جیک کی مرسڈیز نظر آتی ہے۔ وہ لوگ جیک کی گاڑی کا پیچھا کرتے ہیں جو کہ ایک ہوٹل میں جا کے رُکتی ہے جیک گاڑی سے اُتر کر ہوٹل میں داخل ہوتا ہے اور ریسپشن سے چابی لے کر اپنے روم میں چلا جاتا ہے، عمران اس کا تعاقب کرتا ہوا اس کے روم تک پہنچ جاتا ہے۔ ابھی وہ یہ بات ہاشم کو بتا رہا ہوتا ہے کہ پیچھے سے جیک اس پر ریوالور تان لیتا ہے۔ وہ عمران کو اپنے کمرے میں لے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ تم میرا پیچھا کیوں کر رہے تھے۔ عمران کہتا ہے کہ اسے غلط فہمی ہوئی ہے، مجھے تو اپنے دوست ہاشم کی تلاش ہے۔ دوران گفتگو جیک عمران سے غافل ہوتا ہے تو عمران اس پر حملہ کر دیتا ہے اور اسے بے ہوش کر دیتا ہے۔ دونوں اس بات پر پریشان ہوتے ہیں کہ وہ بے ہوش جیک کو ہوٹل سے باہر کیسے لے کر جایا جائے۔ تھوڑی ہی دیر بعد جیک کو ہوش آ جاتا ہے جیک کی تلاشی کے دوران اس کی پنڈلی کے ساتھ بندھا دو دھاری خنجر اور ریوالور برآمد ہوتا ہے۔ اچانک



دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ عمران دروازہ کھولتا ہے دو آدمی ہاشم کو دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہوتے ہیں، جن کے ہاتھوں میں خوف ناک اور جدید قسم کے جرمن ریوالور تھے۔ ''تم دونوں نے ہلکی سی بھی جنبش کی تو وہ اپنی جان سے جائے گا۔'' ان میں سے ایک غرا کر بولا۔

(اب آپ آگے ملاحظہ کیجیے۔)

آنے والے بھی غیر ملکی ہی تھے، وہ انگلش بول رہے تھے، جس آدمی نے مجھے دھمکی دی تھی وہی پھر غرّا کر بولا۔ ''تم اپنا ریوالور پھینک دو اور زمین پر اوندھے لیٹ جاؤ۔ اس نے مجھ سے کہا، کیوں کہ اس وقت ریوالور میرے ہاتھ میں تھا۔

میں نے سیکنڈ کے ہزارویں حصّے میں فیصلہ کیا اور کمرے ہی میں جلتے ہوئے انرجی سیور کو ایک دم نشانہ بنادیا۔ ہاشم میرے نزدیک ہی تھا، میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے زمین پر لٹایا اور دروازے کی طرف پے در پے دو فائر کردیے۔ فائر کی ہلکی سی ٹھک کی آواز سنائی دی اور کمرے میں ایک اذیت ناک چیخ گونجی۔

میں نے جیک کا بریف کیس اٹھایا اور پیٹ کے بل کھسکتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ ہاشم میرے ساتھ ہی دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

ان میں سے ایک نے روشنی کے لیے لائٹر جلانے کی احمقانہ غلطی کردی۔ میں نے فوراً اس پر فائر کیا اور وہ کرب ناک انداز میں چیختا ہوا دھم سے فرش پر گر گیا۔ ہم دونوں تیزی سے باہر کی طرف لپکے۔ میں نے مایوس ہو کر بیڈ کی طرف دو فائر کیے کہ اب جیک کو زندہ پکڑنا تو ممکن نہیں تھا لیکن مجھے کوئی آواز سنائی نہ دی۔ شاید جیک پہلے ہی بستر سے نیچے لڑھک گیا تھا۔

''اب یہاں سے فوراً نکل چلو۔'' ہاشم نے سرگوشی کی۔ ''ان لوگوں کی مکروہ آوازیں بھی سناٹے میں دور تک گئی ہوں گی، ادھر کوئی بھی آسکتا ہے۔''

میں اور ہاشم دروازے سے باہر نکل چکے تھے، ہم فوراً اُٹھے اور تیزی سے ایک طرف روانہ ہوگئے۔

''ادھر نہیں، اُدھر سے۔'' ہاشم نے کہا۔ ''ہوٹل کا ایمرجنسی ڈور اس طرف ہے۔'' وہ مجھے دوسری سمت لے گیا، وہاں بھی ایک تنگ سا زینہ تھا۔

''یہ زینہ کچن کے پاس اترتا ہے۔'' ہاشم نے کہا۔ ''کچن میں اس وقت کوئی نہیں ہوگا۔''

ہم تیزی سے زینہ اترے لیکن کوشش کی کہ ہمارے قدموں کی آہٹ نہ ہونے پائے، دوسرے ہی لمحے ہم کچن میں تھے۔

مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کچن میں اس وقت بھی ایک آدمی موجود تھا اور وہ ایک چولہے کے سامنے کھڑا کچھ پکا رہا تھا یا میرا اندازہ ہے کہ وہ کافی بنا رہا تھا۔ اس کی پشت ہماری طرف تھی۔

ہاشم نے بہت آہستگی سے کچن کا دروازہ کھولا اور مجھے لے کر باہر نکل گیا۔ اس نے اس آہستگی سے دروازہ دوبارہ بند بھی کردیا۔

اب ہمارے سامنے باؤنڈری وال تھی، ہم ہوٹل کے مین گیٹ سے تو باہر نہیں نکل سکتے تھے، کیوں کہ وہاں سیکورٹی گارڈز ضرور موجود ہوتے۔ کچن ہوٹل کے عقبی حصّے میں تھا، باؤنڈری وال زیادہ اونچی نہیں تھی، میں نے ہاشم سے کہا کہ میرے کندھوں پر کھڑے ہو کر وہاں پر چڑھو، پھر اوپر پہنچ کر مجھے بھی کھینچ لینا۔

جیک کا بریف کیس اب ہاشم کے ہاتھ میں تھا، میں نے بریف کیس اس سے لے لیا اور خود زمین پر بیٹھ کر اسے اپنے کندھوں پر کھڑا ہونے کو کہا۔

وہ دیوار تھام کر بہت آہستگی سے میرے کندھوں پر چڑھ گیا، میں آہستہ آہستہ اُٹھا تو مجھے اپنے بائیں بازو میں شدید تکلیف کا احساس ہوا۔ میرے بازو کا زخم ابھی ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ میں نے ہاشم پر ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں شدید درد میں مبتلا ہوں، دوسرے ہی لمحے ہاشم کا وجود میرے کندھوں سے ہٹ گیا، وہ دیوار پر یوں لیٹا ہوا تھا جیسے لوگ عموماً لڑنے والے گھوڑے کی پشت سے چپک جاتے ہیں، پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر مجھے بھی اوپر کھینچ لیا...... دیوار پر پہنچنے کے بعد ہاشم نے

باہر چھلانگ لگادی، وہ دیوار پر چڑھنے کے بعد اردگرد کا جائزہ لے چکا تھا۔ اس کے پیچھے میں نے زمین پر چھلانگ لگادی، پھر ہم تیزی سے ایک طرف چلے گئے۔

''ہماری گاڑی کہاں ہے؟'' میں نے ہاشم سے پوچھا۔

''ہم گاڑی ہی کی طرف جا رہے ہیں۔'' ہاشم نے اپنی رفتار بڑھادی۔

پانچ منٹ کے بعد ہم گاڑی میں بیٹھے ہوئے جارہے تھے، ہاشم اسٹیئرنگ پر تھا اور گاڑی ہوا سے باتیں کررہی تھی۔

''یار مجھے آج کی ناکامی کا بہت ملال ہے۔'' ہاشم نے کہا۔ ''اس سے تو بہتر تھا کہ ہم پہلے ہی جیک کو گولی ماردیتے۔''

''انسان جس انداز میں سوچتا ہے ویسا ہوتا نہیں ہے۔'' اگر مجھے علم ہوتا کہ تھوڑی ہی دیر بعد بازی پلٹنے والی ہے تو میں جیک کو بہت آسانی سے موت کی نیند سلا سکتا تھا۔''

''اب سانپ نکل جانے کے بعد لکیر پیٹنے سے کیا فائدہ؟'' ہاشم نے کہا۔ ''لیکن اب جیک کو دوبارہ تلاش کرنے میں ہمیں دانتوں پسینا آجائے گا۔''

''وہ بہت گھاگ ایجنٹ ہے اور مشہدی نے اسے خاص طور پر بلایا ہے تو کچھ سوچ کر ہی بلایا ہوگا، وہ اتنی آسانی سے ہمارے ہاتھ نہیں آئے گا، آرنلڈ تو بے خبری میں مارا گیا۔'' ہاشم نے کہا۔

''ہم نے جب ایک دفعہ ڈھونڈ لیا تو دوبارہ بھی ڈھونڈ سکتے ہیں'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''بس ابھی اس کی زندگی باقی تھی۔''

''بہ ہر حال مجھے اس ناکامی کا ہمیشہ قلق رہے گا۔ اب نہ جانے ہمیں جیک اور دوسرے لوگوں کو تلاش کرنے میں کتنے



پاپڑ بیلنا پڑیں گے۔"
"اس طرح تو ہوتا ہے، اس طرح کے کاموں میں۔" میں نے ہاشم کی جھنجلاہٹ کو کم کرنے کے لیے کہا۔
ہاشم چند لمحے خاموش رہا، پھر بولا۔ "لیکن یار! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ جیک کے ساتھی اچانک کہاں سے نازل ہو گئے؟"
میرا خیال ہے کہ وہ لوگ جیک کی نگرانی کر رہے تھے اور اس کی حفاظت کے خیال سے اس ہوٹل میں مقیم تھے۔
"میرا خیال ہے کہ وہ دونوں جہنم رسید ہو چکے ہوں گے۔" ہاشم نے کہا۔
"دونوں کے بارے میں تو میں نہیں کہہ سکتا۔" میں نے کہا۔ "ان میں سے ایک احمق نے لائٹر جلا کر روشنی کرنے کی حماقت کی تھی، اس کی تو موت نے اسے آواز دی تھی۔
اس دوران میں، ہم گھر پہنچ چکے تھے۔
ہاشم نے سارے راستے یہ دھیان رکھا تھا کہ کوئی ہمارے تعاقب میں نہ ہو۔
میں نے گھڑی دیکھی وہ ساڑھے تین بجا رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ نادیہ اس وقت جاگ رہی ہو گی اور پیچ و تاب کھا رہی ہو گی، میں نے اپنا سیل فون بھی اس وقت آف کر دیا تھا جب میں جیک کے پیچھے چلتے ہوئے اوپر پہنچا تھا اور تیمور کو کال کی تھی، اس کے بعد میں نے اپنا سیل فون آف کر دیا تھا۔
نادیہ کے ساتھ تاج بخت کو بھی بیدار دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔
نادیہ نے منہ پھلا کر کہا۔ "کم سے کم بتا کر تو جایا کرو کہ کہاں جا رہے ہو؟"
"ہم لوگ تو وقار الحسن صاحب سے ملنے گئے تھے، اسی وقت تیمور ڈرائنگ روم میں داخل ہوا، وہ بھی مجھے بہت تھکا تھکا سا لگ رہا تھا، اس کا حلیہ یہ بتا رہا تھا کہ وہ بھی اب تک ہمارے انتظار میں جاگ رہا ہے۔
"عمران بھائی! کم سے کم ہم میں سے کسی کو ایک کال ہی کر دیتے کہ ہم آج دو بجے تک گھر آئیں گے، ہم بھی مطمئن ہو جاتے۔"
"تمہارے خیال میں ہم گھومنے گئے تھے، شکر کرو کہ ہم دونوں تمہیں زندہ نظر آ رہے ہیں۔" ہاشم نے کہا۔
"ایسا کیا ہو گیا عمران بھائی؟" تیمور نے پوچھا۔
میں نے اسے تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔
وہ حیرت اور شرمندگی سے ہمیں دیکھ رہا تھا، پھر وہ بولا۔ "آئی ایم سوری عمران بھائی! میں نے آپ پر فضول میں غصہ کیا۔"
"اچھا، اب یہ فارملٹیز بھی چلیں گی؟" میں نے کہا، پھر میں نادیہ سے مخاطب ہوا۔ "یار، کچھ کھانے کو تو دے دو، ہم نے تو وقار انکل کے ساتھ ہلکا پھلکا ڈنر کیا تھا۔ اس بھاگ دوڑ میں وہ بھی کب کا ہضم ہو چکا ہے۔"
"میں ابھی کھانا لگاتی ہوں۔" نادیہ کے بجائے تاج بخت نے کہا اور اٹھ کر کچن کی طرف چلی گئی۔
"نادیہ!" میں نے کہا۔ "تاج بخت سے کہو کہ زیادہ اہتمام کی ضرورت نہیں ہے، اس وقت ہم صرف سینڈوچز اور کافی لیں گے۔"
"بھئی، آپ لوگوں نے ڈنر کیا تھا لیکن ہم تو بھوکے ہیں۔" تیمور نے کہا۔ "ہم تو آپ کے انتظار میں تھے کہ آپ آئیں گے تو کھانا کھائیں گے، پھر وقت گزارا کر لیا لیکن آپ تو جیک کے چکر میں پھنسے ہوئے تھے۔
ہم نے ہلکا پھلکا کھانا کھایا، تیمور، نادیہ اور تاج بخت واقعی بھوکے تھے، ان لوگوں نے خوب ڈٹ کر کھانا کھایا، پھر تاج بخت سونے کے لیے چلی گئی، نادیہ ابھی ہمارے ساتھ بیٹھنا چاہتی تھی لیکن میں نے اسے بھی زبردستی سونے کے لیے بھیج دیا، وہ بھی تھکن سے چُور ہو رہی تھی۔ تیمور البتہ اب بھی ہمارے ساتھ بیٹھا تھا اور اب خاصا چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔

ہمیں پا نہیں سکیں۔
اس نے کہا ''عمران بھائی! آپ نے ایک گولڈن چانس مِس کر دیا۔ اب ہم جیک کی گرد کو بھی نہیں پا سکیں۔''
''یار، وہ کوئی چھلاوا نہیں ہے ہماری طرح گوشت پوست کا انسان ہے، میری بھرپور لاتوں سے وہ بھی بے ہوش ہو گیا تھا، اسے میں گولی مارتا تو وہ مر بھی جاتا، اب چھوڑو اس قصّے کو، آئندہ کے لیے سوچو کہ کیا کرنا ہے؟''
''کل تم وقار صاحب سے ملو اور کوشش کرو کہ وہ قدوائی صاحب کو جلسہ کرنے سے روکیں۔''
''قدوائی صاحب اب نہیں مانیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''اس جلسے کی گزشتہ پندرہ دن سے پبلسٹی ہو رہی ہے، لوگ ان کو سننے کے لیے بے چین ہیں، وہ بااصول انسان ہیں، وعدے کے مطابق جلسے سے خطاب ضرور کریں گے۔''
''پھر وقار صاحب سے کہو کہ پولیس اور رینجرز کے ذریعے ان کی حفاظت کا فول پروف انتظام کرائیں، میرا خیال ہے کہ اور وزیرِ داخلہ ان کی بات نہیں ٹال سکتے۔''
''یار، کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔'' میں نے کہا۔ ''میں کل پھر وقار انکل سے ملتا ہوں۔''
''ان سے کہو کہ وہ اگر قدوائی صاحب کو جلسہ کرنے سے روک نہیں سکتے تو کم سے کم ان کی سیکورٹی کے لیے ایس ایس پی علی کی ڈیوٹی وہاں لگا دیں۔''
''علی کراچی میں ہے اور جلسۂ عام حیدرآباد میں ہو رہا ہے۔'' تیمور نے کہا۔
''وقار انکل چاہیں تو اس کی ڈیوٹی حیدرآباد میں لگوا سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اس مسئلے پر اب کل بات کریں گے، کیوں کہ اب مجھ میں مزید سوچنے اور غور کرنے کی انرجی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ حقیقت یہ تھی کہ مجھے اس وقت شدید نیند آ رہی تھی، ہاشم کی پلکیں بھی بوجھل ہو رہی تھیں، تیمور خود بھی تھکا ہوا تھا اس لیے ہم لوگ اُٹھ کر اپنے کمروں میں چلے گئے۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد میں بھی بستر پر گر گیا اور لیٹتے ہی مجھے نیند آ گئی۔

☆......☆

دوسرے دن میں اور ہاشم ایک مرتبہ پھر وقار انکل سے ملنے جا رہے تھے۔ ہم آفس پہنچے تو وقار انکل نے ہمیں فوراً ہی بلوا لیا۔
میں نے انہیں جیک کے بارے میں بتایا تو وہ بھی فکرمند ہو گئے، پھر وہ مسکرا کر بولے۔ ''یار عمران، تمہارا باپ تو ایسا نہیں تھا۔ وہ غصّے کا تیز ضرور تھا، لیکن تم تو اس کے مقابلے میں چلتا پھرتا بم ہو، ویسے مجھے خوشی ہے کہ تم نے حالات سے لڑنا سیکھ لیا ہے۔ ہاں، بات کچھ ادھوری رہ گئی تھی، تم اپنی فیملی کی ٹریجڈی کے بارے میں بتا رہے تھے۔''
میں نے انہیں مختصراً بتایا کہ کیسے ہم لوگوں کی دشمنی مشہدی سے ہوئی اور کیسے میں ارسلان کو ایک عرصے تک مردہ سمجھتا رہا۔
''تو کیا وہ زندہ ہے؟'' انکل نے حیرت سے پوچھا۔
''جی ہاں، وہ زندہ ہے لیکن مجھے تو اس وقت یقین آئے گا جب وہ میرے پاس ہوگا۔''
''تو آج کل وہ کہاں ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔
''اسے ''را'' والوں نے گرفتار کیا تھا اور آج کل وہ دہلی کی تارا جیل میں ہے، لیکن اس خبر کی تصدیق نہیں ہو پائی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''انکل! اس موضوع پر تو بعد میں بات کریں گے، پہلے آپ قدوائی صاحب کے لیے کچھ کریں؟''
''وہ تو میں نے صبح ہی کر دیا ہے۔'' انکل مسکرا کر بولے۔ ''قدوائی اب جلسۂ عام سے خطاب نہیں کرے گا۔ اسے آج دل کا شدید دورہ پڑا ہے اور وہ کارڈیو میں ایڈمٹ ہے۔'' وہ مسکرا کر بولے۔ ''میں نے علی کے ذریعے اس کی حفاظت کا فول پروف انتظام کر دیا ہے، بس تھوڑی دیر میں یہ خبر ٹی وی کا ہر چینل بریکنگ نیوز بنا کر نشر کرے گا۔''
''انکل! میں مان گیا، آپ واقعی ہر قسم کی صورتِ حال کو ہینڈل کر سکتے ہیں۔''
''قدوائی کو میں نے کس مشکل سے دل کا دورہ پڑنے کا ڈراما کرنے پر راضی کیا ہے یہ میں ہی جانتا ہوں۔''
''انکل۔ آپ بھی تو ''را'' کی قید میں رہے ہیں، آپ مجھے وہاں کے بارے میں ایک ایک بات تفصیل سے بتائیں۔

''تفصیل کا تو وقت نہیں ہے، کل علامہ اقبال ڈے کی چھٹی ہے، تم کل گھر آ جاؤ میں تمہیں تفصیل سے سب کچھ بتادوں گا۔''

☆......☆

میں، نادیہ، تیمور اور ہاشم وقار صاحب کے لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ ان کی بیگم بھی ہمارے ساتھ بیٹھی تھیں اور انجوائے کر رہی تھیں۔

میں نے کہا ''انکل! آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آپ انڈیا جانے اور ''را'' کی قید میں رہنے کے واقعات پوری تفصیل سے مجھے بتائیں گے۔ آج تو آپ کے پاس وقت ہی وقت ہے۔''

''انکل پلیز!'' نادیہ نے کہا۔ ''میں بھی انڈیا کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔''

''بیٹا! اب تو بھی اپنے شوہر کی سفارش کر رہی ہے تو مجھے بتانا ہی پڑے گا۔''

''ارے ارے!'' ان کی بیگم درشت لہجے میں بولیں۔ ''نادیہ ابھی صرف عمران کی منگیتر ہے۔''

''تو کیا ہوا؟'' انکل نے کہا۔ ''ایک ہی بات ہے۔'' اس پر نادیہ کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔

انکل وقار نے جلدی سے موضوع بدلا اور بولے۔ ''یہ ان دنوں کی بات جب یونیورسٹی سے فارغ ہو کر میں نے ایک اخبار میں جاب کر لی اور میرے کالم لوگ بہت شوق سے پڑھتے تھے، بھارت تک میری شہرت تھی، ان ہی دنوں میں نے بھارت جانے کا پروگرام بنایا۔ اصل میں اس کی دو وجہ تھیں، ایک تو میں بھارت کے صحافیوں سے ملنا چاہتا تھا جن سے اکثر ٹیلی فون پر بات ہوتی رہتی تھی، دوسرے میں اپنے چچا جان اور ان کی فیملی سے ملنا چاہتا تھا، چچا جان اور ان کی فیملی دہلی میں ہی مقیم تھی۔ ان دنوں بہت شدید سردی پڑ رہی تھی، میں نے آفس سے پندرہ دن کی چھٹی لی اور انڈیا روانہ ہو گیا۔''

''یہ کب کی بات ہے انکل؟'' نادیہ نے پوچھا۔

''بیٹا یہ اب سے لگ بھگ اٹھارہ سال پہلے کی بات ہے۔ میں دہلی پہنچا تو چچا جان مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے، وہاں میں نے کئی صحافیوں کو ٹیلی فون پر اپنی آمد کی اطلاع بھی دے دی تھی، وہ لوگ بھی مجھ سے ملنے کے مشاق تھے کیوں کہ وہاں بھی میرے کالم بہت شوق سے پڑھے جاتے تھے۔

وہاں پہنچ کر میں صحافیوں سے ملاقاتوں میں مصروف ہو گیا۔ میرا کزن ناصر ہر وقت میرے ساتھ رہتا تھا، اس نے بھی میری وجہ سے پندرہ دن کی چھٹی لے لی تھی، ایک دن اچانک مجھے تاج محل دیکھنے کا شوق چڑھا، حالاں کہ میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ چند ہفتے بعد مجھے پاکستان کے لیے روانہ ہونا تھا۔ اس سے پہلے دہلی، کانپور، امروہہ اور بدایوں میں اپنے رشتے داروں سے ملنا تھا۔

میرے دور ونزدیک کے بہت سے رشتے دار یوپی کے مختلف شہروں میں تھے۔ میں جرنلسٹ کے ویزے پر سفر کر رہا تھا اس لیے مجھے آٹھ شہروں کا ویزا مل گیا تھا۔ میں پاکستان کے ایک کثیر الاشاعت روزنامے کا چیف کرائم رپورٹر اور پولیٹیکل انویسٹی گیٹر تھا۔

میں دہلی میں مختلف اخبار نویسوں اور ایڈیٹرز سے مل چکا تھا۔ ایک دن میں اور ناصر دہلی کے پریس کلب سے واپس آ رہے تھے کہ ناصر نے اچانک کہا۔ ''یار وقار! تم نے آگرہ جانے کا پروگرام اب تک نہیں بنایا۔ حالاں کہ انڈیا آ کر آگرہ دیکھے بغیر جانا ایسا ہی ہے، جیسے کنویں کے پاس آ کر پیاسا لوٹ جانا۔'' ناصر میرا سگا عم زاد تھا، واحد چچا نے پاکستان آنا پسند نہیں کیا۔ میرے ایک ماموں کانپور میں تھے، دو امروہہ میں تھے، لیکن وہ امی کے ماموں زاد تھے، ایک سگی خالہ بدایوں میں تھیں۔

''یار، بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے بھی آگرہ دیکھنے کا بہت شوق ہے لیکن ابھی دو دن تو صحافیوں کی دو تنظیموں کی طرف سے ڈنر ہے، پھر ایک دو دن میں چچا جان کے ساتھ بھی گزارنا چاہتا ہوں، ان سے تو ابھی ڈھنگ

میری ملاقات بھی نہیں ہوئی ہے، پھر کانپور، امروہہ اور بدایوں میں بھی ایک ایک دن تو لگے گا۔"
"یار اس کا ایک طریقہ ہے۔" ناصر نے کہا۔ "تم امروہہ جانے کا پروگرام کینسل کر دو، وہ لوگ یہاں رہتے ہوئے اسے تو ملنے آتے نہیں ہیں، تمہاری انہیں کیا پروا ہوگی۔"
"لیکن یار، امی نے کہا تھا کہ امروہہ ضرور جانا، انہوں نے دونوں ماموؤں کے لیے کچھ چیزیں بھی بھجوائی تھیں۔"
"وہ چیزیں میں پہنچا دوں گا۔" ناصر نے کہا۔ "کہہ دوں گا کہ وقار کے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ وہ یہاں آ سکتا۔ آئندہ سال ضرور یہاں آئے گا۔ ویسے بھی تم اگلے سال میری شادی میں شرکت کرنے تو آؤ گے نا؟"
"یار، میں اس کا وعدہ ابھی نہیں کر سکتا۔" میں نے صاف گوئی سے کہا۔ "تم تو ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازمت کرتے ہو، صبح جاتے اور شام کو گھر واپس آ جاتے ہو، لیکن ہماری زندگی بہت زیادہ مصروف ہوتی ہے۔"
"بس بس!" ناصر نے مجھے ٹوک دیا۔ "اب مجھ پہ اپنی صحافت کا زیادہ رعب مت ڈالو، میں پہلے ہی تم سے بہت مرعوب ہو چکا ہوں۔"
"یار، میں رعب نہیں ڈال رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تمہیں شاید یقین نہ آئے کہ میں کراچی میں بھی کئی قریبی عزیزوں کی شادیوں میں شرکت نہیں کر سکا۔"
"یار، تو پھر تمہاری شادی میں کون آئے گا؟" ناصر نے کہا۔ "تم بھی تو چھ مہینے بعد شادی کرنے والے ہو۔"
"تم تو آؤ گے نا؟" میں نے ہنس کر کہا۔
"ہاں ایک شرط پر" اس نے کہا۔ "اگر تم میری شادی میں آنے کا وعدہ کرو تو میں بھی آؤں گا۔"
"اچھا یار! جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔"
یہ ہی باتیں کرتے ہوئے ہم گھر پہنچ گئے۔
چچا جان ہمارے انتظار میں ہی بیٹھے تھے، انہوں نے خفگی سے کہا۔ "میاں صاحب زادے! آپ اگر سرکاری دورے پر یہاں آئے تھے تو میرے گھر ٹھہرنے کی بھی کیا ضرورت تھی، ناحق اتنی زحمت اٹھائی، ٹھاٹ سے کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہرتے، تقریبات میں شرکت کرتے اور واپس چلے جاتے۔ ہاں، رسمی طور پر ایک چکر ہمارے گھر کا بھی لگا لیتے، صرف اپنی شان دکھانے کو۔"
"چچا جان! میں ہرگز سرکاری دورے پر نہیں آیا ہوں، بس مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ یہاں کے دو تین صحافیوں سے ملاقات کر لی، بس اس کے بعد سے مجھے ان لوگوں نے ہائی جیک کر لیا۔ اب بھی کل کا دن اور ہے پھر میں سارا وقت آپ ہی کے ساتھ گزاروں گا۔"
"میاں، بہت احسان ہوگا تمہارا!" چچا جان نے ناراضی سے کہا۔ میں نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور کہا۔ "چچا جان! یقین مانیں، میں صرف اور صرف آپ لوگوں سے ملنے یہاں آیا ہوں۔"
چچا جان نے ہنستے ہوئے مجھے گلے لگا لیا اور بولے۔ "تیری ساری عادتیں بھائی جان والی ہیں، وہ بھی مجھے اس طرح منایا کرتے تھے، بس کل کے بعد تم سارا وقت گھر میں گزارو گے۔" انہوں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔
ان کی آواز سن کر چچی جان اور فرحانہ بھی اپنے کمرے سے نکل آئیں، چچی جان نے کہا۔ "بچہ کچھ دنوں کے لیے تو آیا ہے۔ آپ اس پر بھی غصہ کرنے لگے؟" فرحانہ ہنس کر بولی۔ "ابو ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں، وکی بھائی ہم سے ملنے کب آئے ہیں، یہ تو صرف رات کو یہاں ہوتے ہیں، صبح ہوتے ہی گھر سے نکل جاتے ہیں اور پھر رات گئے ان کی واپسی ہوتی ہے۔"
"ابھی تک تمہاری بچپن کی یہ عادت گئی نہیں بی جمالو؟" میں نے فرحانہ کو چھیڑا۔
"بی جمالو ہوں گے آپ!" وہ برا مان کر بولی۔
"اچھا اب تم بھی لڑنا شروع مت کر دینا۔" چچی جان نے ہنس کر کہا۔ "گھر آئے مہمان سے لڑتے نہیں ہیں بیٹا۔"

پھر وہ مجھ سے بولیں۔ ''تم ہاتھ منہ دھو کر آؤ، میں تمہارے لیے کھانا لگاتی ہوں۔''
''کھانا!'' فرحانہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''یہ تو کھانا کھا کر آئے ہوں گے، جب سے یہ آئے ہیں، یہی ہو رہا ہے آپ فضول میں ان کے لیے کھانا بناتی ہیں، اتنی محنت کرتی ہیں۔ کبھی کوفتے، کبھی کباب، کبھی پلاؤ، کبھی نہاری۔''
''تم کیا سمجھتی ہو، چچی جان کی محنت اکارت جاتی ہے، بھئی، صبح ناشتے میں وہ مجھے ہر چیز کھلاتی ہیں۔''
''یہ تو اسی طرح بولتی رہے گی، تم جاؤ آرام کرو۔''
میں ناصر کے ساتھ اپنے کمرے میں آ گیا، چچا جان کالج میں پروفیسر تھے اور ایک سال بعد ریٹائر ہونے والے تھے۔ وہ بھی مجھے اپنے دوستوں سے ملانا چاہتے تھے، بس انہیں اسی بات کا غصہ تھا کہ میں انہیں وقت نہیں دے پا رہا تھا۔
میں اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا، ناصر بھی وہیں آ گیا، چچی جان نے میرے لیے علیحدہ کمرے کا انتظام کر دیا تھا لیکن ناصر اپنا کمرہ چھوڑ کر میرے ساتھ سوتا تھا، اس سے پہلے بھی میں ایک دفعہ انڈیا آ چکا تھا لیکن اس وقت میں اور ناصر دونوں کالج کے طالب علم تھے، پاپا اور امی ساتھ تھے، ان دنوں میں سارا وقت چچا جان، ناصر اور فرحانہ کے ساتھ گزارتا تھا، اس وقت ناصر سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی ورنہ ہم لوگ اس وقت تک ایک دوسرے کو صرف غائبانہ طور پر جانتے تھے۔ وہ ملاقات گہری دوستی میں تبدیل ہو گئی، پھر چچا جان اس دوران میں دو دفعہ پاکستان آئے تو ہم دونوں کی دوستی مزید گہری ہو گئی۔
میں بیڈ پر لیٹا ہی تھا کہ ناصر نے کہا۔ ''یار وقار......''
''یار اب اس حسینہ عالم کا قصہ مت شروع کر دینا جس کے ساتھ تمہاری شادی ہونے والی ہے۔''
''ویسے میں یہ کہہ رہا تھا کہ تم آگرہ کب چلو گے؟'' ناصر نے کہا۔
''یار، ابھی تو آگرہ جانے کا نام بھی مت لو۔'' میں نے کہا۔ ''ایک دو دن چچا جان کے ساتھ گزاروں گا، پھر ان سے پوچھ کر آگرہ کا چکر لگا لیں گے۔''
''ہاں میں نے امروہہ جانے کا پروگرام ملتوی کر دیا ہے۔''
''وہ تو خیر کرنا ہی تھا۔'' ناصر نے کہا، پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''یار! تم اپنا ویزا کچھ بڑھوا نہیں سکتے؟'' یہاں اتنے معروف صحافیوں سے تمہارے تعلقات ہیں، ان کے تو صرف ایک ٹیلی فون پر تمہارا ویزا بڑھ جائے گا۔''
''یار! مسئلہ ویزے کا نہیں ہے بلکہ میری چھٹیوں کا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے پندرہ دن کی یہ چھٹی بھی کتنی مشکل سے ملی ہے، یہ میں ہی جانتا ہوں۔''
''ارے یار تو کیا کچھ دن مزید چھٹی کرنے پر تمہیں ملازمت سے جواب مل جائے گا۔''
''ایسا تو نہیں ہوگا لیکن میں نے اپنے ایڈیٹر سے صرف پندرہ دن کی چھٹی لی ہے، میں وعدہ خلافی نہیں کرنا چاہتا۔ ہاں اگر میں سرکاری دورے پر یہاں آتا تو اپنی چھٹی بھی بڑھوا سکتا تھا لیکن پھر تم لوگوں سے ملاقات اس طرح ہوتی جیسے چچا جان کہہ رہے تھے۔'' پھر میں ہنس کر بولا۔ ''چھوڑو اس بات کو تم مریم کے بارے کچھ بتا رہے تھے؟''
مریم اس کی منگیتر کا نام تھا۔ ''مریم کے بارے میں؟'' وہ مجھے گھور کر بولا۔ ''تم نے تو چھوٹتے ہی کہا تھا کہ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں سنوں گا۔'' پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''مریم کے گھر والے بھی تمہاری دعوت کرنا چاہتے ہیں اور میں اس سلسلے میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گا۔''
''بھئی اگر وہ لوگ تمہاری پوری فیملی کو مدعو کریں گے تو مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔''
میرا اگلا دن بھی بہت مصروف گزرا، پھر ہم لوگ چچا جان سے پوچھ کر آگرہ کے لیے روانہ ہو گئے، صرف ایک ہی دن کی تو بات تھی، ہم صبح جاتے اور رات تک واپس آ جاتے، میں نے ناصر سے کہا۔ ''یار، ایسا کر مریم کو بھی ساتھ لے لے۔''
ناصر نے مجھے گھورا۔ ''تیرا دماغ تو ٹھیک ہے، مریم کا کھڑوس باپ اسے میرے سامنے ہی مشکل سے آنے دیتا ہے، وہ اسے میرے ساتھ آگرہ بھیجے گا؟''

☆......☆

آگرہ پہنچ کر میرے سامنے تاریخ کا ایک باب کھل گیا، یہ ہی آگرہ کبھی مغلوں کا پایۂ تخت رہ چکا تھا۔ وہاں کا شاہی قلعہ اب بھی مغلوں کی ہیبت کی کہانیاں سناتا ہے، بھارتی حکومت نے اس قلعے پر باقاعدہ ٹکٹ لگا دیا تھا، وہاں بے شمار غیر ملکی سیاح بھی تھے، گائیڈ انہیں قلعے کے مختلف گوشے دکھا کر مغلوں کے بارے میں عجیب عجیب کہانیاں سنا رہے تھے، ان کہانیوں میں ان مسلمان بادشاہوں کی عیاشیوں کی داستانیں تھیں، ان کی بیگمات کے بارے میں انتہائی لچر بلکہ فحش گفتگو تھی۔

ایک گائیڈ ہمارے ساتھ بھی گیا، ایک کمرے کی طرف اشارہ کر کے اس نے بتایا کہ یہ شہنشاہ جلال الدین اکبر کی خواب گاہ ہے، اس وسیع و عریض کمرے کے کئی دروازے دوسرے کمروں میں کھلتے تھے۔

گائیڈ بولا۔ ''یہ دروازے اکبر کی منظور نظر کنیزان کے کمروں میں کھلتے تھے، بادشاہ جب ترنگ میں ہوتا تھا تو کئی کنیزوں کو طلب کر لیتا تھا۔''

''یہ تاریخ کی کتاب میں ہے؟'' میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''کئی کتابوں میں ہے۔'' وہ بوکھلا کر بولا۔

''کسی ایک کتاب کا نام بتاؤ۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''تم لوگوں کی رہنمائی کرتے ہو یا جھوٹی داستانیں سنا کر انہیں گمراہ کرتے ہو؟''

گائیڈ خاموشی سے کھسک گیا، ناصر نے کہا۔ ''یار اس میں اس بے چارے کا کیا قصور ہے، یہ تو سرکاری پالیسی ہے کہ مسلمان بادشاہوں خاص طور پر مغل بادشاہوں اور ان کی بیگمات کی تضحیک و توہین کی جائے، غیر ملکیوں کی نظروں میں انہیں عیاش اور بدکار بنا کر پیش کیا جائے، لیکن ان کی بکواس سے تاریخ تو نہیں بدل سکتی۔''

پھر ہم لوگوں نے تاج محل دیکھا، یہ مقبرہ اس سے پہلے میں نے متعدد بار تصویروں اور فلموں میں دیکھا تھا، اسے قریب سے دیکھ کر عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔

وہیں سے جو کوچ ہمیں آگرہ لے کر آئی تھی، اس میں ہمیں واپس جانا تھا، مختلف ٹرانسپورٹ کمپنیاں مختلف شہروں سے آگرہ کے لیے اپنی بسیں چلاتی ہیں، اسی طرح ایک ٹرپ میں ان کی اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی ہے۔

واپسی پر بس ایک جگہ رکی اور ڈرائیور نے مطلع کیا کہ بس یہاں ایک گھنٹا ٹھہرے گی کسی کو کچھ کھانا پینا ہو یا خریداری کرنا ہو تو وہ کر لے۔

ہمیں خریداری تو خیر کیا کرنی تھی کھانا ہی کھانا تھا۔ میں نے ناصر سے کہا۔ ''یہاں کسی مسلمان کا ہوٹل تلاش کرو۔''

ناصر طنزیہ انداز میں ہنسا۔ ''وقار صاحب! یہاں کسی مسلمان کا ہوٹل آپ کو ڈھونڈے سے نہیں ملے گا، ہر سال یہاں ہولی کے موقع پر بہت بڑے پیمانے پر ہندو مسلم فسادات ہوتے ہیں، مرنے والوں میں اکثریت مسلمانوں کی ہوتی ہے۔''

''اچھا تو پھر کسی ہوٹل میں چل کر فش فرائی کھا لیتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

ویٹر ڈسپوزایبل پلیٹوں میں مچھلی کے تلے ہوئے قتلے لے آیا۔

ہم کھانا کھا کر ہوٹل سے باہر نکلے تو بھی بس کی روانگی میں خاصا وقت تھا، ناصر نے مجھ سے کہا۔ ''یار وقار! آج سگریٹ کی عیاشی کیوں نہ کی جائے۔''

''سگریٹ!'' میں نے کہا۔ ''چلو۔ یہ بھی سہی۔'' سگریٹ ہم دونوں میں سے کوئی بھی نہیں پیتا تھا، اسی لیے کبھی کبھار سگریٹ پینے کو ناصر عیاشی کہتا تھا۔

وہاں نزدیک ہی پان سگریٹ کی ایک دکان تھی، ابھی ہم اس کی طرف بڑھے ہی تھے کہ پیچھے سے ایک نسوانی آواز آئی۔ ''سنیے؟''

ہم دونوں نے بہ یک مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا، مجھے ایک لڑکی نظر آئی، اس کے چہرے پر خوف کے سائے تھے، بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھوں میں خوف کے ساتھ ساتھ حیرت بھی تھی۔
''جی فرمایئے؟'' ناصر نے کہا۔
''آپ مسلمان ہیں؟'' اس نے ارد گرد دیکھتے ہوئے پوچھا۔
اس کے جسم پر سادہ سا لباس تھا، لیکن شخصیت میں ایک عجیب سا تاثر تھا۔
''آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ ہم مسلمان ہیں؟'' میں نے پوچھا۔
''مسلمان تو اپنے چہروں سے پہچانے جاتے ہیں، پھر آپ دونوں ایک دوسرے کو نام سے مخاطب کر رہے ہیں، وقار ہندوؤں کا نام تو نہیں ہوتا۔''
''ہاں، ہم مسلمان ہیں۔'' ناصر نے کہا۔ ''آپ فرمایئے، کیا چاہتی ہیں؟'' ''میں بھی مسلمان ہوں۔'' اس نے پھر ارد گرد دیکھا جیسے اسے کوئی خطرہ ہو۔ ''میرا نام صائمہ ہے۔''
''بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' ناصر ہنس کر بولا۔ ''لیکن آپ ہم سے کیا چاہتی ہیں؟''
''آپ جس بس میں سفر کر رہے ہیں، اب اس میں مت جایئے گا۔'' اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وہاں آپ کے لیے خطرہ ہے۔''
''خطرہ؟'' میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''کیسا خطرہ؟''
''آپ لوگ شاید بھول گئے کہ آپ متھرا میں موجود ہیں، یہاں انتہا پسند ہندوؤں نے مسلمانوں کا صفایا کر دیا ہے، اب آپ کو یہاں ڈھونڈنے سے بھی کوئی مسلمان نہیں ملے گا۔ بچے کھچے مسلمان ہیں، انہیں متھرا کے نشیب میں ایک کچی آبادی میں پھینک دیا گیا ہے، وہ وہاں اچھوتوں کی طرح زندگی گزارنے پر مجبور ہیں، اگر آپ کو مفلسی کی انتہا دیکھنا ہو تو اس بستی کا ایک چکر لگالیں۔''
''لیکن خاتون'' میں نے کہا۔ ''آپ بھی تو مسلمان ہیں؟'' میں نے کہا۔ ''اور اس وقت متھرا میں موجود ہیں کیا آپ......''
''میرا تعلق متھرا سے نہیں ہے۔'' اس نے میری بات کاٹ دی۔
''میرا تعلق شاہ جہاں پور سے ہے، میرے والد وہاں بیرسٹر تھے، بیرسٹر مسعود خان، متھرا میں میری ایک پھوپی اور ان کی فیملی رہتی تھی، میں بھی کبھار ان کے پاس آ جاتی تھی، گزشتہ سال ہولی کے موقع پر ہندو غنڈوں نے ان کے گھر پر بھی حملہ کیا، میرا ایک پھوپی زاد، پھوپی اور پھوپھا اس حملے میں مارے گئے، میں نے اسٹور میں میزوں کے نیچے چھپ کر اپنی جان بچائی، وہ لوگ میری پھوپی زاد مدیحہ کو لے گئے، اس کا آج تک علم نہیں ہوا کہ وہ کہاں ہے؟ میں اس لیے بچ گئی کہ ہندو غنڈوؤں کو صرف اتنا ہی معلوم تھا کہ اس گھر میں صرف چار افراد رہتے ہیں، ان کے جانے کے کافی دیر بعد میں لرزتی کانپتی وہاں سے نکلی اور ایک طرف بھاگ نکلی، ہندو اس وقت بھی مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل رہے تھے، وہ شراب کے نشے میں دھت ہو کر مسلمان لڑکیوں کی آبرو ریزی کر رہے تھے، وہ ہولناک منظر اب تک میرے ذہن پر نقش ہے۔''
''لیکن اس وقت آپ یہاں متھرا میں کیا کر رہی ہیں، کیا آپ اس بس میں سفر کر رہی ہیں؟'' ناصر نے پوچھا۔
''ہاں میں اس بس میں سفر کر رہی ہوں جس میں آپ لوگ سفر کر رہے ہیں، میں آپ کے بالکل پیچھے والی سیٹ پر ہوں، میرے ساتھ میں دو آدمی بھی سفر کر رہے ہیں، وہ اپنی شکلوں اور حلیوں ہی سے خطرناک لگ رہے ہیں۔''
''انڈیا میں ایسی شکلوں والے لوگوں کی تو اکثریت ہے خاتون۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''ایسے لوگ میرے ملک پاکستان میں بھی بہت ہیں۔''
''ان کی باتوں سے مجھے لگ رہا ہے کہ ان کا تعلق بھارت کی کسی خفیہ ایجنسی سے ہے اور وہ آپ لوگوں کو گرفتار کرنا

اہتے ہیں۔"
"لیکن کیوں؟" ناصر نے ہنس کر کہا۔"میں انڈیا کا ایک باعزت شہری ہوں، میرا کزن پاکستان کا ایک معروف جرنلسٹ ہے، ہم کوئی چور اُچکے یا بدمعاش تو نہیں ہیں کہ وہ ہمیں گرفتار کریں گے۔"
"ان کی باتوں سے میں نے یہ اندازہ لگایا ہے۔" صائمہ نے کہا۔"وہ لوگ اب تک آپ کو گرفتار کر بھی چکے ہوتے لیکن انہیں شاید کسی کے احکامات کا انتظار ہے۔"
"آپ کا بہت بہت شکریہ خاتون!" میں نے ہنس کر کہا۔"آپ نے ہمیں خطرے سے آگاہ کر دیا، ویسے آپ کی اطلاع کے لیے میں عرض کر دوں کہ یہاں کے ایسے صحافیوں سے میرے تعلقات ہیں جن کے صرف ایک ٹیلی فون پر ہنگامہ کھڑا ہو سکتا ہے، پھر میرا ہائی کمیشن اور حکومت بھی ابھی اتنی بے بس نہیں ہے کہ وہ لوگ مجھے یوں آسانی سے پکڑ لیں گے۔"
اس وقت مجھے دو آدمی نظر آئے، ان کے چہروں سے نحوست برس رہی تھی، ان میں سے ایک کا سر انڈے کے چھلکے کی طرح شفاف تھا اور چہرے پر ہلکی ہلکی داڑھی مونچھیں تھیں، اس نے سفاری سوٹ پہن رکھا تھا، دوسرا آدمی خاصا دراز قد اور مضبوط ہاتھ پیر کا مالک تھا، اس کے چہرے پر وہ نحوست نہیں تھی جو گنجے کے چہرے پر تھی، اس نے بہت سلیقے سے سوٹ پہن رکھا تھا اور بالوں کی مانگ درمیان سے نکال رکھی تھی، وہ گنجے کے مقابلے میں خاصا نوعمر تھا۔
وہ دونوں ہمیں گھور رہے تھے، میں نے انہیں نظر انداز کر کے آگے بڑھنا چاہا تو گنجا ایک قدم آگے بڑھا اور کرخت لہجے میں بولا۔"ڈونٹ ٹرائی ٹو موو! حرکت کرنے کی کوشش مت کرو۔ یو آر انڈر اریسٹ" (تم زیر حراست ہو)
"کیا مطلب؟" ناصر بھڑک کر بولا۔"ہم کوئی بھیک منگے یا جھاڑو والے نہیں ہیں جو تم ہم سے اس لہجے میں بات کرو گے۔ اور...... تم ہو کون؟" جواب میں گنجے نے اپنی جیب سے گن نکال لی اور بولا۔"زیادہ بکواس کرے گا تو یہیں ٹھونک ڈالوں گا۔"
"تم یقیناً ٹھونکا پیٹی کا کاروبار کرتے ہو گے۔" ناصر نے کہا۔"لیکن......"
اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی دراز قد نے اس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔"زیادہ بکواس نہیں، سیدھی طرح ہمارے ساتھ چلو، ورنہ تجھے تو ہم یہیں ڈھیر کر دیں گے۔"
مجھے اب معاملے کی سنگینی کا احساس ہو رہا ہے۔ پہلے تو میں انہیں معمولی قسم کے اُچکے سمجھا تھا جو گن پوائنٹ پر لوگوں کو لوٹ لیتے ہیں لیکن ان کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ہمیں اپنے ساتھ لے کر جائیں گے۔
"دیکھیے جناب!" میں نے انگریزی میں کہا۔"آپ لوگوں کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، میں پاکستان کا ایک معزز شہری ہوں، انڈیا کے بھی بڑے بڑے نامور جرنلسٹ مجھے جانتے ہیں، میرے پاس پاسپورٹ بھی ہے اور آگرہ کا ویزا بھی، آپ......"
"ہمارے پاس تمہاری تقریر سننے کا وقت نہیں ہے۔" گنجے نے جھنجلا کر کہا۔"اس کا فیصلہ تو ہمارے آفیسرز ہی کریں گے کہ ہمیں غلط فہمی ہوئی ہے یا تم غلط بیانی سے کام لے رہے ہو؟"
"اوکے" میں نے کہا۔"چلو کہاں چلنا ہے؟"
"یہ تم نے عقلمندی کی بات کی ہے۔"
اسی وقت سیاحوں کا ایک گروپ وہاں سے گزرا۔ وہ لڑکی بھی ان میں شامل ہو کر وہاں سے کھسک گئی۔
"ان دونوں کو شاید اس کی اتنی پروا بھی نہیں تھی ورنہ وہ اسے یوں نہ نکلنے دیتے۔"چلو ہمارے ساتھ" گنجے نے میرا بازو پکڑا اور میرے پہلو میں آ گیا۔
دراز قد نے ناصر کو کور کر لیا تھا۔ ناصر نے بھنّا کر کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے اسے اشارے سے روک دیا ورنہ وہ پھر ناصر پر ہاتھ اٹھاتے۔

"اپنے ہاتھ جیبوں سے باہر ہی رکھنا۔" دراز قد نے کہا۔ "ورنہ......"

"ورنہ کیا یار؟" ناصر پھر جھنجلا گیا۔ جواب میں دراز قد نے اسے دھکا دیا، وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک گاڑی موجود تھی، وہ لوگ ہمیں اس گاڑی کے پاس لے گئے اور اس میں بیٹھنے کے لیے کہا۔

میں نے پھر ناصر کو آنکھوں سے اشارہ کیا کہ ان کی بات مان لو، ہم دونوں گاڑی میں سوار ہو گئے۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی گنجے نے میری آنکھوں پر چمڑے کا بلائنڈ فولڈ باندھ دیا، شاید یہی سلوک ناصر کے ساتھ بھی کیا گیا تھا کیوں کہ مجھے اس کی بے ساختہ گالی، پھر کراہنے کی آواز آئی تھی، پھر گنجے نے بہت مہارت سے میرے ہاتھ پشت کی طرف کر کے ان میں اسٹیل کی ہتھکڑیاں ڈال دیں، اس وقت مجھے یقین آیا کہ ہم واقعی کسی سنگین معاملے میں پھنس چکے ہیں اور ہمیں اغوا کرنے والوں کا تعلق بھارت کی کسی خفیہ ایجنسی سے ہے۔

گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہوا اور گاڑی برق رفتار سے ایک طرف روانہ ہو گئی۔ "بس میں ہمارا ایک بیگ بھی تھا۔" ناصر نے کہا۔

"وہ بیگ بھی ہم لے آئے تھے، وہ گاڑی میں موجود ہے۔" دراز قد نے جواب دیا۔ وہ گاڑی خاصی کشادہ تھی لیکن پھر بھی اس کی عقبی سیٹ پر چار صحت مند آدمی آرام سے نہیں بیٹھ سکتے، میں گنجے اور ناصر کے درمیان بری طرح دبا ہوا تھا، ناصر کے ساتھ دراز قد تھا، یہی حال ناصر کا بھی ہوگا۔

"تم لوگ اپنے حق میں یہ اچھا نہیں کر رہے ہو۔" ناصر نے کہا۔

"اپنی بکواس بند کر۔" گنجا ڈپٹ کر بولا۔ "اب تیرے منہ سے ایک لفظ بھی نکلا تو میں تیرے منہ میں کپڑا ٹھونس دوں گا۔"

میرا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا، میں مسلسل یہی سوچ رہا تھا کہ آخر ان لوگوں کو ہماری کس بات سے غلط فہمی ہوئی ہے، میں نے اب تک کوئی غیر قانونی کام نہیں کیا تھا، کسی مشکوک آدمی سے ملاقات نہیں کی تھی، بھارت میں صرف صحافی برادری ہی سے ملاقاتیں رہی تھیں، میرے پاس پاسپورٹ بھی تھا اور ویزا بھی، مجھے اطمینان تھا کہ یہ کسی ایجنسی کے آدمی ہیں تو جلد ہی ان کی غلط فہمی دور ہو جائے گی، میں وہاں سے ایک کال بھارتی اخبار ہندو کے کرائم رپورٹر سشیل کمار کو کروں گا، دوسری کال اپنے ہائی کمیشن کو کروں گا اور تیسری کال دہلی کے سی ایم کو کروں گا، پھر ان لوگوں کی حالت دیکھوں گا، وہ خود ہی معافیاں مانگ کر مجھے چھوڑ دیں گے۔

میرا اندازہ ہے کہ گاڑی گویا دو گھنٹے تک چلتی رہی تھی، پھر وہ ایک جگہ رکی تھی اور ڈرائیور نے ہارن بجایا تھا، آہنی گیٹ کھلنے کی آواز آئی اور گاڑی آگے بڑھ گئی، میں کچھ دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن آواز سے اندازہ لگا سکتا تھا کہ گاڑی گیٹ کے اندر داخل ہوئی ہے اور آہنی گیٹ دوبارہ بند کر دیا گیا ہے۔

پھر گاڑی کا دروازہ کھلا اور میرے پہلو سے گنجا نیچے اتر گیا، دوسرے ہی لمحے اس نے مجھے بھی باہر گھسیٹ لیا، میرے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے اس لیے فرش پر گرنے سے مجھے اچھی خاصی چوٹ آئی، پھر کسی نے پشت سے میرا کالر پکڑ کر اٹھایا اور ہاتھ پکڑ کر گھسیٹنے لگا۔ اس نے اتنا کرم ضرور کیا کہ آگے جا کر جو سیڑھیاں تھیں، ان پر مجھے احتیاط سے چڑھایا، میرا اندازہ تھا کہ وہ برآمدہ ہے، برآمدے کا فرش چکنا تھا۔ وہ آدمی مجھے گھسیٹتا ہوا ایک طرف لے چلا پھر اچانک میری آنکھ سے بلائنڈ فولڈ ہٹا دیے گئے۔ لمحے بھر کو میری آنکھیں چندھیا کر رہ گئیں۔ یہ خاصا بڑا ہال تھا، جس کے وسط میں ایک میز کے گرد چھ سات کرسیاں رکھی تھیں، ان کرسیوں پر مکروہ صورتوں والے، بھانت بھانت کے لوگ بیٹھے تھے، ان سب میں ایک بات مشترک تھی کہ ان کی آنکھوں میں عیاری اور مکاری کی چمک تھی۔

میز کے سرے پر بیٹھے ہوئے آدمی نے کہا۔ "بیٹھو!" اس کا لہجہ سرد اور آواز کچھ بیٹھی بیٹھی سی تھی۔

اس کے اشارے پر میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"اس کے ہاتھ کھول دو۔" اس نے حکم دیا اور میری پشت پر کھڑے ہوئے آدمی نے فوراً میرے ہاتھوں میں پڑی ہوئی ہتھکڑیاں کھول دیں، ہاتھ کھلنے سے مجھے بہت سکون ملا، میں نے اپنے دونوں ہاتھ سامنے میز پر رکھ لیے اور کلائیوں کو باری باری سہلانے لگا۔

''ہاں تو میجر وقار!'' اس نے مجھ سے کہا۔ ''تم کس خاص مشن پر انڈیا آئے تھے؟''
پہلے تو میں سمجھ ہی نہ سکا کہ اس سے مخاطب کون ہے؟''
''میں تم سے پوچھ رہا ہوں باسٹرڈ'' اس نے چیخ کر مجھ سے کہا۔
''میں......میجر......؟......نو سر! آپ کو شدید غلط فہمی ہوئی ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ میں میجر نہیں بلکہ وقارالحسن ہوں، کالمسٹ اور جرنلسٹ اور پاکستان کے ایک......''
''شٹ اپ!'' وہ اپنی بیٹھی ہوئی آواز میں غرایا۔ ''تمہارے پاسپورٹ پر وقارالحسن کا نام ہے، کاغذات کے لحاظ سے تم جرنلسٹ بھی ہو لیکن یہ سب ڈراما ہے، تم میجر وقار ہو اور تمہارا تعلق آئی ایس آئی سے ہے۔'' اس نے حتمی لہجے میں کہا۔
مجھے بھی غصہ آ گیا، میں نے بھنا کر کہا۔ ''مجھے کیا ضرورت ہے یہ سب ڈراما کرنے کی؟ تمہیں اگر یقین نہیں ہے تو تم میرے ہائی کمیشن سے معلوم کر سکتے ہو، میرے ان صحافی دوستوں سے معلوم کر سکتے ہو جو انڈیا میں ہیں۔''
''ہم سب کچھ معلوم کر چکے ہیں میجر!'' اس نے استہزائیہ لہجے میں کہا ''کیا یہاں کے جرنلسٹ تمہیں چہرے سے پہچانتے تھے، میرا مطلب ہے کہ جرنلسٹ وقارالحسن کو؟''
''ان سے ٹیلی فون پر میری بات ہوتی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''ملاقات تو یہاں آ کر ہوئی ہے۔''
''تو وہ یہ بات وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہیں کہ تم ہی وقارالحسن ہو؟''
''میرا پاسپورٹ، میرا قومی شناختی کارڈ، میرا پریس کارڈ۔ کیا یہ تمام ثبوت ناکافی ہیں؟''
''بالکل ناکافی ہیں۔'' اس نے سر جھٹک کر کہا۔ ''پاسپورٹ تمہیں حکومت پاکستان نے جاری کیا ہے، تمہارا قومی شناختی کارڈ بھی تمہاری حکومت ہی نے جاری کیا ہے، وہ لوگ کسی بھی کرنل اور میجر کو ریکارڈ میں کچھ بھی بنا سکتے ہیں۔''
''لیکن ویزا تو تمہاری حکومت نے جاری کیا تھا، وہ بھی پوری انکوائری کے بعد۔'' میں نے کہا۔
''بس ہماری حکومت سے یہ ہی تو غلطی ہوئی تھی۔'' اس نے کہا۔ ''ہم اسی غلطی کا ازالہ تو کر رہے ہیں۔'' پھر وہ سرد لہجے میں بولا۔ ''دیکھو، میں نہیں چاہتا کہ سچ اگلوانے کے لیے تم پر کسی قسم کا تشدد کروں اس لیے میں تمہیں آخری موقع دے رہا ہوں، انڈیا میں تمہارا ہیڈ کوارٹر کہاں ہے اور تمہارے کتنے ساتھی تمہارے رابطے میں ہیں؟'' اس نے پوچھا۔
''جب میں کچھ جانتا ہی نہیں تو اس بات کا کیا جواب دوں؟'' میں نے کہا۔
''اوکے!'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں جانتا تھا کہ تم اتنی آسانی سے کچھ بھی نہیں بتاؤ گے۔ آئی ایس آئی والے بے شک سخت جان ہوتے ہیں، لیکن میرے آدمی تو گونگوں کو بھی بولنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔''
اس کے ساتھ ہی باقی افراد بھی کھڑے ہو گئے، ان میں سے کسی نے مجھ سے ایک لفظ بھی نہیں پوچھا تھا۔
''شنکر!'' بیٹھی ہوئی آواز والے نے کسی کو آواز دی۔ ''ونود!'' اس نے پھر کسی کو پکارا۔
دوسرے ہی لمحے اس ہال کے ایک دروازے سے نکل کر دو آدمی سامنے آ گئے، ان میں سے ایک آدمی بلاشبہ ساڑھے چھ فٹ کا تو ہوگا، اس کے ہاتھ پاؤں مضبوط تھے اور جسم کسی گینڈے کی طرح ٹھوس تھا، اس کی آبنوسی رنگت ٹیوب لائٹ کی روشنی میں چمک رہی تھی، دوسرا آدمی بھی خاصا دراز قد تھا لیکن اس آبنوسی جن کے برعکس اس کا جسم گھٹیا ہوا تھا، اس نے باڈی بلڈرز کی طرح اپنے جسم کو بنایا ہوا تھا، اور اس کی نمائش کرنے کا بھی عادی تھا۔
وہ دونوں اس کے سامنے سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔
''شنکر!'' اس آدمی نے اسے مخاطب کیا۔ ''یہ میجر وقار ہے لیکن یہ بھول گیا ہے کہ یہ آئی ایس آئی کا میجر ہے، اب خود کو ایک صحافی سمجھتا ہے، مجھے بارہ گھنٹے کے اندر اندر اس کے بارے میں مکمل رپورٹ چاہیے۔'' آبنوسی رنگت والے نے گردن ہلائی تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ شنکر ہے۔ اس نے پھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ''سر! بارہ گھنٹے تو بہت ہیں، یہ تو آدھے گھنٹے میں سب کچھ سچ سچ بتا دے گا۔''
''گڈ!'' باس نے کہا۔ ''لیکن خیال رکھنا کہ یہ مرنے نہ پائے، پچھلی دفعہ تم نے جوش میں آ کر آئی ایس آئی کے ایک آدمی کو مار دیا تھا۔''

''اب ایسی غلطی نہیں ہوگی سر!'' شنکر نے کہا اور سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔

''ونود'' باس نے دوسرے آدمی کو مخاطب کیا۔''میں تمہیں بھی بارہ گھنٹے دے رہا ہوں، تم اس سے سچ بھی اگلوانا اور شنکر کو بھی قابو میں رکھنا۔''

''سر!'' اس نے تن کر کہا۔

پھر وہ سب ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے، ان کے جانے کے بعد شنکر نے مجھے یوں گھورا جیسے کوئی بچہ نئے ملنے والے کو دیکھتا ہے، پھر مجھ تک پہنچنے کے لیے اس نے درمیان میں رکھی ہوئی دو کرسیوں کو لات مار کے ایک طرف پھینکا اور میز کو بھی لات مر کے بائیں طرف اچھال دیا۔

اس کا مقصد اگر مجھے خوف زدہ کرنا تھا تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا، کیوں کہ میں واقعی بہت خوف زدہ ہو گیا تھا، موت سے نہیں اس آبنوسی جن سے، وہ مجھے اچانک نہیں بلکہ قسطوں میں مارتا۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھے یوں دبوچ لیا جیسے بلّی، چوزے کو دبوچتی ہے، پھر وہ مجھے گھسیٹتا ہوا ایک طرف لے چلا۔

اس ہال نما کمرے سے باہر نکلنے کے بعد ایک طویل کوری ڈور تھا، اس میں دونوں طرف آمنے سامنے کمرے بنے ہوئے تھے، وہاں سنّاٹا تھا۔ مجھے صرف اپنے قدموں کی آہٹ یا شنکر کے پیروں کی آہٹ سنائی دے رہی تھی، ہمارے پیچھے ونود تھا۔ اس نے کرپ سول کے جوتے پہن رکھے تھے اس لیے اس کے قدموں کی آہٹ سنائی نہیں دے رہی تھی۔

مجھے ناصر کی طرف سے بھی پریشانی تھی، ان لوگوں نے ناصر کے ساتھ نہ جانے کیا سلوک کیا تھا، شاید اسے بھی ان لوگوں نے آئی ایس آئی کا کوئی اہل کار بنا دیا ہوگا۔

راہ داری کے آخری سرے پر بنے ہوئے ایک کمرے کے دروازے پر شنکر رک گیا، ونود نے آگے بڑھ کر اس کمرے کا لاک کھولا اور شنکر مجھے گھسیٹتا ہوا اس کمرے میں لے گیا، اس کمرے میں فرنیچر نام کی صرف ایک کرسی تھی، وہ بھی انتہائی بھدّی اور بدرنگ! اس کے علاوہ کمرے میں دو بنچیں بھی تھیں، دو تین بالٹیاں تھیں، ان میں سے ایک بالٹی پانی سے بھری ہوئی تھی، باقی دو خالی تھیں، اس کے علاوہ وہاں مختلف قسم کے ڈنڈے، پلاس، ہلکے اور وزنی ہتھوڑے، رسّیاں اور نہ جانے کیا کیا تھا۔ میں نے ایک ہی نظر میں کمرے کا سرسری سا جائزہ لیا اور کانپ کر رہ گیا۔

''شنکر!'' ونود نے کہا۔''پہلے اس کے کپڑے اتارو۔''

شنکر نے آگے بڑھ کر پہلے میری جیکٹ اتاری، پھر ٹائی، قمیص پر ہاتھ مارا تو اس کے سارے بٹن ٹوٹ گئے، دوسرے ہی لمحے قمیص اس کے ہاتھوں میں تھی، اس نے ایک ایک کر کے میرے جسم سے تمام کپڑے اتار لیے، اب میرے جسم پر لباس نام کی دھجی بھی نہیں تھی۔

اس لمحے مجھے احساس ہوا کہ آدمی کو اگر سرِ عام بے لباس کر دیا جائے تو وہ خود اپنی نظروں میں ہی حقیر ہو جاتا ہے، سردی کے باوجود میرے چہرے پر پسینا آ گیا اور میں خود کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے ایک کونے میں بیٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

''ابے یار، یہ تو لڑکیوں کی طرح شرما رہا ہے۔'' ونود ہنس کر بولا۔

''یہ ابھی تھوڑی دیر میں ساری شرم بھول جائے گا۔'' شنکر نے کہا اور مجھے بالوں سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔

''اپنا نام بتا؟'' شنکر نے میرے بالوں کو زوردار جھٹکا دے کر پوچھا۔

''وقار الحسن!'' میں نے جواب دیا۔

''عہدہ؟'' اس نے میرے بالوں کو دوسرا جھٹکا دیا۔

''چیف کرائم رپورٹر۔'' میں نے کہا۔

اس نے جھٹکا دے کر مجھے دیوار سے دے مارا، میرا سر اور کہنیاں بری طرح دیوار سے ٹکرائیں اور میں چھپکلی کی طرح پٹ سے فرش پر گر پڑا۔

’’شنکر!‘‘ ونود دھاڑا۔ ’’تو نے پھر وہی حرکتیں شروع کر دیں، تو نے پہلے بھی ایک پاکستانی جاسوس کو اسی طرح ختم کر دیا تھا نا؟‘‘

’’میں نے اسے اتنی زور سے دیوار پر نہیں مارا۔‘‘ شنکر نے کہا۔ ’’اور یہ بہت جان دار آدمی ہے، آئی ایس آئی کا میجر ہے، اس کے لیے تو اس قسم کی چوٹیں معمولی ہیں۔‘‘

’’کچھ بھی ہو، تم اپنے ہاتھ اور پاؤں قابو میں رکھو۔‘‘ ونود نے درشت لہجے میں کہا۔

’’اے!‘‘ شنکر پہاڑ کھانے والے انداز میں بولا۔ ’’تم مجھ سے اس انداز میں بات کرنے کون ہو؟‘‘ تم بھی ذرا اپنی زبان قابو میں رکھو۔‘‘

’’تم نے سنا نہیں تھا کہ کرنل صاحب نے مجھ سے کیا کہا تھا؟‘‘ ونود نے کہا۔

میں بری طرح چونک اُٹھا، گویا وہ بھارتی ملٹری انٹیلی جنس کی کوئی خفیہ ایجنسی تھی اور ان لوگوں نے واقعی مجھے آئی ایس آئی کا میجر سمجھ کر گرفتار کیا تھا۔

میں نے ان لوگوں کے ظلم و تشدد کی بہت داستانیں سنی تھیں، میں جانتا تھا کہ اب جیتے جی ان لوگوں کے چنگل سے نکلنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوگا۔

’’میں ابھی صاحب سے بات کرتا ہوں کہ اگر پوچھ گچھ شنکر ہی کو کرنی ہے تو پھر مجھے اس کے ساتھ کیوں لگایا ہے؟‘‘

’’ساتھ لگانے کا یہ مقصد تو نہیں کہ تم شنکر کی مسلسل توہین کرتے رہو۔‘‘ میں نے شنکر کو مزید اشتعال دلانا چاہا۔ ’’تم کیا رینک میں شنکر سے سینئر ہو؟‘‘

’’کیسا سینئر؟‘‘ وہ تڑخ کر بولا۔ ’’تم بکواس کرتے رہو، میں جا رہا ہوں۔‘‘ ونود نے کہا۔

’’ارے یار، تم تو بُرا مان گئے۔‘‘ شنکر جلدی سے بولا۔ بس مجھے غصہ مت دلایا کرو۔‘‘ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ’’ہاں، تو میجر صاحب اب بھی سچ بولو گے یا میں ترکیب نمبر دو استعمال کروں؟‘‘

’’مجھے جو کچھ معلوم تھا میں نے بتا دیا۔‘‘ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

’’ونود!‘‘ شنکر نے کہا۔ ’’یہ ایسے نہیں مانے گا، اسے الٹا لٹکا اور پھر میں کچھ سوچتا ہوں۔‘‘

ونود نے آگے بڑھ کر میرے پیروں میں مضبوط ریشمی رسّی کچھ اس طرح باندھی کہ اس کی گرہ کھلنے نہ پائے، پھر اس نے رسّی کا دوسرا سرا پکڑ کر کھینچنا شروع کر دیا۔

اسی وقت میری نظر چھت پر لگی ہوئی ایک چرخی پر پڑی، وہ رسّی اس چرخی میں سے گزر کر نیچے آ رہی تھی اس لیے ونود نے بہت آسانی سے مجھے زمین سے چھ ساڑھے چھ فٹ کی بلندی پر سر کے بل معلق کر دیا۔

’’ہاں میجر صاحب!‘‘ شنکر نے کہا۔ ’’تمہارا تعلق پاکستان کے کس ایجنٹ سے ہے؟‘‘

’’میں کسی ایجنٹ کو نہیں جانتا، میں ایک اخبار میں......‘‘ میرا جملہ ادھورا رہ گیا کیوں کہ شنکر نے اتنی زور سے میرے چہرے پر تھپڑ مارا تھا کہ میں گھڑی کے پینڈولم کی طرح جھولتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔ میرے رخسار میں جیسے انگارے سے بھر گئے تھے۔ کان میں سائیں سائیں ہو رہی تھی، میرا خیال تھا کہ میرے رخسار کی جلد اُدھڑ گئی ہے۔

دوسری طرف ونود کھڑا تھا۔

اس نے بھی میرے چہرے پر بھرپور تھپڑ رسید کر دیا۔ میں جھولتا ہوا دوبارہ شنکر کی طرف آ گیا، پھر تو گویا میں ان دونوں کے درمیان ٹیبل ٹینس کی گیند بن گیا۔

تھوڑی دیر بعد میرے دونوں گال سن ہو گئے اور مجھے کچھ سنائی بھی نہیں دے رہا تھا۔

انہوں نے چند منٹ کے لیے مجھے اسی طرح الٹا لٹکا ہوا چھوڑ دیا، میری پنڈلیوں میں شدید اینٹھن ہو رہی تھی اور سر میں دھمک سی ہو رہی تھی، جسم کا پورا خون میرے چہرے کی طرف آ گیا تھا اور سر بہت بھاری ہو رہا تھا۔

اچانک مجھے زور کی ابکائی آئی لیکن میں نے بہ مشکل تمام خود پر قابو پایا۔

ونود نے ایک دفعہ میرے ساتھ پھر وہی پنگ پانگ کا کھیل شروع کر دیا۔
اس کے بعد مجھے کچھ ہوش آیا۔ بے ہوشی کا وقفہ نہ جانے کتنا طویل تھا، دس منٹ، آدھا گھنٹا یا ایک گھنٹا؟
مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میں ہوا میں معلق قلق ہونے کے بجائے فرش پہ پڑا تھا، میرے پیر ابھی تک اسی ریشمی رسّی سے جکڑے ہوئے تھے جو میرے ٹخنوں میں پیوست ہو رہی تھی، ہوش میں آنے کے بعد میں نے آنکھیں کھولیں تو وہاں صرف شنکر موجود تھا، وہ اپنے بھاری بھرکم وجود کے ساتھ لکڑی کی اسی بھدّی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور میری طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔
میں نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔
چند لمحے بعد مجھے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور کوئی کمرے میں آ گیا۔
''اس نے کچھ بتایا۔'' میرے کانوں میں گنجے کی آواز آئی، وہی گنجا جو ہمیں یہاں تک لے کر آیا تھا۔
''نو سر۔'' شنکر نے جلدی سے کہا۔ ''اس نے کچھ بھی نہیں بتایا اور مسلسل یہ ہی کہہ رہا ہے کہ میں ایک صحافی ہوں، میرا آرمی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''
''باس کی دی ہوئی مدت میں سے تین گھنٹے گزر چکے ہیں، باس بارہ گھنٹے بعد رپورٹ مانگے گا۔''
''فکر مت کرو باس!'' شنکر نے کہا۔ ''ابھی تو میں نے اس پر ہاتھ بہت ہلکا رکھا ہے، ابھی میرے پاس نو گھنٹے ہیں۔''
''تم تو جوش میں آ کر ایک گھنٹے کا ٹائم دے رہے تھے؟'' گنجے نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
''اس وقت میں بھول گیا تھا کہ اس کا تعلق آئی ایس آئی سے ہے اور یہ لوگ بہت سخت جان ہوتے ہیں...... ابھی نو گھنٹے باقی ہیں، اتنی دیر میں تو میں پتھروں کو بھی بولنے پر مجبور کر سکتا ہوں۔''
اسی وقت ونود کمرے میں داخل ہوا، گنجے نے اس سے کہا۔ ''تم کہاں مٹر گشت کرتے پھر رہے ہو؟''
''یہ بے ہوش ہو گیا تھا اس لیے میں اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہا تھا۔'' اس نے کہا۔
''اگر میرا تعلق آئی ایس آئی سے ہوتا تو تم مجھے اتنی آسانی سے گرفتار کر سکتے تھے؟'' میں نے گنجے سے کہا۔ ''آئی ایس آئی والے تو خالی ہاتھ بھی کم سے کم دو تین آدمیوں کو ساتھ لے کر مرتے ہیں۔''
گنجا غیر شعوری طور پر کچھ پیچھے پلٹ گیا۔
اس کے انداز سے مجھے محسوس ہوا کہ ان لوگوں پر آئی ایس آئی کی کتنی دہشت ہے۔
''ونود، شنکر!'' اس نے کہا۔ ''اب تمہارے پاس نو گھنٹے ہیں، صرف نو گھنٹے، نو گھنٹے بعد باس کو رپورٹ چاہیے لیکن اسے مرنے مت دینا۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔
مجھے شدید سردی لگ رہی تھی، دسمبر کا مہینا تھا اور میں بالکل برہنہ حالت میں ٹھنڈے فرش پر پڑا تھا۔
''میرے کپڑے تو مجھے دے دو۔'' میں نے کہا۔ ''ورنہ اگر میں تمہارے تشدد سے نہ مرا تو سردی سے اکڑ کر مر جاؤں گا۔''
ونود نے چند لمحے کچھ سوچا، پھر شنکر کو اشارہ کیا کہ اس کے کپڑے واپس کر دو۔ شنکر نے کپڑوں اور جوتوں کا بنڈل بنا کر میری طرف پھینک دیا، پھر اس نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ بھی کھول دیے۔
میں سردی کے باعث اب بری طرح کانپنے لگا تھا، میں نے جیسے تیسے کپڑے پہنے، قمیص کے تمام بٹن ٹوٹے ہوئے تھے اور وہ ایک دو جگہ سے پھٹ بھی گئی تھی۔
کپڑے پہننے کے بعد مجھے خاصا سکون ملا۔
شنکر میری طرف بڑھا اور دانت پیس کر بولا۔ ''کیا تو اب بھی زبان نہیں کھولے گا۔'' وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''ہمیں اپنے دوسرے ساتھیوں کے ایڈریس بتا۔''
''مجھے کسی کا ایڈریس معلوم نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ اس نے گھسیٹ کر مجھے اس چھوٹی سی کرسی پر بٹھا دیا اور ایک پلاس اٹھا کر بولا۔ ''میں ایک ایک کر کے تیری انگلیوں کے تمام ناخن نکال دوں گا بتا۔'' اس نے میرے بال پکڑ کر جھٹکا دیا۔
''میں کچھ نہیں جانتا۔'' میں نے بے بسی سے کہا۔ اس نے کلائی کے پاس سے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا اور پلاس

سے میرے ہاتھ کی انگلی کا ناخن پوری قوت سے کھینچ لیا۔
مجھے ایسا لگا جیسے میری انگلی ہی اکھڑ گئی ہو، تکلیف کی شدت سے میری چیخ نکل گئی، ہاتھ میں انگلی سے لے کر کندھے تک شدید ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔
''بتاؤ، تمہارے دوسرے ساتھی کہاں کہاں ہیں؟'' اس نے پھر پوچھا۔
''میں...... میں...... نہیں...... جانتا......'' میں نے بہ مشکل تمام کہا۔
اس نے پلاس سے اچانک میری دوسری انگلی کا ناخن بھی اکھاڑ لیا۔
میرے حلق سے اذیت ناک چیخ بلند ہوئی، پھر میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔
مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میرا چہرہ اور سر کے بال گیلے ہو رہے تھے، میں اسی طرح کرسی پر بیٹھا تھا، شاید ان لوگوں نے مجھے پانی کے چھینٹے مار کر ہوش میں لانے کی کوشش کی تھی۔ میں ہوش میں تو آ گیا تھا لیکن میری آنکھیں تکلیف کی شدت سے بند تھیں اور بایاں ہاتھ سن ہو کر رہ گیا تھا۔
اس وقت مجھے کہیں دور سے ناصر کی اذیت ناک چیخ سنائی دی، میرا دل کٹ کر رہ گیا، میری وجہ سے وہ ناصر پر بھی ظلم ڈھا رہے تھے، میں نے بہ مشکل تمام آنکھیں کھولیں، ہر چیز مجھے دھندلائی سی نظر آ رہی تھی، پھر آہستہ آہستہ دھند چھٹنے لگی، مجھے شنکر اور ونود کے چہرے نظر آئے۔ مجھے شدید پیاس کا احساس ہو رہا تھا اور گلے میں کانٹے سے چبھ رہے تھے۔
میں نے نحیف لہجے میں کہا۔ ''پا...... نی......!''
''ہم تجھے پانی بھی پلائیں گے اور کھانا بھی کھلائیں گے، بس تو ہمارے سامنے سچ اگل دے، ونود نے کہا۔ ''سچ...... تو...... وہی ہے...... جو...... میں...... تمہیں...... بتا چکا ہوں۔'' میں نے اٹک اٹک کر کہا۔
شنکر نے مجھے بالوں سے پکڑا جھٹکا دے کر کرسی سے کھڑا کر دیا۔ پھر وہ مجھے اس طرح گھسیٹتا ہوا اس طرف لے گیا جہاں پانی سے بھری بالٹی رکھی تھی، اس نے اچانک میرا سر پانی میں ڈبو دیا، میں نے کچھ دیر تو سانس روکی لیکن میں حبسِ دم کا ماہر تو تھا نہیں، دوبارہ سانس لینے کی کوشش کی تھی سانس کے ساتھ بہت سا پانی میرے حلق میں اُتر گیا۔ وہ گندہ اور بدبودار پانی تھا، اور نہ جانے کب سے وہاں رکھا تھا۔ پھر میرا دم گھٹنے لگا اور میں بری طرح ہاتھ پاؤں چلانے لگا۔
شنکر نے جھٹکا دے کر میرا منہ بالٹی سے باہر نکال لیا، پھر وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ ''تجھے کچھ یاد آیا یا پھر میں تجھے ایک ڈبکی اور دوں؟''
''میں...... آئی ایس آئی...... کا آدمی نہیں...... ہوں۔'' اس نے پھر میرا سر پکڑ کے بالٹی میں اوندھا دیا۔
میرا دم گھٹنے لگا اور میں بری طرح ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ اس نے پھر میرا سر بالٹی سے نکالا اور مجھے ایک طرف پھینک دیا، میں فرش پر گرا گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ میری آنکھوں کے گرد لال پیلے نیلے دائرے ناچ رہے تھے اور مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اب میرا زندہ بچنا محال ہے۔
شنکر اور ونود مجھے تشویش سے دیکھ رہے تھے، اسی وقت پھر مجھے ناصر کی اذیت ناک چیخ سنائی دی، وہ چیخ چیخ کر کچھ کہہ بھی رہا تھا جو میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔
''یار یہ تو بہت سخت جان ہے۔'' ونود نے کہا۔ ''وقت بہت تیزی سے گزر رہا ہے، اب ہمارے پاس صرف تین گھنٹے ہیں، اس نے اگر زبان نہ کھولی تو کرنل صاحب ہم دونوں کی زبانیں بند کر دیں گے۔''
''شنکر!'' ونود نے کہا۔ ''ہانڈی لے کر آؤ۔''
''ہانڈی؟'' شنکر ہنس کر بولا۔ ''کیا اسے تل کر کھاؤ گے؟''
''مذاق مت کرو۔'' ونود جھنجلا گیا۔ ''ہانڈی لے کر آؤ۔''
شنکر تیزی سے باہر نکل گیا، وہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوا تو اس کے ہاتھ میں مٹی کی بڑی سی ایک ہانڈی تھی۔
ونود نے اس کے ہاتھ سے ہانڈی لے لی اور اس میں وہاں موجود تھیلیوں میں سے نہ جانے کیا کیا نکال کر ڈالنے

لگا۔ کمرے میں شدید قسم کی ناقابل برداشت بو پھیل گئی۔
شنکر نے ونود کے اشارے پر میری گردن پشت سے پکڑی اور میرا چہرہ ہانڈی کے سامنے کردیا، اس دھوئیں میں مرچوں کی دھانس کے ساتھ ساتھ اور نہ جانے کون سا کیمیکل تھا جو میری ناک کے ذریعے پھیپھڑوں میں اتر رہا تھا۔
میں نے چند لمحے تو وہ دھواں برداشت کیا، پھر بری طرح چیخنے لگا اور ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔
''بولو۔ کچھ یاد آیا؟'' شنکر نے کہا۔
''ہاں...... مجھے...... سب کچھ یاد آ گیا......'' میں نے بہ مشکل تمام کہا اور پھر میرے حواس میرا ساتھ چھوڑ گئے۔
دوبارہ مجھے ہوش آیا تو میں فرش پر پڑا تھا اور شنکر اور ونود میرے نزدیک ہی بیٹھے تھے۔ کمرے میں ابھی تک وہ ناگوار اور ناقابلِ برداشت بو چکرا رہی تھی، میرے حلق سے لے کر سینے تک خراشیں ہی پڑی ہوئی تھیں اور مجھے سانس لینے میں شدید تکلیف ہو رہی تھی۔
''ہاں...... میجر صاحب!'' شنکر نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔
''کچھ یاد آیا یا پھر میں ایک دفعہ پھر تمہیں اس ہانڈی کا مزہ چکھاؤں؟''
''ہاں، مجھے یاد ہے۔'' میں نے کمزور لہجے میں کہا۔ ''میں وقار الحسن ہوں...... اور...... میرا تعلق پاکستان کے ایک اخبار......''
شنکر نے غصّے سے بے قابو ہو کر میرے میرے منہ پر اتنا زوردار تھپڑ مارا کہ میرا جبڑہ تک ہل کر رہ گیا، مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرا چہرہ ٹوٹ کر دوسری طرف نکل گیا ہو۔
''حرام زادے...... تو نے ہمارا اتنا وقت برباد کردیا، میں دیکھتا ہوں، تو کیسے زبان نہیں کھولتا۔''
''ذرا احتیاط سے شنکر!'' ونود نے فوراً کہا۔ اسے شاید یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ شنکر اب قابو سے باہر ہونے والا ہے۔
''یار، اس احتیاط ہی کی وجہ سے تو یہ اب تک کچھ بولا نہیں ہے۔'' شنکر نے کہا۔ ''کرنل صاحب نے کہا تھا کہ یہ مرنے نہ پائے، میں اسے مرنے نہیں دوں گا لیکن اسے زندگی بھر کے لیے معذور ضرور کردوں گا۔ میں اس کے دونوں کان کاٹ کر ابھی اس کے ہاتھوں میں دے دوں گا۔ اس کے بعد بھی یہ نہ بولا تو اس کے گھٹنوں میں ڈرل کردوں گا۔ اس کی بقیہ زندگی گھسیٹ کر بھیک مانگتے گزرے گی۔''
ونود نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب ہمارے پاس صرف ایک گھنٹا ہے۔''
''ایک گھنٹے میں تو میں اسے ایسا معذور کردوں گا کہ آئی ایس آئی بھی اسے دیکھ کر عبرت پکڑے گی، میں اس کے ہاتھ پاؤں توڑ دوں گا، اس کی ریڑھ کی ہڈی توڑ دوں گا، یہ زندہ تو رہے گا لیکن پھر نہ یہ زندوں میں ہوگا، نہ مردوں میں۔''
شنکر نے یہ کہہ کر ایک بھاری ہتھوڑا اٹھایا اور میرے ہاتھ پر دے مارا، اس نے ہتھوڑا مارنے میں زیادہ طاقت استعمال نہیں کی تھی لیکن میرے حلق سے فلک شگاف چیخ برآمد ہوئی، اسی ہاتھ کی دو انگلیوں کے ناخن وہ پہلے ہی نکال چکا تھا۔
اس نے پھر ہتھوڑا اٹھایا، اس مرتبہ وہ میرے گھٹنے کو نشانہ بنا رہا تھا، اس نے ہتھوڑا اٹھایا ہی تھا کہ دروازہ کھلا اور گنجا اندر آ گیا۔ شنکر کا ہاتھ اٹھا رہ گیا۔
''اس کی مرہم پٹی کرواؤ اور اسے کچھ کھانے کو دو۔'' گنجے نے کہا۔
''لیکن سر، اس نے اب تک زبان نہیں کھولی ہے۔''
''تم لوگوں سے جتنا کہا جا رہا ہے، اتنا ہی کرو، اب اسے کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے، میں انکتا کو بھیج رہا ہوں، وہ اس کی مرہم پٹی کردے گی۔'' پھر وہ شنکر سے مخاطب ہوا۔ ''تم لوگ اسے نمبر سات میں شفٹ کرو۔'' یہ کہہ کر وہ عجلت میں چلا گیا۔
''قسمت کے دھنی ہو۔'' ونود نے کہا۔
''اگر سر کو آنے میں چند سیکنڈ کی دیر بھی ہو جاتی تو تمہارا ایک ہاتھ تو ہمیشہ کے لیے معذور ہو ہی چکا ہوتا۔''
''چلو اب اٹھو۔'' شنکر نے جھنجلا کر کہا۔

میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن مجھ سے اٹھا نہ گیا۔ ونود نے سہارا دے کر مجھے اٹھایا اور مجھے اپنے سہارے باہر لے گیا۔ کمرے کے مقابلے میں باہر کوریڈور کی فضا خاصی خوش گوار تھی، میں نے باہر نکل کر دو چار گہرے گہرے سانس لیے اور ونود کا سہارا لے کر چلتا رہا۔ مشکل سے ایک منٹ چلنے کے بعد وہ مجھے ایک دوسرے کمرے میں لے گیا۔

اس کمرے کو دیکھ کر میں چونک اٹھا، وہ کوئی آراستہ بیڈروم تھا۔

''تم یہاں بیٹھو، میں تمہارے لیے دوسرے کپڑے نکالتا ہوں۔'' ونود نے کہا۔ اس کی بات سن کر میں مزید حیرت کا شکار ہوگیا کہ یہ انقلاب کیسے آ گیا؟ شاید یہ بھی زبان کھلوانے کا ایک طریقہ تھا۔

میں نرم و گداز بستر پر بیٹھا تو مجھے بہت سکون ملا۔

اچانک کمرے میں نازک اندام سی، سانولی سلونی ایک حسینہ داخل ہوئی، اس کے ہاتھوں میں ایک ٹرے تھی جس میں مختلف دوائیں، انجکشن، مرہم وغیرہ رکھے تھے۔

میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو وہ نہایت مہذب انداز میں بولی۔ ''آپ بیٹھے رہیں پلیز، مجھے صرف یہ بتادیں کہ آپ کے جسم پر زخم کہاں کہاں ہیں؟'' میں نے اسے اپنی دونوں انگلیاں اور وہ ہاتھ دکھایا جس پر شنکر نے ہتھوڑا مارا تھا۔

انکتا نے نہایت مہارت سے میری مرہم پٹی کی، ایک انجکشن دیا اور مکمل بیڈ ریسٹ کی ہدایت دے کر چلی گئی، ونود نے مجھے دھلی ہوئی ایک شرٹ اور جینز دیتے ہوئے کہا۔ ''تم باتھ روم میں جا کر اپنا لباس تبدیل کرلو۔ میں تمہارے لیے کھانے کو کچھ منگواتا ہوں۔''

میں ہاتھ منہ دھو کر اور کپڑے بدل کر باتھ روم کے باہر نکلا تو ونود ایک ٹرے میں کافی اور سینڈوچز لے کر آ گیا تھا، میں رات سے بھوکا تھا اور اب صبح ہونے والی تھی، بھوک کے مارے میرے پیٹ میں اینٹھن ہو رہی تھی۔

میں نے سینڈوچ کھایا تو مجھ سے نگلنا دشوار ہوگیا، میرے گلے میں شدید خراشیں پڑ رہی تھیں، میں نے جیسے تیسے کافی کی مدد سے سینڈوچ کھایا اور کافی کے مزید دو گھونٹ لے کر ٹرے ایک طرف کھسکادی۔

ونود بہت غور سے میرا جائزہ لے رہا تھا، میرے بائیں ہاتھ کی دو انگلیوں اور کلائی پر پٹی بندھی تھی، میں نے باتھ روم کے

آئینے میں اپنے چہرے کا بھی جائزہ لیا تھا، میرے دونوں گالوں پر نیل پڑے ہوئے تھے اور چہرہ بری طرح سوج گیا تھا۔
''تمہارے آدمیوں نے کام دکھادیا۔'' ونود نے زہریلے لہجے میں کہا۔
''میرے آدمیوں نے؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''میرے کون سے آدمی؟''
''زیادہ معصوم بننے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''تمہارے آدمیوں نے بھارتی پریس کو اطلاع دے دی کہ ہم نے کسی پاکستانی جرنلسٹ کو جاسوسی کے شبے میں گرفتار کیا ہے۔ پریس نے آج کے اخبارات میں ادھم مچادیا ہے کہ اگر کوئی جرنلسٹ گرفتار کیا گیا ہے تو اسے کورٹ میں پیش کیوں نہیں کیا گیا اور اسے میڈیا سے کیوں چھپایا گیا۔ پولیس اس گرفتاری سے لاعلم ہے، تمہارا نام معلوم ہونے کے بعد تو دہلی کے چیف منسٹر نے بھی پولیس سے جواب طلب کرلیا ہے، اب تمہیں میڈیا کے سامنے پیش کرنا ہے۔''
''اوہو، تو یہ بات ہے؟'' میں نے کہا۔ ''اب تمہاری ان مہربانیوں کی وجہ سمجھ میں آئی۔''
''زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' ونود نے بھنا کر کہا۔ ''اب بھی تمہیں رہا نہیں کیا جائے گا بلکہ جاسوسی کے جرم میں مقدمہ چلے گا۔''
اس وقت دروازے پر دستک ہوئی اور گنجا اندر آ گیا، اس نے ونود کو حکم دیا۔ ''اسے گاڑی میں بٹھاؤ۔''
ونود نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل گیا۔
باہر ہی گاڑی کھڑی تھی، میں نے اس عمارت کا جائزہ لینے کی کوشش کی تو گنجے نے فوراً میری آنکھوں پر بلائنڈ فولڈ لگا دیا اور مجھے دھکیل کر گاڑی میں بٹھادیا، پھر وہ خود بھی میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس مرتبہ اس نے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی نہیں ڈالی تھی، گاڑی ایک مرتبہ پھر روانہ ہوگئی۔
''میرا دوست کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔ مجھے ناصر کی فکر تھی۔
''خاموش بیٹھو۔'' میری دائیں جانب سے کوئی غرایا تو مجھے احساس ہوا کہ میری دائیں طرف بھی کوئی بیٹھا ہے۔
گاڑی آدھا گھنٹے ہی چلی تھی کہ کوئی بڑبڑایا۔ ''یہ صبح سڑک پر اپنی بکریوں اور بھیڑوں کا گلہ لے کر آجاتے ہیں۔''
اس کے ساتھ ہی گاڑی کی رفتار بالکل کم ہوگئی اور ڈرائیور زور زور سے ہارن بجانے لگا، پھر گاڑی بالکل ہی رک گئی۔
گنجا چیخ کر بولا۔ ''اے، اپنی بکریوں کو راستے میں سے ہٹا۔'' ''ہٹا تو رہا ہوں۔'' باہر سے کوئی کھسیائی ہوئی آواز میں بولا۔
مجھے اب بکریوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں اور چرواہے کی آوازیں بھی، وہ بکریوں کو شاید سڑک سے ہٹانے کی کوشش کررہا تھا۔
اچانک ایک گرج دار آواز سنائی دی۔ ''تم میں سے کوئی بھی حرکت نہیں کرے گا، ورنہ ہم سب کو بھون کر رکھ دیں گے، گاڑی سے نیچے اترو۔''
''اوشٹ!'' میرے دائیں جانب بیٹھا ہوا آدمی بولا۔ ''مجھے پہلے ہی......''
اس کا جملہ ادھورا رہ گیا، مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے اسے باہر کھینچ لیا ہو، پھر شاید کسی نے گنجے کو بھی باہر کھینچ لیا تھا، کیوں کہ مجھے اب اس کی آواز باہر سے سنائی دی تھی۔ ''کون ہو تم لوگ؟''
جواب میں تھپڑ کی زوردار آواز آئی تھی اور کوئی غرا کر بولا تھا۔ ''اب تیری آواز نکلی تو گولی کھوپڑی میں اتار دوں گا۔''
پھر کسی نے نہایت آہستگی سے مجھے گاڑی سے اتار لیا، فوراً میری آنکھوں سے بلائنڈ فولڈ کھول دیا گیا، باہر سورج کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

☆......☆

یہ پُرتجسس، سنسنی خیز اور لرزہ خیز آپ بیتی ابھی جاری ہے۔
بقیہ واقعات آئندہ ماہ کے ''سچی کہانیاں'' میں ملاحظہ فرمائیں

پوشیدہ دنیا سے جناتی کہانیاں

گلابو......شکیلہ انجم طارق

لاہور سے، ایک جن اور آدم زادی کی محبت کا سچا واقعہ

خوشبو کہاں گئی؟......کاشی چوہان

ایک ایسی دوشیزہ کی کتھا، جس پر بہ یک وقت دو جنات عاشق تھے، ایک جیت گیا مگر دوسرا......

نشانی......بشیر احمد بھٹی

بہاول پور سے ایک ایسے نوجوان کا قصہ، جسے ایک جن کی شادی دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا

انہونے واقعات......عصمت پروین عظیمی

کراچی سے چند سچے پراسرار قصے، جن سے ایک خاندان کا سابقہ پڑتا رہا

شرارتی جنات......عمران مظہر

ژوب، بلوچستان سے، ایک نان بائی کے ساتھ پیش آنے والی جنات اور پریوں کی شرارتیں

انوشکا......حافظہ سون شاہ

سرگودھا سے ایک بھائی کی سچ بیانی، جس نے اپنی بہن کو ایک جن سے نجات دلائی

وہ خوشبو، وہ پائل......اشفاق عباسی

جنوں کی سواری کی لپیٹ میں آنے والے ایک نوجوان کی سچ بیانی



خوشبو کہاں گئی؟

کاشی چوہان

ایک ایسی دوشیزہ کی کتھا، جس پر بیک وقت دو جنات عاشق تھے

"تو پھر تم جا رہی ہو؟"

"ہاں، تو پھر کیا کروں؟"

"تم نے ایک پل بھی میرے متعلق نہیں سوچا؟"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"یعنی یہ تم کہہ رہی ہو؟"

"تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟"

"دیکھو، تم جانتی ہو نا، سب کچھ جانتی ہو...... پھر بھی...... میرا کچھ تو خیال کرو، میں تمہارے بغیر......"

"پلیز، مجھے میری زندگی جینے دو، پلیز۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ مجھے پڑھنا ہے۔ میں اس ماحول سے فرار چاہتی ہوں۔ میں بھاگتے بھاگتے تھک چکی ہوں۔ میرے حال پر رحم کردو۔ خدارا، رحم کردو۔" وہ جیسے تھک کر چور ہوگئی تھی اور اس حالت میں اس کا چیخنا جائز تھا۔

"واسطہ بھی اُس کا دیتی ہو جس کے آگے سب کچھ بے بس ہو جاتا ہے، مگر ایک دن ملنے کی تو اجازت دے دو۔ اب میں تمہارے لیے خود پر اتنا جبر نہیں کرسکتا اور تم جانتی ہونا، قید، رہائی مانگتی ہے۔ میں تم کو نہ دیکھوں تو مجھے لگتا ہے، میری صبح نہیں ہوئی۔ میری زندگی تھم سی جاتی ہے۔ ایک دن تو ملنے آجاؤں تم سے؟"

"بالکل نہیں، تم آؤ گے تو میری زندگی پھر سے تماشا بن جائے گی۔ تم جانتے ہو سب کچھ، صرف تمہاری ہی وجہ سے ہو رہا ہے۔"

"میں محبت کرتا ہوں تم سے، عاشق ہوں تمہارا لیکن پھر بھی کتنا ضبط کرتا ہوں، تم خوب جانتی ہو۔"

"اگر مجھ سے محبت کرتے ہو تو میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟ انہونی کبھی ممکن ہو ہی نہیں سکتی، سمجھتے کیوں نہیں؟ عقلمند ہو تم۔ تم میرا خیال کیوں نہیں کرتے؟ کیسی محبت ہے تمہاری، جو میری زندگی کا روگ بن گئی ہے؟ لوگ مجھ سے ڈرنے لگے ہیں کہ کہیں میں کچھ کر ہی نہ بیٹھوں۔" اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے اور آنسو دیکھ کر وہ بھلا بے اختیار نہ ہو جاتا۔

•......•......•......•

اسے پھر سے دورہ پڑا تھا جب اس نے آنکھیں کھولیں، اس کے اردگرد دادی ماں، دادا ابو اور زیتون پھوپو کھڑے تھے۔ پاس ہی وید و نارائن حکیم جی بھی پیلے چوغے میں لپٹے جانے کیا پڑھ کر اس پر پھونک رہے تھے۔ دادی ماں تسبیح پہ دھڑ دھڑ دانے گرا رہی تھیں اور زیتون پھوپو کا سنولایا چہرہ اس کی حالت پر سیاہ پڑا تھا۔ دادا ابو البتہ تندہی سے ہمت کا مجسمہ بنے کھڑے تھے۔ اس نے پوری

آنکھیں کھول کر ادھر اُدھر کچھ تلاش کرنا شروع کر دیا۔

''کیا ڈھونڈ رہی ہو بالکیے؟'' حکیم جی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہ سیدھی ہو بیٹھی۔

''یہیں.....یہیں تو تھا وہ۔ ابھی یہیں تھا۔'' وہ ہسٹریائی انداز میں بولی اور یوں جیسے اس کی آواز گہرائی میں کھوسی رہی ہو۔

''کون تھا؟''

''وہی، وہی، ہاں، وہی تو تھا۔ ہاہاہا۔'' اس نے قہقہے لگانا شروع کر دیے۔ ہاہاہا.....آ آ.....اور پھر وہ چیخ



مار کر اندھیروں میں ڈوبتی چلی گئی۔

''اللہ.....! اللہ.....! میرے اللہ.....! رحم کر، آیت الکرسی کا دَم کا پانی اِس پر مارو، میری چندا.....! اللہ رے، ظلم سے حفاظت دے دے۔ اللہ رے.....!''

زیتون پھوپو کا چہرہ مزید سیاہ پڑ گیا۔ وہ اس کی تکلیف سے خوب واقف تھیں۔ آخر کو ان کی محبت ہی تو اُس کی اِس حالت کی وجہ بنی تھی۔

''زیتون.....! ہوش کر۔'' دادی ماں کی تسبیح کے دانے تیزی سے گرنے لگے۔ دادا ابو ویدو نارائن کو لیے باہر کی جانب چلے گئے۔

''فوری اُپائے یہ ہے چوہدری، کہ تم اس پتری کو شہر لے جاؤ، لاہور سے تھوڑا آگے میں ایک پتا بتائے دیتا ہوں۔ گرونانک کی جنم بھومی کے دوار، میرا بہت اچھا لنگوٹی ہے۔ وہ ایسی آتماؤں کو اوش رام رام ستے کر دیتا ہے۔ گھبراؤ نا، بس تم راستہ پکڑو۔ دیر ہوگئی تو بالیکا تو جائے گی ہی جان سے، پر تم سب کے گھر پہ جو شاپ ہے، وہ بھی سدا تک کے رہ جائے گا۔''

ویدو نارائن نے راستہ بتا دیا تھا۔ اب چوہدری بہارد باجوہ سوچوں میں غلطاں ڈیوڑھی پہ کھڑا تھا۔ کیسی قسمت تھی

اس کی بھی۔ ساری عمر اپنی بیٹی نے یہ دکھ جھیلا تھا اور اب..... عمر کی آخری منزل پہ اکلوتے بیٹے اور بہو کی موت کے بعد پوتی کو پالا تو یہ درد خوشبو کی طرح اس میں سما گیا۔

•.........•.........•

حسن آراء کا نام رکھتے وقت یقیناً اس کی خوبصورتی کا عمل دخل زیادہ رہا ہوگا۔ چوہدری ریاض باجوہ کی بیوی نے ایک بچی کو جنم دیتے وقت یہ بھی نہ سوچا ہوگا کہ وہ اس گلابی، کانچ سی گڑیا سے بہت دنوں کھیلنا بھی اپنے مقدر میں نہیں لائے۔

حسن آرا والدین کی ایکسیڈنٹ میں موت کے بعد حادثاتی طور پر بچ گئی تھی۔ ریاض باجوہ اور زیتون دو ہی بہن بھائی تھے۔ ریاض باجوہ، بہار و باجوہ کی امیدوں کا مرکز تھا۔ زیتون، ریاض سے بڑی تھی، شادی کے لیے جتنے بھی رشتے آئے، جانے کیوں بات بن نہ پائی اور یوں عمر کا ریشم ہاتھ سے پھسل گیا اور جو ہاتھ میں رہ گیا، وہ ایک حقیقت بن گیا۔ زیتون بانو صرف خوشبو بن کر رہ گئی تھی اور ایسی خوشبو جو صرف چہار دیواری کے اندر تک تو رہ سکتی ہے لیکن اسے کوئی باہر کا محسوس نہیں کر سکتا۔

زیتون پر ایک جن عاشق تھا۔ بات تو عجیب تھی لیکن جس پر گزرے، وہی جان سکتا ہے۔ زیتون پر دورے پڑنے لگے تھے۔ زیتون کی زندگی تو بے رنگ و ویران ہو ہی گئی تھی بلکہ اب تو ریاض باجوہ کی زندگی بھی اس اثر کے زیر اثر آ گئی تھی۔

جہاں ریاض باجوہ کے لیے رشتے کی بات آگے چلتی، زیتون کا جن آگے آ جاتا۔ ایسی باتیں بھلا کہاں چھپتی ہیں۔ وقت کیا تھا، دو دھاری تلوار تھا، خونی رشتوں کے مابین جس نے ان دیکھی خونی لکیروں کا حصار کھینچ دیا تھا۔ ریاض باجوہ پہلے گاؤں سے دور شہر گیا اور پھر بوجہ تعلیم ملک سے ہی باہر چلا گیا۔

•.........•.........•

پانچ سال کا عرصہ گزر گیا، کئی انہونیاں ہوئیں، گھر میں سرخ، سپید زیتون بانو ہلدی کا پتلا بن گئی۔ سرخی، سنہری رنگ میں ڈھلتے ڈھلتے اسے ڈھانچہ کر گئی تھی۔ بہن بھائی کی محبت میں ایک ان چاہا جن آ گیا تھا۔ زیتون پر دورہ پڑتا تو اس کی حالت عجیب ہو جاتی تھی۔ اس کے دل کے پاس بہت سارے درد یکدم ہی اٹھ جاتے۔ وہ واہی تباہی بکنے لگتی۔ شدت کرب سے آنکھیں خوں آشام ہو جاتیں اور اس کی آواز میں ایک سپاٹ سا مردانہ پن آ جاتا۔ گھر کی عزت تھی، لکشمی تھی، بھلا کیسے کسی سے ذکر کیا جاتا۔ اور پھر زیتون کے پاس سے کسی مزار سے اٹھتی بھینی بھینی سی خوشبو آنے لگی۔ اس کے بے قرار دورے بھی آہستہ آہستہ کچھ شانت ہو گئے تھے۔

ایک عرصے بعد گھر میں دور پار سے ایک رشتہ زیتون بانو کے لیے آیا تھا۔ عجیب پژمردگی اس خوشی کی گھڑی میں گھر کے در و بام سے پھوٹ رہی تھی۔

”بھین جی، آپ کو پتا ہے نا، زیتون کے بارے میں؟“ ماں نے اپنی پریشانی گوش گزار کی تھی۔

”مجھے سب پتا ہے لیکن اس میں اِس کا کیا قصور۔ یہ تو نمانی ہے، شادی کے بعد سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ آپ کیوں فکر کرتی ہو۔“ ان کا اطمینان دیکھنے لائق تھا۔ ”میں ہی بولتی رہوں، تسی وی تے کچھ بولو نا؟“

”او جی چوہدری صاحب، ساری باتوں کو پراں کرو اور یہ یاد رکھو، دھی کا مقدر سب سے بڑا جن ہے اور جی، یہ جن کوئی کب تک اپنے گھر رکھ سکتا ہے؟ بسم اللہ کرو جی، اور بس۔ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے جی۔ بس رب سوہنے کے کام ہیں سارے۔ ہم کو آپ کی دھی قبول ہے۔“

خالد بٹ اور زرینہ اپنے بیٹے بہادر بٹ کا رشتہ لائے تھے اور اس رشتے کے لیے پورا دباؤ ڈال رہے تھے۔ چوہدری بہار و کو بیٹی کی خوشیاں عزیز تھیں۔ انہوں نے ان لوگوں سے کچھ نہیں چھپایا تھا، خوامخواہ کے جھوٹ زندگی کو کبھی بھی مفلوج کر سکتے ہیں اور یہی وہ غلطی ہوتی ہے جو ابتدا سے پھانس کی طرح چبھتی ہوئی پوری کیل اور پھر چھینی سے کلہاڑی بن کر رشتوں کو جڑ سے کاٹ دیتی ہے۔

قبولیت کی سند پاتے ہی رشتہ پکا ہو گیا۔ زیتون کی گھبراہٹ حد سے سوا تھی اور پھر ان لوگوں کے جاتے ہی اسے شدید دورہ پڑ گیا۔ زیتون کا جن ظاہر ہو گیا تھا۔

•.........•.........•

ایک خوشبو کا احاطہ کمرے نے کر لیا تھا۔ چوہدری بہار و کمرے میں موجود تھے۔

"میری بیٹی کا پیچھا چھوڑ دو، تم جو بھی ہو لیکن یہ تو بتاؤ، انسان کی زندگی میں اولاد کیا مقام رکھتی ہے؟ جانتے ہو تم یہ؟ کیوں میری بیٹی کی زندگی درگور کرنا چاہتے ہو؟ ایک عرصے بعد اس کے نصیب میں خدا نے بَر بھیجا ہے، میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں اور اللہ کا اور اس کے رسولِ پاک ﷺ کا واسطہ دیتا ہوں، تم چلے جاؤ، اس نمانی کو بھی زندگی گزارنے اور زندگی کی خوشیوں میں سے حصہ لینے کا پورا حق ہے۔ خدارا، چلے جاؤ۔" چوہدری بہار و پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا اور زیتون خلاؤں میں گھور رہی تھی۔

اچانک خوشبو کے احاطے سے آواز بلند ہوئی تھی، مترنم سی آواز، دل میں اترتی سی، ملائم ملائم۔ "بزرگوار، آپ نے جو کہا، میں نے سنا، میں سب کچھ کہے بغیر جانتا ہوں؟ زیتون کو میں دنیا جہان کی خوشیاں دے سکتا ہوں۔ آپ میرا اس سے عقد کر دیں۔ میں یہ سب خود بھی کر سکتا تھا لیکن خیر، چھوڑیں، فی الحال میں نے جو کہا، میں اس صورت میں کہتا جب مجھے اس عقد کی اجازت ہوتی...... میرے پاس زیتون کی خوشیاں......"

"رک جاؤ، ابھی تم نے کہا، زیتون سے عقد کر دیں اور ابھی کہتے ہو، اجازت نہیں؟ ایک بات بتا دو، یہ پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہو؟ تم جانتے ہو، زیتون بانو کی شادی کسی صورت تم سے نہیں ہو سکتی؟"

"کیوں نہیں ہو سکتی؟ مگر خیر، اس وقت یہ بحث بے کار ہے، میں کسی صورت زیتون سے دور نہیں ہو سکتا اور ہاں بزرگوار، آپ نے جو فیصلہ کیا ہے، وہ زیتون کی زندگی خراب کر دے گا۔ میں سب دیکھ رہا ہوں، جو لوگ آپ کو ایک عرصے بعد یاد کر رہے ہیں، وہ کون ہیں؟ کیسے ہیں؟ جانتے ہیں آپ؟"

"میں اچھی طرح ان لوگوں کو جانتا ہوں، میرے اپنے رشتے دار ہیں۔"

"پندرہ سال سے آپ ان سے ملے نہیں ہیں اور کہتے ہیں کہ جانتے ہیں؟"

"تم...... تم یہ سب کیسے......" چوہدری بہارو باجوہ ہکلائے کہ وہ سب کچھ سچ ہی کہتا جا رہا تھا۔

"میں سب جانتا ہوں لیکن آپ لوگ فی الحال میری زیتون کے حال پر رحم کریں۔ اس کو میں نے کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے، بس کچھ دیر کے لیے ہی تو وہ میری ہوتی ہے۔"

"اگر تم واقعی زیتون سے محبت کرتے ہو تو خدارا، ہماری زبان کی لاج رکھ لینا۔ ہمیں بڑھاپے میں خوار مت کرو، بیٹا ہمارا پہلے ہی تمہاری وجہ سے ہم سے دور ہو گیا ہے۔"

"زیتون کی زندگی خراب......"

"تمہیں زیتون کی قسم ہے، تم اس شادی میں کوئی رخنہ نہیں ڈالو گے۔" چوہدری نے اس کی بات کاٹی۔

"ٹھیک ہے، میں کچھ نہیں کروں گا مگر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ زیتون نے تو یہیں آنا ہے۔" ایک عجیب سی پژمردہ آواز میں بولتا ہوا وہ غائب ہو گیا۔

چوہدری بہارو باجوہ نے خدا کے حضور گڑگڑا کر بیٹی کی خوشیوں کی دُعا کی۔ ساتھ ہی حشمت بی بی بھی تسبیح گھمانے لگی تھیں اور ہر گرتے دانے پر بیٹی کا مقدر اچھا ہونے کی دُعا کرتی جاتیں۔

•......•......•

شادی کا مقررہ دن آن پہنچا تھا۔ شادی والا گھر بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ زیتون کا رنگ روپ لوٹ آیا تھا۔ وہ پھر سے گلاب کی طرح نکھر گئی تھی۔ دولہا کو اب تک اس نے نہ دیکھا تھا، بس بہادر بٹ کے نام کو سوچتے ہی اسے مانوس سی خوشبو چہار سو مہکتی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک انجانا سا خوف بھی اس کے دل کے بہت پاس ہمکتا ہوا آن موجود ہوتا تھا۔ اس نے اب زندگی کو وقت کی دھار پر چھوڑ دیا تھا۔

غلغلہ اٹھا اور بارات آ گئی۔ جھٹ پٹ نکاح ہوا اور قبول ہے، قبول ہے کے الفاظ ادا ہوتے ہی اس کا دل ڈوب گیا۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ تمام بارات میں یکدم ہلچل مچ گئی۔ ویدو نارائن حکیم بارات کے ساتھ آیا تھا یا لایا گیا تھا، فوراً ہی زیتون کے کمرے میں آن موجود ہوا تھا۔

"سب لوگ یہاں کمرے سے نکل جائیں، چوہدری صاحب، آپ میرے ساتھ رہیے۔"

اور پھر ویدو نارائن نے جانے کیا کیا پڑھا، پھونکا اور پھر ایک تعویذ دیا۔

"اسے بالیکا کے الٹے ہاتھ پر باندھ دو چوہدری۔" حکم کی تعمیل ہوئی اور تعویذ باندھتے ہی زیتون

نے آنکھیں کھول دیں۔
''پتری، کیسا محسوس ہورہا ہے؟ طبیعت شانت ہوئی کہ نہیں؟'' انہوں نے رسان سے پوچھا۔
''جی، من ہلکا ہلکا محسوس ہورہا ہے۔''
''بس پتری، یہ تعویذ ہاتھ سے نہ اتارنا، کوئی بھی سے ہو، دھیان رکھنا کہ یہ تعویذ نہ اترنے پائے۔'' اور پھر وہ اس پر دوبارہ سے کچھ پھونک کر ایک چھوٹی سی دومنہ کی غلیل جیسی پیلی لکڑی سر پر مارتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔

•........•........•

حجلۂ عروسی میں وہ بہادر بٹ کا انتظار کررہی تھی۔ طبیعت مکدر سی ہونے لگی تھی۔ دروازے کی چرچراہٹ سے اس نے سارے دھیان ایک نقطے پر مرکوز کردیے اور خود کو آنے والے لمحات کے استقبال کے لیے تیار کرنے لگی۔ کسی اجنبی کا اپنا بن جانا جسے جانتے بھی نہ ہوں، اس کا زندگی بن جانا اپنے آپ میں خود ایک معجزہ ہوتا ہے۔ وہ جس کی زندگی خود آندھیوں میں رکھے دیے جیسی تھی، اسے روشن رکھنے کے لیے خدا نے جیون ساتھی کے روپ میں ناخدا بھیج دیا تھا۔
''السلام علیکم! بہادر بٹ نام ہے میرا اور امید کرتا ہوں کہ آپ مجھے اور میری خواہشات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کوئی ردوکد نہیں کریں گی۔''
یہ جملے اس کے کانوں میں رس گھول گئے لیکن اس میں اب تک اتنی تاب نہیں تھی کہ نظر اٹھا کر اسے دیکھ تو لے، وہ بس ہولے سے سر ہلا کر رہ گئی۔
''السلام علیکم! گلفام نام ہے میرا اور امید کرتا ہوں کہ آپ مجھے اور میری خواہشات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کوئی ردوکد نہیں کریں گی۔'' دوسری مختلف آواز اس ''ایک'' وجود سے آئی تھی۔
''السلام علیکم! اطلاس نام ہے میرا اور امید کرتا ہوں کہ آپ مجھے اور میری خواہشات کو......''
اس وجود سے تیسری مختلف آواز آئی اور وہ بے ہوش ہوکر بستر پر ڈھے گئی۔

•........•........•

''تم نے تو قسم کھائی تھی نا، بابا جان سے پھر کیسے مکر گئے؟''
''میں نے......''
''ہاں، تم نے۔ سنا ہے، تمہاری دنیا کے لوگ جھوٹ نہیں بولتے۔''
''میں نے قسم نہیں کھائی۔ اللہ پاک کی قسم، میں نے قسم نہیں کھائی۔ میں تو تم سے اس وقت سے عشق کرتا ہوں جب تم خود نہیں جانتی تھیں کہ تم کون ہو؟''
''کیا بکواس کررہے ہو تم؟ کیا تم میرے گھر پر میرے ساتھ نہیں تھے؟''
''اللہ جانتا ہے، نیک، پری وش، میں تو تم کو شادی کرکے لایا ہوں، جائز طریقے سے۔''
''اور بہادر بٹ......''
''او پری وش، تمہارے بہادر بٹ کا قصہ تو اس وقت ختم ہوگیا تھا، جب وہ بیس سال کا تھا اور ندی میں ڈوب گیا تھا۔ اس کو تو ختم ہوئے بھی پندرہ سال ہوچکے ہیں۔ میں نے تو اس کا جسم بھی پری وش، تمہارے لیے ہی لیا تھا۔ یقین کروگی، میں نے تمہارے جوان ہونے کا انتظار کیا مگر تمہارے اوپر میرا ئم زاد گلفام کا سایہ تھا۔ اب میں کیسے تمہارا ساتھ پا سکتا تھا؟ جب میں نے بابا کو تمہارے گھر بھیجا تو راستہ صاف ہوگیا۔''
''کیا یہ سب جو یہاں ہیں، چاچا، چاچی، یہ تمہاری حقیقت جانتے ہیں؟''
''تم یہ بات جان لو پری وش، کہ اگر یہ لوگ حقیقت جانتے تو زندہ نہ ہوتے۔ میں جن ہوں مگران کی متاعِ حیات ہوں۔''
''اور وہ دیدونارائن نے جو تعویذ دیا تھا، وہ......''
''وہ تعویذ...... تم اس کو چھوڑو۔ اپنی بات کرو۔ تم اس تعویذ کو ہاتھ بھی نہ لگانا۔ اب چھوڑو اِس قصے کو۔'' کچھ اکتایا ہوا سا اُس کا انداز تھا۔
''اس نے میری قسم اٹھائی ہے اور وہ میری جھوٹی قسم نہیں اٹھا سکتا۔'' وہ چلاّ ہی تو پڑی تھی۔ ''میں ایک کے بعد دوسرے جن کی قید میں زندگی نہیں گزار سکتی۔''
''ایسا مت کہو پری وش، میں تمہیں تمہارے طریقے سے، جائز طور پر بیاہ کرلایا ہوں۔''
''میں یہ سب نہیں مانتی، یہ گھر اور اس کے مکین...... میں زندگی کا سودا کسی ابہام سے نہیں کرسکتی۔

میں آدم کی اولاد ہوں۔ میرے نصیب میں آدم سے رشتہ نہیں تو کسی سے بھی نہیں۔"

اور یہ کہتے ہی زیتون نے تعویذ اتار کر آگ میں جلا دیا، تعویذ جلتے ہی جیسے ایک بھونچال سا آ گیا تھا۔ وہ سیج پر بیٹھی اپنے سہاگ کو اپنے بالکل پاس تڑپتے ہوئے دیکھ رہی تھی اور پھر جانے کب وہ بے ہوش ہوئی، کب کوئی کمرے میں آیا، کب اس کا سہاگ ہمیشہ کے لیے اس سے دور چلا گیا، کب اسے بیوگی کی چادر میں لپیٹا گیا، وہ کچھ بھی نہ جان پائی۔

•.......•.......•

چوہدری بہار واسے لٹا پٹا گھر لے آیا تھا۔ دو ماہ سے وہ سکتے میں تھی۔ شہر میں ہوتی تو اسے کوما کیس قرار دے دیا جاتا۔ بہن کی بربادی کی خبر نے بھائی کا پتھر دل پگھلا دیا۔ فطری محبت نے جوش مارا اور ریاض باجوہ لندن سے اپنی بیوی شازیہ اور اپنی محبت کی نشانی حسن آرا کے ساتھ پاکستان پہنچ گیا۔ کراچی سے انہوں نے گوجرانوالہ جانے کے لیے فلائٹ کنفرم کی اور ٹکٹ لے لیے۔ ایئرپورٹ سے باپ کو فون کرکے آنے کی اطلاع دی۔ بھائی کے آنے کی خبر سن کر زیتون کی لاش ایسے جسم میں زندگی سرسرانے لگی۔ اس کی آنکھوں میں قندیلیں چمکنے لگی تھیں اور چمکتی ہوئی آنکھیں زندگی کی علامت ہوتی ہیں۔

یہ معمولی تبدیلی حشمت بی بی کے لیے خوشی کا باعث بنی۔ انہوں نے مجازی خدا کو خبر دی۔ خوشیاں پھر سے گھر میں پیر رکھنے کو بے تاب تھیں۔ اب وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ پہلی بار بہو اور پوتی نے گھر میں قدم رکھنا تھا، اس استقبال کو تو یہ گھر دیدہ و دل فرشِ راہ کیے بیٹھا تھا۔ صبح سے شام ہوگئی لیکن انتظار کی گھڑیاں تھیں کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔ جوں جوں شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے، یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی خوف کا عفریت اپنے پورے پر پھیلائے اندھیرا کرنے کو بے تاب ہو رہا ہو۔ انتظار کرتے کرتے چولہے راکھ اور ہانڈیاں ٹھنڈی ہوگئی تھیں۔ حشمت بی بی کا دل وسوسوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا، مگر کیسی بے بسی تھی اس گھر کے مکینوں کی کہ اپنا دکھ کسی کو کہہ سن بھی نہیں سکتے تھے۔ بہارو چوہدری اور حشمت بی بی ایک دوسرے سے اپنا دکھ چھپائے آس کی چھتری تلے بیٹھے گھر کے صدر دروازے کو دیکھ رہے تھے۔

•.......•.......•

ایمبولینس کے تیز سائرن بج رہے تھے اور آن کی آن میں چوہدری بہارو کے گھر میں پورا گاؤں جمع ہوگیا تھا۔ صحن کے بیچوں بیچ دو چارپائیوں پر دو گھر کے نفوس سفید چادریں اوڑھے گہری ابدی نیند سو رہے تھے اور پاس ہی ایک کانچ کی گلابی گڑیا کلکاریاں مار کر ان کو اٹھانے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ وہ جو اس کی ایک کلکاری پر جی جان سے قربان ہو جاتے تھے، آج وقت نے کیسا کھیل کھیلا تھا کہ وہ اس کی کلکاریوں پر اٹھ تو کیا جاتے، سفید چادر تک سے نہیں جھانک سکتے تھے۔ درد سے بوجھل دل لیے زیتون جاگ گئی تھی، اس کا سکتہ کیا ٹوٹا کہ جیسے آنکھوں سے پانی کے چشمے پھوٹ پڑے تھے۔

زیتون، حسن آرا کو لپٹا کر بے حال ہوگئی تھی۔ بھائی کی نشانی اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی، مگر اسے بھی کوئی دیکھ رہا تھا۔ "کیوں ہے وہ اس کی گود میں؟"

اور پھر زیتون کو دورہ پڑ گیا۔ وہ تو شکر تھا کہ سب موجود تھے ورنہ کانچ کی گڑیا آج ہی ٹوٹ جاتی۔

•.......•.......•

حسن آرا کی صورت، اس گھر میں خوشیاں پھر سے لوٹ آئی تھیں۔ اس کے وجود سے جیسے زیتون دوبارہ سے جی اٹھی۔

بچے فرشتے کا روپ ہوتے ہیں، فرشتے کے آگے جن بے بس ہوتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ گلفام کے حصار کو حسن آرا نے توڑ دیا تھا۔ وقت کے بھید بھلا انسان کب جان سکتا ہے؟ حسن آرا جوں جوں قد نکالنے لگی تھی، اس کا حسن دو آتشہ ہوتا جا رہا تھا۔ گاؤں میں اسے اسکول بھیجا گیا تو اس نے استاد کو حیران کردیا۔ اتنی ذہین بچی جو ایک سے دوسرا لفظ دوسرے دن آپ ہی بنا لے، غیر معمولی ذہانت نے اسے جلد ہی دوسروں میں مزید ممتاز کردیا تھا۔ اوپر سے اُس کا غیر معمولی حسن......

زندگی پھر سے رواں دواں ہوگئی۔ اس نے مڈل تک تعلیم حاصل کرلی تھی۔ اسے اسکول سے گھر تک یوں لگتا کہ جیسے ایک خوشبو اس کے ساتھ ساتھ سفر کرتی

ہو۔ اس نے یہ ذکر کسی سے نہیں کیا تھا۔ زیتون میں اس کی اور اس میں زیتون کی جان تھی۔ اب زیتون پر دورے نہیں پڑتے تھے لیکن پھر بھی گھر میں ایک خوشبو رچ بس سی گئی تھی۔ بہارو چوہدری، حشمت بی بی اور زیتون اس خوشبو کی حقیقت سے خوب واقف تھے مگر حسن آرا وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ وہ کس سے ذکر کرتی، اسے تو یہ سب بالکل انوکھا اور مزے دار سا لگتا تھا اور اب تو اکثر ایسا ہوتا کہ وہ کسی چیز کو ذہن میں لاتی، نام لیتی اور اسے لگتا، وہ اس کی دسترس میں آ گئی ہے۔

اسے پورے گاؤں میں ظفر بہت اچھا لگتا تھا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس کی یکطرفہ محبت میں شدت آتی جا رہی تھی۔ اس کے لبوں سے اکثر زیتون یہ نام سننے لگی تھی۔ زیتون کو اس کا اس طرح سے باتیں کرنا اچھا لگتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ جیسے وہ پھر سے جوان ہو رہی ہو اور جو چیزیں اس عمر میں اچھی لگتی ہیں، حسن آرا کی جگہ وہ خود یہ سب کچھ محسوس کر رہی ہو۔ ظفر کو وہ بھی، خوب اچھی طرح جانتی تھی۔ چوہدری کرامت کو وہ کیسے بھول سکتی تھی۔ اس کا رشتہ بھی اس کے لیے آیا تھا اور پھر دوسرے ہی دن چوہدری کرامت کی ٹانگ ٹریکٹر کی زد میں آ گئی تھی۔ رشتہ طے نہ ہو پایا تھا۔ ظفر اسی چوہدری کرامت کا بیٹا تھا۔

•.........•.........•

''صرف میں نے آج اس سے اتنا کہا تھا پھوپھو کہ تم کالا کرتا پہنا کرو، تم پر اچھا لگتا ہے اور بس، میرا کہنا غضب ہو گیا۔ اتنی بڑی درخت کی ٹہنی اس کے سر پر پڑی کہ جیسے کسی نے زبردست گھات لگا کر نشانے سے ماری ہے۔''

وہ ہچکیاں لیتی ہوئی بتا رہی تھی اور زیتون کو حسن آرا کے اردگرد خوشبو یوں محسوس ہونے لگی جیسے کبھی اس میں سے پھوٹا کرتی تھی۔

''حسن آرا، چندا، تجھے کوئی خوشبو محسوس ہو رہی ہے؟'' زیتون نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں لیتے ہوئے پوچھا۔

''خوشبو!...... پھوپھو......! یہ خوشبو تو میری سہیلی ہے۔ میں نے تو ہمیشہ اسے اپنے آس پاس ہی پایا ہے۔ کیوں پھوپھو؟ کیا بات ہے؟'' حسن آرا کا اطمینان زیتون کو چونکا گیا تھا۔

''باہر جاتی ہو تو......'' زیتون کا جملہ جیسے کہیں بیچ ہی میں اٹک سا گیا تھا۔

''پھوپھو، یہ خوشبو تو میرے ساتھ ہر جگہ ہوتی ہے مگر آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟'' وہ مسکرانے لگی تھی اور زیتون بانو نے اسے اپنے سینے سے چمٹا لیا۔

''میری بچی، میری پھول، تُو نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ جانتی ہے، کتنا بڑا کام ہو گیا اور تجھے خبر بھی نہیں ہوتی؟''

''پھوپھو، کیا بات ہے؟ میں سمجھی نہیں۔ آپ کیا کہنا چاہتی ہیں، کھل کر کہیں۔''

اور پھر زیتون نے بغیر کسی تمہید کے اسے سارے حالات سے باخبر کر دیا۔ یہ سب کچھ سن کر حسن آرا ششدر رہ گئی تھی۔

''میرے اللہ......! یہ کیسے بھید ہیں، کس ہیر پھیر میں تو نے الجھا رکھا ہے میرے خاندان کو؟ مالک......رحم۔'' وہ کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور گھر کے اوپری حصے میں چلی آئی۔

''تم جو کوئی بھی ہو، اب میرے سامنے ظاہر ہو جاؤ۔'' حسن آرا نے جی کڑا کر کے کہا۔

''میں تو تمہارے ساتھ ہی ہوں، بھلا کیسے ظاہر ہو جاؤں؟'' جیسے خوشبو کو زبان مل گئی۔

''کیا چاہتے ہو؟''

''میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ زیتون تو مجھے ملی نہیں کہ اس پر میرے عم زاد کی قسم تھی اور پھر جب مجھے بہارو چوہدری نے قسم دی تو میں اور بے بس ہو گیا۔ وعدے کا پکا ہوں۔ میں نے کبھی پھر زیتون کو تنگ نہیں کیا۔''

''جھوٹ بولتے ہو تم، پھوپھو کو پھر بھی دورے پڑتے تھے، وہ سب تمہاری ہی وجہ سے تھے۔''

''میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں، اس پر ویدو نارائن کے تعویذ کے جلانے کے اثرات نے برا اثر ڈالا تھا اور پھر میرے عم زاد کی موت پر ہمارے قبیلے کے کچھ لوگوں نے بھی تھوڑا بدلہ لیا اور تم اور تمہارے والدین اس کی لپیٹ میں آئے۔''

''یہ سب سچ ہے کیا؟'' اس کی حیرت بجا تھی۔

''بالکل سچ، بالکل سچ ہے یہ سب۔ میرا یقین کرو، میں کسی کے نقصان کا سوچ بھی نہیں سکتا۔''

''اب مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''
''تمہارا ساتھ چاہتا ہوں۔ اب تم میری ہو کر رہو گی۔''
''میں تم سے ایک وعدہ لینا چاہتی ہوں، میرا ساتھ دو گے؟''
''تم حکم کرو۔''
''تم میرے ساتھ شامل لوگوں کو نقصان نہیں پہنچاؤ گے۔'' حسن آرا کو ظفر کا پھٹا ہوا سر یاد آ گیا تھا۔ ''اور میں پڑھنا چاہتی ہوں۔ تم میری پڑھائی کے مقابل نہیں آؤ گے۔''
''منظور ہے لیکن تم اس گھر سے گاؤں کی حدود تک جاسکتی ہو، اس سے باہر تم کہیں نہیں جاؤ گی۔''
''میں شہر میں تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہوں کیونکہ یہ یہاں ممکن نہیں۔''
''میں تمہاری ہر بات مانوں گا مگر تم میری ایک بات مانو گی؟ تم اس گاؤں کی حدود عبور نہیں کرو گی، ورنہ تم خود نتائج کی ذمے دار ہو گی۔''
''میں یہ ذمے داری قبول کرتی ہوں، میں پڑھنے ضرور جاؤں گی۔''

•......•......•......•

جن اور انس کے درمیان معاملہ شروع ہو گیا۔ حسن آرا کو بھی دورے پڑنے لگے تھے۔ زیتون نے ماں باپ کو سب کچھ بتا دیا تھا، دماغ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ بس قرآنی آیات کا پانی اور دم دُرود، مگر حسن آرا کی شہر جانے کی ضد بڑھتی چلی گئی اور گلفام کی شدت بھی۔

•......•......•......•

ویدو نارائن کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ کر بہارو سنگھ اس کے لنگوٹی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ حشمت بی بی تسبیح کے دانے گرا رہی تھیں اور زیتون، حسن آرا کے سرہانے بیٹھی تھی۔ اچانک حسن آرا نے آنکھیں کھول کر ارد گرد دیکھا تھا۔ دادا ابو کسی کو ساتھ لیے چلے آ رہے تھے۔
''پھوپھو، میری چوٹی باندھو۔ دادی امی، میرے سر پر اپنا دوپٹا رکھ دو آپ۔'' حسن آرا غائب دماغی سے کہہ رہی تھی۔
''ارے، کیا کہہ رہی ہے بچی؟ طبیعت تو......''
''میں بالکل ٹھیک ہوں، میری ہر بات کو محبت سے آپ نے برداشت کیا، آپ کی محبتوں کی مقروض ہوں۔ آپ سب اپنا بہت خیال رکھیے گا۔''
''ارے دیکھیے جی، کڑی کیسی باتیں کر رہی ہے؟'' حشمت بی بی نے قریب آتے بہارو چوہدری کو آواز دی تھی۔
''آتا ہوں، لے آیا ہوں میں ویدو نارائن کے لنگوٹی کو۔''
''سسری کال جی، اے ہی کڑی اے نا؟'' اس کی آنکھوں میں چمک کیا آئی کہ ہوا خوشبو سے معطر ہوگئی۔ ''اٹھ جا کڑیے، بس بہت انتظار کرایا۔'' وہ اس کے قریب ہو بیٹھا۔
''میں نے کہا تھا نا کہ گاؤں کی حدود سے باہر کی حد تمہاری نہیں، اب تم خود کو میرے پاس لائی ہو، میں بالکل ذمے دار نہیں ہوں۔''
''جانتی ہوں، میں تیار ہوں۔'' وہ خواب کے سے عالم میں بول رہی تھی۔
''کیا بول رہی ہے، اونچی بول پتر؟'' حشمت بی بی نے اس کا ہاتھ سہلایا۔
''آپ لوگوں نے چنگا کیا، اس کڑی کو لے آئے، اب آپ لوگوں کی پریشانی میں چٹکی بجاتے ختم کروں گا۔ اِدھر تک آنے میں آپ لوگوں کو جو کشٹ ہوا، اس کے لیے معذرت۔'' اور پھر اس نے چٹکی بجائی اور غائب ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی حسن آرا بھی جیسے دھواں ہو گئی تھی۔

•......•......•......•

پانچ سال اور گزر گئے مگر وہ نہ مل سکی۔ گھر سے حسن آرا کیا گئی کہ خوشبو بھی رستہ بھول گئی۔ اللہ کے بھید کون جانے؟ زندگی اپنی ڈگر پر چل پڑی ہے، مگر یہ زندگی بڑی بوجھل ہے۔ گہری جھیل کی طرح ساکت، سورج آتا ہے، پانی چمک اٹھتا ہے اور روشنی منعکس کرتا ہیروں میں ڈھل جاتا ہے۔ رات آتی ہے، چاندنی ہر سو پھیل جاتی ہے، ہجر کو کٹنے لگتا ہے، یوں لگتا ہے جیسے اس جھیل میں حسن آراء کی سواری گلفام کے ساتھ اتری ہے۔ چاند کی چودھویں رات کو زیتون اس خوشبو کی تلاش میں پورے گھر میں ڈولتی پھرتی ہے مگر بھلا خوشبو بھی ہاتھ آتی ہے اور اگر جو آ جائے تو رہتی کب تک ہے؟

•......•......•......•



گُلابو

شکیلہ انجم طارق

لاہور سے، ایک جن اور آدم زادی کی محبت کا سچا واقعہ

''دیکھو رانو موسم کتنا پیارا ہو رہا ہے، لگتا ہے ابھی بارش شروع ہو جائے گی۔'' آسمان سیاہ بادلوں کی ٹکڑیوں میں منہ چھپائے کھڑا تھا، ٹھنڈی ٹھنڈی مست ہوا نے پھولوں، پودوں اور ''انسانوں'' کو عجیب سی سرشاری اور مستی سے دوچار کر رکھا تھا، کچن میں کام کرتی رانو نے اُس کی چہکتی آواز پر باہر نکل کر آسمان کی طرف دیکھا، تو مسکرا کے رہ گئی، کیوں کہ پارو نے سچ کہا تھا، بارش واقعی برسنے کو تیار تھی۔

وہ بھی پارو کے ساتھ دلفریب موسم کی رنگینی میں کھوگئی۔ وہ رانو کے ساتھ گلابوں کے باغ میں کھڑی تھی کہ اُسے اچانک ایک دِل فریب سی تیز خوشبو کا احساس ہوا، وہ خوشبو گلابوں کی نہیں تھی، نہ اُس سے ملتی جلتی تھی۔ وہ ایک الگ سی خوشبو تھی جو بس محسوس ہو رہی تھی، لیکن کہاں سے اور کیوں آ رہی تھی یہ پتا نہیں چل رہا تھا۔ رانو نے بھی اس تیز خوشبو کو محسوس کر لیا، اسے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔

''ارے یار! یہ خوشبو کہاں سے آ رہی ہے۔ کیا تمہیں بھی محسوس ہو رہی ہے؟'' رانو نے اُس سے سوال کیا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور کہیں کھو سی گئی۔

گلابوں کا یہ بڑا سا باغ بابا جانی نے اُس کی فرمائش پر گھر کے سامنے والے احاطے میں بنوایا تھا، جہاں اُس کا بیش تر وقت گزرا کرتا تھا، اس باغ میں تقریباً ہر رنگ کا گلاب تھا۔ وہ گلابوں کی دیوانی تھی، سو بابا جانی نے اُس کے لیے بہت محنت اور پیار سے یہ باغ بنوا دیا جو اس کی زندگی کا سب سے خوب صورت تحفہ تھا۔

بابا جانی کی گاؤں میں ڈھیروں زمینیں تھیں، وہ ایک بڑے اور نیک دل زمیندار تھے۔ سب گاؤں والے اُن کی بہت عزت کرتے تھے۔ وہ اور رانو شہر کے بہترین کالج میں پڑھ رہی تھیں۔ دونوں سگی بہنیں تھیں اور چھٹیوں کی وجہ سے گاؤں آئی ہوئی تھیں۔

گلابوں والے باغ میں، ایک طرف گلاب تھے اور دوسری طرف امرود، جامن، آم، مالٹے، آڑو اور فالسے کے درخت تھے، جب کہ کچھ فاصلے پر انگور کی بیلوں نے عجیب سی دِل کشی کے ساتھ اپنی جگہ بنائی ہوئی تھی۔ ایک طرف مصنوعی آب شار تھی اور باغ کے پیچھے بڑی سی نہر گزرتی تھی۔

رانو کا اصل نام رانیہ اور پارو کا پلوشہ تھا، لیکن وہ دونوں اپنے اصل نام سے کم اور رانو، پارو کے نام سے زیادہ مشہور تھیں۔

پارو گلابوں کی شیدائی تھی۔ اُس کا بس چلتا تو وہ سارا وقت اسی باغ میں گزارتی جاتی لیکن شام ڈھلتے

صورت ماحول میں، کوئی نادیدہ مخلوق بھی اپنی موجودگی کا احساس دلا سکتی ہے۔''



ہی بی جی اُسے گھر بلا لیتیں کہ مغرب کے بعد وہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔ بی جی کا کہنا تھا کہ اتنے خوب

جیسے ہی شام کے سائے گہرے ہوتے، سکھاں اُن کی گھریلو ملازمہ اُسے بلانے آجاتی اور

پارو کو لگتا اُس کا دل وہیں رہ گیا ہے۔ وہ نا چاہتے ہوئے بھی اِک اِک پودے اور درختوں کو نظروں میں سموتے ہوئے واپس آجاتی۔ یہ اُس کا روز کا معمول تھا۔ سب لوگ اُس کے اس ''شوق'' سے بخوبی واقف تھے، سو وہ اُسے زیادہ سے زیادہ وقت گلابوں والے باغ میں گزارنے دیتے تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گلابوں والے باغ کے ساتھ اُس کا عشق بھی بڑھتا گیا۔ اُسے سب چھیڑتے کہ جب تمہاری شادی ہوجائے گی تب کیا کرو گی؟'' تو وہ ہنس کر کہتی۔

''اِسے اُڑا کے اپنے ساتھ لے جاؤں گی، جہاں جاؤں گی یہ گلابوں والا باغ میرے ساتھ جائے گا۔ ویری سمپل!!'' وہ چٹکیوں میں بات بناتی تو سب ہنس پڑتے، اس بات سے بے خبر تھے کہ کوئی اور بھی ہنس رہا ہے اُس کے ساتھ۔ آج وہ جیسے ہی باغ میں آئی، اُسے لگا جیسے کوئی پکار رہا ہو۔ ''گلابو! گلابو! میری گلابو......'' اُس نے بے ساختہ اِدھر اُدھر دیکھا، کوئی نہیں تھا۔ وہ کچھ اُلجھی اُلجھی سی آگے بڑھی اور آم کے درخت پر بندھے اپنے جھولے پہ بیٹھ کے جھولے لینے لگی، دفعتاً اُسے وہی مانوس سی تیز خوشبو محسوس ہوئی۔ کسی نے اُسے سرگوشی میں سلام بھی کیا تھا، وہ ڈرپوک نہیں تھی، لیکن یہ سب اُسے ڈرانے کے لیے کافی تھا، وہ پھر بھی وہیں ڈٹی رہی اور ذرا خوف زدہ لہجے میں بولی۔

''کون ہو تم؟ سامنے کیوں نہیں آتے...... مجھے کیسے جانتے ہو؟'' جواباً زوردار قہقہوں کی آواز آئی۔

''اوپر دیکھو گلابو...... بھئی میں ہوں......''

پارو نے جیسے ہی اوپر کی طرف نگاہ کی تو لہراتی ہوئی زمین پر گرنے لگی۔ اِس سے پہلے کہ وہ باغ کی ہری ہری اور نرم نرم گھاس پر گرتی، دو مہربان ہاتھوں نے اُسے اُٹھالیا اور آہستگی سے، احتیاط کے ساتھ بینچ پر لٹادیا، اور نشانی کے طور پر اُس کے ہاتھ میں پھول تھمادیا۔

تھوڑی دیر بعد پارو کو ہوش آگیا۔ سارا واقعہ پوری جزئیات کے ساتھ نگاہوں میں گھوما تو وہ خوف سے کانپنے لگی اور جب ہاتھ کی طرف نظر گئی تو وہ چیخنے لگی۔ اس کی گلابی ہتھیلی پر عجیب سی شکل کا پھول تھا، جس کی ہر پتی علیحدہ رنگ کی تھی اور اُس پھول میں شعاعیں سی پھوٹ رہی تھیں۔ وہ کوئی عام پھول نہیں تھا جو خاص الخاص پھول تھا، ایک خاص الخاص ہستی کے لیے تھا۔ پارو خوف زدہ، حواس باختہ سی وہاں سے بھاگتی ہوئی اپنے گھر کی طرف چلی گئی۔

گھر آکے رانو کو ایک ایک بات تفصیل سے بتائی تو رانو نے کہا کہ ''اگلے روز وہ بھی اُس کے ہمراہ گلابوں والے باغ جائے گی اور دونوں مل کے اُسے تلاش کریں گے۔''

☆......☆

رات کو پارو سونے کے لیے بستر پر آئی تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہ خوب صورت سا عجیب و غریب مختلف رنگوں والا پھول اُس کے بستر پر موجود ہے اور اُس میں سے ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ رہی ہے...... اُس نے ڈرتے ڈرتے پھول کی طرف ہاتھ بڑھایا...... پھول کی روشنی ایک دم تیز ہوگئی اور ساتھ ہی وہ پراسراری تیز خوشبو کمرے میں پھیل گئی۔

''ڈرو نہیں گلابو...... میں تمہارا غلام ہوں...... یہ پھول میری نشانی ہے، جب تم اِسے چھوؤ گی تب ہی میں حاضر ہوا کروں گا۔ اور میرے آنے کی نشانی خوشبو اور تیز روشنی ہوگی۔'' ایک مہربان سی آواز نے پارو کو مخاطب کیا۔ اس بار پارو کا حوصلہ بڑھا۔ اُس نے فوراً پوچھا۔

''تم کون ہو؟ اور مجھے کیسے جانتے ہو......اور میرا نام گلابو نہیں پارو ہے پارو!''

جواب میں ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا۔

''ہاہاہاہا! میں جو کوئی بھی ہوں تمہارا دوست ہوں۔ میں تمہیں بہت پسند کرتا ہوں اور تمہیں ''روزِ اوّل'' سے جانتا ہوں۔ جب تم پیدا ہوئی تھیں تب سے میں تو گلابوں والے باغ میں رہتا ہوں اور رہی بات تمہارا نام پارو ہے تو میں یہ بھی جانتا ہوں، لیکن مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا، میرے لیے تو تم گلابو ہو اور گلابو ہی رہو گی، گلابوں جیسی خوب صورت اور نرم و نازک سی......'' اُس نے اُسے تفصیلی جواب سے

نوازا تو وہ ہنس دی۔

"ہاں جی یہ ہوئی نا دوستوں والی بات، لو ملاؤ ہاتھ...... آج سے ہم تم دوست ہیں۔ تم جب بھی مجھے یاد کرو گی میں حاضر ہو جایا کروں گا، اب تم آرام سے سو سکتی ہو......"

پارو نے اس سے ہاتھ ملایا۔ اُس کا ہاتھ کیا تھا جیسے ریشم سے بھی زیادہ نرم گویا ہڈیوں سے پاک...... اُس کا ننھا سا ہاتھ اُس کے ریشمی ہاتھ میں، آ کے خوشبو دار سا ہو گیا۔ اچانک اُسے لگا کہ اُسے سخت نیند آ رہی ہے، سو وہ ایک ٹراس کے عالم میں اپنے بیڈ تک آ گئی اور ایک منٹ کے اندر اندر نیند کی آغوش میں، کھو گئی۔

رانو کے علاوہ پارو نے جان بوجھ کے یہ سب باتیں کسی اور کو نہیں بتائیں کہ وہ اس راز کو راز ہی رکھنا چاہتی تھی۔ رانو کو بھی سختی سے تاکید کر دی تھی کہ وہ اس سلسلے میں اپنا منہ بند رکھے اور کسی سے کچھ نہ کہے۔ رانو نے وعدہ کیا اور اُس کا ہمیشہ ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔

پارو اور رانو دونوں مقررہ وقت پر گلابوں والے باغ پہنچ گئیں تو انہیں لگا کہ باغ میں موجود ہر پھول، ہر پودے نے انہیں خوش آمدید کہا ہے۔ اُن کی آمد کے ساتھ ہی مسحور کن ہوا کے جھونکے چلنے لگے، حالاں کہ باغ سے باہر ایسا کچھ بھی نہیں تھا، ہوا بالکل ساکت تھی۔

پارو نے اوپر کی طرف منہ کر کے کہا۔ "لو بھئی ہم آ گئے...... تم بھی آ جاؤ اور رانو کو بھی اپنا جلوہ دکھاؤ!"

یکا یک فضا میں ہلچل سی ہوئی، یوں لگا جیسے کسی بادشاہ کی کوئی سواری آ رہی ہے...... تھوڑی دیر بعد شہزادوں کی سی آن بان لیے چاندی کے سے چمکتے لباس میں، وہ حاضر ہوا۔ آج وہ اپنی اصل شکل کی بجائے انسانی روپ میں حاضر ہوا تھا۔ رانو اور پارو تو اسے دیکھتے ہی رہ گئیں۔ اتنا حسین اور خوبرو نوجوان انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں بھی اس عجیب و غریب پھول جیسا ایک اور پھول تھا جو اُس کی پہچان تھا، ساتھ ہی تیز خوشبو نے اِرد گرد کے ماحول کو ڈھانپ ۔

"جی جناب میرا نام شاہِ زرناب ہے۔ قوم جنات میں سے ہوں۔ اور گلابو کا دوست ہوں...... اُمید ہے آپ بھی بُرا نہیں مناؤ گی اپنی بہن کی طرح!! ہم تینوں دوست بن کے رہ سکتے ہیں اور ہاں مجھ سے خوف کھانے کی ضرورت نہیں، میں ایک شریف جن ہوں......"

رانو جو منہ کھولے، آنکھیں جھپکائے بغیر اسے دیکھ رہی تھی، پارو کے متوجہ کرنے پر ہوش میں آئی۔

پارو کو اس کے "شریف جن" کہنے پر زوردار ہنسی آ رہی تھی، جو وہ چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد تینوں ہوائی کھٹولے پر بیٹھے اُڑے جا رہے تھے، ساتھ ہی خوش گپیاں بھی لگا رہے تھے...... تینوں کو ایک دوسرے کی سنگت میں بہت مزا آ رہا تھا...... لگ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ اُن میں سے نہیں ہے۔ وہ اس وقت اُن دونوں جیسا ہی لگ رہا تھا، اور اُن ہی میں سے لگ رہا تھا...... رانو کو نشانی کے طور پر اُس نے سچے موتیوں سے بنی ہوئی ایک انگوٹھی دی، جب کہ پارو کو بیش قیمت، لاکٹ دیا، جس میں ہیروں اور موتیوں سے گلاب کا پھول بنا ہوا تھا، اور ہر پتی کا رنگ الگ الگ تھا۔ لال، ہلکا گلابی، فیروزی، زمرد، سبز اور سفید...... جب سب رنگ چمکتے تو بہت خوب صورت لگتے...... دونوں کو اپنے یہ تحفے بہت پسند آئے۔ شام ڈھلتے ہی شاہ زرناب دونوں کو باحفاظت اُن کے گھر کے سامنے اُتار گیا۔

اُن کے تحائف کی خاص بات یہ تھی کہ یہ بس ان دونوں ہی کو نظر آتے تھے اور کسی کو نظر نہیں آ سکتے تھے، لہٰذا رانو اور پارو بلا خوف و خطر انہیں استعمال کرتیں اور خوب خوش ہوتیں۔

☆......☆

شاہِ زرناب کی سال گرہ آ رہی تھی، جو وہ ان دونوں کے ساتھ منانا چاہتا تھا۔ ان دونوں نے خفیہ خفیہ دو کیک بنائے اور خوب صورت سا اُسے ڈیکوریٹ کیا اور گلابوں والے باغ میں آ گئیں۔ تھوڑی دیر بعد شاہ زرناب کی سواری بادِ بہاری آ گئی...... دونوں نے اُسے

خوش آمدید کہا۔
سال گرہ کی مبارک باد دی تو شاہ زرناب نے بتایا کہ یہ اُس کی 250 ویں سالگرہ ہے اور خاص الخاص ہے۔ دونوں نے اسے اپنے ہاتھ کے بنائے ہوئے کیک کھلائے تو شاہ زرناب نے فضا میں ایک چٹکی سی بجائی، آن کی آن میں گلابوں والا باغ انواع واقسا کے کھانوں سے سج گیا۔ ہر چیز کا ذائقہ دنیا کی چیزوں سے کہیں مختلف اور کہیں ذائقے دار تھا۔ یہ ایک جن کا ادنیٰ تحفہ تھا، جو انہیں دیا گیا تھا۔
پارو نے شاہ زرناب کو اپنے باغ کا ایک نایاب قسم کا گلاب تحفے میں دیا، جب کہ رانو نے اپنے ہاتھ سے کڑھائی کیا ہوا رومال تحفتاً دیا، جسے اُس نے شکریے کے ساتھ قبول کرلیا۔
شاہ زرناب نے اُن سے وعدہ لیا تھا، کہ وہ کسی تیسرے کو ''اُس'' کی اصلیت کا نہیں بتائیں گی، ورنہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نظروں سے اوجھل ہوجائے گا جو پارو اور رانو کو کسی قیمت پر قبول نہیں تھا، سو وہ تہہ دل سے وعدہ کر بیٹھیں کہ وہ اس کا راز، راز میں ہی رکھیں گی۔
ایک دن پارو اکیلی اپنے گلابوں والے باغ میں آئی جہاں شاہ زرناب بیٹھا اُسی کا انتظار کررہا تھا۔
''گلابو! تم مجھے ہمیشہ اپنے پاس پاؤ گی، جب تک یہ پھول تمہارے پاس رہے گا۔ میں تمہاری راہوں میں آتا جاتا رہوں گا۔ کوشش کرنا یہ کبھی تم سے گم نہ ہو۔ اگر یہ کھو گیا تو سمجھ لینا میں بھی کہیں کھو جاؤں گا جو تم بھی نہیں چاہو گی اور نہ میں چاہتا ہوں۔ گلابو تم سے عشق کیا ہے میں نے۔ کیا ہوا جو میں تمہاری قوم میں سے نہیں یہ بتاؤ گلابو کہ عشق میں، ملن کہاں ضروری ہے؟ عشق تو آگ کا دریا ہے اور میرے لیے تمہیں ایک نظر دیکھنا ہی کافی ہے...... گلابو تم بھی تو کچھ کہونا!'' زرناب نے پیار سے کہا۔
''میرے پیارے زرناب! میں بھی تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گی، اپنے دل میں، اپنی باتوں میں، اپنی یادوں میں...... بہت خوش قسمت ہوں کہ کوئی مجھے، مجھ سے بھی بڑھ کر چاہتا ہے۔ شاہ جی کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تم اپنی دنیا چھوڑ کر ہمارے ساتھ ''انسان'' بن کر رہو اور مجھ سے شادی کرلو......'' پارو نے اپنی دانست میں آسان ساحل بتایا جسے سُن کر شاہ زرناب نے قہقہہ لگایا۔
''نہیں میری گلابو میں ایسا نہیں کرسکتا۔ ہماری بھی حدود و قیود ہوتی ہیں۔ تم سے دوستی کی اجازت اسی شرط پر ملی تھی کہ تمہارے ساتھ کبھی شادی نہیں کروں گا اور نہ اپنی برادری کو چھوڑوں گا......اب تم ہی بتاؤ اگر شادی کرتا ہوں تو غدار اور ''وعدہ خلاف'' کہلاؤں گا اور باقی برادری تمہیں نقصان پہنچانے کے درپے ہوجائے گی، سو بہتری اور بھلائی اِسی میں ہے کہ میں اور تم ساری عمر اچھے اور مخلص دوستوں کی طرح رہیں۔ چاہے کچھ بھی ہوجائے، میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا میری گلابو......'' شاہ زرناب جذباتی ہوتے ہوتے رہ گیا۔ خود پارو کی خوب صورت آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تیر رہے تھے۔ اُس نے زرناب کا ہاتھ تھام کے لبوں سے لگالیا تو وہ بے بس ہوکے رہ گیا۔ بہت دیر تک وہ دونوں ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔ پارو جب جانے لگی تو اس کی گود سے چمکتے موتی گرتے چلے گئے۔ اُس نے حیرانی سے شاہ سے پوچھا۔
''اب یہ کیا ہے؟''
شاہِ زرناب نے بے حد چاہت سے جواب دیا۔
''گلابو جی، یہ تمہاری آنکھوں سے نکلنے والے ''موتی'' ہیں۔ میں اُنہیں زمین پہ گرا کے اُن آنسوؤں کی توہین نہیں کرسکتا تھا، سو انہیں آنسوؤں سے موتیوں میں تبدیل کردیا، لو یہ موتی سنبھالو اور آئندہ رونے سے پرہیز کرنا، کیوں کہ مجھے تمہارا رونا نہیں صرف اور صرف مسکراہٹ اور تمہاری ہنسی پسند ہے!!'' جواباً پارو مسکرا کے رہ گئی۔
☆......☆
پارو اور رانو کی چھٹیاں ختم ہوئیں، تو شاہِ زرناب انہیں شہر تک چھوڑنے آیا۔ یہ اور بات تھی کہ اس بات کی کسی تیسرے کو خبر تک نہ ہوئی۔
''دیکھو گلابو اپنا بہت خیال رکھنا...... تمہیں خوش دیکھنا اور خوش رکھنا میری زندگی کا مقصد ہے۔'' شاہِ

زرناب نے ہوا میں تحلیل ہوتے ہوئے مخصوص الفاظ دہرائے تو پارو سر ہلا کے رہ گئی۔
یونیورسٹی میں اُس کی خوب صورتی اور ذہانت کے چرچے زبان زدِعام تھے۔ ہر نوجوان اُس سے دوستی کرنا چاہتا تھا، لیکن وہ سب کو مسلسل نو لفٹ کا بورڈ دکھا رہی تھی، ایسا وہ شاہ زرناب کی پاکیزہ سی محبت میں کر رہی تھی، جس نے کبھی بھی محبت کی توہین نہیں ہونے دی تھی اور وہ اس بات کو بہت سراہتی تھی کہ "پاور اور سپر پاور" ہونے کے باوجود اُس نے کبھی کوئی ناجائز فائدہ نہیں اُٹھایا تھا اور یہی بات اُسے باقی انسانوں (لڑکوں) پر سبقت دلا رہی تھی۔
ہر لڑکا محبت کی آڑ میں ٹائم پاس کے چکر میں، محبت جیسے حسین جذبات کو آلودہ کرنے کے چکر میں تھا۔ گھڑی دو گھڑی کی دوستی کے لیے وہ اپنی عزت نیلام نہیں کرنا چاہتی تھی...... اُسے شاہ زرناب دوسروں سے بہت بلند اور خوب صورت نظر آیا۔
دوسری طرف شاہ زرناب کے ذریعے اُس کے ہر پل کی خبر رکھ رہا تھا، اُسے بے پناہ خوشی تھی کہ اُس کی پیاری گلابو کوئی عام لڑکی ثابت نہیں ہوئی تھی اُسے لگا کہ اسے گلابو کی عادت سی ہوگئی ہے اور عادتوں کو بدلنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ ویسے بھی عادتیں کب بدلتی ہیں۔ نہ کسی کے کہنے پہ اور نہ ہی خود کو سمجھانے پر...... عادتیں تو بس عادتیں ہی ہوتی ہیں!!
شاہ زرناب اور گلابو دو مختلف دنیا کے باسی، پر اُن کے دل ایک دوسرے کے لیے دھڑکتے تھے اور رانو اُن کے اِن پاکیزہ جذبوں کی امین تھی۔
پارو اور رانو نے اپنی تعلیم مکمل کی تو گاؤں واپس آ گئیں، جہاں شاہ زرناب اور گلابوں والا خوب صورت باغ اُن کا منتظر تھا......
شاہ زرناب کی محبتیں کچھ اور شدت سے سامنے آنے لگیں، لیکن اُن میں ہوس کا کوئی رنگ شامل نہیں تھا۔ وہ اپنی گلابو کو اُسی عقیدت اور احترام سے چاہتا تھا جس طرح پہلی دفعہ عزت و احترام سے اُسے چاہنے کا آغاز کیا تھا۔
پارو کی دنیا میں بھونچال اُس وقت آیا جب اُس کے لیے دوسرے گاؤں سے بڑے چوہدری صاحب کے سرجن بیٹے کا رشتہ آیا۔ یہ رشتہ ہر لحاظ سے موزوں تھا۔ پارو چاہتے ہوئے بھی انکار نہیں کرسکتی تھی، کیوں کہ اگر وہ انکار کرتی تو وہ راز سب کے سامنے کھل جاتا جس کی برسوں اُن تینوں نے حفاظت کی تھی اور اقرار کرتی تو وہ شاہ زرناب کی محبتوں کے ساتھ ساتھ کسی اور کی محبت کو شامل کردیتی جو اسے کسی صورت گوارا نہ تھا، آگے بھی کھائی اور پیچھے بھی کھائی...... بچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی، سو اُس نے شاہ زرناب سے مشورہ کر کے اپنے گھر والوں کو ہاں کردی۔ اُس روز دونوں اپنی بے بسی پہ خوب پھوٹ پھوٹ کے روئے......

☆......☆

بالآخر پارو کی ڈولی، شاہ زرناب کی موجودگی میں ڈاکٹر ارشد خان کے گھر اُتری۔ گلابوں والا باغ آباد ہونے کے باوجود ویران، اجڑا اجڑا اور سوگوار لگ رہا تھا، گلابو کی جھلک ہر جگہ نظر آرہی تھی۔ اُس کی یادوں نے شاہِ زرناب کے اردگرد میلہ سا لگا رکھا تھا۔ وہ کمی بچوں کی طرح خوش ہوتا تو تھوڑی دیر بعد ایسے افسردہ ہو جاتا جیسے کوئی اپنی سب سے قیمتی چیز کہیں رکھ کے بھول گیا ہو...... جو بہت تلاش کے باوجود نہ ملے اور اس وقت انسان کی جو حالت ہوتی ہے وہی شاہِ زرناب کی ہو رہی تھی۔
کون کہتا ہے کہ محبت پہچانی نہیں جاتی۔
محبت کے سفر میں اُس نے اپنا سب کچھ تیاگ دیا تھا، لیکن صلہ اُس نے کچھ بھی تو نہیں چاہا تھا کہ یہی عشق کی معراج ٹھہرا...... خوشبو کی صورت۔ وہ آج بھی اپنی گلابو کے ہمراہ ہے۔ جب تک دونوں زندہ ہیں گلابوں والا باغ اور گلابو دونوں مہکتے رہیں گے...... دلوں میں وفا کی صدائیں بلند ہوتی رہیں گی کہ محبت تو محبت ہوتی ہے، پہچان کا سفر مل جائے تو معتبر...... اور اگر نہ ملے تو بے نام و نشان جزیرے کی طرح زمینِ دل کو شاد و آباد رکھتی ہے...... سب کہتے ہیں، محبت مر نہیں سکتی۔
گلابوں والا باغ بھی یہی کہتا ہے......
شاہ زرناب بڑے خوب صورت جذبوں والا بھی یہی کہتا ہے۔
اور سوہنی گلابو بھی لبوں پہ یہی گیت سجائے رکھتی ہے۔

☆......☆



نشانی



بشیر احمد بھٹی

ایک ایسے نوجوان کا قصہ، جسے جنات کی شادی دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا

جس طرح انسانوں میں اچھے بُرے لوگ پائے جاتے ہیں، اسی طرح قوم جنات میں بھی اچھے برے جن ہوتے ہیں۔ جس طرح اچھی عادات و خصائل رکھنے والے اچھے انسانوں سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے اور برے انسان دوسروں کے لیے تکلیف اور نقصان کا سبب بنتے ہیں، بالکل اسی طرح برے اور کٹھور جنات بھی لوگوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ اچھے جنات لوگوں کو فائدہ نہیں پہنچاتے تو نقصان بھی نہیں پہنچاتے۔ بعض اوقات ان جنات میں سے کوئی جن انسانی روپ میں سامنے آ کر خوش خلقی کا مظاہرہ ضرور کر جاتا ہے۔ اس طرح اس کی یہ نیکی اپنے انمٹ نقوش چھوڑ جاتی ہے۔ ذیل میں جو واقعہ میں بیان کر رہا ہوں۔ یہ بھی ایک جن کی خوش خلقی اور میزبانی پر مبنی واقعہ ہے۔ پر اس جن نے میزبانی کا شرف حاصل کر کے ہم دو انسانوں کو اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔ ترنڈہ محمد پناہ اور ظاہر پیر سے براستہ روڈ صادق آباد کی جانب سفر کیا جائے تو راستے میں سردار گڑھ آ جاتا ہے۔ اب تو ہر جانب چھوٹی بڑی تارکول کی سڑکیں بن گئی ہیں، پہلے یہ سڑکیں ناپید تھیں۔ ایک آدھ پکی اینٹوں کی سولنگ ہوتی تھی یا کچے پکے راستے یا پگڈنڈیاں ہوتی تھیں، یہ کم از کم پینتالیس پچاس سال قبل کی بات ہے۔ اس وقت گھنے جنگلات کی بھرمار تھی۔ پاکستان کو وجود میں آئے ہوئے پندرہ بیس برس ہو چکے تھے۔ اسی وقت انسانی آبادی خال خال تھی اور ویران علاقے بہت زیادہ تھے، پھر قدیم تناور درخت، گنجان خودرو جھاڑیاں اور جنگلی پودے گزرگاہوں کا احاطہ کیے ہوتے تھے۔ پکی بلڈنگیں کم اور کچے پکے مکانات زیادہ تھے۔ ویران علاقوں میں جنات کا بسیرا ہوتا تھا۔ ہندو، جن کو مقامی لوگ ''کراڑ'' کہتے تھے۔ کراڑوں کے مکان پُراسرار قسم کے ہوتے تھے۔ یہ لوگ مکانوں کی تعمیر میں دو ڈھائی انچ موٹی اور سات آٹھ انچ چوڑی ٹیل کی اینٹ استعمال کرتے تھے۔ ٹیل کی اینٹ کی وجہ سے کمروں کی دیواریں بہت موٹی بنائی جاتی تھیں۔ دیار کی لکڑی جو کافی مضبوط ہوتی تھی۔ اس لکڑی کے دروازے، بالے یعنی کڑیاں اور شہتیر استعمال ہوتے تھے۔ کراڑوں کے مکانوں کے درمیان جو کوچے ہوتے تھے، یعنی گلیاں، یہ بہت تنگ ہوتی تھیں۔ اس دور میں جو باغات کے اردگرد کچی مٹی کی دیوار چُن دی جاتی تھی۔ ایک طرف اینٹوں کے دو ستون بنا کے لکڑی کا گیٹ لگا دیا جاتا تھا۔ کھجور کے

بلند و بالا درخت اپنی کج ادائی میں ہوا سے جھومتے تو ماحول پُر اسرار سا ہوجاتا تھا۔ سنا ہے انسانوں سے جنات کی تعداد کئی حصے زیادہ ہے۔ یہ ویرانوں کو پسند کرتے ہیں۔ جدت اور آبادی سے دور رہتے ہیں۔ کچی جگہوں پر رہنا پسند کرتے ہیں۔ پاکستان بن جانے کے بعد کراڑ ہندوستان ہجرت کر گئے تھے۔ اپنے قدیم طرز کے مکانات بطورِ نشانی چھوڑ گئے تھے۔ بڑے بڑے سیٹھ ہندو یہیں رہ گئے تھے جو آج بھی سندھ اور بلوچستان میں موجود ہیں۔ اِن کے شمشان گھاٹ جہاں مُردوں کو جلایا جاتا تھا، وہ لوگوں کے بقول بدروحوں کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ جب ریگستانی ہوا سرسراتی تو یوں لگتا تھا، جیسے ہندو آتمائیں (روحیں) ایک دوسرے سے نبرد آزما ہیں۔ ہندوستان سے آنے والے مہاجرین کے حصے میں زیادہ تر ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے مکانات آئے تھے۔ کئی مکانوں اور دکانوں پر مسلمان قابض ہوگئے تھے اور آبادی کم ہونے کی وجہ سے کئی مکان غیر آباد رہے اور پھر کھنڈر بن گئے۔

سردار گڑھ سے کئی راستے اِدھر اُدھر نکل جاتے تھے۔ ایک راستہ جے والی کی جانب جارہا تھا۔ جے والی میں ایک رحم دل معروف شخصیت آج بھی موجود ہے، ڈاکٹر یٰسین صاحب، جو بہت ہی رحم دل اور نیک انسان ہیں۔ وہ غریبوں کا علاج مفت کرتے ہیں۔ دوسرا راستہ لال گڑھ سے ہوتا ہوا کوٹ سمابہ کی طرف نکل جاتا ہے۔ راستے میں بڑی نہر پڑتی ہے، جس میں سے ایک چھوٹی نہر نکلتی ہے جو جے والی کے قریب ختم ہوجاتی ہے۔ بڑی نہر سے کچھ دور جلال آباد ہے، جسے جلال پور کہتے ہیں۔ جلال پور کی تمام عمارتیں کراڑوں کی مرہونِ منت ہیں۔ یہ بڑے پُراسرار قسم کے مکانات ہیں۔ اُن کی ہیئت دیکھ کر خوف سا آتا ہے۔ ٹیل کی اینٹوں سے چنی گئی عمارتیں پرانے دور کی عکاس ہیں۔ پچاس سال پہلے جلال پور کے کئی مکان خالی پڑے تھے اور کھنڈرات کی صورت اختیار کر گئے تھے۔



پچاس برس پہلے کا محل وقوع میں نے بیان کر دیا ہے۔تصور کی نگاہ سے آپ ایک جسم قائم کر لیں۔اب آتے ہیں اصل کہانی کی طرف۔

یہ ایک سرد شام کا ذکر ہے۔گہری سناٹے دار شام زمین پر اُتر آئی تھی۔تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔میں اور میرے ماموں عبدالرحمٰن سڑک کے کنارے کھڑے تھے۔ایک پرانی کھٹارا سی کپڑے پھاڑ بس ہمیں سڑک کے کنارے اُتار کر آگے جا چکی تھی۔کپڑے پھاڑ بس میں نے اس لیے کہا ہے کہ اس بس کی سیٹیں پرانی تھیں اور جگہ جگہ سے اُدھڑی ہوئی۔اس کی جا بجا ٹیڑھی میڑھی پتریاں کپڑوں سے اُلجھ جایا کرتی تھیں اور اُٹھنے کی کوشش میں کپڑے پھٹ جایا کرتے تھے۔یہ پورن ماشی کی رات تھی۔چاند کی چودہ تاریخ تھی۔کسی بھی لمحے مشرق کی طرف سے چودھویں کے چاند نے طلوع ہونا شروع ہو جانا تھا۔ہم لبِ سڑک کھڑے تھے اور سوچ رہے تھے کہ اب کیا کریں، براستہ جلال پور بستی کی طرف روانہ ہو جائیں یا کسی کے ہاں رات بسر کر کے صبح کو سفر شروع کریں۔سردار گڑھ کا یہ علاقہ اُس وقت اتنا ترقی پذیر نہیں تھا۔سڑک کے دونوں طرف چیدہ چیدہ کچے پکے پرانی طرز کے مکان نظر آ رہے تھے۔کئی مکانوں سے دھواں بھی اُٹھ رہا تھا، یعنی وہاں کے مقامی لوگ کھانا تیار کرنے کے لیے تندور اور چولہے جلا چکے تھے۔اس علاقے میں کسی سرائے کا وجود بھی نہیں تھا۔ورنہ ہم کرائے پر چارپائیاں لے کر شب بسری کر لیتے۔سفر کرنے کا شوق تھکاوٹ پر غالب آ گیا تھا۔ہم تازہ دم تو نہ تھے، لیکن ڈھائی تین کوس کا سفر پیدل طے کرنے کے قابل ضرور تھے۔اس علاقے میں اتنی زیادہ لوگوں سے واقفیت بھی نہ تھی، اس لیے ہم دونوں ماموں، بھانجے نے چلتے رہنے کو ترجیح دی۔بقول شاعر......"چلے تو کٹ ہی جائے گا سفر آہستہ آہستہ"

ہم دونوں سڑک سے ہٹ کے کچے پکے مکانوں کے درمیان سے ایک تنگ سی گلی سے گزر کے کھلے علاقے میں پہنچ گئے۔یہ 1965ء کی جنگ سے دو تین سال قبل کا واقعہ ہے۔اس وقت کھیت کھلیان کم ہوتے تھے۔غیر آباد زمین کا تناسب آباد کاری سے کہیں زیادہ تھا۔گھنے درخت جنگل کا سماں پیش کرتے تھے۔بنجر اور غیر آباد زمینوں کی وجہ سے ہر طرف ہُو کا عالم طاری رہتا تھا۔پرندے بولتے تو دور دور تک آبادی کا شور نہ ہونے کی وجہ سے آواز آ جاتی تھی۔رات نے اپنے پر پھیلانا شروع کر دیے تھے، ہر جانب اک سکوت سا طاری تھا۔اس وقت راستے پگڈنڈیوں کی صورت میں ہوتے تھے۔اِن راستوں کے ارد گرد خودرو جھاڑیاں اور کانٹے دار گھاس اُگی ہوئی ہوتی تھی، جن میں نیولے اور سانپ چھپے ہوتے تھے۔جگنو، جو اُڑتے وقت ہوا میں چمکتا ہوا نظر آتا ہے، دراصل اس کے جسم سے روشنی خارج ہوتی ہے۔وہ بھی یہاں بہت زیادہ تھے۔جاہ (ساہی) ایک گول مٹول سا بڑا ہی حساس جانور ہوتا ہے۔یہ بھی اس علاقے میں بڑی تعداد میں تھا۔اس کے جسم پر نوک دار لمبے کانٹے ہوتے ہیں۔اب ہمارا سفر جلال پور کی طرف جاری تھا۔جلال پور کے آباد اور غیر آباد مکانوں کے درمیان سے ہم نے گزرنا تھا۔یہاں سے دو نہروں کے بعد ہماری بستی تھی۔جو بستی ڈھکڑاں کے نام سے مشہور ہے۔اس علاقے میں زیادہ ترقی نہیں ہوئی تھی۔گھنے جنگل اور میدانی کھلے علاقے وحشت کا منہ بولتا ثبوت تھے۔

ہمارا پیدل سفر جاری تھا۔یکا یک میری نگاہ مشرق کی طرف گئی۔لمبے قد آور درختوں کی اک قطار میرے سامنے تھی۔مشرق کی طرف سے چودھویں کا چاند زمین کے حصار سے باہر آ چکا تھا۔گول پیلے تھال کی صورت میں وہ نگاہوں کو بہت بھلا محسوس ہو رہا تھا۔بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔سبحان اللہ! کیا نظارہ تھا۔قدرت کی عکاسی بھی کیا خوب ہے۔اللہ تعالیٰ کی قائم دنیا میں ایسے ایسے حقیقی نظارے دیکھنے کو ملتے ہیں کہ منہ سے بے ساختہ "سبحان اللہ" کے معتبر الفاظ ادا ہو جاتے ہیں۔ہم دونوں ماموں بھانجے پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے جلال پور کی جانب بڑھ رہے تھے۔اس وقت جلال پور کی پرانی عمارتیں مخدوش حالت میں تھیں اور اِن کی بناوٹ کچھ ایسی تھی کہ ان کو دیکھ کر عجیب سی پر اسراریت کا احساس ہوتا تھا۔گھنے طویل درخت، کہیں

کہیں کھیت کھلیان اور سنسان علاقہ۔ یہ سب وحشت برپا کرنے کو کافی تھے۔ میرے ساتھ میرے ماموں تھے، اس لیے میرے حوصلے بلند تھے۔ میں اکیلا ہوتا تو شاید یہ ماحول دیکھ کے گھبرا جاتا۔

ہم بڑے طمطراق سے چل رہے تھے۔ ایک جذبہ ہمیں اپنی منزل کی جانب کشاں کشاں لیے جا رہا تھا۔ یہ شارٹ کٹ راستہ تھا۔ چودھویں کا چاند آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا۔ درختوں سے چھن چھن کر آنے والی چاندنی نے زمین پر پیلی دھاریاں سی بنا دی تھیں۔ اس ہلکے ملگجے میں دور سے جلال پور کی پراسرار عمارتیں عجیب وحشت کا سماں پیدا کر رہی تھیں۔ ایک جادوئی منظر سامنے تھا، گو کہ اس واقعے کو ساٹھ برس سے زیادہ کے عرصے نے دھندلا دیا ہے، مگر میں آج تک اسے بھلا نہیں پایا۔ وہ پراسرار رات اب بھی میرے تصور میں رچی بسی ہوئی ہے۔

انسانی دماغ میں اللہ تعالیٰ نے ایسی قوت رکھ دی ہے کہ ماضی کے گزرے ہوئے حالات اس کے زمین میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ انسان یہ واقعات بھلانے کی کوشش بھی کرے تو بھلا نہیں پاتا۔ جب انسان مرتا ہے تو اس کی زندگی کے تمام نشیب و فراز بھک سے اُڑ جاتے ہیں، پھر وہ ایسی بوسیدہ کتاب کی مانند ہو جاتا ہے، جس کے الفاظ مٹ جائیں اور صرف خالی پنے باقی رہ جائیں۔

ہم جوں جوں جلال پور کے قریب ہو رہے تھے۔ عمارتوں کی بلندی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ انسان عمارتوں کو دور سے دیکھے تو وہ پست نظر آتی ہیں، لیکن قریب ہونے پر اُن کی بلندی کا احساس ہوتا ہے اور پھر حیرت بھی ہوتی ہے کہ دور سے نظر آنے والی چھوٹی چھوٹی بلڈنگیں اب کتنی بلند نظر آ رہی ہیں۔ چلتے چلتے آخر کار ہم دونوں ماما بھانجے جلال پور کے قریب پہنچ گئے۔ اب ہمارے دائیں بائیں کھجوروں کے گنجان درخت موجود تھے۔ ان کے درمیان ایک چھوٹی سی پگڈنڈی موجود تھی، جس پر ہم چل رہے تھے۔ پگڈنڈی کے اردگرد لمبوتری سی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ اس گھاس کے اگلے سرے پگڈنڈی پر منہ کے بل گرے ہوئے تھے۔ ماموں کی دھوتی اور میری شلوار کے نچلے حصے سے یہ گھاس اُلجھ رہی تھی۔ کھجور کے درختوں کے اِر جھاڑیوں کی اس قدر بہتات تھی کہ ان کانٹے دار خودرو جھاڑیوں اور چھوٹے چھوٹے کھجور کے درختوں کا اک جنگل سا بن گیا تھا۔ چاند کی روشنی میں کھجوروں کے درختوں کے لمبے سائے بڑے پراسرار لگ رہے تھے۔

اِن درختوں کے درمیان سے گزر کر ہم جلال پور کی مین گلی کے سامنے پہنچ گئے۔ سامنے ڈھلوانی راستہ تھا، جو بلند گلی سے نیچے کی طرف آ رہا تھا۔ ہم اس گلی کے سامنے پہنچے تو جان میں جان آئی۔ کھجوروں کے درمیان کا جو راستہ ہم طے کر کے آئے تھے۔ ایسے راستے بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ جھاڑ جھنکاڑ کی وجہ سے ایسی جگہوں پر زہریلے حشرات الارض فراوانی سے موجود ہوتے ہیں۔ اس دور میں ان علاقوں میں زہریلے سانپ کثرت سے پائے جاتے تھے۔ رات کو جو دیہاتی کھیتوں میں پانی کی وارہ بندی کے لیے کندھے پر کسی رکھ کے گھر سے نکلتے تھے، اِن میں سے کسی نہ کسی بدنصیب کو سانپ ڈس لیتا تھا۔ سانپ کے ڈسنے کو مقامی لوگ ''ککھ سونگھنا'' کہتے تھے۔ یعنی فلاں بندے کو ککھ سونگھ گیا ہے، گویا سانپ نے ڈس لیا ہے۔ سانپ کی جلد میں قدرت نے دھمک محسوس کرنے کی حِس رکھ دی ہے۔ انسانی قدموں کی چاپ یہ دور سے محسوس کر لیتا ہے۔ اپنے بچاؤ کے لیے یہ فوراً اِدھر اُدھر ہو جاتا ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ یہ کسی جگہ سو رہا ہو اور آدمی قریب پہنچ جائے تو آنکھ کھلتے ہی یہ قریب پہنچ جانے والے پر وار کر دیتا ہے۔ یہ وار وہ اپنے دفاع کے لیے کرتا ہے، تاکہ آنے والا اسے نقصان پہنچانے سے پہلے ملک عدم کا راہی بن جائے۔ جان سب کو پیاری ہوتی ہے۔ سانپ کے کان نہیں ہوتے۔ جوگی جب بین بجاتے ہیں تو وہ اس کو دائیں بائیں کرتے رہتے ہیں۔ سانپ بین کو ہتھیار سمجھ کے ڈر جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ شاید اسے بین مارنے کی کوشش کی جا رہی ہے، اس لیے وہ بین کے ساتھ ساتھ اپنے دفاع میں لہرانا شروع کر دیتا ہے، جسے جھومنا کہتے ہیں۔ تماش بین سمجھتے ہیں کہ سانپ بین کی لے پر رقص کر رہا ہے۔ اس طرح جوگی سانپ کے جھومنے کا

تماشہ دکھا کے اپنی روزی بنا لیتے ہیں، حالاں کہ بین کی آواز سانپ سنتا ہی نہیں، کیوں کہ سانپ کو قدرت نے کانوں سے محروم رکھا ہے۔ جونہی ہم دونوں ڈھلوانی راستے کے سامنے پہنچے تو ایک لمبا سا سانپ ہمیں دائیں طرف کے کچے راستے پر تیزی سے رینگتے ہوئے محو سفر نظر آیا۔ گو کہ چاند کی روشنی اس پر نہیں پڑ رہی تھی، مگر روشنی کے ملگجے میں اسے ہم نے دیکھ لیا تھا۔ تھوڑا سا آگے جا کے وہ سانپ کھجوروں کے جھنڈ میں رینگ گیا۔ یہ سانپ اسی راستے کا راہی تھا، جس پر ہم چلتے ہوئے آئے تھے۔ جلد کے ذریعے وہ ہمارے قدموں کی دھمک محسوس کر کے اپنے دفاع میں بھاگ اُٹھا تھا۔ اس طرح ہم ایک خطرے سے دوچار ہونے سے بچ گئے تھے۔ ورنہ وہ ہم دونوں میں سے کسی ایک کو ڈس سکتا تھا۔ ہم جلال پور کی مین گلی میں داخل ہوئے اور پُر پیچ گلیوں سے ہوتے ہوئے مشرقی جانب جلال پور کی مخدوش عمارتوں سے باہر نکل آئے۔ اب ہمارے سامنے کھلا علاقہ تھا اور چاند کی روشنی تھی۔ چاند کافی اوپر اُٹھ آیا تھا۔ سامنے ایک گھنے درختوں والا باغ نظر آ رہا تھا۔ جس کے اِرد گرد کچی مٹی کی دیوار بنی ہوئی تھی۔ درختوں کے سائے زمین پر پڑ رہے تھے۔ اس سائے میں ایک عجیب سا نظارہ ہم نے دیکھا۔ اسے دیکھ کر میں تو گھبرا گیا، لیکن میرے ماموں اس سے بالکل نہیں گھبرائے، کیوں کہ وہ انہی علاقوں کے باسی تھے اور ایسے نظاروں سے ان کا واسطہ اکثر پڑتا رہتا تھا۔

ہم نے دیکھا کہ ایک درجن کے لگ بھگ مٹی کے دیے روشن تھے، جو زمین سے دس فٹ کی بلندی پر متحرک تھے۔ وہ ہمیں دائرے کی صورت میں گھومتے ہوئے نظر آئے۔ یہ ایک پُر اسرار منظر تھا جو ہم دونوں ماموں بھانجے حیرت سے دیکھ رہے تھے، پھر وہ دیے ایک لمبی قطار میں باغ کی طرف بڑھ گئے۔ وہ جنات جنھوں نے یہ دیے اُٹھا رکھے تھے، ہمیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ باغ کا لکڑی والا پھاٹک (گیٹ) اس وقت کھلا ہوا تھا اور وہ دیے گیٹ کے راستے سے باغ میں دائیں جانب گھوم کر غائب ہو چکے تھے۔ ابھی ہم اپنی جگہ حیرت کا مجسمہ بنے سوچ رہے تھے کہ اب کیا کریں کہ اچانک باغ کے گیٹ سے ایک لمبا تڑنگا آدمی نکلا اور بڑی تیزی سے ہماری جانب بڑھتا چلا آیا۔ قریب ہی ایک چوبارے والا مکان تھا، وہ اچانک فضا میں بلند ہوا اور چوبارے کی دیوار پر جا ٹکا۔ انجانے ماورائی ہاتھوں نے مجھے دیوار پر بٹھا دیا تھا، فضا میں اُٹھ کر میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور چوبارے کے اندر کمرے کی چھت پر پڑی ہوئی بے ترتیب اینٹوں پر جا گرا۔ اس اچانک مصیبت سے میں ہڑ بڑا گیا، پھر میں جلدی سے اپنی جگہ سے اُٹھا اور سامنے لکڑی کا ایک ٹوٹا ہوا دروازہ نظر مجھے آیا تو میں اس دروازے تک پہنچا۔ سامنے کی طرف مجھے ٹوٹی پھوٹی سیڑھیاں نظر آئیں، جو نیچے کی طرف جا رہی تھیں۔ میں جلدی سے اُن سیڑھیوں کو پھلانگتا ہوا ایک کھلے صحن میں پہنچ گیا۔ جہاں کاٹھ کباڑ کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ مکان عرصے سے ویران پڑا ہوا ہے۔ مجھے اپنے سامنے ہی ایک اور ٹوٹا ہوا دروازہ نظر آیا تو میں اس دروازے سے گلی میں نکل آیا۔ یہ وہی گلی تھی جہاں سے کچھ دیر پہلے گزر کر ہم کھلی جگہ میں پہنچے تھے۔ میرے سامنے ہی وہ کھلی جگہ تھی، جہاں میرے ماموں کھڑے تھے، میں گلی سے نکل کر ان کے قریب پہنچ گیا۔ ماموں نے مجھ سے پوچھا۔

''تو کہاں چلا گیا تھا؟'' ماموں عبدالرحمٰن کی بات سن کر مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ میں سوچنے لگا کہ کیا واقعی ماموں نے مجھے فضا میں بلند ہو کر دیوار کے اوپری حصے تک جاتے نہیں دیکھا۔ اب مجھ پر لازم تھا کہ میں یہ پُر اسرار حرکت جو جنات نے میرے ساتھ کی تھی، ماموں کو نہ بتاؤں، تاکہ وہ پریشان نہ ہوں۔ میں نے بات بدل کر کہا کہ میں رفع حاجت کے لیے گیا تھا۔ میری بات سن کر ماموں خاموش ہو گئے۔ اتنے میں وہ لمبا تڑنگا شخص جو باغ سے نکلا تھا، ہمارے قریب پہنچ گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں ایک تھال اُٹھا رکھا تھا، جو ایک رومال سے ڈھکا ہوا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ شخص جنات میں سے ہی ہے، اس کے دونوں کانوں کی لویں اتنی لمبی تھیں کہ کاندھوں تک آ رہی تھیں۔ مجھے

اس کی بڑی بڑی آنکھیں شعلے برساتی نظر آئیں۔ وہ انگارے کی طرح بالکل سرخ تھیں اسے دیکھ کر میں اک دم گھبرا گیا تھا اور میرے پیروں میں بالکل جان نہ رہی تھی، لہٰذا میں زمین پر بیٹھ گیا۔ ''نیچے نہ بیٹھ، کھڑا ہو جا۔'' لمبا جن سخت لہجے میں بولا۔

میں اک دم اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ میرا بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ اچانک اس شخص نے ہاتھ ہلایا تو قریب ہی ایک گدھا آموجود ہوا۔ وہ لمبا جن چند لمحے خاموش رہا، پھر بولا۔

''کوئی اور موقع ہوتا تو ہم تمہیں ضرور نقصان پہنچاتے، لیکن آج ہمارے لیے یہ خوشی کی رات ہے۔ میں قومِ جنات میں سے ہوں، میرا نام فِداؤ ہے۔ آج میرے بیٹے گداؤ جن کی شادی ہے۔ میں تمہارے لیے اس لگن میں کھانا لایا ہوں۔ تم گھبراؤ نہیں، ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ آج خوشی کی رات ہے، تم کھانا کھا کے اس تھال کو یہیں رکھ دینا، ساتھ نہ لے جانا۔ ہم نے جلال پور کے گھروں سے یہ برتن اٹھائے ہیں۔ صبح ہونے سے پہلے ہمیں ان برتنوں کو واپس اس جگہ رکھنا ہے، جہاں سے اٹھائے ہیں۔ تم لوگ کھانا کھا کے اس گدھے پہ سوار ہو کے یہاں سے دور نکل جانا اور جانے کے لیے یہ سامنے والا راستہ اختیار کرنا۔ تم اس راستے پر واپس ہرگز نہیں آنا، جہاں سے تمہیں روکا جا رہا ہے، کیوں کہ ہماری قوم میں کئی وحشی، شرارت پسند جنات بھی ہیں جو تمہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ ایک اور بات بھی تم لوگ ذہن نشین کر لو کہ یہ گدھا جب اپنی گردن ہلائے، تو فوراً نیچے اُتر جانا، ورنہ بعد کے نقصان کے تم خود ذمے دار ہو گے، یہ کوئی عام گدھا نہیں ہے جس پر انسان سواری کرتے ہیں، بلکہ یہ قوم جنات کی سواری ہے اور یہ خاص سواری تمہیں صرف اس لیے دی جا رہی ہے کہ تم ہمارے مہمان ہو اور ہم لوگ مہمان نواز ہیں۔ اگر آج یہ ہماری خوشی کی رات نہ ہوتی تو ہم تمہیں جلال پور کی دیواروں میں چُن دیتے، لیکن یہ آدمی بڑا معصوم ہے اور ہمیں اس کا چہرہ بہت پسند آیا ہے۔''

فداؤ جن میرے ماموں عبدالرحمٰن کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

''یہ ایک نیک اور سیدھا سادا، بے لوث انسان ہے۔ ہم ایسے انسانوں اور اُن کے ہمراہیوں کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ تم اس بھلے مانس انسان کے ہمراہی ہو، اس لیے ہم تمہیں بھی کچھ نقصان نہیں دے سکتے۔''

میں نے ڈرتے ڈرتے گداؤ جن کے باپ فداؤ جن سے پوچھا۔ ''اے ہمارے محسن، یہ تو بتایئے! کیا یہ گدھا پرواز بھی کر سکتا ہے؟''

فداؤ جن بولا۔ ''ہاں یہ اوپر اُڑ بھی سکتا ہے، مگر جب تک تم اپنی منزل کے قریب نہیں پہنچ جاتے، یہ اُڑے گا نہیں، کیوں کہ اس کی رکاب وغیرہ تو ہے نہیں اور اس کے پرواز کرنے سے تم زمین پر بھی گر سکتے ہو، لیکن تم گھبراؤ نہیں، تمہیں پیٹھ پر بٹھا کے یہ نہیں اُڑے گا، بلکہ واپسی پر یہ اُڑ کے ہمارے پاس آئے گا۔'' پھر اس نے تھال میری طرف بڑھایا۔ میں نے تھال اس سے لے لیا۔ اس کی صلح جویانہ باتیں سن کر میں اب کچھ نارمل ہو گیا تھا۔ تھال لے کر میں نے فداؤ جن سے کہا۔

''اے نیک جن، کیا ہم دور سے آپ کی شادی کی رسومات دیکھ سکتے ہیں۔'' اس نے جواب میں کہا۔

''بالکل دیکھ سکتے ہو، مگر اس کے قریب نہ جانا۔ شادی میں ہمارا سردار اِلی موگا بھی موجود ہے، جو شاید تمہیں پسند نہ کرے۔'' اب تم یہ کھانا کھاؤ پھر تم جب باغ کے گیٹ پر آ کر جنوبی حصے کی طرف دیکھو گے تو جان جاؤ گے کہ وہاں میرے بیٹے گداؤ جن کی بارات موجود ہے۔ اس گدھے کو یہیں رہنے دینا۔'' اتنا کہہ کر فداؤ جن غائب ہو گیا۔ میں نے تھال زمین پر رکھا۔ رومال ہٹایا تو تھال میں چاول تھے۔ چاولوں کی خوشبو نے ہمیں مسحور کر دیا تھا، پھر جب ہم نے چاول کھانے شروع کیے تو طبیعت نہال ہو گئی۔ بڑے لذیذ چاول تھے۔ تھال خالی کر کے ہم نے اسے وہیں رکھ دیا، اب ہم سیر ہو چکے تھے۔ میں نے اپنے ماموں سے کہا۔ ''آپ یہیں بیٹھیں، میں ذرا باغ کے جنوبی حصے کا نظارہ کر آؤں۔'' ماموں بولے۔

''بصد شوق جاؤ۔''

چاند اب کافی اوپر آ گیا تھا۔ میں باغ کے گیٹ کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ گیٹ کے قریب پہنچ کر میں رک

گیا۔ لکڑیاں جوڑ کر گیٹ بنایا گیا تھا۔ میں نے ایک حصّے پر ذرا سا زور دیا تو گیٹ تھوڑا سا چرچرایا، پھر اس میں سے گزرنے کے لیے تھوڑا سا راستہ بن گیا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ اندر داخل ہوگیا۔ باغ کے جنوبی حصے میں ایک عجیب سا سماں تھا۔ روشنی ہی روشنی تھی۔ مجھے وہاں بڑے پُراسرار چہرے نظر آئے۔ جن کے کانوں کی لویں اُن کے کندھوں کو چھو رہی تھیں۔ ایک تخت پر ایک بڑے سر والا جن بیٹھا ہوا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق یہی سردار ابی موگا تھا، پھر مجھے مجمعے کے درمیان دو لمبے قد کی لڑکیاں رقص کرتی نظر آئیں۔ اُن کے نصف چہرے نقاب میں چھپے ہوئے تھے اور ان کے دوپٹے پشت سے ہوتے ہوئے زمین تک چلے گئے تھے۔ ہلکی ہلکی موسیقی کی گونج میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ میں اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا۔ میں زندگی میں پہلی بار جنات کی شادی دیکھ رہا تھا۔

چند لمحوں بعد میں وہاں سے باہر آ گیا۔ ماموں عبدالرحمٰن کے پاس پہنچا تو انہوں نے پوچھا۔

''دیکھ آئے ہو، وہاں کیا تھا؟''

میں نے ماموں کو حرف بہ حرف سب بتادیا۔ ماموں نے کہا۔ ''اب چلیں''

میں نے کہا۔

''ہاں۔'' پھر ہم دونوں گدھے پر سوار ہوئے، اس طرح کہ نہ اس کی راس اور نہ اس کی باگ۔ میں نے اپنے دل میں سوچا، آخر ہم اس کو اپنی منزل کی طرف کس طرح موڑیں گے، خیر دیکھیے! آگے آگے ہوتا ہے کیا۔ گدھا سر جھکائے چلتا رہا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ گدھا اسی راستے پر چل رہا تھا، جو ہمارے گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی لیکن تسلی تھی کہ آخر کو وہ جنات کا گدھا تھا۔ اچانک گدھے نے اپنی گردن ہلائی۔ اس سے قبل کہ ہم جمپ مار کے نیچے اُترتے، تیزی سے اس کا قد بڑھنے لگا۔ اب وہ اونچا ہوتا جا رہا تھا، یہاں تک کہ اونٹ کے کوہان کے برابر اس کی پیٹھ بلند ہوگئی۔ یہ دیکھ کر ہم پریشان ہوگئے، اس کے ساتھ ہی وہ غائب ہوگیا۔ ہم دھڑام سے زمین پر گرے اور گرتے ہی ہم سٹپٹا گئے، اس وقت تک گدھا غائب ہو چکا تھا۔ ہماری عافیت اسی میں تھی کہ ہم بھاگم بھاگ وہاں سے نکل جاتے، چناں چہ ہم پیدل ہی گاؤں کی طرف روانہ ہوگئے۔ اس دوران ہم کہیں بھی نہیں رُکے بلکہ گھر جا کر ہی دم لیا۔

ہم نے تمام راستے بڑے پُراسرار مناظر دیکھے تھے، جو ناقابلِ یقین تھے۔ اس لیے ہم نے ان واقعات کا کسی سے ذکر نہیں کیا، مبادا لوگ مذاق نہ اڑائیں۔ ویسے تو ایسے واقعات کی اِن اجاڑ علاقوں میں بھرمار تھی۔ ویرانوں میں موجود جنات سے مقامی لوگوں کا اکثر واسطہ پڑتا رہتا تھا۔

میں چند دن ماموں کے ہاں رہا۔ میرے دل میں بڑا تجسس تھا کہ دن کی روشنی میں اس باغ کو اندر سے دیکھنا چاہیے۔ آخر میں نے واپس گھر جانے کا پروگرام بنالیا اور ماموں سے کہا کہ مجھے سردار گڑھ تک چھوڑ آئیں۔''

اس روز ماموں نے سبز دیسی مرچوں کی چٹنی بنائی، پھر اس میں لسّی ڈال کے تندور کی روٹیوں سے ہم نے وہ چٹنی کھائی۔ اسے کھا کر مجھے بڑا مزہ آیا۔ میرے گھر میں دودھ بلو کے مکھن بنایا جاتا تھا اور مکھن بناتے ہوئے نمکین لسّی کافی مقدار میں بن جاتی تھی، جو دن بھر ہم پیتے تھے یا چٹنی میں استعمال کرتے تھے۔ کھانا کھا کے تقریباً دن کے گیارہ بجے میں اور میرے اماموں سردار گڑھ کی طرف روانہ ہوئے، ہم نے براستہ جلال پور جانا تھا، تاکہ اس باغ کو ایک نظر دیکھتے جائیں۔ ہم دونوں ماموں بھانجے اِدھر اُدھر کی ہانکتے جلالپور کے قریب پہنچ گئے۔ جب وہ باغ نظر آیا، جہاں میں نے جنات کی شادی دیکھی تھی اور میں نے اور میرے ماموں نے اُن کی شادی کے لذیذ چاول بھی کھائے تھے۔ میں نے ماموں سے کہا کہ آپ کچھ دیر کے لیے کسی درخت کے سائے میں بیٹھیں، میں ذرا باغ کا چکر لگا آؤں۔''

ماموں نے مجھے مشورہ دیا کہ دور سے اس جگہ کو دیکھنا جہاں جنات کی شادی دیکھی تھی، اس جگہ نہ جانا، یہ جگہ بھاری ہوتی ہے اور جنات نقصان پہنچانے سے باز نہیں آتے۔''

میں نے ماموں سے کہا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں، میں دور ہی سے باغ کا وہ جگہ دیکھ کے آجاتا ہوں۔''

ماموں ایک پگڈنڈی پر بیٹھ گئے۔ میں باغ کے گیٹ کی طرف بڑھا۔ لکڑی کا گیٹ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ میں باغ میں داخل ہوگیا۔ مجھے سامنے ہی درختوں کے نیچے ایک چارپائی بچھی ہوئی نظر آئی، جس پر ایک گول مٹول سا بڑے پیٹ والا شخص نظر آیا جو ہاتھوں سے کھجور کا بان بٹ رہا تھا۔ اس نے اک دم مجھے دیکھا اور بولا۔ ''آؤ، آؤ، بچے...... کیا کام ہے۔'' اس نے کپڑے کی واسکٹ پہن رکھی تھی۔ جس کے بٹن ہی نہیں تھے اور اس کے اندر سے اس کا بڑا سا پیٹ نظر آ رہا تھا۔ میں چارپائی کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے میری طرف الفت سے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے سلام کر کے اس سے مصافحہ کیا۔ اس نے مجھے سلام کا جواب دیا اور چارپائی پر بیٹھنے کی دعوت دی۔ میں چارپائی پر بیٹھ گیا اور باغ کے اس حصّے کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں جنات کا بسیرا تھا، پھر میں نے کن اکھیوں سے اس پیٹو بڈھے کی طرف دیکھا تو وہ مجھے مسکراتا ہوا نظر آیا، پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

''بچے کہاں سے آئے ہو، اگر مجھ سے کوئی کام ہے تو بتاؤ۔''

میں نے بڑے میاں سے کہا کہ میں فلاں بستی سے آیا ہوں اور اپنے شہر جا رہا ہوں، چند روز پہلے میں اور میرے ماموں یہاں سے رات کو گزرے تھے تو اس باغ کے جنات سے ہمارا واسطہ پڑ گیا تھا۔ انہوں نے ہمیں چاول کھانے کو دیے تھے اور سواری کے لیے ایک گدھا بھی دیا تھا، جو سر جھٹکنے پر اوپر کی طرف لمبا ہو جاتا تھا۔ ہم ماموں بھانجے اس پر سوار ہوئے تو وہ چند قدم چل کے بڑا ہونا شروع ہوگیا، پھر وہ اونٹ جتنا بڑا ہو کر وہ غائب ہوگیا۔ اس کی بڑھوتری دیکھ کر ہم نیچے گر گئے تھے، پھر جن کی اجازت سے میں نے اس باغ میں جھانک کے اُن کی شادی بھی دیکھی تھی۔ اب تسلی کرنے آیا ہوں کہ کیا واقعی اس باغ میں جنات رہتے ہیں۔''

میری بات سن کر وہ بوڑھا بولا۔ ''تم بالکل سچ کہہ رہے ہو، باغ کے اس حصّے میں جنات کا بسیرا ہے۔ میں عرصہ دراز سے اس باغ میں رہتا ہوں اور اس طرح کے کئی نظارے دیکھ چکا ہوں۔'' اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھیں سرخ ہونا شروع ہوگئیں، پھر اچانک اسے حال آ گیا اور جھومنے لگا۔ جھومتے جھومتے اس نے چارپائی کے قریب پڑا ہوا گھڑا اُٹھا کے میرے چہرے پر دے مارا جو میری دائیں آنکھ کے قریب لگا اور ٹوٹ گیا۔ مٹکا لگنے سے میری جلد پھٹ گئی اور زخم سے خون بہنا شروع ہوگیا۔ پھر بوڑھا جھومتے جھومتے چارپائی سے نیچے لڑھک گیا۔ شاید اس پر جن آ گیا تھا، اسی وقت سامنے کے مکان سے ایک خوب صورت سی عورت نمودار ہوئی اور چلاّتے ہوئے چارپائی کی طرف بھاگتی چلی آئی۔

''ہائے ہائے...... میرے میاں پر جن آ گیا، اے لڑکے بھاگ جا یہاں سے'' یہ صورتِ حال دیکھ کر میں فوراً باغ سے باہر نکل آیا اور بھاگم بھاگ ماموں کے پاس پہنچا تو وہ میرا خون آلود چہرہ دیکھ کے گھبرا گئے۔ ایک چھوٹی سی کھیتوں کو سیراب کرنے والی نالی میں پانی بہہ رہا تھا۔ میں نے اس پانی سے چہرہ صاف کیا، پھر ماموں نے اپنی لنگی کے نچلے حصّے سے تھوڑا سا کپڑا بھگو کے مجھے پھاڑ کے دے دیا کہ اسے میں زخم سے لگا کے رکھوں، تاکہ خون بند ہو جائے۔ میں نے کپڑا زخم سے لگایا تو ذرا دیر کے بعد خون بہنا بند ہوگیا۔ اس کے بعد میں نے ماموں کو باغ میں گزرا ہوا سارا واقعہ سنا دیا۔ اس کے وہاں سے ہم سردار گڑھ کی طرف روانہ ہوگئے۔

ماموں نے مجھے بتایا ''اس بوڑھے پر جب جن آ گیا تھا، تو تم فوراً وہاں سے چلے آتے۔''

میں نے ماموں سے کہا ''میں نے کھسکنے کا پورا اِرادہ کر لیا تھا، لیکن اس سے پہلے کہ میں وہاں سے بھاگتا بوڑھے نے فوراً ہی میرے چہرے پر گھڑا دے مارا۔'' ماموں نے مجھے تلقین کی کہ گھر جا کے کسی سے اِس بات کا ذکر نہ کرنا۔ پھر ہم چلتے ہوئے سردار گڑھ پہنچ گئے اور سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر بس کا انتظار کرنے لگے۔ ایک گھنٹے بعد رحیم یار خان کی طرف سے ایک کپڑے پھاڑ بس آ گئی۔ جب وہ رُکی تو میں نے ماموں سے ہاتھ ملایا اور بس میں سوار ہوگیا۔ اس طرح میں اپنے شہر پہنچ گیا۔ اس واقعے کو ایک لمبا عرصہ ہوگیا ہے اور اس کہانی کی سچائی کی شہادت کی بڑی نشانی اب تک میرے چہرے پر داغ کی صورت موجود ہے۔

☆......☆



شرارتی جنات



عمران مظہر

ژوب بلوچستان سے، ایک نان بائی کے ساتھ پیش آنے والی جنات اور پریوں کی شرارتیں

آج میں بہت بڑے نقصان سے دوچار ہوا تھا۔ وہ تیرہ کمرے میری آنکھوں کے سامنے سوکھے ہوئے تنکوں کی طرح جل رہے تھے، جن میں خاندان بھر کا سال بھر کا اناج ذخیرہ تھا۔ میرے ساتھ میرے خاندان کے لوگ بھی حسرت بھری نظروں سے، غصے میں بھرے ہوئے حیرت و غم اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات چہروں پر لیے اپنا سب کچھ برباد ہوتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ ان سب کے ذہنوں میں اِس وقت یہی چل رہا ہوگا کہ ان کے تمام نقصان کا ذمے دار صرف میں ہوں۔ ان کی یہ بات کسی حد تک نہ صرف درست تھی بلکہ سچ بھی تھی۔ واقعی یہ میری بدنصیبی ہی تھی کہ میرے ساتھ ساتھ ان سب کے نقصان کی بھی ذمے داری میری تھی، لیکن میرے بس میں یا میرے اختیار میں اس وقت کچھ بھی نہیں تھا۔ مجھے تو اس بات کا بھی علم نہیں تھا کہ میرے ساتھ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟ اس لیے اس وقت مجھے جہاں سے جو سمجھ ملی، یا کسی نے جو کچھ بتایا، اس کے مطابق میں نے اِس کا علاج کیا، لیکن یہ سب کچھ بے سود رہا، کیوں کہ آج میرے ساتھ ساتھ میرے خاندان والوں کا بھی بہت بڑا نقصان ہوگیا تھا۔ ان کی سال بھر کی خوراک، جو غلّے کی صورت جمع تھی، چشم زدن میں جل کر خاکستر ہو چکی تھی۔

"غلام قادر تیرا اب ہمارے ساتھ اکٹھے رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ ہم تجھے اور تیرے بیوی بچوں کو اپنے گھر سے باہر کی زمینوں پر دو کمرے ڈلوا دیتے ہیں۔ تو ان کے ساتھ وہاں گزارا کر۔" اُسی شام اپنے نقصان پر افسردہ و غم زدہ بحث کرتے ہوئے، جب سب لوگ گھر کے ایک مقام پر جمع تھے، تو میرے بھائی افضل نے مجھ سے یہ بات کہی تھی، جس کی تائید وہاں بیٹھے ہوئے گھر کے سبھی لوگوں نے کی تھی۔

"افضل میں ژوب شہر چھوڑ کے یہاں ڈی آئی خان آپ سب کے پاس اسی لیے آیا تھا کہ شاید یہاں میرے ساتھ وہ سب کچھ نہ ہو، جو میں نے وہاں ژوب میں برداشت کیا ہے؟ لیکن آج جو ہوا، مجھے تو اُس سے یہی لگتا ہے کہ میں دنیا کے جس کونے میں بھی چلا جاؤں، یہ مخلوق میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی، اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ میں واپس ژوب چلا جاؤں، پھر جو میری قسمت میں لکھا ہوگا، وہ ہو کر رہے گا۔ بس بہت ہوگیا اب مجھے واپس چلے جانا چاہیے۔" میں نے سب کے سامنے نہایت کرب سے یہ بات کہی تھی۔ میری بات سن کر سب لوگ ایک دم چپ ہوگئے تھے۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ وہ



لوگ اس بات پر قطعی طو پر راضی ہیں کہ مجھے واقعی اب واپس چلے جانا چاہیے۔

☆......☆

میرا نام غلام قادر ہے۔ میں ایک غریب نان فروش ہوں اور تندور پر روٹیاں لگا کر اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتا ہوں۔ روزگار کے سلسلے میں ژوب شہر میں میری رہائش ہے، جب کہ میرا گھر اور میرا خاندان ڈی آئی خان میں رہائش پذیر ہے۔ تقریباً دو سال پہلے سے میرے اور میرے بیوی بچوں کے ساتھ عجیب و غریب واقعات پیش آنے لگے تھے۔

یہ بات بڑی عجیب ہے کہ میں جہاں بھی رہائش اختیار کرتا تو اُس گھر میں اکثر کنکریاں اور پتھر گرنے لگتے۔ یہ پتھر میرے ساتھ جڑے ہمسایوں کے گھروں میں بھی گرتے تھے، جس کی وجہ سے بار بار مجھے رہائش تبدیل کرنی پڑتی تھی۔ پہلے پہل تو میں نے اسے کسی کی شرارت سمجھی، اس لیے پولیس میں بھی کئی ایک بار جا کے رپورٹ درج کرائی تھی۔ میرے بار بار رپورٹ درج کرانے پر تھانے دار بھی بھڑک اُٹھا تھا اور وہ مجھ سے کہتا تھا کہ یہ کسی کی شرارت نہیں ہے جی، بلکہ اِس سب کے پیچھے کچھ اور ہے۔ اس ''کچھ اور'' کو میں سمجھنے سے قاصر تھا۔ اچانک میرے ساتھ یہ سب جو شروع ہوا تھا، اس نے اور بار بار کرائے کے گھر بدلنے سے میں اور میرے گھر والے بہت پریشان تھے۔

ابھی ہم ان واقعات سے نکل بھی نہ پائے تھے کہ ایک دن میرے گھر کے داخلی دروازے پر لگے پردے نے اچانک آگ پکڑ لی۔ اس اچانک افتاد سے میرے

بیوی بچے گھبرا گئے۔ محلے والے بھی صورت حال کو دیکھ کر جمع ہو گئے، پھر مجھے بلایا گیا۔ کسی بزرگ نے مجھے کہا کہ یہ شرارتیں میرا کوئی دشمن کر رہا ہے۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ مجھ جیسے غریب کا بھی کوئی دشمن ہو سکتا ہے؟ یہ بات میری سمجھ سے باہر تھی۔ خیر ہم نے کسی طرح پردے میں لگی آگ بجھائی اور جلا ہوا پردہ ہٹا کر دوسرا پردہ لگا دیا۔

ابھی ہم سب اس اچانک رونما ہونے والے واقعے پر غور ہی کر رہے تھے کہ ہماری آنکھوں کے سامنے صحن میں خود بخود آگ بھڑک اُٹھی۔ یہ منظر دیکھ کر وہاں کھڑے ہر شخص کے حواس گم ہو گئے، میری پریشانی دیدنی تھی۔ آگ جل رہی تھی اور ہم میں سے کوئی بھی اسے بجھانے کے بارے میں نہیں سوچ پا رہا تھا۔ سب لوگ حیران و پریشان تھے کہ ہماری آنکھوں کے سامنے خود بخود آگ کیسے لگ گئی؟ اسی دوران کسی نے ایک اخبار کے رپورٹر کو بھی کسی طرح بلوا لیا تھا۔ وہ اپنے کیمرے سے اِس سارے منظر کی تصویریں بنا رہا تھا۔ ابھی اُس نے چند تصویریں ہی اُتاری تھیں کہ اس کے کیمرے کو اچانک آگ لگ گئی اور کیمرہ اس رپورٹر کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ رپورٹر یہ پراسرار منظر دیکھنے کے بعد خاموشی سے وہاں سے رفوچکر ہو گیا۔ پھر جس طرح آگ خود بخود لگی تھی، ویسے ہی آہستہ آہستہ خود بخود ہی بجھ گئی۔ یہ ایک عجیب تماشا تھا جو ہمارے سامنے ہوا تھا۔

''غلام قادر یہ جو کچھ تیرے ساتھ ہو رہا ہے، یہ سب مجھے جنات کی کارستانی لگتی ہے۔'' وہاں کھڑے ایک عمر رسیدہ بزرگ نے اپنے تجربے کی روشنی میں یہ بات مجھ سے بڑا زور دے کر کہی تھی اور اب میرے ذہن کو اس بات کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ یہ کسی شریر جن کی ہی شرارت ہے۔

اِس کے بعد جہاں سے مجھے جس پیر، فقیر، عامل، کامل یا مولوی کا پتا ملا، میں اُس کے پاس گیا اور ان سب نے مجھے ایک ہی بات بتائی کہ میرے پیچھے، پریاں اور جنات لگے ہوئے ہیں، جو کہ ہندو ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ اچانک میرے پیچھے کیوں لگے یا ان کا کیا مقصد ہے، یہ بات سب پیر فقیر اور عامل کامل بتانے سے قاصر تھے۔ اُن میں سے اکثر مجھے جو تعویز وغیرہ استعمال کرنے کو دیتے، وہ تعویذ رکھے رکھے اچانک آگ پکڑ لیتے تھے اور جل کر ضائع ہو جاتے۔ میرے اوپر کیا ہوا ہر عمل اور میرے پاس رکھا ہوا ہر تعویذ ضائع ہو رہا تھا اور اب مولوی صاحب کے بقول اُن پریوں اور جنات کی تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ واقعی میں اب تو ان کی کارروائیاں بھی تیز تر ہو گئی تھیں اور میں خود بھی اس بات کو محسوس کر رہا تھا، اب جگہ جگہ آگ لگنا معمول بن گیا تھا اور اب تو گھر کے بستروں میں بھی آگ لگنی شروع ہو گئی تھی۔ میرا موبائل اکثر گم ہو جاتا تھا، تلاش کے باوجود نہ ملتا تو بازار سے جا کر میں نیا لے آتا تو پھر مجھے پرانا والا بھی مل جاتا اور نیا والا گم ہو جاتا۔ میرے گھر میں عجیب و غریب پراسرار اور وحشت زدہ کر دینے والے حالات پیدا ہو گئے تھے اور ان حالات کی وجہ سے مجھ پر اور میرے بیوی بچوں پر جو اذیت و مصیبت گزر رہی تھی، وہ بیان سے باہر ہے۔

اس کرب ناک زندگی کے سدِ باب کے لیے میں کراچی سے پشاور، کوئٹہ، لاہور اور جانے کہاں کہاں کے مشہور پیروں فقیروں سے جا کے ملا تھا، لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ میری اچھی خاصی رقم اس فضول چکر میں ضائع ہو رہی تھی۔ میں اس کرب ناک صورت حال سے سخت پریشان تھا کہ ایک روز ژوب کے ہی ایک ملّا نے جو صوم وصلواۃ کے پابند اور خوفِ خدا رکھنے والے شخص تھے، فی سبیل اللہ اپنے عمل کے ذریعے میری مدد کی۔ انہوں نے کوئی عمل وغیرہ ایسا کیا کہ اس عمل کے بعد انہوں نے مجھے بتایا کہ اُس نے اِس مخلوق کے سترہ افراد کو مسلمان کر دیا ہے اور اب یہ تمہارا کچھ نقصان نہیں کریں گے۔ اُن کے کہنے کے مطابق کچھ دن تو سب کچھ ٹھیک رہا اور اپنی جگہ پر میں بھی کچھ مطمئن سا ہو گیا، لیکن یہ اطمینان زیادہ دن قائم نہ رہ سکا۔ کچھ دن بعد پھر وہی سب شروع ہو گیا، جو ہوتا آیا تھا۔ آخر کار کسی نے مجھے بتایا کہ اگر میں یہ شہر چھوڑ دوں اور کہیں اور چلا جاؤں تو شاید اس طرح مجھے سکون مل جائے گا اور میں ان شرارتی جنوں کے شر سے بھی محفوظ ہو جاؤں گا۔ آخر کار میں نے مجبوراً گھر بار سمیٹا اور ڈی آئی خان چلا آیا، لیکن یہاں آ کر تو میں اور بھی عذاب میں گرفتار ہو گیا، کیوں کہ یہاں تو مجھ سمیت

میرے خاندان والوں کو بھی بڑے نقصان سے دوچار ہونا پڑا، پھر ہوا یہ کہ مجبوراً مجھے مع اپنے اہل و عیال کے واپس ژوب آنا پڑا۔

☆......☆

عید کا پہلا دن تھا اور عید کی گہما گہمی زوروں پر تھی، لیکن میرے اور میری بیوی کے لیے عید کے دن بھی آزمائش ختم نہیں ہوئی تھی۔ میرا چھوٹا بیٹا اور بیٹی اچانک کہیں غائب ہوگئے تھے۔ میں نے انہیں ہر جگہ تلاش کرلیا تھا، لیکن اُن کا کہیں پتا نہ چلا تھا۔ میری بیوی کا رو رو کر بُرا حال تھا۔ میں خود بھی سخت پریشان تھا۔ جب میں ہر طرف سے مایوس ہوگیا تو مجھے قلعہ سیف اللہ میں رہائش پذیر اپنے ایک دوست سلیم کا خیال آیا۔ میں نے شدتِ غم میں اُسے کال کی اور اُس سے مدد چاہی۔ اُس نے مجھے کسی ''خان فقیر'' کا موبائل نمبر دیا اور دلاسا دیا کہ یہ فقیر ایسے معاملے بخوبی حل کرلیتے ہیں۔ میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا، میں نے سلیم سے ان کا نمبر لے لیا اور فوراً خان فقیر کو کال کی، کال شاید انہوں نے ہی ریسیو کی تھی۔ میں نے انہیں اپنی پریشانی بتائی۔ جواب میں انہوں نے مجھے بڑے جلال میں حکم دیا کہ دس منٹ صبر کے ساتھ انتظار کرو اور پھر مجھے کال کرو۔ میں نے کسی طرح دس منٹ گزارے اور دوبارہ کال کی تو فقیر نے بتایا کہ تمہارے بچوں کو پریاں اُٹھا کر لے گئی ہیں۔ اس وقت تمہارے بچے افغانستان کے کسی علاقے میں موجود ہیں۔ میں یہ سب سن کر پریشان ہوگیا، لیکن انہوں نے مجھے تسلی دی اور کہا کہ میں چند گھنٹے میں تمہاری مدد کردوں گا۔ کچھ دیر بعد تمہارے دروازے پر ایک لڑکا آئے گا اور وہ تم سے جہاں چلنے کو کہے، تم خاموشی سے اُس کے ساتھ چلے جانا۔ اگر کسی وجہ سے وہ لڑکا میرے دیے گئے وقت میں نہ پہنچا تو پھر تمہیں میرے پاس آنا ہوگا۔

یہ کہہ کر انہوں نے فون بند کردیا۔ میں اور میری بیوی انجانے مہمان کا بے صبری سے انتظار کرنے لگے۔ آدھا گھنٹہ گزر گیا، لیکن جب کوئی نہ آیا تو میں نے دوبارہ فقیر کو کال کی تو وہ ایک دم سے ناراض ہو اُٹھے میری بے صبری پر اور غصے میں فون بند کردیا۔ اِس کے کوئی بیس منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ میں بھاگا بھاگا گیا تو دروازے پر کالے کپڑوں میں ملبوس ایک نوجوان کو کھڑے پایا۔ ابھی میں اُس سے کچھ کہنا ہی چاہ رہا تھا کہ اُس نے خود ہی کہنا شروع کردیا۔

''تمہارے بچے اس وقت عید گاہ کے ساتھ والے قبرستان میں موجود ہیں، چلو انہیں لے کر آتے ہیں'' اُس کی بات سن کر میں چپ چاپ اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہ ایک وقار کے ساتھ میرے آگے آگے چل رہا تھا اور میں اُس کے پیچھے پیچھے سر جھکائے چلتا ہوا لرز رہا تھا۔ ہم جب قبرستان میں داخل ہوئے تو اُس کالے کپڑوں والے لڑکے نے دور ایک طرف اشارہ کر کے کہا۔

''وہ دیکھو سامنے پچاس ساٹھ کے قریب پریاں اور جنات بیٹھے ہیں۔'' میں نے غور سے دیکھا تو واقعی سامنے اتنی ہی تعداد میں مجھے کچھ بچے بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ اُس نے پھر میری طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے کہا۔

''تم ان کے قریب جاؤ اور انہیں ادب سے سلام کرو اور پھر ان میں دیکھو جو تمہارے بچے ہیں، انہیں لے کر سیدھا اپنے گھر چلے جاؤ۔''

میں نے اُس کی بات بغور سنی، اثبات میں سر ہلایا اور لرزتے قدموں سے آگے کی طرف بڑھا۔ کچھ قدم چل کر میں نے لڑکے کو دیکھنے کی غرض سے کہ وہ موجود ہے یا نہیں، جو منہ پھیرا تو وہاں اُس لڑکے کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ میں گھبرا گیا کہ اچانک یہ لڑکا کہاں چلا گیا؟ خوف کے مارے میرے پیروں تلے زمین نکلی جا رہی تھی، پھر میں نے فوراً بچوں کی طرف نگاہ دوڑائی تو وہاں کسی بچے کا بھی نام و نشان تک نہ تھا۔ میرے سارے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میں نے فوراً خان فقیر کو وہیں سے کھڑے کھڑے کال کی اور سارا ماجرہ انہیں سنایا تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ ''یہ پریاں اور جنات ضدی قسم کے لوگ ہوتے ہیں، کیوں کہ یہ لوگ جو تمہارے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، ہندو قوم سے تعلق رکھتے ہیں، لہٰذا اب ان کے ساتھ باقاعدہ فیصلہ کرنا پڑے گا۔ اب تم ایسا کرو کہ وقت ضائع کیے بغیر آج ہی میری طرف آنے کے لیے روانہ ہوجاؤ اور ہاں جو لڑکا تم نے کالے کپڑوں میں دیکھا تھا، وہ میرا فقیر تھا۔''

اُس کی بات سُن کر میں نے جانے کی تیاری شروع کر دی۔ اپنی بیوی کو دلاسا دیا اور بلا تاخیر فقیر سے ملنے کے لیے روانہ ہوگیا۔

☆......☆

رات دس بجے کے قریب میں ڈی آئی خان پہنچا تھا۔ خان فقیر نے مجھے ڈی آئی خان تو بلوالیا تھا، لیکن میرے پاس اُن کا کوئی اتا پتا نہیں تھا، بس ایک موبائل نمبر ہی تھا، جس سے میں اُن سے رابطے میں تھا۔ میں نے شہر میں اُترتے ہی خان فقیر کو کال کی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ فلاں روڈ پر فلاں جگہ بیٹھا ہوا ہے۔ وہ ملنگ قسم کا بندہ ہے اور اُس کے ساتھ ہی ایک چھوٹی عمر کا بچہ بھی سائیڈ پر بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ بھی اس نے اپنی کچھ مخصوص نشانیاں بتائیں، تو پھر میں اُس کے بتائے ہوئے روڈ کی طرف روانہ ہوگیا اور کچھ دیر بعد میں اپنی مطلوبہ جگہ پر پہنچ چکا تھا۔ ''خان فقیر'' کو بھی ڈھونڈنے میں مجھے زیادہ دِقت نہیں ہوئی، کیوں کہ اُس کی بتائی ہوئی نشانیوں سے میں نے اُسے پہچان لیا تھا۔ میں اس کے قریب گیا اور ادب سے جھک کر سلام کیا۔ جواب میں اُس نے میرا ہاتھ پکڑا اور چپ چاپ مجھے لیے ہوئے چائے کے ایک ڈھابے نما ہوٹل میں داخل ہوگیا۔ رات کے اس مخصوص پہر میں بھی وہ ہوٹل کھلا ہوا تھا، لیکن ہم دونوں کے علاوہ وہاں کوئی اور نہ تھا۔ چائے پینے کے بعد اُس نے مجھے وضو کرنے کو کہا۔ میں نے ہوٹل کے باہر لگے نل سے وضو کیا، پھر اُس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور چل پڑا۔ وہ آگے آگے تھا اور میں اُس کے پیچھے، رات کے سناٹے میں صرف ہماری چپلوں اور گہری گہری سانسوں کی آواز ہی آرہی تھی۔ کچھ دیر چلنے کے بعد ہم ایک قبرستان میں داخل ہوگئے۔ قبرستان میں ہُو کا عالم تھا۔ ہر طرف گہرا سناٹا...... ایسا خوف ناک سناٹا جو روح میں سنسنی پیدا کر رہا تھا۔ میرا دِل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ خان فقیر نے قدرے کھلی جگہ پر ایک بڑا سا دائرہ اپنی لاٹھی سے بنایا اور اس کے بعد مجھ سے گویا ہوا۔

''سنو! جب تک میں تم سے نہ کہوں اس حصار سے باہر نہ نکلنا اور نہ ہی اٹھنے یا ہلنے جلنے کی کوشش کرنا، چاہے کچھ بھی ہو جائے، ورنہ جو بھی کچھ ہوگا، اُس کے ذمے دار صرف تم ہوگے۔ اب تم فوراً اس دائرے کے اندر آجاؤ، جلدی کرو۔'' میں اُن کی بات سن کر فوراً اس دائرے میں داخل ہوگیا۔ وہ فقیر خود بھی دائرے میں آلتی پالتی مار کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ میں نے بھی فوراً اس کی تقلید کی اور ان کی شبیہ بن کر بیٹھ گیا۔

''دائرے سے باہر پیر بھی نکالا تو مرجائے گا۔'' یہ بات ایک بار پھر کان کھول کر سن لے۔

خان فقیر نے مجھے آخری بار تنبیہ کی اور پھر آنکھیں بند کر کے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگا۔ وہ بے خوف ورد کر رہا تھا۔ میں ساکت و جامد اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا تھا، لیکن قبرستان کے وحشت زدہ ماحول سے میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ ہر طرف گہرا سکوت طاری تھا۔ جب کہ کہیں کہیں جھینگر کی آواز بلند ہوتی تو اس کے خوف سے بھی مجھ پر وحشت سی طاری ہو جاتی، حالاں کہ جھینگر سے کیا خطرہ؟ لیکن اُس وقت کا ماحول مجھے بہت ہی ہیبت ناک لگ رہا تھا۔ خان فقیر کو جاپ کرتے ہوئے ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ قبرستان میں عجیب وغریب قسم کی آوازوں کا ایک شور بپا ہوگیا۔ میں اُس شور کو سمجھنے سے قاصر تھا اور جو کچھ سمجھ آرہا تھا تو صرف اتنا کہ مختلف قسم کی چیخیں فضا میں گونج رہی تھیں، ابھی یہ خوف ناک چیخیں جاری تھیں کہ ایک دم سے دائرے کے باہر پتا نہیں کہاں سے سیکڑوں بلّیاں اور کتّے جمع ہوگئے۔ میں نے خوف زدہ آنکھوں سے دیکھا کہ بلیوں کی آنکھوں میں وحشت ناچ رہی تھی اور وہ اپنی مخصوص آوازوں میں چلاّ رہی تھیں۔ کتّے بھی غصّے سے باؤلے ہوئے جارہے تھے۔ وہ زور زور سے بھونک رہے تھے۔ اتنا شور اور اس وحشت ناک ماحول کو دیکھ کر میرے تو رونگٹے کھڑے ہوگئے، ڈر کے مارے میرا بُرا حال تھا۔ بار بار جی میں آرہا تھا کہ فوراً یہاں سے اُٹھ کر بھاگ جاؤں، لیکن پھر خان فقیر کی تنبیہ یاد آجاتی تھی۔ یہ تو صرف میں اور میرا خدا ہی جانتا ہے کہ میں کس طرح وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ کتّے بلّیاں مسلسل چیخ رہے تھے۔ اب تو ان کی چیخوں میں گالیاں بھی

نمایاں ہوگئی تھیں۔ کوئی تو بہت ہی غلیظ اور اخلاق سے گری ہوئی گالیاں دے رہا تھا۔ میرا ڈر تھا کہ بڑھتا ہی جارہا تھا اور اِس سے پہلے کہ میں اُٹھ کھڑا ہوتا، خان فقیر نے ایک دم آنکھیں کھول لیں اور میری طرف اپنی انگارہ بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ مُک مُکا پر راضی ہوگئے ہیں، لیکن اب وہ جو مانگیں گے تجھے دینا ہوگا۔ بولو منظور ہے؟“

میں نے فوراً اقرار میں سر ہلا دیا۔ خان فقیر نے پھر آنکھیں بند کرلیں۔ ابھی انہیں آنکھیں بند کیے ہوئے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ کہیں سے ایک بھیانک آواز گونجی تھی۔ یہ آواز مرد کی تھی یا عورت کی، یہ میں سمجھنے سے قاصر تھا، لیکن وہ آواز بہت ہی خوف ناک تھی اور بہت صاف سنائی دی تھی۔ اُس نے بڑے صاف اور واضح الفاظ میں کہا تھا۔

”پچیس ہزار...... پچیس ہزار لیں گے ہم اِس سے اور اس کا یہ موبائل بھی، جو اس وقت اس کی جیب میں ہے، یہ بھی اِسے دینا ہوگا اور ایک کالا بکرا بھی اسے ہمیں دان کرنا ہوگا، ورنہ ہم اسے نہیں چھوڑیں گے ایسے۔“ اتنا کہہ کر وہ خوف ناک آواز آنا بند ہوگئی تھی۔ خان فقیر نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا، جیسے پوچھ رہا ہو کہ کیا ارادہ ہے اب؟“

اس کی نظروں کا مفہوم سمجھ کر میں گھبراہٹ سے بولا تھا۔

”فقیر بابا موبائل دے دیتا ہوں۔ پیسوں کا بندوبست بھی میں کرلوں گا کسی نہ کسی طرح، لیکن میں بہت غریب آدمی ہوں، بکرے کا بندوبست میں کہاں سے کروں گا۔“ ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ وہ بھیانک آواز ایک بار پھر فضا میں گونجی۔

”تیرا ایک گائے کا بچھڑا بھی ہے نا...... چل تُو وہ ہی دے دے۔“

میں حیران ہوگیا کہ اسے بچھڑے کے بارے میں کیسے علم ہوا۔ میرے پاس سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ جلد بازی میں میرے منہ سے ایک دم یہ نکلا کہ ”میں اسے بچھڑا نہیں دوں گا، بلکہ میں تین ماہ تک دیکھوں گا۔ اگر اس دوران میرے گھر میں امن رہا تو تین ماہ بعد میں بچھڑا دے دوں گا، ورنہ نہیں دوں گا۔“

اتنا کہہ کر میں خاموش ہوگیا، پھر کچھ لمحے میں نے انتظار کیا، لیکن پھر کوئی آواز نہ آئی۔ خان فقیر نے پھر آنکھیں بند کرلیں، چند ثانیے بعد آنکھیں کھولیں اور میری طرف دیکھ کر یوں بولے۔

”موبائل تم یہیں اسی دائرے میں چھوڑ دو اور پیسے کا انتظام کر کے رکھنا، میرا فقیر آ کر تم سے لے جائے گا اور میں اِن تک پہنچا دوں گا۔ تیری تین ماہ کی شرط یہ لوگ مان گئے ہیں۔ اب تم اُٹھو اور اس دائرے سے باہر نکلو، لیکن پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ہرگز غلطی مت کرنا۔“

یہ کہہ کر خان فقیر بھی اُٹھ کھڑا ہوا اور تیزی سے دائرے سے نکل گیا۔ میں بھی موبائل وہیں دائرے میں چھوڑ کر اُس کے پیچھے پیچھے تقریباً دوڑتے ہوئے باہر نکلا اور پھر ہم دونوں قبرستان سے باہر کی جانب چل پڑے، اگلے دن خان فقیر نے مجھے کچھ تعویذ دیے، جن کو مختلف طریقوں سے استعمال کرنا تھا، خان فقیر نے مجھ سے اس تمام کام کا کوئی نذرانہ یا معاوضہ نہیں لیا تھا اور ہاتھ کے اشارے سے اس نے مجھے وہاں سے چلے جانے کو کہا تھا۔ میرے لیے اب اس شہر میں رکنا بے کار تھا۔ میں نے تعویذ اٹھائے اور اپنے گھر کے لیے رختِ سفر باندھا۔ گھر پہنچا تو دیکھا کہ میرے دونوں بچے صحیح سلامت اپنی ماں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ میری بیوی نے مجھے بتایا کہ کچھ ہی دیر پہلے ہی یہ لوگ اُسے صحن میں بیٹھے ہوئے نظر آئے ہیں تو میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا ہے۔ اس کے بعد میں نے کسی نہ کسی طرح پچیس ہزار کا بندوبست کیا اور اپنے لیے ایک موبائل بھی خریدا، اس کے بعد میں خان فقیر کے فقیر کا انتظار کرنے لگا۔

کچھ دن بعد ایک نوجوان آیا اور پیسے لے کر چلا گیا۔ اس واقعے کے بعد ایک ماہ بالکل خیر خیریت سے گزر گیا۔ یہ پہلی بار تھا کہ اتنے دن کچھ نہیں ہوا تھا۔ میں قدرے مطمئن سا ہوگیا تھا کہ چلو اب جان چھوٹی، لیکن یہ محض میری خام ہی خیالی ثابت ہوئی، ایک دن اچانک میرے سارے گھر میں زبردست قسم کی آگ بھڑک اُٹھی۔ یہ آگ بہت شدید قسم کی تھی۔ میرا گھر میرے

سامنے جل رہا تھا۔ آگ اس قدر شدید تھی کہ پانی کے بھرے دو ٹینکر بھی آگ بجھانے کے لیے ناکافی ثابت ہوئے تھے۔ اس اچانک لگنے والی آگ سے بہت زیادہ نقصان ہوگیا تھا۔ یہ دیکھ کر تو میرے اوسان ہی خطا ہوگئے تھے۔ ایسے میں مجھے ایک بار پھر خان فقیر کا خیال آیا اور میں نے انہیں اسی وقت کال کی۔ انہوں نے کچھ دیر بعد کال کرنے کو کہا۔ کچھ دیر بعد میں نے دوبارہ کال کی تو انہوں نے بتایا کہ تقریباً سات سو کے قریب پریوں اور جنات نے میرے گھر پر دھاوا بول دیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ مجھے پھر ان کے ساتھ فیصلہ کرنا ہوگا۔ جو ہونا تھا، وہ تو ہوگیا تھا، اب میں خود انہیں سنبھال لوں گا، تم مجھے کل اسی وقت دوبارہ کال کرنا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کل کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ جیسے ہی خان فقیر کا دیا ہوا مقررہ وقت آن پہنچا، میں نے انہیں پھر سے کال کی۔ انہوں نے مختصراً بتایا کہ انہوں نے اُن پریوں اور جنات کے ساتھ فیصلہ کرلیا ہے، فیصلہ تمہارے حق میں ہوا ہے، بس تم اپنا وعدہ نبھاؤ اور وہ بچھڑا جلد از جلد ان کو دے دو۔

یہ کہہ کر انہوں نے کال منقطع کردی، خان فقیر کی بات سن کر مجھے کچھ سکون سا ہوا تھا۔ میں نے بچھڑا جلد از جلد خان فقیر تک پہنچانے کا سوچا تھا، لیکن پھر گھریلو الجھنوں میں یہ بات ٹلتی چلی گئی۔ کچھ ہی دن ٹھیک گزرے تھے کہ پھر یوں ہونے لگا کہ میرے گوندھے ہوئے آٹے میں کبھی مٹی گر جاتی تو کبھی گھر کے سالن میں کنکریاں پڑی ملتیں یا وہ پانی سے بھرا ہوا نظر آتا۔ مجھ میں اب مزید کچھ سہنے کی ہمت نہیں تھی۔ ان حالات کی وجہ سے میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ کا مقروض ہوگیا تھا۔ میں نے فوراً سے پیش تر بچھڑا خان فقیر کو پہنچادیا، تاکہ اس عذاب سے کسی صورت جان کو خلاصی ملے۔ اب پانچ ماہ سے زیادہ ہوگئے ہیں، لیکن اب تک کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا ہے، شاید کہ خان فقیر نے واقعی فیصلہ کردیا تھا۔ مجھے امید ہے کہ اب ان شاء اللہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا، آپ بھی میرے لیے بہتری کی دعا کرتے رہیں۔ اللہ ہم سب کو ان شریر جنات کی شرارتوں سے محفوظ رکھے۔

☆......☆



انہونے واقعات

عصمت پروین عظمی

کراچی سے، چند سچے پراسرار قصے، جن سے ایک خاندان کا سابقہ پڑتا رہا

ہم کرائے کے گھر میں رہتے تھے۔ اُس گھر میں میرے شوہر نماز تسبیحات بھی کرتے تھے۔ وہ صوم وصلواۃ کے بڑے پابند تھے۔ تقریباً 15 سال پہلے کا ذکر ہے کہ ہم لوگ سو رہے تھے۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ رات کو میری آنکھ کھلی تو کچھ عجیب دغریب قسم کی آوازیں سنیں۔ میرے شوہر حمید کسی کو نیند میں بہت بُرا بھلا کہہ رہے تھے، جیسے کسی سے بہت بُرا جھگڑا ہو رہا ہے۔ اس وقت میرے شوہر شدید غصے میں تھے۔ جب میری آنکھ کھلی تو میں نے کسی کو بھاگتے ہوئے دیکھا۔ میرے کمرے کے واش روم پر دو چھتی بنی ہوئی تھی۔ مجھے وہاں سے کوئی بندر نما چیز بھاگتی ہوئی نظر آئی، جو کہ اُڑتی ہوئی بھاگ رہی تھی۔ باتھ روم کے اوپر سے وہ چیز تیزی سے بھاگی اور پیچھے پیچھے میرے شوہر حمید تھے، جو برابر اسے مغلظات بک رہے تھے۔ میرے کمرے کے باہر بالکونی تھی۔ وہ چیز تیزی سے اُڑتی ہوئی بالکونی تک گئی اور اُس کے بعد نہ جانے کہاں غائب ہوگئی۔ میرے شوہر غصے سے بولتے ہوئے باہر تک پیچھے گئے اور پھر کچھ دیر بعد واپس آ گئے۔ ابھی تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ پیچھے گلی سے شور کی آوازیں آنا شروع ہوگئیں پچھلی گلی میں ہمارے سامنے والے گھر میں انتقال ہوگیا تھا۔ یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ اُس بندر نما چیز کا کام تھا یا کچھ اور۔ وہ چیز اتنی رات کو میرے گھر کیا لینے آئی تھی۔ مجھے تو کچھ نہیں پتا، بس میرے شوہر نے یہ ہی کہا کہ میں نے اُسے ڈانٹ کر بھگا دیا تھا کیوں کہ وہ ایک جن تھا۔

اسی طرح ایک اور واقعہ میں سناتی ہوں

یہ واقعہ تقریباً 25 سال پہلے کا ہے، جب ہم برنس روڈ میں رہتے تھے، چاندنی رات اپنے جوبن پر تھی اور چاند کی روشنی میں اکثر ہمارے محلّے کے سب نوجوان چھت پر گپ شپ کرتے تھے۔ اُس رات بھی سب لڑکے میرے دیور سمیت چھت پر بیٹھے تھے، رات کافی ہوگئی تھی۔ یہ لوگ باتوں میں مصروف تھے کہ اچانک میرے دیور عزیز کی نظر سامنے بلڈنگ کے کونے پر پڑی، جہاں پر اس نے کچھ لوگوں کو دیکھا جو سفید کپڑوں میں ملبوس تھے اور تلواریں ہاتھوں میں لیے سفید چوغے پہنے ہوئے تھے۔ اس کے بعد تو تقریباً یہ معمول سا بن گیا کہ وہ جو بھی لوگ تھے اسے روز نظر آنے لگے اور وہ سب کو ہی نظر آتے تھے، جن میں میرے دو دیور مجید، عزیز اور اُن کے دوست انور، سعید، رشید، سلمان شامل تھے۔ یہ لوگ جب چھت پر جاتے تو اُن کو سفید کپڑوں اور چمکتی تلوار لیے وہ آدمی نظر آتے، اُس وقت کراچی کے حالات کافی خراب

تھے۔حالات کی خرابی کی وجہ سے سب ہی گھر پر جلدی آ جاتے تھے اور رات گئے تک لڑکے چھت پر رہتے تھے۔
چھت پر پانی کی ٹنکی تھی۔ یہ سب ٹنکی کے پیچھے چھپ کر ڈرتے ڈرتے اُن لوگوں کو دیکھتے رہتے اور کہتے کہ اللہ میاں کی پولیس گھوم رہی ہے۔
پھر رمضان کا مہینہ آیا تو سب لڑکے چھت پر تراویح پڑھنے جاتے تو اُن لوگوں کو بھی تراویح پڑھتے ہوئے دیکھا۔ دوسرے دن لڑکے نیچے آ کر بتاتے اور آپس میں باتیں بھی کرتے۔ میں تجسس سے پوچھتی تو بتا دیتے اور ایک دوسرے کا مذاق اُڑاتے کہ اُس کو ڈر لگ رہا تھا، یہ ڈر گیا تھا۔ یہ برنس روڈ حاجرہ بائی منزل کا بالکل سچا واقعہ ہے اور اسی کی چھت پر یہ لوگ نظر آتے تھے۔
میرے دونوں دیور عبدالمجید، عبدالعزیز اور ان کے دوست کے ساتھ پیش آیا۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ جن تھے یا کوئی بزرگ لیکن ہم لوگ انہیں اللہ میاں کی پولیس کے نام سے آج بھی یاد کرتے ہیں۔
اسی طرح ایک اور واقعہ بھی اب ذہن کی سکرین پر روشن ہونے لگا ہے۔ اُن دنوں ہم ماڈل کالونی میں رہائش پذیر ہیں۔ ہمارا اپنا گھر نہیں تھا، اس لیے ہم 9-C بس اسٹاپ کے قریب کرائے پر رہتے تھے۔ وہاں کے



حالات بہت خراب رہتے تھے، اسی وجہ سے ہم نے گھر شفٹ کر کے ماڈل کالونی کے ہی ایک گھر میں رہنے کا ارادہ کیا اور سامان کی شفٹنگ شروع کر دی۔ رات کافی ہونے کی وجہ سے آدھی شفٹنگ ہی ہو سکی اور میرا ایک بیٹا اور تین بیٹیاں رات کو اسی گھر میں رُک گئے۔ رات کو بلب وغیرہ لگا کر بیٹا تو سو گیا، لیکن صبح جب وہ واش روم گیا تو اس نے بلب زمین پر رکھا دیکھا، جیسے کسی نے اوپر سے اُتار کر نیچے رکھا ہو، جب کہ زمین سے بلب تک کا فاصلہ کافی تھا۔ اس بات کو ہم نے کوئی اہمیت نہیں دی، لیکن اُس کے بعد کچھ نہ کچھ ایسا ہوتا رہا، کسی کی موجودگی کا احساس ہمیں ہوتا، جیسے کوئی چیز تیزی سے گزرتی محسوس ہوتی۔ اکثر دوپہر میں ایسا محسوس ہوتا کہ کوئی چل رہا ہے، ہمیں باقاعدہ آہٹ سی محسوس ہوتی اور یہ سب صرف مجھے ہی نہیں میری پوری فیملی کو محسوس ہوتا تھا۔ میرا کمرا اوپر چھت پر تھا۔ میرے کمرے کے سامنے نیچے کو ایک اور کمرا بنا ہوا تھا، جو خالی رہتا تھا۔ اُس کمرے کے باہر میرے شوہر کو اکثر بچے کھیلتے نظر آتے تھے۔ گو کہ وہ اکثر اپنے کمرے میں نماز و تسبیحات پڑھتے تھے اور پڑھتے پڑھتے ہی وہ اوپر مسکرا کے دیکھتے تھے۔

میرے بہت پوچھنے پر مجھے بتاتے اور مسکراتے رہتے۔ میری بچیاں اوپر صحن میں ڈر جاتی تھیں۔ وہ بہت شرارتی تھے، کبھی تنگ بھی کرتے تھے اور کسی نہ کسی طرح اپنے ہونے کا احساس دلاتے تھے، لیکن ہمیں کبھی نقصان نہیں پہنچایا۔ میں اور میری فیملی نماز روزے کی پابند بھی ہے اور گھر بھی ہمارا صاف ستھرا رہتا تھا۔ درس و تدریس کا سلسلہ بھی چلتا رہتا تھا، شاید یہ ہی وجہ تھی کہ اس نے اپنی موجودگی کا ہمیں احساس ضرور دلایا، لیکن نقصان نہیں پہنچایا۔ ہم اُس گھر میں 5,4 سال تک رہے۔ اُس کے بعد گھر کے قریب ہی ہم نے اپنا گھر لے لیا، لیکن ہم نے پھر بھی گھر شفٹ نہیں کیا کوئی 3,2 مہینے کے بعد ہم نے گھر شفٹ کرنے کا سوچا۔ ایک رات میری بچیاں سو رہی تھیں کہ رات کے کوئی 4 بجے کمرے کے دروازے پر میری بیٹی کھڑی تھی۔ روشنی پڑنے کی وجہ سے میری چھوٹی بیٹی کی آنکھ کھل گئی اور اُس نے کہا کہ کیوں کھڑی ہو۔ دروازہ بند کرو اور یہ کہہ کر کروٹ بدلی تو وہی بیٹی ساتھ میں سو رہی تھی یہ دیکھ کر چھوٹی بیٹی ڈر گئی اور بھاگ کر میرے پاس آ گئی اور سو گئی۔ پھر ہم سب دوسرے گھر میں آ گئے لیکن دوسرے گھر میں ہمارا کافی سامان باقی تھا۔ ایک روز میری بچیاں وہاں کسی کام سے گئیں تو بڑی بیٹی کو اوپر سے آواز آئی ”تم لوگ جاؤ نہیں۔“ جس سے وہ ڈر گئی۔ اسی طرح دوسری بیٹی نہانے گئی تو وہ واپس آ کر چھوٹی بہنوں کو ڈانٹنے لگی کہ ”دروازہ کیوں بجا رہی تھیں۔“ چھوٹی بہنوں نے جواب دیا کہ ہم تو یہاں بیٹھے تھے، ہم نے کب دروازہ بجا دیا۔ ہم لوگ رمضان شریف میں اعتکاف میں بیٹھتے تھے، تو محسوس ہوتا تھا کہ کوئی روشنی ہمارے قریب سے اور بعض دفعہ اوپر سے گزر گئی ہے۔

ایسے ہی بہت سے واقعات ہمارے ساتھ اُس گھر میں ہوئے، لیکن اللہ کا کرم ہے کہ ہمیں کوئی نقصان نہیں ہوا، بلکہ اُس گھر سے نکل کر ہم اپنے گھر میں آ گئے۔

وہ شرارتی بچے تھے یا کوئی بھی، لیکن اُن کے ہونے کا احساس مجھے ہی نہیں، میرے سب بچوں اور شوہر کو بھی ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک میری فیملی اس بات کو فراموش نہیں کر سکی۔

☆......☆





انوشکا

حافظہ مون شاہ

سرگودھا سے، ایک بھائی کی کتھا، جس نے اپنی بہن کو ایک جن سے نجات دلائی

پاشا حسرت زدہ نظروں سے گردو پیش کا جائزہ لے رہا تھا، جو حویلی آج ویران اور بے رونق نظر آ رہی تھی..... کبھی اس کے در و بام آباد ہوا کرتے تھے..... افراد کی چہل پہل ہمہ وقت رہا کرتی تھی۔ رنگ، خوشیاں اور قہقہے ہر طرف بکھرے ہوتے تھے۔ یہ سارے منظر ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔ اچانک یخ بستہ ہوائیں سرسرانے لگیں اور کشادہ باغیچے کے اونچے اونچے پیڑ اس کے سامنے بھوت کی طرح ناچنے لگے، اُسے لگا جیسے ہوا کی سرسراہٹوں میں ''انوشکا، انوشکا'' کی سرگوشیاں ہو رہی ہوں، پھر یہ سرگوشیاں فلک شگاف قہقہوں کے شور میں دب گئیں......

پاشا نے دونوں ہاتھوں کو کانوں پہ رکھ کر سمع خراش شور کے باوجود زیرلب ورد کرنا شروع کر دیا۔ یکایک فضا میں زوردار قہقہے بلند ہونے لگے۔ اور پھر یکدم خاموشی چھا گئی، اس نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کانوں سے ہاتھ ہٹا کر آنکھیں کھولیں تو سامنے کے منظر نے اُسے ساکت کر دیا...... باغیچے میں ایک وجود گھٹنوں میں سر دیے بین کر رہا تھا۔ اس کے رونے کی آوازیں پاشا کے اعصاب پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھیں۔ خوف کے مارے اس کا رنگ زرد پڑ چکا تھا..... مگر وہ وہاں سے بھاگ جانے کی ہمت نہیں کر سکا...... اچانک وجود جھٹکے سے اُٹھ کر کھڑا ہوا۔ آہستہ آہستہ پاشا کا ذہن اس کے الفاظ سمجھنے کے قابل ہو گیا...... وہ بھاری آواز اس کی طرف رُخ کیے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''میرا نام طرطوس ہے، میں اپنی انوشکا کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ چاہے کچھ بھی کر لو تم، کچھ بھی ہو جائے...... لیکن یہ حویلی میں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ سُنا تم نے...... سُنا تم نے......'' اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا...... پاشا اپنے کمرے کی طرف دوڑ گیا۔

☆......☆

انوشکا گاؤں کے نامی گرامی جاگیردار چوہدری بہرام کی بیٹی اور تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ انوشکا کی ماں اس کے بچپن میں ہی چل بسی تھی، مگر بہرام خان نے اس کی پرورش نازونعم سے کی اور اسے ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دی...... وہ اپنے بھائیوں، فرغام، آسام اور پاشا کی لاڈلی تھی، خاص طور پر پاشا اس پر جان چھڑکتا تھا......

چوہدری بہرام خان کی خوشحالی بربادی میں اس وقت بدلی...... جب حسن و جمال میں یکتا انوشکا ماں کی قبر پہ فاتحہ پڑھنے پاشا کے ہمراہ قبرستان گئی...... فاتحہ پڑھتے ہوئے اچانک اسے اپنے کاندھے پر کسی کے ہاتھ کا بوجھ محسوس



ہوا۔ انوشکا نے جو مڑ کر دیکھا تو ایک زوردار چیخ مار کے اپنے بھائی سے لپٹ گئی۔ گھر آ کے بھی وہ دیوانہ وار چیخنے جا رہی تھی۔ ڈاکٹر نے آ کے اُسے نیند کا انجکشن لگایا۔ جب تک وہ اس انجکشن کے زیر اثر پُرسکون رہی، لیکن بیدار ہوتے ہی وہ چیخیں، دورے میں تبدیل ہو گئیں۔ گاؤں کے بزرگوں نے چوہدری بہرام کو سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ وہ اپنی بیٹی کو کسی عامل کو دکھائے..... لیکن چوہدری اور اس کے بیٹے یہ بات ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ پاشا کا دل انوشکا کی حالت دیکھ کر کٹتا تھا..... وہ بار بار باپ سے انوشکا کو کسی عامل کے پاس لے جانے کی گزارش کر چکا تھا، لیکن اس کے باپ کا انکار اپنی جگہ پر قائم تھا.....

قیامت تو اس وقت ٹوٹی جب انوشکا بے پردہ ہو کر گلیوں میں بھاگ جاتی..... کبھی پاگلوں کی طرح ہنستی رہتی..... پھر اچانک رونے لگتی..... اصولوں کے پکے بہرام خان کو انوشکا کی حالت دیکھ کر سبکی کا احساس ہوتا۔ وہ اذیت کے ساتھ ساتھ احساسِ توہین میں بھی جلنے لگتا۔

ایک روز پاشا بے مقصد یونہی ٹہلتا ہوا نہر کی طرف چل پڑا..... اور پل پر کھڑے ہو کر مٹیالے پانی پہ تیرتی ہوئی مرغابیوں کو دیکھتے ہوئے وہ انوشکا کے متعلق سوچنے لگا۔ اسی اثناء میں کسی نے پاشا کے کاندھے پر ہاتھ رکھا..... پاشا نے چونک کر پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہاں ایک نورانی صورت بزرگ کھڑے تھے..... ”تم پریشان ہو؟“

”جی..... مگر آپ کون؟“

”میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ میرے بارے میں زیادہ جاننے کی کوشش فضول ہوگی، البتہ میں تمہارے

ابوالقاسم فردوسی کی نظم شاہ نامہ

1009ء میں ایران کے مشہور شاعر ابوالقاسم فردوسی نے 35 برس کی محنت کے بعد اپنی معرکتہ الآراء نظم "شاہ نامہ" مکمل کی۔ شاہ نامہ ایران کی منظوم تاریخ ہے اور قبل از اسلام ایرانی تہذیب کی سرگزشت اور ایران کے سیاسی عروج و زوال کی داستان ہے۔ فردوسی کا انتقال 1025ء میں خراسان میں ہوا تھا۔

حالات سے اچھی طرح واقف ہوں۔"

ان کی اس بات پر پاشا نے حیرت سے انہیں دیکھا بزرگ اس کی حیرانگی پر مسکرائے اور بولے۔

"دیکھو پاشا...... اللہ تعالیٰ نے کسی انسان کو بے مقصد تخلیق نہیں کیا، تمہارے ذمے بھی کوئی مقصد تو ہوگا...... بلکہ سب سے بڑا مقصد تو اللہ کی عبادت اور انسانیت کی فلاح کے لیے سرگرداں رہنا ہے۔ ہمیشہ یاد رکھو کہ ہر طاقتور سے زیادہ قوت والا اللہ ہے...... تم اپنی بہن سے بہت محبت کرتے ہو، تمہاری بہن دراصل شیطانی سائے کے زیر اثر آ گئی ہے۔ تم اشرف المخلوقات ہو...... مسلمان ہو...... اگر اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو تمہیں صرف اس سے ہی ڈرنا نہیں چاہیے۔"

"الحمد اللہ میں مسلمان ہوں...... آپ کوئی حل بتائیں مجھے کیا کرنا ہوگا؟" پاشا نے ایک عزم سے کہا۔

"تمہیں سات راتوں کا ایک چلّہ کرنا ہوگا...... چلّے کے دوران بہت سی شیطانی قوتیں تمہیں ڈرانے اور روکنے کی کوشش کریں گی مگر تم ہرگز خوف نہ کھانا اور مضبوطی سے اپنے ارادے پر جمے رہنا یہ چلّہ تمہیں حویلی سے باہر کرنا ہوگا اللہ تعالیٰ تمہارا حامی و ناصر ہو۔" بزرگ نے پاشا کو تفصیل سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

☆......☆

کل رات سے پاشا نے چلّہ شروع کرنا تھا۔ آج دن بھر وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف رہا تھا اور تھوڑی دیر پہلے ہی سونے کے لیے بستر پر لیٹا تھا کہ اُسے یوں لگا جیسے بھونچال آ گیا ہو۔ وہ کلمہ شریف کا ورد کرتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ پاشا نے دروازہ کھول کر باہر نکلنا چاہا مگر زمین نے اس کے جیسے پیر ہی جکڑ لیے تھے۔ وہ منہ کے بل گر فرش پر پڑا پھر زلزلے کو قرار آ گیا۔

اچانک کمرے کے بھاری دروازے پر زور زور سے دستک شروع ہوگئی پاشا ہمت کر کے اُٹھا اور دروازہ کھول دیا۔ باہر کسی ذی روح کا نشان تک نہ تھا پھر اچانک ہی کمرے کی چھت پر پتھروں کی بارش ہونے لگی۔

پاشا ڈرتے ڈرتے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اسے محسوس ہوا جیسے کوئی ہیولا ابھی ابھی اس کے قریب سے گزرا ہے۔ خوف کی ایک سرد لہر اس کے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ چھت پر پتھروں کا انبار لگا ہوا تھا مگر پتھر پھینکنے والا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان پتھروں نے قوی ہیکل عقاب نما پرندوں کی شکل اختیار کرلی اور پوری چھت ان عقابوں سے بھر چکی تھی، جو اپنے پروں کو پھڑ پھڑاتے ہوئے خود کو چونچیں مار مار کر زخمی کر رہے تھے۔

آج پاشا کے عمل کی آخری اور فیصلہ کن رات تھی۔ اُس رات انوشکا کے کمرے میں آگ بھڑک اُٹھی تھی۔ جیسے تیسے کر کے انوشکا کو کمرے سے نکالا گیا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ انوشکا اس ساری صورت حال میں سکون سے سو رہی تھی۔ حویلی کے لوگوں کے بقول آگ شارٹ سرکٹ کے باعث تھی، لیکن انوشکا کی صحت یابی کا راز کسی کی سمجھ میں نہ آ سکا۔

اس بات سے صرف پاشا واقف تھا کہ وہ آگ دراصل اس شیطانی طاقت کو بھسم کرنے کے لیے تھی جو انوشکا پر حاوی ہونے کی کوشش کر رہی تھی، لیکن نورانی علم کے سامنے سب کچھ ہار گیا تھا۔

آج بھی اچانک کہیں کسی گھر میں آگ لگنے کی خبر پاشا کے کانوں میں پڑتی ہے تو وہ زیر لب مسکرا کے کہتا ہے۔

"آج ایک اور "طرطوس" واصلِ جہنم ہوا۔"

☆......☆



وہ خوشبو، وہ پائل

اشفاق عباسی

جِنوں کی سواری کی لپیٹ میں آنے والے ایک نوجوان کی پُراسرار کہانی

یہ غالباً 2011ء کی بات ہے جب امتحان سے فراغت کے بعد سیر و تفریح کی غرض سے ہم فیملی کے ساتھ اپنے گاؤں ہری پور ہزارہ گئے۔ ہمارا گاؤں ہری پور ہزارہ سے آگے دو گھنٹے کی مسافت پر دیوہیکل



پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے جو کہ صوابی ''میہرا'' کے نام سے مشہور ہے۔ تفریح کے حوالے سے ہمارا یہ ٹور میری فیملی کے لیے بڑا یادگار رہا، لیکن مجھے وہ ایام آج بھی اس لیے یاد ہیں کہ وہاں کے ایک رہائشی نوجوان کے ساتھ ایسا ناقابلِ یقین واقعہ پیش آیا، جس پر بعض قارئین یقین نہیں کریں گے۔ میرا بھی شاید یہی ردِعمل ہوتا، اگر میری خود اس نوجوان سے روبرو ملاقات نہ ہوجاتی، آیئے باقی روداد اِسی کی زبانی سنیے۔

میرا نام عقیل عباسی ہے اور میں ایف اے آرٹس کا اسٹوڈنٹ ہوں مذکورہ واقعہ میرے ساتھ جولائی 2011ء میں پیش آیا۔ وہ جولائی کی ایک سیاہ شب تھی۔ جولائی کو ساون کا مہینہ بھی کہتے ہیں۔ اس ماہ گاؤں میں اکثر حبس بڑھ جاتا ہے اور بارش کسی بن بلائے مہمان کی طرح آن ٹپکتی ہے۔ گاؤں میں اس موسم میں لوگ اکثر کمروں میں بستر لگاتے ہیں، مگر میری بچپن کی عادت ہے کہ گرمیوں کے موسم میں باہر صحن میں ہی سوتا ہو۔ ہمارے گھر کے چاروں اطراف قبرستان ہیں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اس دن لائٹ نہ ہونے کے باعث رات 12 بجے تک میرے کزنز باہر میرے پاس بیٹھے رہے پھر نیند آنے کے سبب سب اپنے کمروں میں چلے گئے۔ لیکن مجھے نیند نہیں آرہی تھی، بوریت دور کرنے کے لیے میں موبائل پر ہینڈ فری لگا کر گیتوں سے دل بہلانے لگا وہ شاید 2 بجے کا پہر تھا۔ جب مجھے محسوس ہوا کہ کسی نے میرے بالوں کو چھیڑا ہے۔ میں سمجھا کہ شاید کوئی کزن شرارت کررہا ہوگا۔ اس لیے میں نے نظر انداز کردیا۔ لیکن جب لگاتار تیسری مرتبہ یہی حرکت دوبارہ ہوئی تو میں نے غصہ سے اُٹھ کر گھرکنا شروع کردیا لیکن وہاں کسی ذی روح کا وجود نہیں تھا۔ البتہ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ صحن کے بیچ میں کوئی سفید لباس میں کھڑا ہے۔ گو کہ میں ایک بہادر انسان ہوں اور میرا بچپن اسی گاؤں میں گزرا تھا۔ اس لیے مجھے کسی قسم کا ڈر محسوس نہیں ہوا۔ میری توجہ ابھی تک اسی ہیولے پر تھی۔ پھر مجھے محسوس ہوا کہ وہ ہیولا چل رہا ہے اور اس کے چلنے سے پائل کی مدہم آواز سے کسی کی موجودگی کا احساس ہورہا تھا۔ میرے قدم اس کی طرف بڑھے اور جب ہم دونوں کے درمیان تھوڑا فاصلہ رہ گیا تو وہ ہیولا مجھ سے آگے چلنے لگا اور ساتھ ہی کسی دوشیزہ کی دلکش ہنسی کی آواز بھی سنائی دی۔ اب میرا دل کھٹکنے لگا کہ آخر یہ دوشیزہ کون ہے اور رات کے اس پہر یہاں کیا کررہی ہے۔ خیر اس کا پیچھا کرتے ہوئے میں قبرستان تک جا پہنچا۔ لیکن وہاں پہنچ کر مجھے خوف محسوس ہوا اور میں نے واپس گھر کی طرف دوڑ لگادی۔ جب میں گھر کے صحن میں پہنچا تو ہمارے گھر کے صحن میں لگے پیپل کے پیڑ کے پاس وہی لڑکی کھڑی نظر آئی میں ابھی اُس سے چند کوس ہی دور تھا کہ اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا! اُف اتنا خوب صورت چہرہ میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی کہ میں اپنی جگہ پر ساکت ہوکر رہ گیا۔ الفاظ میرے منہ میں جم کر رہ گئے۔ حبس اور گرمی کے باوجود میرا جسم کانپنے لگا۔ اس دوشیزہ کو شاید میری کیفیت کا اندازہ ہوگیا تھا۔ اس لیے اس نے ہلکی سی مسکان دی اور غائب ہوگئی۔ میں نے اپنی حالت پر قابو پایا اور آیت الکرسی اور چاروں قل پڑھ کر اپنے اوپر پھونکے اور واپس اپنے پلنگ پر آکر لیٹ گیا۔ وہ لڑکی اس کی سحر انگیز آنکھیں ابھی تک میرے حواس پر چھائی ہوئی تھیں وہ شب پوری میں نے جاگ کر گزاری اور صبح ہوتے ہی اس واقعہ کا کسی سے ذکر کیے بغیر کلہاڑا لے کر پیپل کے پیڑ کی ٹہنیوں کو کاٹنے لگا۔ میری ماں، چچی اور باقی کزنز سمیت سب اس بات سے پریشان تھے کہ آج صبح ہی صبح اس لڑکے کو کیا سوجھی ہے جو یہ درخت پر چڑھ گیا ہے۔ میں نے کسی کی بات نہ سنتے ہوئے اپنا کام جاری رکھا اور سب مجھے اپنے حال پر چھوڑ کر اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوگئے۔ ابھی میں نے اس پیڑ کی چند ہی ٹہنیاں کاٹی ہوں گی کہ مجھے ایسا لگا کہ نادیدہ ہاتھوں نے مجھے پیپل کے پیڑ سے اُٹھا کر گیند کی طرح اُچھال کر نیچے صحن پر پھینک دیا۔ نیچے گرتے ہی میری دِل خراش چیخوں نے تمام گھر والوں سمیت آس پڑوس کے لوگوں کو بھی جمع کردیا اور اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ اس کے بعد کی کہانی بتول میرے گھر والوں کے کچھ یوں تھی کہ

پیڑ سے گرنے کے بعد گاؤں میں جدید طبی سہولیات میسر نہ ہونے کی وجہ سے مجھے ہری پور اور پھر وہاں سے ایبٹ آباد کمپلیکس لے کر گئے وہاں پر ایکسرے کے بعد یہ رپورٹ آئی کہ معجزاتی طور پر میری ریڑھ کی ہڈی میں معمولی سا کریک پڑا ہے جو کہ ایک مہینے کے آرام سے ٹھیک ہوجائے گا۔ گھر والے مجھے پلستر لگوا کر گھر لے آئے، جب مجھے ہوش آیا تو میں کسی کو پہچان نہیں پا رہا تھا۔ کبھی زور زور سے رونے لگتا تو کبھی دروازے کی طرف اشارہ کرتا کہ وہ وہاں کھڑی ہے! مجھے بلا رہی ہے۔ کبھی قہقہے لگانے لگتا۔

میری حالت دن بہ دن بگڑتی جا رہی تھی آخر کئی کوششوں کے بعد راولپنڈی کے کسی عامل کا پتا چلا۔ چھوٹے چچا اُن صاحب کو گاؤں لے کر آئے، اُن صاحب عقیدت پر نظر پڑتے ہی اُن کی نورانیت کا اندازہ ہوگیا تھا۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی آنکھیں بند کر کے اپنا دائیں ہاتھ میرے ماتھے پر رکھا اور کچھ پڑھنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں، میں نے اور بزرگ دونوں نے آنکھیں کھول دیں۔ میں نے سرخ آنکھوں سے سب کو گھورا اور پھر سکون کی نیند سو گیا اور جو کچھ انہیں بزرگ صاحب نے بتایا وہ کچھ یوں تھا کہ!

اِس رات جنوں کے ایک خاندان کا گزر آپ کے گھر کے اوپر سے ہوا اور انہوں نے رات گزارنے کے لیے اس درخت پر بسیرا کرلیا۔ ان کے کنبے کی ایک لڑکی سیر کے غرض سے نیچے اُتری تو اس لڑکے کی نظر اس پر پڑ گئی اور وہ اس کا پیچھا کرنے لگا اور صبح اُٹھتے ہی اس لڑکے نے ان کے آرام میں خلل ڈالا یہ بات اُن پر گراں گزری جس کی سزا اُسے ملی۔ اب میں نے اس بچے پر دم کردیا ہے اور اللہ کے حکم سے وہ مکمل صحت یاب ہوجائے گا۔ بزرگ کی ہدایت پر اب اُس پیڑ کے آس پاس بھی کوئی نہ جاتا تھا اور پھر جیسے جیسے میری حالت بہتر ہوتی گئی پیڑ سوکھتا گیا اور جب میں مکمل طور پر صحت یاب ہوگیا تو اُس درخت کا وجود بھی گھر سے ہمیشہ کے لیے مٹ گیا۔ لیکن ابھی تک ساون کی راتوں میں کبھی کبھی بھینی بھینی خوشبو کے ساتھ ہلکی پائل کی آواز بھی سنائی دیتی ہے جو پتا نہیں میرا وہم ہے یا حقیقت!

☆......☆

ناگن

اعجاز احمد نواب

زندگی صرف وہی تو نہیں جو ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ زندگی تو وہ بھی ہے، جسے ہم صرف سوچتے ہیں۔ نیا سلسلہ ''ناگن'' آپ کو یقیناً ایک نئی دنیا، نئی زندگی میں قدم رکھنے پر مجبور کر دے گا۔ ہزاروں سال کی تپسیا پر پھیلا، زندگی کا نیا رنگ۔ ناگن کے روپ میں، آپ کو ضرور تسخیر کرے گا

قسط نمبر: 4

گزشتہ قسط کا خلاصہ:

شکنتلا کی کنیز خاص پریہ کوشیلیا سے کہتی ہے ان تمام لوگوں کے نام بتاؤ جو تمہارے سمیت رانی ماریہ کے لیے جاسوسی کرتے ہیں۔ وہ اسے دھمکی دیتی ہے کہ معلومات فراہم نہ کرنے پر مجھے مہارانی شکنتلا کی مکمل آشیر باد حاصل ہے کہ جو چاہے وہ سلوک تمہارے ساتھ کروں، تب کوشیلیا فر فر اسے سب کچھ بتا دیتی ہے۔ رام ناتھ نے سامری جادوگر سے رانی شکنتلا کی جنم کنڈلی (زائچہ) کی بابت دریافت کیا۔ سامری راجہ رام ناتھ کو جواب دیتا ہے کہ وہ اس بارے میں اپنے گرو شداد جادوگر کی بدروح سے ملاقات کر کے بتائے گا۔
شکنتلا راجہ رام ناتھ سے جو اس پر بری طرح فریفتہ تھا۔ ان قیدیوں کو سزا دینے کا کہتی ہے کہ میری چھوٹی سی اچھا ہے کہ ان چاروں قاتلوں کو کسی خفیہ تہ خانے میں بند کر کے چابی اس کے حوالے کر دی جائے، جہاں میں ان سے آہستہ آہستہ انتقام لے سکوں۔ شکنتلا دیوی کے دیوانے راجہ رام ناتھ اسے اس قید خانے کا بتاتے ہیں جو کہ اس خواب گاہ کے عین نیچے ہے اور جہاں قید ہونے کے بعد رام ناتھ کا دشمن دوبارہ آسمان دیکھنے کی خواہش دل میں لیے دنیا سے چلا جاتا ہے۔ شکنتلا حیرت سے یہ بات سنتی ہے اور مہاراجہ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ دوسری طرف دلاور کا دوست جبار دلاور کی بیوی غزالہ کو عامل کے پاس لے جانے کا کہتا ہے، لیکن اس سے پہلے ہی غزالہ جبار کا خون کر دیتی ہے۔
سامری جادوگر اپنے گرو شداد جادوگر سے ملاقات کرتا ہے جو اسے کہتا ہے کہ وہ ناگن ہے اور ''تو سب کچھ چھوڑ ناگن سے ناتا جوڑ'' سامری یہ سن کر بہت خوش ہوتا ہے۔ سامری شکنتلا سے ملاقات کرتا ہے اور اسے سانپ زادی کہہ کر مخاطب کرتا ہے مہارانی شکنتلا یہ سن کر سمجھ جاتی ہے کہ سامری اس کے راز کو جان گیا ہے۔ شکنتلا کہتی ہے کہ ''آؤ سامری ہم ایک ہو جائیں اور دونوں مل کر اس وسیع ریاست پر اپنی حکمرانی قائم کریں، میں سانپوں کی ملکہ ہوں اور تم جادوگروں کے بادشاہ، ہم دونوں بادشاہ اور ملکہ بن جاتے ہیں۔ سامری اسے کچھ دن بعد جواب دینے کا کہتا ہے۔ شکنتلا اپنی ملازمہ خاص پریہ کو بھی اپنی سچائی کے بارے میں بتاتی ہے اور اسے کہتی ہے کہ آج کے بعد میرے لیے



نوجوان انسانی خون کی فراہمی تمہاری ذمے داری ہوگی۔ پریہ یہ سن کر بہت خوف زدہ ہوتی ہے۔ شکنتلا اس سے کہتی ہے کہ اگر یہ بات کسی کو پتا چلی تو وہ پریہ کا خون کردے گی، دوسری صورت میں اسے تابانہ کی حکومت میں اعلیٰ عہدہ دیا جائے گا۔ پریہ مہارانی کے حکم کے آگے سر جھکا دیتی ہے۔

شکنتلا مہاراجہ سے دربار میں جانے کی فرمائش کرتی ہے اور اس سے پورے محل کا دورہ کرنے کا کہتی ہے۔ دربار میں شکنتلا سپہ سالار بلکرام کو اپنی نگاہوں سے اسیر کرلیتی ہے۔ وہ محل کے دورے پر نکلتی ہے، محل کے منتظمین مہارانی کی اچانک آمد سے پریشان ہوجاتے ہیں۔

(اب آپ آگے ملاحظہ کیجیے

''کیا نام ہے تمہارا؟'' شکنتلا پورے اعتماد کے ساتھ اس سے مخاطب ہوئی۔

''جی...... آنند...... آپ تشریف رکھیے نا۔''

''کب سے یہاں ہو......؟'' شکنتلا اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے بولی۔

''جی تقریباً پانچ سال سے۔''

''محل میں اس وقت کل کتنے ملازم ہیں۔''

''جی تقریباً سو تنخواہ دار ملازم ہیں اور دو سو کے قریب غلام اور کنیزیں ہیں۔ حفاظتی عملہ اور افسران بالا اس کے علاوہ ہیں۔''

''پریہ......''

''جی مہارانی جی......'' پریہ ہاتھ باندھ کر کھڑی ہوگئی۔

''آنند سے تمام حساب کتاب لے کر ساتھ چلو۔ ہم خود اس کی جانچ پڑتال کریں گے۔ ہمیں شک ہے کہ حساب میں گڑبڑ ہے۔''

''نہیں مہارانی جی آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''بکواس مت کرو...... سپاہیو اسے گرفتار کرلو اور میرے اگلے حکم تک اسے زندان میں رکھو......'' شکنتلا نے شان بے نیازی سے کہا اور اپنی فوج ظفر موج کے ساتھ نکلی اور محل کے لیے خوراک و لباس فراہم کرنے والے شعبے میں پہنچ گئی...... یہاں ایک عورت محکمے کی افسر تھی......وہ شکل سے ہی خرانٹ نظر آتی تھی...... مہارانی کو دیکھ کر پورے اعتماد سے کھڑی ہوگئی۔

''کیا نام ہے تمہارا......؟''

''کلپنا مہارانی جی۔''

''کب سے یہاں کی منتظم ہو؟''

''دو سال سے۔''

''جب سے یہاں آئی ہو اپنے تمام بہی کھاتے اور تمہارے آنے سے پہلے کا حساب فوری طور پر پیش کرو۔ پریہ اس سے بہی کھاتے لے کر اسے بھی گرفتار کرلو۔'' اب مہارانی کا رُخ محل کے اندر بنے ہوئے زندان کی طرف تھا۔ زندان کی عمارت سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی تھی اور تقریباً چھ کمروں پر مشتمل تھی۔ پہلے برآمدہ تھا، پھر صحن اور آخر میں دیوار کے ساتھ ساتھ کمرے تھے۔ قید خانے سے باہر اونچی دیوار تھی، جس کے اوپر نوکیلے شیشے کے ٹکڑے لگائے گئے تھے۔ ایک کمرے میں عملہ تھا...... اور دوسرے میں داروغہ، تیسرے کمرے میں سامان تھا۔ ایک کمرے میں قیدی مرد...... اور دوسرے میں قیدی عورتیں اور آخری کمرے میں خطرناک نوعیت کے قیدی ہوتے تھے۔ داروغہ مہارانی کو سامنے پاکر حیران و پریشان تھا۔ مہارانی نے اسے بھی صرف چند لمحوں میں تمام لکھت پڑھت پیش کرنے کا حکم دیا اور ماتحتوں کو حکم دیا کہ داروغہ کو گرفتار کرلیا جائے۔

''پریہ......'' شکنتلا نے اس کے کان میں کہا۔ یہاں چار قیدی ہوں گے، جنہیں مہاراجہ نے ہمسایہ ریاست سے واپس آتے وقت راستے میں گرفتار کیا تھا۔ ان چاروں کو ہماری خواب گاہ میں پہنچاؤ اور ان تینوں کو لے کر اپنے کمرے

میں چلی جاؤ......ہم بھی وہیں آئیں گے۔ یہ کہہ کر شکنتلا ابھی زنداں سے باہر آئی ہی تھی کہ سپہ سالار بلگرام اسے تلاش کرتا ہوا ادھر آنکلا......

"نمستے" اس نے ہاتھ باندھ کر پرنام کیا۔ مہارانی نے سر ہلا کر جواب دیا۔

"بلگرام تم ہمارے کمرے میں آ کر ہم سے ملاقات کرو۔"

"جو حکم مہارانی...... کس وقت حاضر ہو جاؤں؟"

"دوپہر کا کھانا آج تم ہمارے ساتھ کھاؤ......" یہ کہہ کر مہارانی چل پڑی اور کنیزیں اور دیگر لوگ تھوڑی دیر بعد پریہ کے کمرے میں آ گئے۔ زندان کا داروغہ، انتظامیہ کا سربراہ اور محکمہ خوراک ولباس کا افسر وہاں سپاہیوں کی حراست میں موجود تھے۔

"پریہ کیا تمہارے کمرے کے پیچھے بھی کوئی کمرہ ہے۔"

"جی ہاں مہارانی جی۔ اس کے پیچھے تو کمروں کی قطار ہے۔"

"تینوں کو پچھلے کمرے میں لے جاؤ......" سپاہیوں کا دستہ تینوں کو اندر کے کمرے میں لے گیا۔ اب شکنتلا نے باقی تمام لوگوں کو کمرے سے نکل جانے کا حکم دیا۔

"پریہ تم اندر جا کر سپاہیوں کو ہدایت کرو کہ ان کے پاؤں باندھ کر ہاتھوں میں رسی ڈال کر چھت کے ساتھ باندھ دیں، منہ میں کپڑا ٹھونس دیں۔" پھر خود کرسی پر بیٹھ گئی......تھوڑی دیر بعد پریہ نے آ کر بتایا کہ تمام کام ہو چکے ہیں۔

"چلو ہم بھی دیکھیں۔" پریہ شکنتلا کو لے کر پچھلے دروازے سے اندر آ گئی۔ پیچھے راہداری تھی۔ جس میں آمنے سامنے کمرے تھے......ایک کمرہ چھوڑ کر دوسرے کمرے میں دونوں داخل ہوئیں تو داروغہ، افسر عورت اور آنند کو کمرے کے وسط میں بری طرح جکڑے پایا۔



''بہت اچھا.....شاباش پریہ.....'' شکنتلا مسرت سے بولی..... ''تم میری ہر بات سمجھ جاتی ہو۔''
''داسی ہوں آپ کی حضور! اب کیا حکم ہے مہارانی جی.....'' پریہ ادب سے بولی۔
''ایک بید لے کر آؤ.....''
''ابھی لائی جی۔'' چند ہی لمحوں میں پریہ ایک موٹا بید، جو اس کے اپنے استعمال میں تھا، لے آئی اور شکنتلا کو پیش کر دیا۔ ''خود پکڑو.....'' شکنتلا نے حکم دیا۔ ''اور ان تینوں کو اس وقت تک مارو جب تک تمہارے ہاتھوں کی طاقت ساتھ دے۔''
''ضرور مہارانی جی!'' پریہ جھک کر پیچھے ہوئی اور..... بید سیدھا کر کے افسر عورت پر برسانے لگی.....عورت بری طرح تڑپنے لگی لیکن ہاتھ پاؤں بندھے ہونے کی وجہ سے زیادہ تڑپ بھی نہ سکی.....اور پھڑکنے لگی.....منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا.....لہٰذا بے چاری کی آواز بھی حلق میں ہی رہ جاتی..... پریہ اس کی تکلیف سے قطع نظر شکنتلا کے حکم پر اس کی بری طرح پٹائی کر رہی تھی اور شکنتلا بڑی دلچسپی سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔
''بس کرو.....'' شکنتلا ہاتھ اٹھا کر بولی..... ''اب اس کو شروع ہو جاؤ۔'' اُس نے داروغہ کی طرف اشارہ کیا.....اور پریہ ایک روبوٹ کی طرح، اب داروغہ کی خدمت کرنے لگی۔ داروغہ جی بھی بے بس پرندے کی طرح پھڑک کر رہ گئے اور چپ چاپ پٹتے رہے۔ اس کے بعد تیسرے قیدی آنند کی باری آئی، اس کی آنکھیں پہلے ہی خوف سے پھٹ رہی تھیں، لیکن شکنتلا کو اس بات کی پروا نہیں تھی.....اور پریہ اب بید آنند پر ایسے برسا رہی تھی جیسے گدھے کو پیٹ رہی ہو۔ تینوں پر خاصا تشدد کر چکنے کے بعد شکنتلا نے پریہ کو ہاتھ روک لینے کا حکم دیا.....اور اس کو ساتھ لے کر پریہ کے کمرے میں واپس آ گئی۔ پریہ پسینے سے شرابور ہو چکی تھی۔ بال بے ترتیب اور بناؤ سنگھار بگڑ چکا تھا اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ وہ بُری طرح تھک گئی تھی۔ شکنتلا نے پریہ کو کرسی پر بیٹھ کر حالت درست کرنے کا حکم دیا اور خود اس کے بستر پر لیٹ گئی۔ پریہ تولیے سے پسینا پونچھ رہی تھی اس کے بعد اس نے پانی کے دو گلاس پیئے اور اپنا حلیہ درست کرنے لگی۔
''پریہ.....'' شکنتلا لیٹے لیٹے بولی..... ''ان چاروں قیدیوں کو کس حال میں چھوڑ کر آئی ہو؟''
''مہارانی جی آپ کے کمرے میں بند ہیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں اور چاروں کی گردنیں ایک ہی زنجیر سے باندھ دی ہیں۔ منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا ہے۔''
''بہت خوب۔'' شکنتلا مسکرائی۔
''آؤ اب وہاں چلیں۔''
''شربت پانی وغیرہ تو پی لیں.....صبح سے تھک گئی ہوں گی۔''
''نہیں پریہ.....پانی وانی اپنے کمرے میں پیوں گی تمہیں ایک تماشہ بھی دکھانا ہے۔''
''چلیں.....باندی تیار ہے.....'' پریہ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی۔ پریہ نے تالی بجائی تو ایک کنیز اندر آ گئی.....
''باقی کنیزوں کو بلاؤ مہارانی کو احترام سے لے چلیں۔'' تھوڑی دیر میں کئی کنیزیں اندر داخل ہوئیں اور شکنتلا کو اپنے جلو میں لے کر احترام سے چل پڑیں۔

☆......☆

شکنتلا جب اپنی خواب گاہ میں داخل ہوئی تو پریہ کو باہر سے ہی کنیزوں کو بھیج دینے کا حکم صادر کیا..... پریہ نے فوراً کنیزیں واپس کر دیں اور خود ملکہ کے کمرے میں داخل ہو گئی اور کمرے کا دروازہ اندر سے مقفل کر دیا۔ کمرے کے فرش پر رندھیر، تلک رائے، کرم سنگھ اور ایک نوجوان بندھے ہوئے تھے۔ وہ شکنتلا کو اپنے سامنے پا کر حیرانی سے دیکھنے لگے۔ شکنتلا اس وقت شاہانہ لباس میں تھی۔
''پریہ ان کے پاؤں کھول دو.....'' اور پریہ آگے بڑھ کر چاروں قیدیوں کے پاؤں کی رسیاں کھولنے لگی.....لڑکی ہونے کی وجہ سے اسے خاصی مشکل پیش آئی، تاہم کسی نہ کسی طرح وہ پاؤں کی رسیوں کو کھولنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس کی رسی کھولنے کے دوران ہی شکنتلا نے اُٹھ کر کمرے کے آخری سرے پر دیوار کے ساتھ نیچے قالین اتنی آہستگی سے ہٹایا کہ

پر یہ کو کانوں کان خبر نہ ہوسکی اور پھر زمین پر بنے گول سوراخ کے اوپر ایڑی رکھ کر اسے دائیں طرف گھمایا تو بغیر کسی معمولی آواز کے سامنے کی دیوار درمیان سے شق ہوگئی۔ شکنتلا نے فوری طور پر قالین واپس اپنی جگہ پر رکھ دیا۔ پر یہ جب ان کی رسی کھول کر اٹھی تو اپنے سامنے دیوار میں شگاف پا کر ہکا بکا رہ گئی۔

"یہ کیا ہے مہارانی جی۔"

"پر یہ......" شکنتلا نے سنجیدہ لہجے میں کہا...... "سوال مت کیا کرو......"

"معافی چاہتی ہوں سرکار......" پر یہ سمجھ گئی کہ شکنتلا اسے نہیں بتانا چاہتی۔ ان چاروں کو دیوار کے اس طرف لے جاؤ...... پر یہ نے فوراً ہنٹر نکال کر لہرایا اور ان چاروں کو اٹھنے کا اشارہ کیا...... چاروں قیدی لڑکھڑاتے ہوئے کھڑے ہوئے۔ چاروں کی حالت طویل عرصہ قید میں رہنے کے سبب خستہ ہو چکی تھی۔ وہ آہستگی سے کھڑے ہو رہے تھے۔ پر یہ نے کوڑا گھما کر رندھیر کی پشت پر رسید کیا تو وہ تڑپ گیا اور تیز تیز حرکت کرنے لگا، باقی قیدی بھی چست ہوگئے اور اُٹھ کر دیوار کے اس طرف جانے لگے۔ ان کے راہداری میں داخل ہونے سے پہلے ہی شکنتلا نے دوسری طرف جا کر قید خانے والا رستہ کھول دیا...... اب چاروں قیدی آگے آگے ایک دوسرے کے ساتھ چل رہے تھے۔ پر یہ ان کے پیچھے ہنٹر ہاتھ میں پکڑے اور سب سے پیچھے ملکہ شکنتلا بید تھامے چل رہی تھی۔ دیوار کے شگاف کے پاس ہی سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ تقریباً تیس سیڑھیاں اترنے کے بعد ایک ہال سا آ گیا جس میں لوہے کے سریوں سے چھوٹے چھوٹے پنجرے بنے تھے جو خالی تھے۔ ہر پنجرہ تقریباً بیس فٹ اونچا اور دس فٹ لمبا اور چوڑا تھا۔ ان کے باہر لوہے کے دروازے تھے۔ دروازوں کے کنڈوں پر ایک ایک تالا تھا...... جن کی چابیاں ان کے اندر ہی تھیں۔ ہر کیبن کے اندر پانی کی چھوٹی سی حوضی تھی جس میں گدلا پانی جمع تھا۔ دو پنجروں میں پہلے سے دو قیدی موجود تھے۔ شکنتلا نے بید کے اشارے سے پر یہ کو ایک کیبن کا دروازہ کھولنے کا حکم دیا۔ پر یہ نے فوراً آگے بڑھ کر دروازہ کھول کر کوڑا زور سے گھما کر تلک رائے کے شانوں پر رسید کیا...... وہ تکلیف سے تڑپ اٹھا اور تیزی سے پنجرے میں داخل ہوگیا...... باقی سب بھی اس کے پیچھے جلدی جلدی گھس گئے...... پر یہ نے فوراً تالا لگا دیا اور چابی نکال کر شکنتلا کو پیش کر دی...... "پر یہ فوراً جا کر باسی روٹیاں لا کر ان کے آگے ڈھیر کر دو...... تاکہ یہ شریر و آتما کا رشتہ برقرار رکھ سکیں۔" پر یہ اثبات میں گردن ہلا کر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد شکنتلا جنگلے کے سامنے آ کر بولی۔ مجھے پہچانا رندھیر...... ؟" رندھیر، تلک رائے، کرم سنگھ وغیرہ اس وقت شکنتلا کو حیرت اور خوف بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے...... منہ میں کپڑا ہونے کی وجہ سے سب بولنے سے قاصر تھے۔

"میں شکنتلا ناگن ہوں...... میرے ناگ کو تم لوگوں نے میرے سامنے جلا کر مار دیا تھا۔ اس وقت میں بے بس تھی، لیکن آج وقت شکنتلا کی گرفت میں ہے۔ تم چاروں کو میں اپنے ہاتھوں سے قتل کروں گی، لیکن اس سے پہلے تمہارا وہ حشر کرنا ہے کہ تم خود موت مانگنے لگو......" اتنے میں پر یہ ایک تھیلے میں باسی روٹیاں لے آئی۔ شکنتلا نے خشمگیں نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا...... تمہارے ساتھ کوئی اور بھی خواب گاہ میں آیا ہے...... نہیں مہارانی...... پر یہ اعتماد سے بولی۔ میں نے خود دروازے پر کھڑے ہو کر نرملا کو روٹیاں لانے بھیجا تھا۔ ٹھیک ہے، شکنتلا مطمئن انداز میں بولی اور پر یہ کو روٹیوں کے ٹکڑے جنگلے کے اندر پھینکنے کا حکم دیا۔ پر یہ باسی روٹیوں کے ٹکڑے جنگلے کے اندر پھینکنے لگی...... اور شکنتلا پہلے سے موجود شکستہ حال قیدیوں کو طائرانہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ "پر یہ......" شکنتلا بولی، ان کے منہ سے کپڑا نکال دو...... تاکہ یہ کچھ کھا سکیں اور گندا پانی پی سکیں...... شکنتلا نے نخوت سے حکم دیا...... تھوڑی دیر بعد دونوں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئیں...... پر یہ کو کمرے میں بھیج کر شکنتلا قید خانے کا راستہ بند کر کے خواب گاہ میں آ گئی۔ خواب گاہ میں آنے کے بعد شکنتلا نے پر یہ کو کمرے کے غسل خانے میں جانے کا حکم صادر کیا، وہ غسل خانے میں گئی تو اس نے دیوار برابر کر دی...... اور پھر پر یہ کو واپس بلا لیا...... پر یہ دیکھ کر حیران تھی کہ دیوار کو دیکھ کر بالکل محسوس نہ ہوتا تھا کہ اس کے پیچھے بھی کوئی چیز موجود ہے یا نہیں۔ شکنتلا گہری سانس لے کر اپنے بستر پر آڑی ترچھی چاروں شانوں چت لیٹ گئی......

"آج آپ بہت تھک گئی ہوں گی۔" پر یہ اس کے جوتے اُتارتے ہوئے بولی۔ "ہاں پر یہ لیکن ابھی بہت کام باقی ہیں۔ ابھی ہم نے سپہ سالار کو بھوجن پر بلایا ہے، وہ آتا ہی ہوگا تم چند کنیزوں کو بھیج کر کھانے کے کمرے میں انتظامات کرو......

''جو حکم...... عالی جاہ'' اور پریہ کمرے سے نکل گئی۔ تھوڑی دیر بعد چند کنیزیں نہایت ادب اور خاموشی سے اجازت لے کر اندر داخل ہوئیں...... ایک نے پھلوں کا رس پیش کیا...... دو کنیزیں مورچھل جھلنے لگیں۔ دو کنیزیں شکنتلا کا حسن سنوارنے لگیں، دو جسم دبانے لگیں۔ تھوڑی ہی دیر میں شکنتلا سکون میں آ گئی اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ کنیزیں بدستور مورچھل جھلتی اور اس کا جسم دباتی رہیں اور باقی ادب سے سر جھکا کر کھڑی ہو گئیں۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ پریہ اندر داخل ہوئی اور آہستہ سے شکنتلا کے انگوٹھے پر گلاب کا پھول مار کر اسے متوجہ کیا...... اور بولی ''سپہ سالار بلگرام کھانے والے کمرے میں تشریف لا چکے ہیں اور آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔'' شکنتلا اُٹھ کر بیٹھ گئی...... ایک کنیز نے اس کے پاؤں باری باری اپنی گود میں رکھ کر جوتے پہنائے اور پھر شکنتلا نے کھڑے ہو کر ایک نظر اپنا جائزہ لیا اور زلفوں کو ایک جھٹکا دے کر چل پڑی...... کنیزوں کا قافلہ ہمراہ تھا۔ کھانے کے کمرے میں سپہ سالار بلگرام اپنی مکمل وردی میں ملبوس کمر میں تلوار لٹکائے اور شانوں پر عہدے کے پھول سجائے چاق چوبند بیٹھا تھا...... مہارانی کی آمد پا کر احتراماً کھڑا ہو گیا اور زوردار سیلوٹ کیا...... تو شکنتلا نے اپنا نرم و ملائم ہاتھ ملانے کے لیے آگے بڑھا دیا...... یہ بات بلگرام کے لیے غیر متوقع تھی، لیکن مہارانی کے ہاتھ کو نظر انداز کرنا توہین کے زمرے میں آتا تھا، لہٰذا اس نے بھی اپنا دایاں ہاتھ مہارانی سے ملاتے ہوئے اس سے آنکھیں چار کیں...... نرم و نازک ہاتھ پکڑنے سے بلگرام کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی...... اتنا خوب صورت اور نرم ہاتھ اس نے کبھی نہ چھوا تھا۔ اب دونوں آمنے سامنے بیٹھ چکے تھے۔ شکنتلا نے پریہ کو اشارہ کیا تو پریہ نے تمام کنیزوں کو باہر جانے کا حکم دے دیا اب کمرے میں صرف تین آدمی رہ گئے تھے۔ ''سنائیے...... بلگرام آپ کیسے ہیں؟''

''جی مہارانی میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''کب سے اس عہدے پر ہیں؟''

''جی ایک سال سے۔''

اتنے میں پریہ نے دونوں کو کھانے کی طرف متوجہ کیا اور دونوں کھانا نکال کر کھانے لگے۔

''بلگرام آپ شادی شدہ ہیں؟'' شکنتلا نے اچانک سوال داغا۔

''جی نہیں...... میری ابھی شادی نہیں ہوئی۔''

''والدین اور بہن بھائی......؟''

''جی کوئی بہن بھائی نہیں...... والدہ پچھلے سال ہیضے سے پرلوک سدھار گئیں اور پتا جی تو بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا...... کہ پہاڑ سا جیون اور خوب صورت جوانی اکیلے ہی گزار رہے ہیں۔'' شکنتلا نے بلگرام کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر معنی خیز انداز میں مسکرا کر کہا تو بلگرام صرف مسکرا کر رہ گیا۔

''مہارانی...... کیا آپ نے مجھے کسی خاص مقصد کے لیے دعوت دی تھی۔''

''نہیں بلگرام۔'' شکنتلا میٹھے پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولی۔

''مجھے فوجی وردی میں نوجوان بہت اچھے لگتے ہیں...... سچ مانیے تو آپ جیسا...... سپاہی میں نے پہلی مرتبہ دیکھا...... میرا من چاہا کہ آپ کی دعوت کروں، آپ سے باتیں کروں اور فوجی زندگی کا قریب سے مشاہدہ کروں...... مہاراجہ کے توسط سے اس لیے نہ بلایا کہ انہیں ریاستی کاموں سے فرصت نہیں ہوتی...... اگر انہیں آپ کی دعوت کرنے کا کہتی تو معاملہ کئی دنوں تک چلا جاتا۔''

''مہارانی! میں آپ کی اس ذرہ نوازی اور عزت افزائی کا بے حد مشکور ہوں...... کبھی ہو سکے تو غریب خانے پر تشریف لائیے نا!'' یہ کہتے ہوئے بلگرام جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا...... تو ملکہ اسے رخصت کرنے کے لیے دروازے تک آئی۔ ایک بار پھر گرم جوشی سے ہاتھ ملا کر اور گہری مسکراہٹ کے ساتھ اس کو رخصت کیا۔ اب شکنتلا اور پریہ...... دونوں ہی ملکہ کی خواب گاہ میں آ گئیں۔ ملکہ پھر اپنے بستر پر دراز ہو گئی...... اور پریہ نے احترام سے اس کے جوتے اتارے اور تالی بجا کر چند کنیزیں بلائیں۔ چار کنیزوں کو پلنگ کے چاروں طرف پنکھا جھلنے کا حکم دیا۔ اور ایک قیمتی اور خوب صورت بلوریں جام میں شراب ڈالنے لگی۔ پریہ تم بھی پیو اور ادھر کرسی نزدیک کر کے بیٹھ جاؤ۔ ''نہیں مہارانی جی

ں کھڑی ہی ٹھیک ہوں۔" "بیٹھونا......" شکنتلا۔ نے اسے میٹھی نظروں سے دیکھتے ہوئے ہاتھ سے کھینچ کر بٹھادیا۔ اس نے کرسی شکنتلا کی پائنتی کے پاس رکھ دی اور اس عنایت پر نہال ہوگئی۔

"تم نے پوچھا نہیں کہ تمہارے پاس جو تین قیدی ہیں ان کا کیا کرنا ہے؟"

"پر یہ تو آپ کی داسی ہے حضور...... سوال کرنے کی جرأت نہیں، جیسا آپ کہیں گی...... بلا چون و چراں ویسا ہی کروں گی۔"

"شاباش پر یہ شاباش تم ترقی پاؤ گی اور سنورات کو ان تینوں کو تھوڑا بہت کھانے پینے کو دے دینا...... تا کہ مر نہ جائیں اور پھر اسی طرح باندھ کر...... مزید ان کی خدمت کرنا۔ میرا مطلب سمجھ گئی ہو......؟"

"بالکل سرکار سمجھ گئی۔" پر یہ نے ملکہ کے پیروں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"صبح کو...... پھر ان کی خبر لو...... ان کو ڈرا دھمکا کر اپنا کرنے کی کوشش کرو کہ یہ ہر بات ہمیں بتائیں اور محل کے سارے رازوں میں ہمیں شامل کرلیں...... اگر بات نہ بنے تو پھر تم ان کی جگہ اپنی مرضی کے آدمی لگا سکتی ہو...... اور ان کے ساتھ جو چاہے سلوک کرسکتی ہو لیکن کوشش کرو کہ انہیں کوئی زخم وغیرہ نہ آئے۔"

"آپ فکر نہ کریں......" پر یہ اعتماد کے ساتھ بولی۔

"اب تم جاؤ آرام کرو...... ہمیں نیند آرہی ہے۔" اور پھر شکنتلا نے پر یہ کا جواب سنے بغیر منہ پھیر کر آنکھیں بند کرلیں۔ پر یہ نے کنیزوں کو پنکھا جھلتے رہنے کا حکم دیا...... اور کمرے سے نکل گئی۔

☆......☆

"سامری تم نے کیا کیا...... تو نے کہا تھا کہ شداد کی بدروح سے مشورہ کرنے کے بعد ہی بتاؤں گا...... اب مجھے بتاؤ...... یا تمہارا کالا علم کچھ بتانے سے قاصر ہے۔" ماریہ جو آج اپنی شاہی حویلی سے دربار میں شرکت کرنے آئی تھی...... دربار برخواست ہونے کے بعد سامری کے پاس پہنچ کر بولی۔ "ماریہ جی آپ میری حویلی آئیں گی...... تو میں آپ کو ساری صورت حال بتاؤں گا......" سامری یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ رانی ماریہ کنیزوں اور محافظوں کے ہجوم میں اپنی حویلی روانہ ہوگئی۔ بگھی مختلف راستوں سے ہو کر حویلی کی طرف رواں تھی۔ بگھی کے آگے پیچھے مسلح گھڑ سوار اور بگھی میں رانی ماریہ کے ساتھ اس کی چند چہیتی کنیزیں تھیں۔ ماریہ اس وقت سامری کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی...... اس کو سامری کا رویہ بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔ ضرور دال میں کچھ کالا ہے، ورنہ سامری تو ایسا ٹھور نہ تھا۔ اب کہاں جاؤں؟ سامری نے اپنی حویلی میں بلایا ہے، ٹھیک ہے وہاں بھی جاؤں گی...... کوشیلیا اور سادھنا کو بھی شکنتلا نے وہاں قید کرلیا ہے۔ مہاراجہ میری بات سنتے نہیں، شاہی محل اور دربار پر شکنتلا کا طوطی بولنا شروع ہوگیا ہے۔ ہر طرف راستہ بند ہو رہا ہے۔ ماریہ رانی بگھی کے پردے سرکا کر باہر دیکھتے ہوئے یہی باتیں سوچتی جارہی تھی کہ اسے کالی کا مندر نظر آیا...... تو اچانک ہی اسے شاہی پنڈت گروزائن کا خیال آیا جو کالی کے مندر کا بڑا پجاری تھا...... سنا ہے کچھ آتمائیں بھی اس کی دسترس میں ہیں، کچھ شکتیوں کا مالک بھی ہے...... اور جنتر منتر پر بھی عبور رکھتا ہے۔

"بگھی روکو۔" ماریہ نے اونچی آواز میں حکم دیا۔ کوچوان نے فوراً راسیں کھینچ لیں۔ کالی کے مندر چلو۔ شاہی قافلے کا رخ کالی کے مندر کی طرف ہوگیا۔ عام راستے سے ہٹ کر یہ مندر ایک کھلی جگہ پر تھا...... چاروں جانب سیڑھیاں تھیں اور مندر دور سے ایک چبوترے کی شکل میں نظر آتا تھا۔ مندر کے بڑے دروازے پر بگھی روک لی گئی۔ رانی ماریہ نے سوچا کہ آج چوں کہ گروزائن دربار نہیں آئے۔ لہٰذا ضرور مندر میں ہی ہوں گے۔ رانی کی سواری دیکھ کر پجاریوں اور سادھوؤں کے علاوہ یاتریوں میں بھی بھگدڑ مچ گئی۔ محافظ ہنٹر مار مار کر لوگوں سے راستہ صاف کرانے لگے، کچھ ہی دیر میں راستہ صاف ہوگیا۔ رانی ماریہ کنیزوں اور محافظوں کے درمیان سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر چلی گئی...... دو کنیزوں نے اس کا لباس سنبھالا ہوا تھا...... سیڑھیاں ختم ہونے کے بعد جب اوپر آئی تو مندر کے تمام پجاری، سادھو اور داسیاں رانی ماریہ کی جھلک دیکھنے کے لیے اکٹھے ہو چکے تھے۔ محافظ دستہ رانی ماریہ کو گھیرے میں لے کر شاہی پجاری گروزائن کے حجرے کی طرف چل پڑا۔ گروزائن کا ڈیرہ مندر کے برآمدے کے آخر میں جا کر ایک تہ خانے میں تھا جہاں خوب صورت سیڑھیاں بنائی گئی

تھیں۔ گرونرائن کو ماریہ کی آمد کی اطلاع فوری طور پر پہنچادی گئی تھی اور وہ رانی ماریہ کے سواگت کے لیے اوپر ہی آ رہا تھا۔ ماریہ نے اپنے ہمراہ لوگوں کو باہر ہی رکنے کا حکم دیا اور خود اکیلی اندر چلی گئی۔ سب لوگ باہر رُک گئے۔ ماریہ نے اندر جا کر دروازہ بند کرلیا۔ گرونرائن قدرے پھیلے ہوئے جسم کا مالک تھا...... کانوں میں چھلے اور گلے میں مالا...... سرخ رنگ کا چولا پہنے ہوئے تھا۔ چہرے پر کرختگی چھائی ہوئی تھی...... یہ نہ صرف شاہی پجاری تھا...... بلکہ کالی کے مندر کا مہان پجاری ہونے کے باعث ریاست تابانہ کے تمام گرو، پنڈت، سادھوؤں اور پجاریوں کے لیے قابل احترام تھا...... رانی ماریہ کو دیکھتے ہی خوف ناک انداز میں مسکرایا......

''میری مہان شکتی کہتی تھی کہ سب طرف سے مایوس ہوکر رانی ماریہ کالی دیوی کے استھان اوش آئے گی۔''

''پجاری جی...... میری سہائتا کریں۔ میں تو لٹ گئی برباد ہوگئی۔'' رانی بے کھٹکے گرونرائن کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر سسک پڑی۔ گرونرائن مسکراتے ہوئے کچھ دیر مالا جپتا رہا اور پھر رانی سے مخاطب ہوا۔ ''رانی جی...... سامری سے بھی تو آپ نے مدد طلب کی تھی۔ اس کا کیا بنا؟''

''پنڈت جی...... مجھے مایوس نہ کریں...... سامری کی بات چھوڑیں...... مجھے تو وہ بھی شکنتلا سے ملا ہوا نظر آتا ہے۔ آپ ہی میری سہائتا کر سکتے ہیں۔ آپ مہان ہیں۔ آپ کی شکتی اپرم پار ہے۔ آپ کو کالی کا واسطہ۔''

''کالی کا واسطہ دیا ہے تو سن۔ وہ لڑکی شکنتلا انسان نہیں...... ناگن ہے وہ سامری کے بس کی نہیں...... سامری تو اس کے ماضی میں جھانکنے کے لیے بھی اپنے گرو کی بدروح سے مدد لینے پر مجبور ہوگیا تھا۔ اس کو قابو کرنا...... صرف گرونرائن کے بس میں ہے۔ ہم نے کٹھن تپسیا کے بعد وہ شکتیاں قبضے میں کی ہیں جو سامری کی اگلی دس نسلیں بھی نہیں کرسکتیں۔'' رانی ماریہ خاموش سکتے کے عالم میں گرونرائن کو دیکھ رہی تھی...... جیسے اسے پنڈت جی کی کسی بات کا اعتبار نہ آ رہا ہو۔

''وہ...... وہ ناگن ہے۔ پنڈت جی......؟''

''ہاں ماریہ وہ ناگن ہے۔ شیش ناگن۔ تیرے لیے بہتر یہی ہے کہ اس کے مقابلے پہ نہ آ...... وہ بہت شاطر ہے۔ انسانی خون اس کی خوراک اور ظلم وتشدد اس کا خاصہ ہیں۔''

''گرو جی...... آپ تو مہان ہیں۔ آپ اگر کوشش کریں تو وہ آپ کے تابع ہوسکتی ہے۔''

''ہاں ہوسکتی ہے پرنتو، اس کارن ہمیں تیرتھ اشنان کرنا پڑے گا۔ کالی دیوی کے مندر کلکتہ جا کر نوے دن کے لیے مسلسل بن باس لینا پڑے گا، تب جا کر ہمیں وہ شکتی دان ہوسکتی ہے کہ ہم اس ناگن کے زہر سے اور ناگ دیوتا کے قہر سے بچ سکیں اور پھر یہ ناگن ہماری زرخرید لونڈی بن جائے گی اور میرے ہر حکم پر ہر کام کرے گی۔ لیکن اس سے پہلے ہمیں ایک کنیا کالی کے آگے بلیدان کرنا پڑے گی۔ اس کا خون کالی ماتا کے شبھ چرنوں میں ڈالنا ہوگا۔ تب ہمیں تیرتھ اشنان کرنے کی اجازت ہوگی۔ بول رانی ان کاموں کے بدلے میں تو ہماری کیا سہائتا کرے گی۔''

''میں اپنے جیون کے کشٹ دور کرنے کے لیے ہر کام کرنے کو تیار ہوں۔ پنڈت مہاراج...... بس تم میری سوتن کا کریا کرم کروا دو۔ ہم تمہارا احسان کبھی نہ بھولیں گے۔'' یہ کہتے ہوئے ماریہ گرونرائن کے قدموں میں گر گئی۔

''تو پھر جا رانی ماریہ...... انتظار کر اس سمے کا جب ہم تمہیں یہاں بلائیں۔''

''آپ کی بڑی کرپا ہے پنڈت جی۔'' ماریہ دونوں ہاتھ ماتھے تک لے جا کر پرنام کرتے ہوئے بولی۔

☆......☆

شکنتلا آنکھیں بند کیے آرام دہ مسہری پر لیٹی ہوئی تھی۔ کنیزیں مورچھل جھل رہی تھیں اور دو کنیزیں اس کی ٹانگیں دبا رہی تھیں کہ اچانک شکنتلا نے محسوس کیا...... ٹانگیں دبانے والیوں کے ہاتھ رک گئے ہیں اور مورچھل کی ہوا آنا بھی بند ہوگئی ہے۔ اس نے غصے میں آ کر دیکھنا چاہا کہ کنیزوں نے ہاتھ کیوں روکے ہیں تو کیا دیکھتی ہے کہ سب کنیزیں اپنی اپنی جگہ ساکت ہوکر بتوں کی شکل اختیار کرگئی ہیں اور سامری اس کے پاس کھڑا مسکرا رہا ہے۔ کالے سیاہ چہرے میں سفید دانت ہی نمایاں نظر آرہے تھے۔ ''ہوں اس کا مطلب ہے کہ سامری کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔'' سامری نے ہاتھ میں پکڑی انسانی پنڈلی کی ہڈی لہراتے ہوئے پورے غرور کے ساتھ کہا...... اس کے کاندھے پر ایک آنکھ والا الو بیٹھا تھا۔

''خوش ہو...... جا...... سامری نے تیری سہائتا کا فیصلہ کر لیا ہے۔''
''اگر تیرا ساتھ مجھے مل جائے تو ساری دنیا میرے قدموں میں ڈھیر ہو جائے۔ شکنتلا ناقابل تسخیر بن جائے گی سامری جی......'' شکنتلا پلنگ سے اُتر کر سامری کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''ہاں شکنتلا...... دیوی دیوتاؤں کی بھی اچھا ہے کہ کالی کا سیوک اور ناگ دیوتا کی چہیتی ایک ہو جائیں اور چھا جائیں اس بے وقوف دنیا پر۔ اب میں جا رہا ہوں! تجھے جب میری ضرورت ہو تو دل میں بس تین دفعہ...... سامری، سامری، سامری کہہ دینا...... میں اللہ دین کے جن کی طرح تیری مدد کو آ جاؤں گا۔'' یہ کہہ کر سامری ایک دم غائب ہو گیا اور اس کے جاتے ہی کنیزیں مورچھل جھلنے لگیں اور پاؤں دابنے والیاں بھی حرکت کرنے لگیں اور حیران نظروں سے شکنتلا کو دیکھنے لگیں کہ وہ ابھی تو پلنگ پر تھی اب پلنگ سے نیچے اُتر کر کیسے کھڑی ہو گئی۔

☆......☆

''شکنتلا تمہارے روپ میں دیوتاؤں نے مجھے اپسرا دان کر دی ہے۔'' رام ناتھ شکنتلا کو دیکھتے ہوئے بولے۔
''اور آپ کا ساتھ ملا تو میں نے جانا کہ مجھے دنیا میں سورگ مل گئی۔'' شکنتلا نگاہیں جھکا کر شرمیلے لہجے میں بولی...... تو رام ناتھ اس ادا کی تاب نہ لاتے ہوئے اس کی نشیلی آنکھوں میں کھو گئے۔
''آج بلگرام کو تم نے دوپہر کے بھوجن پر بلایا تھا......؟'' رام ناتھ نے اچانک کچھ یاد آنے کے انداز میں کہا۔
''جی ہاں...... محل کا دورہ کرتے ہوئے وہ مجھے ملا تھا تو اتنے میں بھوجن کا وقت ہو گیا، وہ واپس جانے لگا تو میں نے اسے روک لیا...... اچھا نہیں لگتا تھا کہ سپہ سالار کو بغیر کھانے کے واپس جانے دیا جاتا......''
''چلو ٹھیک ہے۔'' مہاراجہ تائید کرتے ہوئے بولے۔
''محل کا دورہ کرتے وقت مجھے خبر ملی ہے کہ تم نے کچھ لوگوں کو گرفتار کیا تھا؟''
''ہاں آپ تو سارا دن دربار میں مصروف ہوتے ہیں تو یہ سرکاری اہلکار اپنے فرائض سے غفلت برتتے ہیں اور مکاریاں دکھا کر حساب کتاب میں الٹ پھیر شروع کر دیتے ہیں۔ میں نے ان کے تمام کھاتے اور حسابات جانچ پڑتال کی غرض سے قبضے میں لیے اور ان کو فیصلے تک گرفتار کر لیا ہے۔ اگر حسابات ٹھیک ہوئے تو چھوڑ دیا جائے گا اور اگر آپ کہتے ہیں تو صبح ہی چھوڑ دیتے ہیں۔'' شکنتلا نے آخری جملہ قدرے خفگی سے ادا کیا تو مہاراج بولے......
''نہیں شکنتلا میرا یہ مطلب ہرگز نہیں...... بلکہ میں تو خوش ہوا کہ تم نے سرکاری کاموں میں میرا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا ہے۔''
''میں تو ان چاروں قیدیوں کو بھی لے آئی ہوں جنہیں آپ نے میرے ساتھ گرفتار کیا تھا۔'' شکنتلا مہاراج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی......
''چلو اچھا کیا...... اب تم جانو اور تمہارا کام۔'' مہاراج نے کہا اور شکنتلا خود سپردگی کے عالم میں ان کے آگے بچھتی چلی گئی اور تھوڑی ہی دیر میں مہاراج رام ناتھ تھک کر نیند کی میٹھی آغوش میں سما گئے۔ شکنتلا جو جھوٹ موٹ سونے کی اداکاری کر رہی تھی آہستگی سے اُٹھی اور مہاراج کو بغور دیکھنے لگی...... مہاراج گہری نیند سو چکے تھے۔ شکنتلا نے فوراً ناگن کا روپ اختیار کیا...... رام ناتھ کو ہلکا سا ڈس کر بے ہوش کر دیا اور انسانی روپ میں آ کر قالین کے نیچے سے ایک ہنٹر نکال کر ہاتھ میں پکڑا اور قید خانے کی طرف چلی گئی اور دیوار برابر کر دی۔ سیڑھیاں اُتر کر اس نے ناگن کا روپ اختیار کیا اور پنجرہ نما کیبن کے اندر داخل ہو گئی...... جہاں رندھیر وغیرہ آڑے ترچھے سو رہے تھے۔ قید کی سختیوں سے ان کی حالت بہت خراب تھی۔ کپڑے پھٹے ہوئے، داڑھی بڑھی ہوئی۔ شکنتلا انسانی روپ میں آ کر چند لمحے انہیں حقارت سے دیکھتی رہی۔ اب اسے ارجن کا خیال آ گیا۔ وہ منظر اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا جب ارجن آگ کے شعلوں میں گھرا بے بسی کی موت مر رہا تھا...... شکنتلا کے دل میں انتقام سر اُٹھانے لگا...... ارجن کے قاتل اس کے سامنے آج بے بس ہو چکے تھے...... شکنتلا نے فوراً ہنٹر گھما کر رندھیر کو رسید کیا تو وہ تڑپ کر رہ گیا۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اپنے سامنے شکنتلا کو پا کر گھگھیانے لگا...... شکنتلا نے یکے بعد دیگرے کئی ہنٹر چلائے جس سے سب قیدی اُٹھ کھڑے ہوئے اور سہمی نظروں سے

شکنتلا کو دیکھنے لگے...... جو بڑے کرّوفر سے مسکرا رہی تھی۔
''ارجن کے قاتلو...... آج تم میری مٹھی میں ہو...... تم نے میرے ارجن کو بے بسی کی موت مارا ہے، میں تمہیں عبرت کا نشان بنا دوں گی۔''
''ہمیں معاف کر دو......'' گاؤں کا سرپنچ تلک رائے بولا......
''ہم ساری زندگی تمہارے چرنوں میں غلاموں کی طرح گزار دیں گے۔'' وکرم سنگھ موت کو سامنے دیکھ کر باقاعدہ رونے لگا تھا۔
''میرا تو کوئی قصور نہیں۔'' نوجوان بولا......
''شکنتلا بہن...... ہمیں آزاد کر دو۔'' رندھیر بے چارگی سے بولا۔
''موت کو نظروں کے سامنے دیکھ کر بہن کہتا ہے کتے......!'' شکنتلا نے کوڑا زور سے رندھیر کے منہ پر مارا...... تو وہ چیخنے لگا۔ خون کی لکیریں اس کے چہرے پر نمودار ہونے لگیں...... کوڑے نے اس کے سارے چہرے کو زخمی کر دیا تھا۔
''اُس وقت تو مجھے بہن کہہ دیتا تو نہ ارجن آگ میں جلتا نہ میں دربدر ہوتی۔ میرے ارجن پر تم نے رحم نہ کیا...... مجھے بھی مارنے میں کسر نہ چھوڑی...... مہاراجہ کو بھی کہا کہ میں ناگن ہوں! ہاں میں ناگن ہوں...... انسان نہیں ہوں۔'' یہ کہہ کر شکنتلا نے ایڑی پر گھوم کر زور سے پھنکار ماری تو اب وہ بہت بڑی ناگن کی شکل میں تھی اور ان کے چاروں طرف تیزی سے گھومنے لگی۔ چاروں قیدی انتہائی خوف زدہ ہو چکے تھے۔ ناگن پھر شکنتلا بن گئی اور بولی......
''کتو! اس وقت میں بے بس تھی لیکن آج وقت کی راسیں میرے ہاتھ میں ہیں۔ اب میں تابانہ کی مہارانی ہوں، میرا نام شکنتلا ہے۔ میں تم سے وہ سلوک کروں گی کہ موت بھی تم سے پناہ مانگے گی اور زندگی تمہارے لیے خواب بن جائے گی۔'' یہ کہہ کر وہ زور زور سے کوڑا چلانے لگی...... چاروں قیدی جو گلے کے طوق اور ہتھکڑیوں کی وجہ سے زیادہ حرکت نہ کر سکتے تھے، تڑپنے لگے...... کوڑا ان کا گوشت ادھیڑ رہا تھا اور وہ فرش پر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے...... شکنتلا ان کی چیخوں اور التجاؤں سے بے نیاز کوڑا برسا رہی تھی۔ اسے پتا تھا کہ ان کی آوازیں تہ خانے میں ہی گھٹ کر رہ جائیں گی۔ تھوڑی ہی دیر بعد...... چاروں خون میں لت پت پڑے تھے۔ ان کے جسم جگہ جگہ سے پھٹ چکے تھے۔
''تمہارا نام کیا ہے......؟'' شکنتلا نے چوتھے قیدی کے سینے پر سینڈل سمیت اپنا پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔
''میرا نام پرشاد ہے دیدی......'' نوجوان نے زار و قطار روتے ہوئے بتایا۔
''میں تو ناٹک دیکھ رہا تھا...... مجھے خوامخواہ دھر لیا گیا ہے۔'' تو شکنتلا نے اپنے سینڈل کی ایڑی اس کے منہ پر ماری۔
''میرا سو سالہ ساتھی مر رہا تھا اور تو اسے ناٹک کہہ رہا ہے خبیث......! میرا نام شکنتلا ہے۔ میں انسان نہیں ناگن ہوں، میرے دل میں رحم کا خانہ ہی نہیں، دوسروں کو تکلیف میں دیکھتی ہوں تو میرا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔''
''پانی پانی......'' کرم سنگھ مرغ بسمل کی طرح تڑپتے ہوئے بولا تو شکنتلا نے جوتے کی نوک اس کی کمر پر رسید کی...... جس سے کرم سنگھ درد کی شدت سے بلبلا کر دوہرا ہو گیا۔
''پانی نہیں میں تمہیں موت پلواؤں گی۔ اب تمہاری زندگی میں خوشی کی کوئی رمق نہیں ہو گی۔ باقی سارا جیون تم سسکتے، تڑپتے بلکتے اور شکنتلا سے رحم کی بھیک مانگتے گزارو گے! ہاہاہاہا'' شکنتلا قہقہہ لگاتی ہوئی بالوں کو خوب صورت انداز میں جھٹک کر تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ پہلے سے موجود دونوں قیدی ملکہ کو سانپ اور پھر عورت بننے اور پھر دیوانہ وار ظلم کرتے دیکھ کر بے ہوش ہو چکے تھے۔

☆......☆

ادھر پر یہ...... تینوں قیدیوں کے کمرے میں بیٹھی تھی۔ شکنتلا سے ڈھیل ملنے کی بناء پر وہ خوشی سے پھولے نہیں سماتی تھی۔ خوب صورت کرسی پر بیٹھی...... خوب صورت سفید ریشمی چست قمیص اور چست پائجامے میں اس کا انگ انگ نمایاں تھا۔ وہ اس وقت کنیز کی بجائے شہزادی بنی ہوئی تھی۔ ہاتھوں میں کنگن اور چوڑیاں چھن چھن کر رہی تھیں کملا، نرملا...... اس کے دائیں بائیں کھڑی تھیں اور کرسی کے پیچھے کی جانب دو باندیاں اسے پنکھا جھل رہی تھیں۔

پریمہ بھری آنکھوں میں شرارت بھری مسکراہٹ کے ساتھ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر وہ ایک جام سے چسکیاں لے رہی تھی۔ تینوں قیدی جن کے ہاتھ چھت سے اور پاؤں زمین سے بندھے تھے، منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا...... قصور سے بے خبر خوف اور حیرت سے پریہ کی اداؤں کو دیکھ رہے تھے جو اس وقت بالکل چھوٹی سی گڑیا نظر آ رہی تھی لیکن تینوں قیدی، داروغہ شاہی جیل، کلپنا اور آنند اس خوب صورت معصوم گڑیا کا پیارو دوپہر کو دیکھ چکے تھے۔

''نرملا...... ''پریہ نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''ان کے منہ سے کپڑا نکالو......'' اور نرملا آگے بڑھ کر ان کے منہ سے کپڑا نکالنے لگی۔ ''سنو......'' پریہ جام سے چسکیاں لیتی ہوئی اپنی شوخ آنکھیں ان پر جماتے ہوئے بولی۔ ''مجھے مہارانی شکنتلا کی طرف سے پوری اجازت ہے کہ تمہاری کھال ادھیڑ سکتی ہوں...... پرنتو تم کالی کی سوگند کھا کر وچن دو گے کہ اپنے اپنے محکمے میں ہماری مرضی سے چلو گے تو تمہاری جاں بخشی بھی ہو سکتی ہے۔''

''جس طرح آپ کہیں گی میں ویسے ہی کروں گی کنیز عالیہ......'' کلپنا التجا کے لہجے میں بولی۔

''اور تم...... موٹے سؤر......'' پریہ نے داروغہ جیل کو مخاطب کیا۔

''میں تو داس ہوں آپ کا۔ آپ حکم دیں گے تو گنہگار کو رہا کر دوں گا اور بے گناہ کا سر قلم کر دوں گا......''

''بہت خوب...... ہم چاہتے بھی یہی ہیں کہ محل میں لوگ سانس بھی شکنتلا کی مرضی اور پریہ کی اجازت سے لیں۔''

''آنند صاحب سنو...... پورے محل میں خوراک اور لباس کی تقسیم سے پہلے پریہ سے اجازت لو گے؟''

''لوں گا...... شہزادی جی...... لوں گا۔ میری کیا مجال کہ آپ سے ٹکرا سکوں۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے میری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ مجھے چھوڑ دیں۔''

''بچے تمہارے چاہے مر جائیں......'' پریہ سفاک لہجے میں بولی۔ ''چھوڑا تم لوگوں کو اس وقت جائے گا جب مجھے تم لوگوں پر یقین اور شکنتلا جی سے اجازت ملے گی۔ آج رات بھر تم بھوکے پیاسے اسی حالت میں رہو گے۔ صبح تم سے بات کروں گی۔''

''نہیں نہیں...... کنیز عالیہ ہم وچن دیتے ہیں۔ آپ کے حکم پر چلیں گے!'' تینوں کورس کے انداز میں بولے...... لیکن پریہ اُٹھ کر چھڑی بار بار ان کے منہ سے مارنے لگی اور پھر ہنستے ہوئے بولی۔ آ ؤ نرملا...... اور کملا آج کی رات تو انہیں ایسے ہی بندھا رہنے دو صبح ہی دیکھیں گے...... اور ان کی التجاؤں کو سُنا اَن سُنا کرتی کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆......☆

رانی ماریہ سرشام ہی سامری کی حویلی میں پہنچ گئی تھی۔ وہ پہلے بھی کئی بار یہاں آ چکی تھی۔ یہاں کا ماحول اس کے لیے نیا نہ تھا اور وہ اس وقت سامری کے کمرۂ خاص جادو نگری میں سامری کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔

''اب بتا سامری...... شکنتلا کون ہے اور میں اس کو کیسے نیچا دکھا سکتی ہوں؟''

''شکنتلا کو نیچا دکھانے کا خیال اوش من سے کھرچ دے ماریہ! دیوتا اس کے ساتھ ہیں۔''

''تم...... تو اس کے ماضی میں جھانکنے کے لیے گرو کی بدروح کو ڈھونڈتے پھر رہے ہو، مگر مجھے شاہی پنڈت گرو نرائن نے کب کا بتا دیا ہے کہ شکنتلا انسان نہیں ناگن ہے اور گرو نرائن نے میری سہائتا کا وچن بھی مجھے دیا ہے۔''

''سہائتا اور گرو نرائن...... ہاہاہا'' سامری قہقہہ لگاتے ہوئے بولا......

''کیا پدّی اور کیا پدّی کا شوربہ''

''ماریہ...... سن آنے والے کل کا سورج سامری کی حکومت اور ملکہ کا تاج شکنتلا کے سر پر لے کر طلوع ہو گا۔ تیرے لیے بہتر یہی ہے کہ راتوں رات تابانہ کی سرحدوں سے باہر چلی جا......''

''سامری تو حد سے بڑھ رہا ہے۔ مت بھول میں اب بھی رانی اور مہاراجہ رام ناتھ کی پتنی ہوں......'' ماریہ یہ کہہ کر پاؤں پٹختی ہوئی جادو نگری سے باہر نکل آئی۔

''سامری کہو تو...... اس کا خون پی جاؤں۔'' سمترا نے سامری کو مخاطب کر کے کہا۔

''نہیں سمترا! اس کو جانے دو آخر کو تابانہ کی رانی ہے!'' سامری نے طنزیہ لہجے میں کہا اور ہنسنے لگا۔

☆......☆

سپہ سالار بلگرام اپنے گھر کے باغیچے میں ٹہل رہا تھا...... رات خاصی گزر چکی تھی...... مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ جب سے وہ شکنتلا سے ملاقات کر کے آیا تھا اسے کسی پل اور کسی کل چین نہ تھا...... شکنتلا کی من موہنی صورت رہ رہ کر اس کی آنکھوں کے پردے پر آ رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اسے پر لگ جائیں اور وہ جا کر شکنتلا کو بانہوں میں لے لے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ بار بار شکنتلا کا دربار میں میری طرف متوجہ ہونا اس بات کی نشانی ہے کہ شکنتلا مجھے پسند کرنے لگی ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مہاراجہ رام ناتھ بوڑھے ہیں اور شکنتلا بالکل نوجوان اور میں بھی بھرپور جوان ہوں۔ مرد رعنا ہونے کے ساتھ ساتھ تابانہ کی فوج کا سپہ سالار بھی ہوں۔ یقیناً مہارانی مجھ سے پیار کرنے لگی ہے۔ یہ سوچ کر...... بلگرام کا دل خوشی سے تیز تیز دھڑکنے لگا...... وہ سوچ رہا تھا کہ شکنتلا جیسی حسین دوشیزہ کا ساتھ مل جائے تو...... جیون میں بہار آ جائے۔ آج صبح ہی محل جا کر مہاراجہ کے دربار جانے کے بعد مہارانی سے ملاقات کروں گا اور اسے اپنے دل کی حالت سنا دوں گا۔ یہ سوچتے ہی بلگرام کو قرار آ گیا اور وہ صبح محل جا کر شکنتلا سے ملاقات کرنے کا تہیہ کر کے اپنے کمرے میں جا کر سو گیا۔

☆......☆

''پریہ اب محل کے تقریباً ہر اہم عہدے پر ہمارا اپنا بندہ ہو گیا ہے۔ اب ہماری مرضی کے بغیر یہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ اس کے علاوہ سامری جادوگر کی مدد بھی ہمیں حاصل ہے۔'' شکنتلا نے مطمئن انداز میں کہا۔

''سب سے بڑھ کر یہ ملکہ عالیہ کہ مہاراجہ آپ کے حسن کے غلام ہیں۔'' پریہ نے شکنتلا کے اطمینان کو مزید بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ہمارا حسن تو اچھے اچھوں کو دیوانہ بنا دیتا ہے پریہ...... رام ناتھ کیا شے ہے۔'' شکنتلا غرور سے اپنی زلفوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ ''ہمیں پورا وشواس ہے کہ سپہ سالار بلگرام ہمارے ساتھ کل کی ملاقات کو آسانی سے بھلا نہ پائے گا...... اور دوبارہ ہم سے ملاقات کرنے کا بہانہ تلاش کرے گا۔'' شکنتلا نے مسکراتے اور پریہ کو تحسین طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ پریہ کچھ بولنا ہی چاہتی تھی کہ ایک کنیز نے اندر آنے کی اجازت چاہی...... اجازت پا کر اندر آ گئی اور بولی...... مہارانی سپہ سالار بلگرام آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ کنیز کے منہ سے یہ سنتے ہی پریہ اور شکنتلا نے مسکراتے ہوئے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا...... اور پھر شکنتلا نے آنکھ کے اشارے سے پریہ کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ پریہ خاموشی سے چلی گئی۔

''اندر آنے دو۔'' شکنتلا نے اجازت دی، چند ہی لمحوں بعد سپہ سالار خواب گاہ میں اپنے پورے سرکاری لباس میں داخل ہوا تو پریہ نے اسے کرسی پیش کر دی۔ شکنتلا نے لیٹے لیٹے مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے کر دیا...... سپہ سالار نے اس کا نرم ہاتھ زور سے دبایا تو شکنتلا بالوں کو جھٹک کر مسکرا دی۔

''کیسے آنا ہوا بلگرام......؟'' شکنتلا گاؤ تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے بولی۔

''مہارانی......! کل آپ کے ساتھ دوپہر کا بھوجن...... اتنا مزیدار لگا کہ آج بن بلائے مہمان بن کر آ گیا۔''

''بھوجن اچھا لگا...... اور ہم نہیں!'' شکنتلا نے بلگرام کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا تو بلگرام گڑبڑا گیا۔ وہ نہ سمجھ سکا کہ کیا جواب دے۔ ''تم نے ہماری بات کا جواب نہیں دیا بلگرام۔''

''کیا جواب دوں ملکہ عالیہ......؟'' بلگرام نگاہیں جھکا کر بولا۔

''کچھ تو بولو بلگرام۔ ہم آپ کو کیسے لگتے ہیں؟'' شکنتلا بدستور اسی لہجے میں بولی۔

''مہارانی جی! سچ بات تو یہی ہے کہ میں صرف آپ کو ہی ایک نظر دیکھنے آیا ہوں۔ رات بھر مجھے نیند نہیں آئی۔ آج صبح ہی سے فیصلہ کر لیا تھا کہ آپ کو آج پھر ملوں گا۔''

''بلگرام......!'' شکنتلا نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''تم ایک مکمل اور وجیہ جوان ہو۔ مہاراجہ رام ناتھ...... بوڑھے اور نامکمل، تم کبھی کبھی ملنے آ جایا کرو...... ہمارا من

بھی بہلا رہے گا۔"
"ضرور آیا کروں گا مہارانی...... آپ کی من موہنی سوہنی صورت مجھے خود یہاں کھینچ لائے گی!" اتنے میں پریہ نے اندر آنے کی اجازت چاہی......اور اندر آ کر بولی......مہارانی بھوجن تیار ہے! تناول فرما لیجیے۔مہارانی اُٹھی اور بلگرام کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔"آؤ بلگرام......" اور وہ کھانے کے کمرے کی طرف چل دیے۔تھوڑی ہی دیر بعد مہارانی اور بلگرام کھانے کی میز پر بیٹھے تھے۔کنیزیں کھانا لگا رہی تھیں کہ اچانک باہر بہت سے قدموں کی آوازیں اُبھریں۔ان آوازوں کا رُخ اسی کمرے کی جانب تھا۔شکنتلا اور بلگرام دونوں نے ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھا......

☆......☆

مہاراجہ رام ناتھ دربار میں بیٹھے تھے اور رانی ماریہ ان کے ساتھ والے تخت پر پژمردہ انداز سے بیٹھی تھی مہاراجہ کی طرف دیکھ کر شکوے بھری آواز میں بولی۔
"یوں لگتا ہے جہاں پناہ کی نظروں میں ہماری اہمیت ختم ہوگئی ہے۔"
"نہیں ماریہ، یہ بات نہیں۔ہم جلد ہی تمہاری حویلی میں آئیں گے۔"
"بہت مشکل ہے عالی جاہ! اب تو لگتا ہے کہ وہ ناگن آپ کی جان لے کر ہی چھوڑے گی۔"
"کیا کہہ رہی ہو ماریہ! تمہیں ایسے الفاظ منہ سے نکالنے سے پہلے سوچنا چاہیے۔" مہاراج ذرا خفگی سے بولے۔
"سوچا تو وہاں جاتا ہے سرکار جہاں شک ہو...... یہ بات تو یقینی ثابت ہو چکی ہے کہ شکنتلا ناگن ہے اور انسانی روپ میں آپ کو بے وقوف بنا رہی ہے۔"
"بکواس مت کرو ماریہ......" مہاراجہ اپنے تخت پر کھڑے ہوگئے سب درباری بھی اچانک متوجہ ہوگئے اور حیرت سے انہیں دیکھنے لگے۔
"آپ جوش کے بجائے ہوش سے کام لیں تو میں ثابت کر سکتی ہوں کہ شکنتلا انسان نہیں ناگن ہے، ناگن ہے۔ یقین جانیں مہاراج مجھے آپ کی جان پیاری ہے، شکنتلا واقعی ناگن ہے جو سو سال بعد انسان بن گئی ہے۔آپ چاہیں تو شاہی جادوگر سامری سے تصدیق کرا سکتے ہیں۔"
ماریہ نے جان بوجھ کر پہلے سامری کا نام لیا......حالاں کہ اسے پتا تھا کہ وہ آج رخصت پر ہے......سامری تو آئے نہیں مہاراجہ کچھ سوچ کر ٹھنڈا پڑتے ہوئے بولے۔
"پھر آپ شاہی پنڈت گرو نرائن کو بلا کر تصدیق کریں۔" ماریہ زور دے کر بولی۔
"گرو نرائن حاضر ہو۔" مہاراجا رام ناتھ نے باآواز بلند کہا۔
گرو نرائن اپنی جگہ سے اُٹھ کر آہستگی سے چلتے ہوئے شاہی چبوترے کے نزدیک آ گیا۔
"گرو نرائن......" مہاراج تذبذب کے عالم میں بولے۔"تمہارا علم اور تجربہ کیا کہتا ہے، کیا شکنتلا ناگن ہے؟"
"جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔" گرو نرائن قدرے جھجکتے ہوئے بولا۔
"امان ہے۔" مہاراج نے پرسوچ لہجے میں کہا۔
"میں نہ تو جادوگر ہوں اور نہ علم نجوم پر دسترس رکھتا ہوں، لیکن تجربہ اور مشاہدے کی بناء پر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ملکہ شکنتلا پلکیں نہیں جھپکتی اور یہ امر اس بات کی پہلی نشانی ہے کہ ہوسکتا ہے کہ وہ ناگن ہو۔"
"گویا تمہیں یقین نہیں محض شبہ ہے۔" مہاراجہ نے بھنویں اچکائیں۔
"ایک ثبوت میں بھی پیش کروں گی حضور۔" ماریہ رانی پرجوش لہجے میں بولی۔
"جلدی بتاؤ۔"
"شکنتلا کے کمرے اور اس کی رہائشی حدود میں میرے جاسوسوں کی اطلاع کے مطابق آئینہ رکھنے کی اجازت نہیں۔مشہور یہ کیا گیا ہے کہ شکنتلا آئینے سے نفرت کرتی ہیں اور ناگوں کی تاریخ بتانے والے کہتے ہیں کہ سو سال بعد کوئی بھی روپ اختیار کر لینے والے ناگ درپن کے سامنے اپنے اصل روپ میں ظاہر ہوجاتے ہیں۔یعنی شکنتلا اگر ناگن ہوئی

تو شیشے میں اس کا عکس ناگن کا ہی ہوگا۔'' رانی ماریہ انکشاف کرتے ہوئے بولی۔

''تو پھر گھوڑا بھی حاضر ہے اور میدان بھی۔'' وزیر اعظم بال ٹھاکرے جو اس بحث کو دیکھتے ہوئے قریب آ گیا تھا۔ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

''تو پھر ہم ابھی زنان خانے چلیں گے۔'' مہاراج اُٹھتے ہوئے بولے۔

''اگر شکنتلا ناگن ہوئی تو اس کو فوراً آگ میں جلا دیا جائے گا اور اگر یہ الزام جھوٹا ثابت ہو گیا تو ماریہ کو اسی آگ میں پھینک دیا جائے گا......'' مہاراج کے آخری جملے سے ماریہ کا دل بیٹھنے لگا۔ اگر گرو نرائن کی بات غلط ہوئی اور شکنتلا ناگن نہ ہوئی تو پھر اس کی اپنی موت یقینی تھی۔ بہر حال اسے ساتھ تو چلنا ہی تھا اور آئینے سے گریز والی بات بھی اسے معلوم ہو چکی تھی۔

''سپہ سالار کہاں ہے؟'' مہاراج اونچی آواز میں بولے۔

''وہ تو آج نہیں آئے جہاں پناہ۔'' بال ٹھاکرے نے ادب سے کہا۔ ''چلو...... ٹھاکرے تم اور گرو نرائن تم بھی سپاہیوں کا ایک دستہ بھی ساتھ لے لو درپن بھی لے چلو...... آج اس بات کا فیصلہ ہو ہی جائے۔''

اور تھوڑی ہی دیر میں اچھا بھلا ہجوم شکنتلا کی رہائش کی جانب چل پڑا زنان خانے میں پہنچ کر کنیزوں کی زبانی معلوم ہوا مہارانی کھانے کے کمرے میں ہیں اور سپہ سالار بلگرام بھی وہیں ہے۔

یہ سن کر مہاراج کا پارہ چڑھ گیا وہ وزیر اعظم، گرو نرائن، ماریہ اور دیگر اہم زعماء کے ساتھ سیدھے کھانے کے کمرے میں داخل ہو گئے، سامنے شکنتلا اور بلگرام ایک ہی میز پر آمنے سامنے بیٹھے کھانا شروع کرنے والے تھے۔

''مہاراج آپ'' شکنتلا حیرانی سے کھڑی ہو گئی۔

''بلگرام آج تم دربار کیوں نہیں آئے۔'' مہاراج نے شکنتلا کو نظر انداز کرتے ہوئے بلگرام سے مخاطب ہو کر کہا۔

''جی جناب...... وہ۔ میں۔ دراصل۔'' سپہ سالار سے کوئی بہانہ نہ بن سکا......

''جواب دو بلگرام......؟'' رام ناتھ گرج کر بولے...... ''تم دونوں میں کیا چکر چل رہا ہے۔ تم نے کل بھی کھانا شکنتلا کے ساتھ کھایا اور آج بھی تم یہیں ہو، جبکہ دربار باقاعدہ لگا ہوا ہے اور تمہاری حاضری وہاں ضروری ہوتی ہے۔''

''دیکھیے مہاراج دیکھیے......'' ماریہ خوشی سے چلائی۔ اس نے ہاتھ میں درمیانے سائز کا درپن (آئینہ) پکڑا ہوا تھا...... جسے اس نے اپنے لباس میں چھپا رکھا تھا اور جسے رش میں شکنتلا نہ دیکھ پائی تھی اور شکنتلا کے سامنے کر دیا۔ مہاراج کے ساتھ کئی لوگ ایک دم شیشے میں جھانکے تو اس میں بہت بڑی ناگن کرسی کے قریب پھن اٹھائے کھڑی نظر آئی۔

مہاراج کی کھوپڑی گھوم گئی۔

''گرفتار کر لو سپاہیوں ان دونوں کو'' وہ جلال میں آ کر بولے۔

''رک جاؤ......'' بلگرام نے ہاتھ اٹھا کر سپاہیوں سے کہا۔

''میں تمہیں سپہ سالار کی حیثیت سے حکم کرتا ہوں کہ رام ناتھ کو گرفتار کر لو۔'' سپاہی اپنی جگہ پر رک گئے۔ وہ اس شش و پنج میں تھے کہ کس کا حکم مانیں کس کا نہ مانیں۔

شکنتلا نے حالات کی سنگینی محسوس کرتے ہی دل ہی دل میں سامری کو یاد کرنا شروع کر دیا، تین دفعہ سامری کا نام دہراتے ہی آواز آئی:

''سامری کا جادو کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ ہمیشہ سر چڑھ کر بولتا ہے۔'' یہ آواز دروازے کی جانب سے آئی تھی۔ سب لوگوں نے گھوم کر دیکھا تو سامری دروازے کے پٹ کے ساتھ ٹیک لگائے ہاتھ میں اپنی مخصوص ہڈی اور کاندھے پر کانا اُلو بٹھائے کھڑا تھا۔

''آؤ سامری آؤ...... تم نے تو ہمیں بتایا ہی نہیں کہ شکنتلا ناگن ہے۔'' مہاراج نے سامری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اس نے سمجھا کہ سامری باہر سے آیا ہے۔

''سپاہیو۔'' سامری نے ایک سپاہی کی گردن پیچھے سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا، رام ناتھ کو جکڑ لو۔

پھر لوگوں نے دیکھا کہ بھاری جسامت والا سپاہی زمین سے کئی ہاتھ اوپر سامری کے ہاتھ میں چوہے کی طرح

پھڑک رہا تھا۔
''سامری......'' رام ناتھ گرجا۔ ''مت بھول کہ تو صرف دربار کا جادوگر ہے اور میں ریاست کا والی ہوں۔''
''آج کے بعد تو شکنتلا کے باغ کا مالی ہوگا۔'' سامری نے تمسخرانہ انداز میں کہا اور سپاہی کی گردن سے ہاتھ ہٹا لیا، جبکہ سپاہی بدستور ہوا میں معلق ہاتھ پاؤں ہلا رہا تھا۔
یہ منظر دیکھ کر کئی لوگ بھاگ نکلے اور کنیزیں خوف سے چیخنے لگیں۔
سپاہیو میرے حکم پر عمل کرو۔ بلگرام نے نیام سے تلوار کھینچ کر سپاہیوں کو حکم دیا۔ سپاہیوں نے ایک سپاہی کا انجام اور سامری کی جادوگری دیکھتے ہوئے فوراً رام ناتھ کو گھیرے میں لے لیا۔ ہوا میں معلق سپاہی اب زمین پر زوردار آواز سے گر چکا تھا۔
''ہاہاہاہا...... شکنتلا ایک ناگن ضرور ہے۔'' شکنتلا نے حالات کو پلٹا کھاتے دیکھ کر قہقہہ لگایا...... ''لیکن اب تابانہ کی بااختیار ملکہ ہے۔''
''پریہ......'' شکنتلا نے ہانک لگائی۔
''جی مہارانی۔''
''ماریہ کو اپنی حراست میں لے لو۔'' پریہ نے کنیزوں کو اشارہ کیا، جو خوف سے سہمی ہوئی تھیں، تو وہ فوراً ماریہ پر جھپٹیں اور پل بھر میں اس کو قابو کر لیا۔
''سامری۔ زیادتی کر رہے ہو۔'' گروزائن نے آگے بڑھ کر سامری کو للکارا۔
''تم'' سامری گروزائن کو ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ بی مینڈکی کو بھی زکام ہوا، ہو ہو ہو ہو...... سامری بھدے انداز میں ہنسا...... ''کیاپدی اور کیاپدی کا شوربہ''
''زائن۔ فوراً ڈنڈوت کر کے مجھے گرو اور اپنے آپ کو میرا چیلا مان لو، ورنہ ابھی جلا کر بھسم کر دوں گا......''
''سامری......'' گروزائن آگے بڑھتے ہوئے تیزی سے بولا۔ ''تیرا جادو صرف عام منش کو قابو کر سکتا ہے۔ گرو زائن کالی ماتا کا مہان پجاری ہے اور اس کی شکتیاں اپرم پار ہیں۔ تجھ جیسوں کو سبق سکھانا گروزائن کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔'' یہ کہہ کر گروزائن نے بائیں ہاتھ کی پانچوں انگلیاں سامری کی طرف کر کے جھٹکیں تو ان سے بھڑکتی آگ کے شعلے نکل کر سامری کی طرف لپکے۔ سامری فوراً بیٹھ گیا اور پھر دیکھنے والی ہر آنکھ نے دیکھا کہ وہ آگ کے شعلے پھول بن کر سامری کے اوپر گر پڑے۔ گروزائن نے اپنا وار خالی جاتا دیکھ کر اپنے دونوں ہاتھ اپنے منہ پر پھیر کر سامری کی طرف دوبارہ جھٹکے تو بہت سے زہریلے سانپ ہاتھوں سے نکل کر سامری کی طرف بڑھے۔
سامری فوراً قلابازی کھا کر اپنی جگہ سے غائب ہو گیا اور پھر جس جگہ پر سامری کھڑا تھا، وہاں سے اچانک کئی نیولے نکل کر سانپوں پر حملہ آور ہوئے اور ان سے لڑنے لگے اور سامری لوگوں کو شکنتلا کے پیچھے کھڑا نظر آیا۔
اچانک گڑگڑاہٹ کے ساتھ جہاں گروزائن کھڑا تھا عین اس کے نیچے سے زمین پھٹ گئی اور اس سے پہلے کہ گروزائن اس میں گرتا لمبی چھلانگ لگا کر دور جا کر کھڑا ہوا اور پھر کچھ ساعت سوچ کر کھڑکی کی طرف دوڑ پڑا اور کھڑکی جو باغ کی طرف کھلتی تھی، اس سے باہر چھلانگ لگا دی......
سامری نے سرعت سے کھڑکی سے باہر جھانکا تو گروزائن ایسے غائب ہو چکا تھا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔
''بھاگ گیاپدی کا شوربہ......'' سامری ہاتھوں سے مٹی جھاڑنے کے انداز میں کھڑکی سے پلٹ کر بولا۔
''سپاہیو رام ناتھ کی مشکیں کس دو......'' شکنتلا نے حکم دیا تو سپاہیوں نے فوراً رام ناتھ کے ہاتھ اور پاؤں ایک کپڑے سے کس کر باندھ دیے۔
''اب سب لوگ کمرے سے باہر چلیں۔'' شکنتلا حاکمانہ انداز سے بولی تو وزیر اعظم سمیت سب لوگ باہر چلے گئے۔
رانی ماریہ اور رام ناتھ زمین پر بندھے پڑے تھے۔ شکنتلا، سامری اور بلگرام کمرے میں رہ گئے۔ پریہ دروازے پر کھڑی ہو گئی۔
بلگرام بولا۔ ''اب حکمران کون ہوگا......؟''

"میں......" شکنتلا فوراً بولی۔ "سامری جی تو جادوگر ہیں انہیں دنیا داری سے کیا کام اور تم بلگرام سپہ سالار اور وزیر اعظم دونوں عہدے تمہارے پاس ہوں گے، کیوں سامری جی......؟"

"اصولاً حکمران تو مجھے ہی ہونا چاہیے تھا لیکن میں حسن کے آگے ہتھیار ڈالتا ہوں۔" سامری نے شکنتلا کی ٹھوڑی پکڑتے ہوئے کہا۔ "ویسے بھی مجھے سرکاری کاموں کے جھنجٹ سے کوفت ہوتی ہے۔"

"شکنتلا تمہارے بنا کچھ بھی نہیں سامری۔ تم نہ ہوتے تو میرے لیے سوائے بھاگنے کے کوئی راستہ نہ تھا۔" شکنتلا نے آگے بڑھ کر اپنی بانہیں سامری کے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا تو سامری کے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔

"آئیں اب ہم دربار طلب کر کے اس فیصلے کا اعلان کرتے ہیں۔" بلگرام تیزی سے بولا اور زور سے تالی بجائی، پر یہ اندر داخل ہوئی۔

"پر یہ فوراً دربار طلب کیا جائے۔" شکنتلا نے تیزی سے کہا۔

☆......☆

دربار لگ چکا تھا۔

تمام درباری، وزراء اور مشیر درجہ بدرجہ کرسیوں پر براجمان ہو چکے تھے۔ مہاراجہ رام ناتھ کے تخت پر شکنتلا پوری اداؤں اور طمطراق کے ساتھ براجمان تھی اور جو دو چھوٹے تخت اس سے قبل ماریہ اور شکنتلا کے لیے تھے اب ان پر بلگرام اور سامری بیٹھے تھے۔

چبوترے کے سامنے ہی رام ناتھ اور ماریہ رسیوں سے جکڑے فرش پر پڑے ہوئے تھے۔ پر یہ دربار میں کسی پری کی مانند اُڑتی پھر رہی تھی۔ بلگرام نے فوراً ہرکاروں کے ذریعے پوری فوج کو اطلاع کر دی کہ مہاراج رام ناتھ کا تختہ الٹ دیا گیا ہے۔ اب شکنتلا حکمران ہے اور بلگرام وزیر اعظم، تمام درباری اپنی جگہ پر بیٹھ چکے تو بلگرام نے کھڑے ہو کر اعلان کیا۔

"رام ناتھ کا تختہ اُلٹا جا چکا ہے۔ مہارانی شکنتلا نے اب باقاعدہ ملکہ کا عہدہ سنبھال لیا ہے۔"

"میں ملکہ کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ دربار سے پہلا خطاب فرمائیں......"

ملکہ شکنتلا بھاری اطلس و کمخواب کا لباس سنبھالتے ہوئے کھڑی ہوئی اور چاروں طرف طائرانہ نگاہ ڈالی۔

"تابانہ کے دربار میں موجود تمام لوگوں کو نمستے۔" شکنتلا نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے کو لگاتے ہوئے کہا۔

"ملکہ شکنتلا کی جانب سے تابانہ کے ہر سرکاری عہدیدار، اہلکار اور عوام کو یہ پیغام پہنچ جانا چاہیے کہ رام ناتھ کی حکومت ختم ہو گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے قوانین بھی ختم کیے جا رہے ہیں۔ آج سے میں ہی تم سب کے لیے قانون بناؤں گی اور میری ہر بات قانون کا درجہ پائے گی۔ میرے ساتھ تابانہ کے شاہی جادوگر سامری ہیں اور تابانہ کے سپہ سالار بلگرام نے بھی میری غیر مشروط حمایت کا اعلان کر دیا ہے۔ جو لوگ کسی قسم کی مزاحمت یا بغاوت کا سوچ رہے ہوں۔ وہ اس خیال کو اپنے من سے کھرچ کر نکال دیں۔ تابانہ کے موجودہ حکمران کے خلاف بات کرنا بھی بغاوت کے زمرے میں آئے گا اور سابقہ حکمران کی حمایت بھی بغاوت سمجھی جائے گی۔ گرونرائن کو ان کے شاہی پجاری کے عہدے سے ہٹا دیا گیا ہے، اس کے ساتھ ہی ان کا کالی ماتا کے مندر کے مہان پجاری کا عہدہ بھی چھین لیا گیا ہے۔ باغیوں کے لیے کوئی معافی نہیں ہوگی اور انہیں عبرت ناک طریقے سے سزائے موت دی جائے گی۔ وزیر اعظم بال ٹھاکرے کے عہدے میں تنزلی کر کے انہیں نائب وزیر اعظم کر دیا گیا ہے، وزیر اعظم کا عہدہ بھی بلگرام کے پاس ہوگا۔ پر یہ جو محل کی تمام کنیزوں اور غلاموں کے لیے کنیز عالیہ تھی اب وہ ملکہ تابانہ شکنتلا کی مشیر خاص بھی ہوگی۔ باغیوں یا سابقہ حکمران کے حامیوں کی نشاندہی کرنے والوں کو انعام و اکرام سے نوازا جائے گا۔" یہ کہہ کر شکنتلا بیٹھ گئی اور دربار پر سناٹا چھا گیا۔ ایسے عجیب و غریب خطاب کی کسی کو توقع نہ تھی۔ ازاں بعد دربار برخواست کر دیا گیا۔

☆......☆

شکنتلا اپنی خواب گاہ میں شاندار بستر پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے شراب کا جام ہاتھ میں پکڑے شاہی تاج سجائے بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے بڑے بڑے صوفوں پر سامری، بلگرام اور پر یہ بیٹھے تھے۔ یہ چار بڑوں کا ایک خصوصی اجلاس تھا

جس میں کسی پانچویں کی قطعاً گنجائش نہ تھی۔
''سامری جی......'' شکنتلا نے سامری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ اپنی جادوگری سے ان لوگوں کی نشاندہی کریں، جو حکومت کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔''
''سامری کا جادو ہمیشہ سر چڑھ کر بولتا ہے شکنتلا جی...... ملکہ کوئی چنتا نہ کریں، ایسے تمام لوگوں کو چیونٹی کی طرح مسل دوں گا۔''
''گروزائن کا بھی کچھ پتا نہیں چلا، یہ ضرور پھر سر اٹھائے گا۔'' شکنتلا نے فکرمند لہجے میں کہا۔
''گروزائن آکاش کی وسعتوں میں سما جائے یا پاتال کی گہرائیوں میں جا چھپے۔ سامری کی نظروں سے بچ نہیں سکتا...... میں کل ہی اس کا پتا دوں گا۔''
''ٹھیک ہے سامری جی۔ آپ اس اپرادھی کا ضرور کھوج لگائیں اور بلگرام تمام دربار کے عہدیداروں اور تمام اہم سرکاری اکابرین کے پیچھے اپنے جاسوس لگا دو تاکہ معلوم ہو سکے کہ یہ ہمارے خلاف کیا بات کرتے ہیں؟''
''کیسی بات کرتی ہیں ملکہ عالیہ، یہ کام تو میں نے دربار لگنے سے پہلے ہی کر دیا تھا۔'' بلگرام نے فخریہ لہجے میں کہا۔
''شاباش بلگرام......'' شکنتلا نے خوشی کا اظہار کیا۔
''اور پریہ...... تم محل کے اندر اور اب باہر بھی اپنی کنیزوں اور غلاموں کا جاسوسی کا ایک جال بچھا دو تاکہ پتا لگے کہ کوئی سازش تو تیار نہیں ہو رہی۔''
''ملکہ عالیہ کا حکم سر آنکھوں پر۔'' پریہ نے آگے بڑھ کر شکنتلا کے پاؤں چھوتے ہوئے کہا۔
''شکنتلا جی۔'' سامری نے اپنی گنجی ٹانٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
''اب کوئی جشن بھی تو ہونا چاہیے جس میں اپنی دہشت جمانے اور رام ناتھ اور اس کے حامیوں کو انجام تک پہنچانے کا بہانہ مل سکے۔''
''ضرور۔ بالکل ہونا چاہیے۔'' شکنتلا کی آنکھوں میں چمک بڑھ گئی۔ ''بلگرام کل کے دربار میں شاہی جشن منانے کا اعلان کیا جائے۔''
''اس جشن میں پوری ریاست سے لوگوں کو اپنے ہنر اور فن کا مظاہرہ دکھانے کا موقع دیا جائے گا اور باغیوں اور سابقہ حکمرانوں کو عبرتناک موت سے ہمکنار کیا جائے گا۔''
''لیکن یہ جشن تو بہت بڑا ہوگا، بہت سے لوگ شریک ہوں گے، جگہ کون سی مناسب رہے گی؟'' بلگرام نے نکتہ اُٹھایا تو سامری فوراً بول اُٹھا۔
''کالی کے مندر کے سامنے وسیع میدان ہے، یہ جگہ مناسب ترین ہے۔''
''ٹھیک ہے تو پھر ہو گیا فیصلہ۔ اگلی سوموار کو جشن منایا جائے گا۔ اعلان کر دیا جائے گا۔'' شکنتلا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔
''ماریہ اور رام ناتھ کہاں ہیں؟''
''ملکہ عالیہ انہیں شاہی قید خانے میں رکھا گیا ہے۔''
''ٹھیک ہے ان پر کڑا پہرا لگا دو۔ اب ہم ان سے دو دو ہاتھ جشن والے دن کریں گے۔'' شکنتلا غرور اور اختیارات سے سرشار لہجے میں بولی۔ ''اب تم جاؤ پریہ'' اور پریہ باہر نکل گئی اور شکنتلا نے سکون سے آنکھیں موند لیں۔ ابھی چند ہی لمحے گزرے تھے کہ پریہ دوبارہ اندر داخل ہوئی اور ساتھ ہی کسی لڑکی کے چیخنے کی آواز شکنتلا کے کانوں میں پڑی۔ اس نے فوراً آنکھیں کھول کر دیکھا تو پریہ ایک لڑکی کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے اندر لا رہی تھی۔
''یہ کون ہے؟'' شکنتلا حیرانی سے بولی۔
''ملکہ عالیہ اسے کملا اور پونم نے مشکوک حالت میں آپ کے کمرے کے گرد چکر لگاتے، آتے جاتے ہوئے پکڑا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ ماریہ کی پرانی نمک خوار ہے۔''

"کیا نام ہے تمہارا؟" شکنتلا نے لیٹے لیٹے پوچھا۔

"گیتا، ملکہ عالیہ۔" لڑکی خوف سے کانپ رہی تھی۔ شکنتلا چند ساعت اسے بغور دیکھتی رہی، معاً اس کی آنکھوں میں چمک بڑھ گئی۔ "اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دو" حکم سن کر پر یہ باہر نکل گئی۔

"ملکہ عالیہ!" گیتا دوڑ کر ملکہ کے قدموں سے لپٹ گئی۔ "میں ماریہ کی جاسوس نہیں ہوں۔ میں تو کئی سالوں سے یہاں ہوں۔ ماریہ کی حویلی بھی نہیں دیکھی۔ میں تو کبھی محل سے باہر بھی نہیں گئی۔ جاں بخشی فرما دیجیے۔" لیکن شکنتلا پر اس کی آہ وبکا کا مطلق اثر نہ ہوا اور وہ مسکراتی رہی، اتنے میں پر یہ نے رسی لا کر لڑکی کو باندھنا شروع کر دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ مؤدب نظروں سے شکنتلا کو دیکھنے لگی۔ "اب اس کو غسل خانے میں لے جا کر اس کی شہ رگ پر خنجر چلاؤ۔ انسانی خون پینے کو جی چاہ رہا ہے۔"

پر یہ کانپ اٹھی لیکن حکم ماننے پر مجبور تھی، وہ لڑکی کو گھسیٹ کر غسل خانے میں لے گئی، جہاں سے کچھ دیر کے بعد لڑکی کی دلخراش چیخیں سنائی دیں۔

کچھ ہی دیر کے بعد شکنتلا ایک بڑے سے کٹورے میں تازہ خون کی چسکیاں لے رہی تھی۔

☆......☆

گرونرائن نے جیسے ہی اپنے قدموں کے نیچے زمین کو گڑگڑاہٹ کے ساتھ شق ہوتے محسوس کیا تو اس کو یقین ہو گیا کہ سامری اس کو زمین میں زندہ دفن کرنے کے خیال میں ہے۔ گرونرائن کوئی باقاعدہ جادوگر نہ تھا، مگر سارا جیون مندروں میں اور دیوی دیوتاؤں کو سجدے کرتے گزارا تھا۔ اس وقت یہی کٹھن تپسیا کام آئی اور اس نے اوشا دیوی کا مختصر اوجھل جاپ جپ کر کھڑکی سے باہر چھلانگ لگائی اور انسانی آنکھ سے اوجھل ہو گیا۔ اب اسے صرف جنات اور جانور ہی دیکھ سکتے تھے یا پھر وہ انسان جس نے اوجھل کاٹ جاپ پر عبور حاصل کیا ہو، جبکہ سامری صرف کالی کا سیوک تھا۔ اسے اوجھل کاٹ جاپ پر دسترس نہ تھی، لہٰذا گرونرائن، سامری کو حیران چھوڑ کر اپنی جان بچا کر محل سے باہر آ گیا، اب اس کا رخ کالی کے مندر کی جانب تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے، وہ دیرہ دون سے نکل جائے اور کلکتہ (کالی کے بڑے مندر) میں پناہ لے لے تا کہ سامری کے شر سے محفوظ رہ سکے، کیوں کہ اسے پتا تھا کہ سامری جادوگروں کا بادشاہ ہے، وہ کسی بھی وقت اس کے اوجھل جاپ کی کاٹ کر سکتا تھا، جبکہ کالی کے بڑے مندروں کی حدود کے اندر وہ ہر قسم کے جادو سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ تھکا دینے والے تیز رفتار سفر سے وہ منزلوں پہ منزلیں مارتا چلا گیا۔ شکروار (جمعہ) کو دن کے وقت اسے کلکتہ شہر کے آثار نظر آنے لگے۔ اب سامری اور شکنتلا سے مقابلے کے لیے اسے کالی کے مندر میں ایک کنیا کا بلیدان کر کے تیرتھ اشنان نوے دن اکیلے کرنا تھا اور اس جاپ کے لیے نوجوان لڑکی کو کالی کے چرنوں میں قربان کرنا ضروری تھا۔

آج وہ کلکتے پہنچ گیا اور پوچھتے پوچھتے وہ کالی کے مندر تک آ گیا۔ یہاں یاتریوں کا ایک ہجوم بیکراں تھا۔ سیاہ کالے پتھروں سے بنا ہوا یہ عظیم الشان مندر کالی دیوی کا استھان کہلاتا تھا۔ اس مندر کی حدود میں آ کر کالی کا ہر سیوک اس کی پناہ [illegible] آ جاتا تھا، اس لیے گرونرائن نے مندر کی سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہی اطمینان کا سانس لیا، مندر میں دور دراز کے علاقوں [illegible] آنے والے سادھوؤں، پنڈتوں کے لیے چھوٹے چھوٹے کمرے کرائے پر ملتے ہیں۔ گرونرائن نے ایک کمرہ کرائے [illegible] لیں ہو کر کمرے کا دروازہ بند کر کے اطمینان سے ٹانگیں پسار کر سو گیا۔ اسے بلیدان سورج ڈھلنے کے بعد کرنا تھا۔

[illegible] کر کے اسے یہ بھی علم تھا کہ بلیدان کرنے کے لیے بڑے پجاری سے خاص اجازت نامہ حاصل کرنا پڑتا ہے، کیوں کہ ہر [illegible] اموں کے نام کو بلیدان کرنے کی اجازت نہ تھی، لیکن گرونرائن کے پاس اب وقت نہ تھا کہ پجاری سے ملاقات کر کے اجازت [illegible] اند ہی کرنے کی کوشش کرتا، لیکن سب سے بڑا مسئلہ نوجوان لڑکی کی تلاش تھی۔ وہ کالی دیوی کے بڑے عظیم الشان ہال کی [illegible] یب خطاب کی کسی [illegible] ہال میں کالی دیوی کا بت سرخ زبان نکالے، ہاتھ پھیلائے کھڑا خاص خوفناک منظر پیش کر رہا تھا۔

☆......☆

شکنتلا اپنی خواب [illegible]

[illegible] تھی۔ اس کے [illegible]

(حیرت کے نئے رنگوں سے آباد اس سلسلے وار ناول کی اگلی قسط مارچ میں ملاحظہ کیجیے)

پراسرار نمبر کی خوف ناک کہانیاں

خونی مجسمہ.......ملک صفدر عباس اعوان

جہانیاں سے ایک ایسے شخص کی کتھا، جو آج بھی اپنی کہانی سنانے کے لیے بھٹک رہا ہے

خونی بدروح......شاہد سلیم

کچہ موڑ، حسن ابدال سے ایک خونی بدروح کی دل ہلا دینے والی سرگزشت، جس نے ایک سفلی عمل میں رکاوٹ سے جنم لیا تھا

قصّہ ایک روح کا......انجم فاروق

لاہور سے ایک روح کی خونی سرگزشت

سوکن......نفیسہ فضل

ایک سہاگن سے چمٹی ہوئی سوکن کا پراسرار واقعہ، کراچی سے

تیسری منزل کا آسیب......عادل حسین

ایک خالی گھر میں پیش آنے والا پراسرار، جان لیوا واقعہ





خونی مجسمہ

ملک صفدر عباس اعوان

جہانیاں سے ایک ایسے شخص کی کہانی، جو آج تک اپنی کہانی سنانے کے لیے بھٹک رہا ہے

وہ جون کا گرم ترین دن تھا۔ گرمی اتنی زوروں پر تھی جیسے وہ تمام تر ریکارڈ آج ہی توڑے گی۔ مانو جیسے سورج آگ برسا رہا ہو۔ اس لیے میں دفتر سے ہوتا ہوا کچھ دیر آرام کی غرض سے ایک ریسٹوران میں جا پہنچا کیفے کا دروازہ کھولتے ہی اندر چلتے اے سی کی ٹھنڈی ہوا نے میرا خوش گوار طریقے سے استقبال کیا۔ ٹھنڈے ٹھار ایپل جوس کا آرڈر دے کر میں ایک ٹیبل پر جا بیٹھا۔ میرے ساتھ والی دوسری کرسی پر پختہ عمر کا ایک شخص پہلے ہی براجمان تھا۔ میں نے اس شخص کا بغور جائزہ لیا۔ وہ سفید شلوار قمیض میں ملبوس تھا۔ اس کی چھوٹی داڑھی تھی جس میں سفیدی جھلک رہی تھی جبکہ سر کے بال بھی سفید ہو رہے تھے۔ اس نے نظر کی عینک لگائی ہوئی تھی۔ وضع قطع سے وہ کافی مہذب اور شریف انسان معلوم ہو رہا تھا۔

میں نے اس سے رسمی سلام دعا کی۔ ٹھنڈا ایپل جوس ملتے ہی میں اس سے لطف اندوز ہونے لگا۔ یقیناً یہ گرمی کا ہی اثر تھا کہ میں جوس کو ایک ہی سانس میں غٹاغٹ پی گیا۔ اس آدمی نے میری طرف نگاہ اٹھا کر ایسے دیکھا جیسے وہ میری اتنی جلد بازی کو دیکھ کر کافی حیرت زدہ ہوا ہو۔ مجھے کافی سبکی محسوس ہوئی۔ یہ کوئی مہذب طریقہ تو نہیں تھا جو میں نے ابھی جلدی میں انجام دیا تھا۔

"گرمی بڑی ہے، اوپر سے پیاس کی شدت نے بے حال کر کے رکھا ہوا تھا۔" میں تیزی سے بولا۔ میں شاید صفائی دینے کے چکر میں پڑ گیا تھا۔

"ہاں واقعی آج گرمی تو حد سے زیادہ ہے۔" اس نے میری ہاں میں ہاں ملائی۔ "گرمی ہے تو یہ اپنا اثر دکھائے گی ہی۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ اس کی بات پر میں بھی ہنس دیا۔

وہ آدمی خاصا باتونی ثابت ہوا۔ اس نے بات چیت شروع کی اور پھر تو بولتا ہی گیا، جیسے نہ رکنے کی اس نے قسم اٹھائی ہو۔ وہ موسم، سیاست، کھیل تقریباً ہر موضوع پر بحث کرنے کا فن جانتا تھا۔

شروع شروع میں تو میں اس کی بات چیت میں حصہ ملاتا رہا، پھر میں جلد ہی بور ہونے لگا۔ میں نے کلائی پر بندھی گھڑی میں ٹائم دیکھا۔ اس آدمی کی باتوں میں تقریباً پون گھنٹہ بیت چکا تھا پر وہ مسلسل بولے جا رہا تھا۔ اس وقت اس کا موضوع بحث سیاست تھا۔ میں اب اس کی باتوں سے بیزار ہونے لگا تھا۔ مجھ سے اور کچھ نہ ہوسکا تو کرسی پر بیٹھا بار بار پہلو بدلنے لگا۔ میرا بس نہیں

چل رہا تھا کہ اُٹھ کر فوراً یہاں سے بھاگ جاؤں، مگر یوں اُٹھ کر جانا کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بندہ نہ جانے کیا سوچتا۔ ایک بار پھر کوئی غلطی کر کے میں اپنے بارے میں کوئی غلط رائے قائم نہیں کرانا چاہتا تھا۔

میری یہ بے چینی بھری کیفیت اس آدمی نے شاید نوٹ کر لی۔

''آپ کچھ ڈسٹرب معلوم ہو رہے ہیں، کوئی مسئلہ تو نہیں......''

''نہیں۔ نہیں...... کچھ نہیں۔'' میں یوں اچانک سوال پوچھنے پر گڑبڑا گیا۔

''وہ دراصل ٹائم بہت ہو گیا ہے، دیر ہو رہی ہے، گھر جا کر کچھ آرام کروں گا۔ رات کو ذاتی کام کے سلسلے میں نور پور بھی جانا ہے۔

اس کو یہ سب بتانا میرے لیے کوئی ضروری تو نہیں تھا، مگر غیر ارادی طور پر نجانے کیوں میرے منہ سے نکل گیا۔



''نور پور۔'' وہ آدمی یہ نام سن کر ایسے اُچھلا جیسے اسے کسی نے کرنٹ لگا دیا ہو۔ میں جو کرسی سے اُٹھنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ اُس آدمی کی یہ کیفیت دیکھ کر دوبارہ بیٹھنے پر مجبور ہو گیا۔

''خیریت تو ہے......'' میں حیرت زدہ تھا۔

''نور پور کا نام سن کر آپ یوں بوکھلا گئے جیسے میں نے کسی خوف ناک شے کا نام لے لیا ہو۔''

''نہیں......نہیں......تم......تم شاید نہیں سمجھو گے، بلکہ کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا اور پھر بھلا کوئی سمجھ بھی کیسے سکتا ہے، اس علاقے سے میری ایک ایسی بھیانک یاد وابستہ ہے۔ اگر میں لاکھ بھولنا چاہوں تو بھی نہیں بھول سکتا۔''

''بھیانک یاد۔ وہ بھی نور پور کے علاقے سے......کیسی یاد......؟''

میں نے اس کی طرف دیکھا۔

''تم......تم شاید اس کا یقین نہیں کرو گے، کوئی بھی میری بات کا یقین نہیں کرتا، میں نے جس کو بھی یہ بات بتائی اس نے اس کو ایک مذاق سمجھ کر اُڑا دیا، لیکن صرف میں جانتا ہوں کہ اس میں کتنی سچائی ہے۔ جو لوگ اس کو مذاق کے طور پر لیتے ہیں اگر یہ واقعہ ان کے ساتھ وقوع پذیر ہوتا تو......''

اس آدمی کی باتوں میں نجانے کیا اثر تھا کہ میری دلچسپی اس کی باتوں میں بڑھتی جا رہی تھی۔ میں جلد از جلد وہ بات اس کے منہ سے سننے کے چکر میں تھا۔

''تم یقین کرو گے؟'' اس کی ایک ہی رٹ تھی۔

''ہاں۔ اس میں نا یقین کرنے والی ایسی کون سی بات ہو گی۔ آپ اگر کہہ رہے ہوں گے تو سچ ہی ہو گا۔'' میرے یوں کہنے سے وہ جلد ہی مطمئن سا ہو گیا۔ وہ کچھ دیر خاموش سا بیٹھا شاید اپنی پچھلی یاد کے تانے بانے بنتا رہا۔ جیسے وہ اسے اکٹھا کرنے کی کوشش میں ہو۔ بعد میں وہ گویا ہوا تو میں نے اپنا سارا دھیان اس کی باتوں میں لگا دیا۔

اس بات کو تقریباً 2 سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ میں اپنے ایک دیرینہ دوست کے بھائی کی شادی میں ملتان سے میانوالی جا رہا تھا۔ میرے ساتھ میری پرسنل سیکریٹری بھی تھی۔ میں بزنس مین تھا اور میرے نام یعنی حیات گروپ آف انڈسٹریز کے نام کے ہر جگہ چرچے تھے۔ بزنس ٹور پر اکثر ہی میری پرسنل سیکریٹری ساتھ ہوتی مگر اس ذاتی ٹور پر میں اسے ساتھ نہیں لے جانا چاہ رہا تھا۔ اس کی بڑی خاص وجہ بھی تھی۔

میری پرسنل سیکریٹری کا نام روزینہ تھا، مگر اسے ہر کوئی روزی کے نام سے جانتا تھا۔ روزی بہت ہی چولبلی طبیعت اور ماڈرن قسم کی انتہائی حسین لڑکی تھی۔ فیشن پرست، آزاد خیال، وہ اکثر جینز اور ٹی شرٹ میں نظر آتی۔ دھان پان نازک سی گلابی رنگت کی مالک جس کے بال براؤن اور آنکھیں سبز تھیں۔ وہ چند ماہ پہلے ہی جاب کے سلسلے میں میرے آفس آئی تھی۔ پہلی ہی نظر میں دیکھتے ہی میرا دل اُس پر آ گیا تھا۔ وہ تھی ہی ایسی، لوگوں کے ہوش اُڑانے کی صلاحیت سے مالا مال تھی، تو پھر میں کب اس سے بچ سکتا تھا۔

اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں فلرٹ قسم کا بندہ تھا۔ بس روزی میں بات ہی ایسی تھی کہ میں اس کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس سے شادی کرنے پر بھی رضا مند ہو گیا۔ ورنہ پندرہ سال قبل میری پہلی بیوی ثریا کی موت کے بعد میرا دل شادی کے نام سے ایسا اُچاٹ ہوا کہ مجھے شادی سے گویا نفرت سی ہو گئی تھی۔ میں اپنی بیوی سے بہت زیادہ پیار کرتا تھا اور باقی ماندہ زندگی اس کے پیار کے سہارے ہی گزارنا چاہتا تھا، مگر روزی......''

اس آدمی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری، پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔

روزی کو دیکھ کر میرے دل میں دوسری شادی کا خیال آنے لگا۔ میں نے اس سے شادی کے متعلق بات کی، مگر وہ نجانے کیوں ہر بار ٹال مٹول سے کام لیتے ہوئے بات کا رخ ہی موڑ دیتی۔ کئی ہفتے گزر گئے اور آخر کار مجھے اس کی ٹال مٹول کا جواب بھی مل گیا۔

میں تو اس کے بارے میں بہت سنجیدہ تھا مگر وہ سنجیدہ نہیں تھی اور وہ سنجیدہ ہو بھی کیسے سکتی تھی۔ اسے تو بس میری دولت کی ضرورت تھی۔ وہ میری طرح دوسرے کئی لوگوں کو ایسے ہی پیار کے دھوکے میں لے کر

ان کی مال و دولت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ چکی تھی۔ اس کے کئی لوگوں سے افیئر تھے۔ لوگوں کے جذبات سے کھیلنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس کڑوی سچائی کا مجھے پتا چل چکا تھا، لیکن اس بات کا میں نے اس کو پتا نہیں چلنے دیا کہ اس کی حقیقت مجھ پر آشکار ہو چکی ہے۔ میں نے اس کو نوکری سے نہیں نکالا بس اس سے اپنا رویہ بدل لیا۔ میں اس سے انتقام لینا چاہتا تھا، کسی کے جذبات و احساسات سے کھیلنے کا انتقام...... پتا نہیں میرا بدلا رویہ روزی کو محسوس ہوا یا نہیں، مگر اس نے اس سے متعلق مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔

دوست کے بھائی کی شادی پر میرے میانوالی جانے کا اس کو علم ہوا تو وہ میرے ساتھ جانے کے لیے ضد کرنے لگی۔ میرے انکار پر بھی وہ نہیں مان رہی تھی۔

''کیا ہے حیات! اگر تمہارے ساتھ چلی چلوں گی تو کچھ وقت تمہارے ساتھ بیت جائے گا اور وہ میرے لیے بہت خوب صورت پل ہوں گے۔''

وہ شوخ نظروں سے بولی۔ اس کے لہجے میں مصنوعی پن محسوس ہو رہا تھا۔ پھر میں بھی یہ سوچ کر راضی ہو گیا کہ چلو لمبا سفر اکیلے بور ہونے سے اچھا ہے کہ کوئی تو ساتھ ہو۔ چلو روزی ہی سہی۔

اگلے دن صبح دس بجے ہی ہم میانوالی کے لیے روانہ ہو گئے۔ روزی بڑی سج دھج سے تیار ہوئی تھی۔ بلیک باریک ریشمی ساڑی کے ساتھ گہرے گلے کے بلاؤز سے اس کی منہ زور جوانی جھلک رہی تھی۔ ساتھ ہی ہلکے میک نے اس کی گلابی رنگت کو مزید نکھار دیا تھا۔ سبز آنکھوں پر گھنی براؤن تفسیری پلکیں، گھونگریالے بال جو بار بار اس کے چہرے کو کسی ناگن کی طرح ڈسنے لگتے اور بالوں کو پیچھے کرنے کی ناکام کوشش کرتی اس وقت وہ دنیا کی حسین ترین عورت سے کم نہیں لگ رہی تھی۔

کار چلاتے ہوئے میرا کئی بار دھیان اس کی طرف ہی اُٹھ سا جاتا۔ تب روزی نے جھینپ کر ایک بار شرارتی نظروں سے میری جانب دیکھا۔ ''خیریت تو ہے......! کہیں آج نظر لگانے کے ارادے تو نہیں ہیں جناب کے۔''

میں نے کوئی بات کیے بغیر صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا۔

روزی نے ایک ادا سے آگے بڑھ کر گاڑی میں کیسٹ پلیئر آن کرنا چاہا۔ اس کوشش میں اس نے نرم و گداز ہاتھ گیئر پر موجود میرے ہاتھ پر رکھ دیا اور میرے جسم میں گویا چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔

دوری نہ رہے کوئی آج اتنے قریب آؤ
میں تم میں سما جاؤں تم مجھ میں سما جاؤ

گانے کے خوب صورت بول نے میرے جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے گاڑی میں دلکش رومانوی سی فضا قائم کر دی۔ میں نے گانے کو انجوائے کرتے ہوئے گاڑی کی رفتار تھوڑی تیز کر دی۔ اس لمحے میں شاید میرے ذہن سے روزی کا ہرجائی پن کچھ دیر کے لیے پتا نہیں کہیں غائب ہو گیا تھا۔

شام ہونے کے قریب تھی۔ سورج دور کہیں اپنا منہ چھپانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ میں جلد از جلد اپنی منزل مقصود پر پہنچنا چاہتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہمیں سفر کرتے ہوئے دیر ہو جائے اور شام ڈھل کر گہری رات میں تبدیل ہو جائے۔

میں کار کو تیزی سے بھگا لے جا رہا تھا کہ ایک مقام ''کاکا'' پر مجھے گاڑی کو تیزی کے ساتھ بریک لگانا پڑا، کیوں کہ سامنے سڑک پر ایک بہت بڑا پرانا درخت گرا پڑا تھا۔ اس طرح سے کہ آگے جانے کا تمام ہی راستہ بند ہو گیا تھا۔ گاڑی کو اگر پوری قوت سے میں بریک نہ لگاتا تو اس کا درخت سے ٹکرانا لازماً تھا۔ میرے اس طرح اچانک بریک لگانے سے میرے ساتھ بیٹھی روزی اور خود میں بھی اپنی سیٹوں پر جیسے اُچھل پڑے۔ روزی جو گانے میں مگن تھی، اچانک بوکھلاہٹ کا شکار ہو گئی۔

''ارے! یہ کیا ہوا؟'' وہ حیرانی سے بولی۔

''کیا ہونا ہے؟ وہ سامنے دیکھ رہی ہو نا سڑک پر پڑا ہوا درخت...... آگے کا راستہ تقریباً بند ہے۔'' میں نے پریشانی کے عالم مں اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''اب کیا کریں؟ درخت کو ہٹانے کے سوا کوئی چارہ ہے کیا......؟''

روزی نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

’’تم......تو ایسے کہہ رہی ہو گویا میں کوئی سپر مین ہوں اور اس کو آسانی سے سڑک پر سے پرے کر سکتا ہوں۔ ارے بھئی......! وہ منوں وزنی درخت ہے۔ ہاں اگر تم کہو تو تمہیں ضرور اٹھا سکتا ہوں۔‘‘ میں نے اس کے چہرے پر پھیلی پریشانی کو کم کرنے کے لیے ہنستے ہوئے کہا۔

’’اچھا کوئی اور راستہ تو ہوگا ہی نا۔‘‘

’’راستہ......‘‘ میں گاڑی کے شیشے کو نیچے کر کے مدد کے لیے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

’’اگر ہم اس سڑک سے جائیں تو۔‘‘ روزی نے مشرق کی سمت جانے والی سڑک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

’’شاید یہ متبادل راستہ ہو، میرا خیال تو یہ ہی کہتا ہے۔‘‘

’’ہاں، ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔‘‘ میں نے کندھے اُچکائے۔

’’کسی سے پوچھ لیتے، مگر یہاں تو ہر طرف سناٹا ہی سناٹا ہے۔‘‘

’’دیکھو، یہاں ایک ہوٹل بھی ہے اور دوسری دکانیں بھی، لگتا ہے دن کو یہاں خاصا رش ہوتا ہوگا۔‘‘

’’ہوتا ہوگا؟ مگر......اب یہاں ایک بندہ بھی نہیں نظر آرہا۔‘‘

روزی نے کہا۔

’’ہوسکتا ہے یہاں کے لوگ شام ڈھلنے سے پہلے اپنے گھروں کی راہ لے لیتے ہوں۔‘‘ میں زیر لب بڑبڑایا۔

’’اوہو! اب کیا ہوگا حیات؟‘‘ روزی کے چہرے پر فکرمندی کے تاثرات دکھائی دینے لگے۔ نجانے کیوں مجھے اس کے بھولے حسین چہرے پر پریشان کچھ اچھی نہیں لگی۔ وہ تو صرف ہنسنے مسکرانے میں ہی بھلی معلوم ہوتی تھی۔

’’اچھا تم پریشان نہ ہو۔‘‘ میں نے اسے تسلی دی۔

’’کیسی باتیں کرتے ہو حیات۔ پریشانی تو ہوگی ہی نا۔ ہم یہاں بیچ سڑک پر پھنس گئے ہیں۔ نا آگے جاسکتے ہیں اور واپسی بھی نہیں ہوسکتی۔ شام ڈھلتے ڈھلتے اب رات ہونے کو آرہی ہے، ایک سنسان جگہ اور ہمیں اب درست سمت کا اندازہ بھی نہیں ہے۔‘‘

روزی کی بات واقعی ٹھیک تھی۔ شام واقعی ڈھلنے کے قریب تر تھی۔ اندھیرا ہر سو پھیلنے لگا تھا۔ وہ رات تو چودھویں کی تھی، مگر لگتا تھا کہ چاند میاں نجانے کہاں اوندھے منہ ابھی تک سوئے ہوئے تھے۔

میں نے گاڑی کو اسی مشرق کی جاتی ہوئی سڑک پر ڈالنے کا فیصلہ کرلیا۔ شاید یہیں سے کوئی شارٹ کٹ راستہ میانوالی جانے کے لیے مل جائے۔ روزی نے بھی میرے اس فیصلے کی تائید کی۔ میرے پاس اس کے علاوہ کوئی دوسرا چانس بھی نہیں تھا۔

میں نے گاڑی سڑک پر ڈالی اور اس کی رفتار تیز کردی۔ یہ چھوٹی سڑک اگرچہ پکی تو تھی، مگر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوچکی تھی۔ لگتا تھا کہ کافی عرصے سے اس کی مرمت نہیں کروائی گئی تھی، اس لیے تیزی سے چلتی گاڑی جھٹکے کھا رہی تھی۔ گاڑی کے ساتھ ہم بھی اپنی سیٹوں پر کافی ہل جل رہے تھے۔ روزی نے ایک دو دفعہ مجھے گاڑی کی رفتار آہستہ کرنے کا مشورہ دیا، مگر مجھے تو جلد از جلد ایسا راستہ تلاش کرنے کی جلدی تھی جو ہمیں ہماری مطلوبہ جگہ تک پہنچادے۔ ’’فارگاڈ سیک‘‘

آخر کار روزی سے رہا نہ گیا وہ تقریباً چلا اٹھی۔

’’حیات مجھے یقین ہے کہ اگر تم اسی طرح گاڑی دوڑاتے ہے ناں تو میری تو ہڈی پسلی ایک ہوجانی ہے۔‘‘ لیکن میں نے اس کی بات سنی ان سنی کردی اور گاڑی کو سڑک پر ہوا بنانے پر تلا ہوا تھا کہ اچانک......گاڑی کو زبردست جھٹکا سا لگا اور وہ ہچکولے کھاتی ہوئی اور میرے قابو سے باہر ہوئی اور سڑک کے ادھر اُدھر ہوتی، ایک بڑی سی خاردار جھاڑی سے زوردار آواز کے ساتھ جا ٹکرائی اور جھاڑی میں اندر کی طرف دھنستی چلی گئی۔ میں اور روزی اپنی سیٹوں پر جیسے سُن ہو کر ہی بیٹھ گئے۔

کچھ لمحے تو ہمیں پتا ہی نا چل سکا کہ آخر کار گاڑی کے ساتھ ایسا کیا مسئلہ ہوا ہے، مجھے ہوش آیا تو میں جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ روزی بھی میری پیروی کرتی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔

گاڑی کو دیکھ کر مجھ پر انکشاف ہوا کہ اس کا اگلا

ٹائر پنکچر ہو چکا تھا۔ جس کی وجہ سے گاڑی مجھ سے ایسی بے قابو ہوئی کہ جھاڑی سے جاٹکرائی۔ گاڑی کے فرنٹ کا بھی خاصا نقصان ہو چکا تھا۔ ہیڈ لائٹس ٹوٹ چکی تھیں۔

''ایک نئی آفت'' ہم بے بسی سے کھڑے اردگرد دیکھنے لگے۔

چاند اپنی پوری دلکشی کے ساتھ بڑے جوبن سے چمک رہا تھا۔ اردگرد کی ہر شے صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ خاردار بڑی بڑی جھاڑیوں اور کیکر کے درختوں سے بھرا ہوا سنسان ریتیلا علاقہ تھا۔ جس میں جابجا چھوٹے بڑے ریت کے ٹیلے تھے۔ خاموشی ایسی کہ دل کے دھڑکنے کی بھی میں بخوبی آواز سن سکتا تھا جو میرے سینے میں تیزی کے ساتھ پھڑ پھڑا رہا تھا۔

گاڑی کا ٹائر تبدیل بھی نہیں کیا جاسکتا ہے، میرے پاس دوسرا اضافی ٹائر موجود نہیں تھا۔ اور یہ سب سے بڑی پریشانی ہے۔

میں سوچنے لگ گیا کہ اب کیا کیا جائے۔

''تم گاڑی کو اسٹارٹ کر کے اس جھاڑی سے تو باہر نکالو۔ ہم اسے آہستہ آہستہ چلا کر کہیں ایسی جگہ لے جاسکتے ہیں جہاں آبادی ہوگی اور ہم گاڑی کی مرمت بھی کرواسکیں۔ میں اس ویرانے میں ایک منٹ بھی اور نہیں رہ سکتی۔''

یہاں کا سنسان ماحول یہ ویرانہ......!

روزی نے اس وقت خاصی عقل مندی کی بات کی، مگر قسمت ہم سے کھیل کھیل رہی تھی۔ میری لاکھ کوشش کے باوجود بھی گاڑی اسٹارٹ ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

''مشکل ہے، بہت ہی مشکل.....'' مجھے ایک دم غصہ سا آنے لگا۔

''تو پھر......؟'' روزی خوف سے تقریباً رونے والی ہوگئی۔

''کچھ نہیں یار! ہمت سے کام لو۔ میں نے آگے ہو کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اس کے جسم کی حدت اور تنہائی نے پریشانی کے اس عالم میں بھی میرے جذبات میں آگ لگانا شروع کر دی۔ اور میرے تسلی دیتے ہاتھ اس کے جسم پر پھسلنے لگے۔ تب ہی اچانک دور کہیں سے کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ آواز کی سمت ہمارے دائیں جانب سے تھی۔ ہم دونوں چونک کر علیحدہ ہوئے اور اس طرف نگاہیں دوڑائیں۔

دور لالٹین کی روشنی میں ہمیں چلتا ہوا کوئی انسانی سایہ نظر آنے لگا۔ یہاں تو کسی بندے کا اس وقت تصور نہیں کر سکتے تھے۔ چہ جائیکہ اس ویرانے میں یوں چلتا ہوا ایک انسانی سایہ، جو پراسرار طریقے سے قریب سے قریب تر آتا جا رہا تھا۔

روزی تو خوف سے تقریباً کانپنے لگی۔ میرا بھی حال روزی سے اچھا نہیں تھا، رات کے اس پہر اس سنسان ویرانے میں وہ کون تھا۔ کوئی آسیب کوئی بلا......؟ میرے پاؤں منوں بھاری ہونے لگے، چاہتے ہوئے بھی میں وہاں سے ہل نہیں پا رہا تھا۔ روزی تو تقریباً بے ہوش ہونے کو تھی۔

چلتی لالٹین کو پکڑے وہ انسانی سایہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ہمارے بالکل قریب آ گیا۔ کالے سیاہ چوغے میں ملبوس وہ بوڑھا سا آدمی تھا۔ جس کا اپنا رنگ بھی سیاہ تھا، اس کا چہرہ جھریوں سے اٹا ہوا اور ایک آنکھ کانی تھی۔ شکل سے وہ کافی ہیبت ناک تھا۔

روزی کی نظر جیسے ہی اس کے چہرے پر پڑی، اس کے منہ سے دل خراش چیخ نکل گئی وہ بری طرح سے تھر تھر کانپنے لگی اور دوڑ کر گاڑی کا دروازہ کھول کر اس میں جا بیٹھی۔

''کون...... کون...... ہو تم؟'' میں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''گھبراؤ نہیں۔ گھبراؤ نہیں۔'' وہ بوڑھا تیزی سے بولا۔ اس کی آواز بھی خاصی بھدی تھی۔ ''میں تو تمہاری مدد کے لیے یہاں آیا ہوں۔ میں یہاں قریب ہی رہتا ہوں، گاڑی کی آواز سن کر ادھر آن نکلا۔''

وہ میرا کوئی جواب سنے بغیر گاڑی کی حالت کا اندازہ لگانے لگا۔

''وہ۔ وہ ہم میانوالی جا رہے تھے، راستہ بھٹک کر ادھر آن نکلے کہ ہماری گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔'' مجھے کچھ حوصلہ ہوا تو میں بولا۔

''ٹائر بھی پنکچر ہو گیا اور گاڑی کا اگلا حصہ بھی تباہ

ہوگیا ہے۔'' میں روانی سے اپنے ساتھ بیتے ہوئے تمام حالت بتانے لگ گیا۔ شاید وہ بوڑھا ہماری مدد ہی کردے۔

''ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکلنا ہے۔ یہاں قریب کوئی بستی یا شہر ہے جہاں سے ہم کوئی مدد لے سکیں۔''

''نہیں۔ یہاں نزدیک کوئی آبادی نہیں ہے، ہاں، یہاں سے چند میل پر ایک بستی ''پلواں'' ہے، لیکن وہاں گاڑی کی مرمت نہیں ہوسکتی۔ اس کے لیے تمہیں شہر جانا پڑے گا۔ یہاں سے کافی آگے ایک شہر نور پور ہے، وہاں تم لوگ جا تو سکتے ہو لیکن صبح...... اس وقت وہاں پہنچنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔''

''اوہ......'' بوڑھے کی بات سن کر جیسے میرا رہا سہا حوصلہ بھی جواب دے گیا۔ میانوالی شادی میں کسی صورت بھی نہیں جایا جاسکتا تھا۔

''اس کا مطلب ہے ہمیں ساری رات یہیں ویرانے میں گزارنی ہوگی، گاڑی میں بیٹھ کر۔'' مجھے اب رات گزارنے کی فکر لاحق ہوگئی۔

''ہاں، صبح ہوتے ہی یہاں آمد و رفت شروع ہوجاتی ہے، تم آسانی سے اپنا کام کرواسکتے ہو۔'' وہ بوڑھا بولا۔

''لیکن یہاں یوں پوری رات سڑک پر گزارنا ہم دونوں کے لیے بڑا مشکل کام ہے۔ میری ساتھی روزی یہاں کسی صورت بھی نہیں رہ سکتی ہے۔'' میں نے اشارے سے روزی کی طرف اس بوڑھے کا دھیان کرایا۔

''یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے......'' بوڑھا ہولے سے مسکرایا۔

''تم لوگ میرے ساتھ میرے مکان میں رات گزار سکتے ہو، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اگر تم لوگوں کو کوئی اعتراض نہ ہو تو......''

''نہیں۔ نہیں، میں میں اس بوڑھے کے ساتھ نہیں جاؤں گی، حیات میں کسی صورت بھی نہیں جاؤں گی۔''

روزی جو گاڑی میں بیٹھی ہماری باتیں سن رہی تھی، ایک دم چلا اُٹھی، ویسے میرا دل بھی اس پراسرار بوڑھے کے ساتھ جانے کو نہیں چاہ رہا تھا مگر......

''جیسے مرضی آپ کی۔'' وہ بوڑھا بغیر روزی کی بات کا بُرا منائے ہوئے واپسی کے لیے مڑا۔ ''میں تو تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہا تھا۔ اس جگہ یوں تمہارا موجود ہونا کوئی ٹھیک بات نہیں۔ تم اس علاقے میں نئے ہو، اور نہ تمہیں اس علاقے کے بارے میں کسی بات کا علم ہے۔'' وہ بوڑھا ہمیں نہ جانے کیا باور کرانا چاہتا تھا۔

''سنو۔ سنو۔'' ہم تمہارے ساتھ جانے کو تیار ہیں۔

میں نے جاتے ہوئے اس بوڑھے کو روک لیا۔

اس ویرانے میں یوں اکیلے رات بیتانے سے بہتر تھا کہ اس بوڑھے کی بات مان لی جائے۔ روزی کو منانا بہت مشکل عمل تھا، مگر میرے سمجھانے بجھانے پر آخر کار وہ آمادہ ہو ہی گئی۔

وہ بوڑھا ریتیلی زمین پر اُگی ہوئی خاردار جھاڑیوں سے ہمیں گزارتا ہوا تھوڑی ہی دور بنے ایک کچے مکان پر لے گیا۔ جو ایک کمرہ پر مشتمل تھا۔ ارد گرد کیکر کے درختوں کی بہتات تھی۔ مکان کے اندر ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پڑی ہوئی تھی اور چارپائی کے ساتھ پانی کا ایک گھڑا بھی موجود تھا۔ وہ بوڑھا ہمیں اس چارپائی پر بٹھا کر خود نیچے ایک کچی اینٹ پر جا بیٹھا۔

کچھ دیر نہ تو اس بوڑھے نے کوئی بات کی نا ہم میں سے کوئی بولا۔ روزی کو تو ویسے ہی چپ سی لگ چکی تھی۔

کتنی ویرانی خاموشی ہے یہاں، لگتا ہے دور دور تک کوئی انسان یہاں نہیں بستا اور تم یہاں اکیلے......''

میں نے بوڑھے کی طرف دیکھا۔

''میں۔ میں یہاں ہمیشہ تو اکیلا نہیں ہوتا ہوں۔'' بوڑھے نے بات شروع کی۔

''ہم لوگ خانہ بدوش ہیں، ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا ہمارا معمول ہے، لیکن میں اب بوڑھا کمزور ہوچکا ہوں، در در کا سفر کرنا اب میرے بس کی بات نہیں ہے۔ میرے ساتھی خانہ بدوش مجھے یہیں چھوڑ کر چند ہفتوں کے لیے مانگنے نکل پڑتے ہیں اور بعد میں یہیں دوبارہ آجاتے ہیں۔ اس وقت تک میں یہیں پڑا ان کا راستہ دیکھتا رہتا ہوں، اتنی خوراک پانی میرے پاس ہوتا ہے

جس کو میں کھا کر گزارا کر سکتا ہوں۔

''اوہ......'' میں نے ہنکار بھری۔ ''پھر بھی یہاں کوئی دوسرا بندہ تو نظر آنا ہی چاہیے۔ تم پیچھے کہیں کسی بستی ''پلواں'' کا ذکر کر رہے تھے، وہاں اس بستی میں بھی ہم نے کوئی ایک فرد تک نہیں دیکھا۔''

''خوف...... ڈر...... جب یہ دونوں چیزیں مل جائیں تو پھر کیسے رات کے سے کوئی بندہ مل سکتا ہے۔''

بوڑھا خود کلامی جیسے انداز میں گویا ہوا۔ اس کی آواز بہت آہستہ تھی، مگر میں نے اس کے الفاظ سن لیے۔

''خوف......ڈر......کیسا خوف......اور کیسا ڈر؟''

بوڑھے نے کوئی جواب دینے کی بجائے اس گھڑے سے ایک پانی کا گلاس بھر کر میری طرف بڑھایا۔ مجھے پیاس تو تھی، مگر میں نے وہ گلاس روزی کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ روزی نے جھپٹ کر گلاس پکڑا اور سارا گلاس غٹاغٹ کر کے پی گئی۔

''سننے میں آیا ہے کہ پہلے یہاں بھی آبادی ہوا کرتی تھی، لوگ یہاں رہا کرتے تھے۔ چنے کی کاشت یہاں ہوتی تھی، مویشی پالتے تھے، پھر آہستہ آہستہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ یہاں سب کچھ اُجڑ گیا۔ لوگ یہاں سے دوسری جگہوں پر نقل مکانی کر گئے، اس جگہ کو ویران کر گئے۔''

''آخر کیوں؟'' میں نے بوڑھے سے سوال کیا۔

روزی جو پہلے چپ چاپ بیٹھی تھی، اب ہماری باتوں میں دلچسپی لینے لگی تھی۔

''کیوں کہ ہر چودھویں کی رات کو یہاں اس علاقے میں کوئی نہ کوئی عورت بے موت ماری جاتی۔ یہ پرانی داستان ہے، تم شہری لوگوں کے لیے یہ شاید عجیب ہو۔

ہندوستان کے وقتوں میں یہاں اس علاقے میں ایک مسلمان راجا رہا کرتا تھا، نور پور شہر سے لے کر اردگرد دور دور تک یہ سارے علاقے اس کی تحویل میں ہوتے تھے۔ کہتے ہیں اس کی بیوی جو بڑی خوب صورت تھی، مگر وہ نیک سیرت نہیں تھی، راجا اس سے بے پناہ پیار کرتا تھا، مگر اس کی بیوی نے اسے دھوکا دیا وہ بے وفا نکلی۔ ایک رات وہ راجا کے وزیر کے ساتھ بھاگ گئی۔ مگر راجا کے ہاتھوں وہ پکڑی گئی۔ راجا نے اس کو وزیر سمیت موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ سرِ عام دونوں کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ انتقام کی وجہ سے ان دونوں کی لاشوں کو کئی ہفتے یونہی سرِ عام لٹکائے رکھا، مگر اس کا انتقام شاید ابھی تک پورا نہیں ہوا تھا۔

بیوی کو مارنے کے بعد راجا بھی زیادہ عرصے تک زندہ نہ رہ سکا۔ چند ہفتوں بعد وہ بھی مر گیا۔ مرنے سے قبل ایک ہندو جوتشی جو اس کا دیرینہ ساتھی تھا، اس کو وصیت کی تھی کہ اس کی لاش کو غسل و کفن دینے کے بجائے ایسے ہی گڑھا کھود کر دفنا دیا جائے اور اس گڑھے کے اوپر اس کی شکل کا ایک مجسمہ بنایا جائے۔ وہ مرا تو اس کی وصیت کے مطابق اس کے ہندو جوتشی ساتھی نے اسے ویسے ہی گڑھے میں دفنا کر اس کے اوپر ایک مجسمہ تعمیر کروا دیا۔ دیکھنے والے کہتے تھے کہ اس کا ہندو جوتشی ساتھی اکثر رات کو اس کے مجسمے کے نیچے بیٹھا کوئی منتر پڑھتے پایا جاتا تھا، پھر ایک دن نجانے کیسے وہ مجسمہ زندہ ہو گیا اور چاندنی راتوں میں وہ اکثر لوگوں کو نظر آنے لگا۔ چاند کی پوری رات کو کہیں بھی اسے اکیلی عورت نظر آتی تو وہ اس کو مار دیتا۔ رات بارہ بجے کے بعد وہ مجسمہ حرکت میں آ جاتا ہے۔ اگر ریتیلی زمین گیلی ہو تو صبح اس کے قدموں کے نشان صاف دیکھے جا سکتے ہیں۔''

''کیا بکواس ہے؟ ایک دم جھوٹ'' بوڑھے سے کہانی سن کر میں قہقہہ لگا کر ہنس پڑا، روزی بھی کھلکھلا اُٹھی۔

''تم بوڑھے ہو گئے ہو اور تمہارا دماغ بھی شاید اب کام نہیں کرتا۔ کیسی جھوٹی بے مقصد کہانیاں سناتے ہو، کیا بھلا کوئی مجسمہ زندہ بھی ہو سکتا ہے۔'' میں نے اس بوڑھے کا مذاق اُڑایا۔

''میں نے کہا نہیں تھا، تم شہری لوگ کہاں مانتے ہو ایسی باتوں کو۔''

''اچھا۔ وہ چاندنی راتوں میں زندہ ہو کر عورتوں کو آخر مارتا کیوں ہے؟''

روزی نے ہنستے ہوئے سوال کیا۔

''اس کا شاید انتقام پورا نہیں ہوا۔ اب بھی اپنی

بیوی کی بے وفائی کا انتقام ہر اس عورت سے لیتا ہے جو اس کی بیوی جیسی خصلت کی ہوتی ہے۔''

یہ بوڑھا حد سے زیادہ جھوٹا اور گپی تھا، میں نے کم از کم اس کے متعلق یہی اندازہ لگایا۔ روزی کافی دیر اس بوڑھے کی اوٹ پٹانگ باتوں پر ہنستی رہی، لیکن میں نے ایک دو بار ٹوک کر اس کو چپ کروایا۔

بوڑھے کی باتوں میں پتا ہی نہ چلا کہ رات کتنی بیت چکی تھی، ٹائم دیکھا تو گھڑی پونے بارہ بجا رہی تھی، چارپائی صرف ایک تھی، میں نے روزی کو مشورہ دیا کہ تم چارپائی پر آرام سے سو جاؤ۔ ویسے بھی وہ کافی تھکی ہوئی ہلکان سی لگ رہی تھی، اس کی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ نیند سے بوجھل وہ سونے کو بے تاب ہو رہی تھی۔

نیند میری آنکھوں سے تو کوسوں دور تھی، میں ویسے ہی چہل قدمی کی غرض سے سگریٹ سلگا کر وہاں سے بہت دور نکل آیا۔ یہاں تک کہ وہ بوڑھے کا مکان نظروں سے اوجھل سا ہو گیا۔ وہ بوڑھا بھی آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے پیچھے مجھ تک آن پہنچا۔ میں بوڑھے کو ساتھ لیے ایک چھوٹے سے ریت کے ٹیلے پر جا بیٹھا۔ اس وقت موسم بہت خوش گوار ہو رہا تھا، ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، چاند کی ٹھنڈی چاندنی اور پھر ٹیلے کی ٹھنڈی ریت بہت سکون دے رہی تھی، میں سگریٹ کے آہستہ آہستہ کش لینے لگا۔

''تمہیں یوں اپنی بیوی کو اکیلے چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا۔ چاند کی اس رات میں تنہا عورت کا ہونا کسی طور پر بھی خطرے سے خالی نہیں ہے، اسے تمہاری ضرورت ہے۔''

وہ بوڑھا پھر اول فول بکنے لگا۔

بس کرو تم۔ اس طرح اس عمر میں جھوٹ بولنا تمہیں زیب نہیں دیتا۔ کیوں ایسے فرضی فسانے گھڑتے ہو، کم از کم میں تمہاری ان باتوں میں نہیں آنے والا۔'' کب سے بوڑھے کی یہ سب بے سروپا باتیں سن کر میں تنگ سا آ گیا تھا۔

میں بوڑھے پر برس پڑا لیکن وہ بوڑھا خاموش رہا کچھ بولا نہیں۔

''اور وہ عورت...... میری بیوی نہیں ہے۔ میں، میں۔ اس کو اپنی بیوی بنانا چاہتا تھا، مگر وہ کمینی ذلیل عورت...... تمہاری کہانی کے راجا کی بیوی کی طرح حرام زادی نکلی، وہ ہر پھول پر منڈلانے والی تتلی ہے۔''

میں نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا اور دھواں باہر چھوڑنے کی بجائے سارا اپنے سینے میں اتار لیا۔ شاید میں اس دھوئیں سے سینے میں لگی آگ کو ٹھنڈا کرنا چاہتا تھا، جو میرے اندر بھڑک بھڑک کر شعلہ بن چکی تھی۔

''حسین عورت بھی ایک فتنہ ہے۔'' بوڑھا آہستگی سے بولا۔

پھر ہمارے درمیان کافی دیر خاموشی طاری رہی، میں اپنے زخم پر مرہم رکھتا رہا اور وہ بوڑھا بھی نجانے کس سوچ میں ڈوبا اپنی انگلیوں سے ریت پر نشان بناتا رہا۔

میں نے گھڑی پر نظر دوڑائی۔ بارہ کب کے بج چکے تھے، پھر نجانے کیوں میرے ذہن میں ایک خیال کوندا کہ میں اس راجا کے مجسمے کو دیکھوں کہ وہ اپنی جگہ موجود ہے بھی یا نہیں، مجھے تو یقین تھا کہ وہ مجسمہ اپنی جگہ ہی موجود ہوگا اور یہ ثابت کر کے میں اس بوڑھے کا جھوٹ ثابت کرنا چاہتا تھا۔

''کیا تم مجھے وہ جگہ دکھا سکتے ہو جہاں اس راجا کا مجسمہ نصب ہے۔ میں اس کو دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ ہے کیسا۔''

''اس وقت؟ نہیں اس وقت وہاں جانا مناسب نہیں، تم دیکھ نہیں رہے بارہ کے بعد کا عمل ہے۔''

''اچھا، تم اپنی یہ فضول بکواس بند کرو اور مجھے اس کا پتا بتاؤ۔''

میرے یوں ڈانٹنے سے وہ بوڑھا سہم گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور پھر سامنے نظریں دوڑا دیں۔

''وہ اس اونچے ٹیلے کے نیچے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک قدیم قبرستان واقع ہے، اسی قبرستان میں اس راجا کا مجسمہ بنا ہوا ہے، لیکن...... میں وہاں نہیں جاؤں گا، تم نے جانا ہے تو شوق سے جاؤ۔'' وہ بوڑھا اپنی بات پر اڑ گیا۔

وہ کہنے لگا۔ ''اگر وہ ہمیں وہاں زندہ حالت میں مل گیا تو پھر......؟''

''پہلی بات تو یہ ہے کہ'' میں اس کو سمجھانے لگا۔

''وہاں ایسا کچھ نہیں ہوگا اگر فرض کرو...... وہ ہمیں زندہ حالت میں مل بھی گیا تو تمہارے کہنے کے مطابق وہ صرف عورتوں کو مارتا ہے اور مجھے اتنا یقین ہے کہ ہم دونوں میں سے کوئی بھی اس وقت عورت نہیں ہے۔''

میں نے زندگی سے بھرپور ایک زوردار قہقہہ مارا۔

وہ بوڑھا میرے منہ کو تکنے لگا۔

''تم میرے ساتھ آؤ تو سہی، کچھ نہیں ہوگا۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔'' شاید یہ میری باتوں کا اثر تھا وہ میرے ساتھ جانے پر رضامند تو ہوگیا، مگر وہ صرف قبرستان کی دیوار تک ساتھ جانے پر رضامند ہوا۔

قبرستان کے اندر کسی بھی قیمت پر نہیں جانا چاہتا تھا۔

میں نے بالآخر بوڑھے کی یہ شرط مان لی اور اس کو لیے چھوٹے بڑے ٹیلوں سے نیچے اترتا قبرستان کی طرف جانے لگا۔ بوڑھے کی اس بات کی تو تصدیق ہوگئی کہ وہ قبرستان قریب ہی تھا، مگر دوسری بات کی تصدیق کے لیے کہ وہ راجا کا مجسمہ اس وقت اپنی جگہ پر موجود ہے بھی یا نہیں، یہ دیکھنے کے لیے میں نے اکیلے ہی قبرستان میں جانا تھا۔ سو اس بوڑھے کو وہیں باہر چھوڑتے ہوئے میں قبرستان کے اندر داخل ہوگیا۔

وہ بہت قدیم قبرستان تھا۔ قبرستان کی باہر والی دیواریں ٹوٹی ہوئی خستہ حالی کا نمونہ لگ رہی تھیں۔ قبرستان کا گیٹ اُکھڑ کر ایک جانب ریت پر پڑا ہوا تھا۔

قبرستان کے اندر داخل ہونے پر مجھے یاد آیا کہ مجسمے کا تو میں نے پوچھا ہی نہیں کہ وہ آخر نصب کہاں ہے۔ قبرستان کے اندر بڑی بڑی خاردار جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں جس میں دیکھنا محال تھا۔ وہاں کیکر کے درختوں کی بھی بہتات تھی۔

میں گیٹ پر واپس آیا، بوڑھے نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''کیا ہوا۔'' اس کا لہجہ گھبرایا ہوا تھا۔

''تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ وہ مجسمہ آخر کہاں نصب ہے۔''

میں نے اس سے سوال کیا۔

''وہ، وہ تم سامنے بڑا سا کیکر کے درختوں کا جھنڈ دیکھ رہے ہونا۔'' بوڑھے نے میری توجہ ان لاتعداد کیکر کے درختوں کی طرف کروائی جنہوں نے قبرستان میں ایک کافی بڑی جگہ کو گھیرا ہوا تھا۔ ''بس وہیں اس جھنڈ کے دوسری طرف اس کا مجسمہ ہے، دیکھو اب بھی تم میری بات مان جاؤ۔ وہاں اس طرف نہ جاؤ۔'' اس بوڑھے نے مجھے ایک بار پھر سمجھانا چاہا، مگر...... مجھے تو اس بوڑھے کی بات کو جھوٹا ثابت کرنے کا جنون تھا۔

میں قبرستان کی پرانی دھنسی ہوئی قبروں اور وہاں اُگی خاردار جھاڑیوں سے بچتا اس کیکر کے جھنڈ کے نزدیک پہنچ گیا۔

اچانک مجھے اپنے پیچھے کسی کی آہٹ محسوس ہوئی، میں نے بے اختیار مڑ کر دیکھا۔ مگر...... وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ کیکروں کا جھنڈ گول دائرے میں اُگا ہوا تھا، اس جھنڈ میں سے ہوتے ہوئے مجھے اس مجسمہ تک پہنچنا تھا۔

میں جھنڈ میں داخل ہوا۔ اب کی بار صاف طور پر مجھے محسوس ہوا کہ کوئی عین پیچھے میرے آرہا ہے، خوف نے ایک دم ہی میرے دل میں جگہ بنالی۔ دل نے کہا کہ مجھے یہاں سے فوراً بھاگ جانا چاہیے، مگر دماغ مجھے وہاں ٹھہرنے کا مشورہ دے رہا تھا۔ میں نے آخرکار دل کو چھوڑ کر دماغ کی مانی اور آگے قدم بڑھاتے ہوئے جھنڈ کو پار کر کے عین اس جگہ جا پہنچا جہاں وہ مجسمہ نصب تھا۔

چاند تو جانے کب کا بادلوں سے آنکھ مچولی کھیلنے میں مصروف تھا۔ جس کی وجہ سے کبھی اندھیرا کبھی روشنی سی پھیل جاتی، لیکن میرے جھنڈ کے پار پہنچنے تک چاند بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا۔

چاند کی ٹھنڈی چاندنی میں میری نگاہ سامنے بنے ہوئے ایک چھوٹے سے چبوترے پر پڑی، میرا دل سینے سے ایسا اچھلا کہ گویا حلق تک آن پہنچا ہو۔

وہاں کوئی پتھر کا مجسمہ نہیں تھا۔ مجسمہ وہاں سے غائب تھا مجھے وہاں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا، میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس چبوترے کو دیکھا۔

''اوہ میرے خدا! کیا وہ بوڑھا سچ کہہ رہا تھا۔ میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ میرا سارا جسم جیسے پسینے سے تر ہوگیا۔

میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، دیوانہ وار واپسی کے لیے دوڑ لگادی۔ میں ہانپتا کانپتا قبرستان کے دروازہ تک

بمشکل پہنچا۔
وہ بوڑھا میرے انتظار میں کھڑا میری راہ تک رہا تھا۔
''وہ، وہ، راجا کا مجسمہ وہاں نہیں ہے۔ خدا کی قسم......میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔''
میرے سب بتانے پر وہ بوڑھا ششدر ہو کر رہ گیا۔
''وہ یقیناً اسی علاقے میں بھٹک رہا ہوگا۔ تمہارے ساتھ والی لڑکی وہاں اکیلی ہے، اس کی جان کو خطرہ ہے۔ ہمیں جلد از جلد مکان پر جانا چاہیے۔'' بوڑھا جو خوف سے بُری طرح کانپ رہا تھا، بمشکل بولا۔
میرا دماغ بالکل ماؤف ہو چکا تھا، مجھے خود پر یقین نہیں آ رہا تھا جو میں نے ابھی دیکھا تھا، میں اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود بھی اس حقیقت کو ماننے کے لیے وہاں کھڑا اشش وپنج میں پڑ گیا۔
''ایسا ہو نہیں سکتا؟ ایسا کیسے ہو گیا۔''
میں نے بوڑھے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''کیا مطلب؟ تم، تم...... ابھی بھی نہیں۔'' اس بوڑھے کو میری ذہنی حالت پر شبہ سا ہونے لگا تھا۔ اس کا اندازہ ہی بتا رہا تھا۔
''میرا خیال ہے ہم دونوں کو وہاں جا کر ایک بار پھر اس بات کی تصدیق کرنی چاہیے کہ وہاں وہ مجسمہ ہے بھی یا نہیں۔''
''تم۔ تم مجھے بے وقوف، کم عقل سمجھ رہے تھے۔ مگر......تم خود بہت بڑے جاہل بے وقوف ثابت ہوئے ہو، اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود بھی تم پھر بھی نہیں مان رہے۔''
''میں پڑھا لکھا باشعور بندہ ہوں۔ تم مجھے جاہل کہہ رہے ہو۔'' اس کے الفاظ پر میں یک دم سیخ پا ہو گیا۔
''شاید یہ میری آنکھوں کا دھوکا ہو، میں تمہیں خود وہاں لے جا کر دکھاتا ہوں یا پھر تمہاری کہانی کی طرح مجسمے کا وجود بھی جھوٹا ہو۔''
میں اس بوڑھے کا زبردستی ہاتھ پکڑ کر قبرستان کے اندر لے جانے لگا۔ اس بوڑھے نے مجھ سے ہاتھ چھڑا کر واپس بھاگنے کی بڑی کوشش کی، مگر وہ بوڑھا کمزور شخص ہر جتن کے باوجود بھی کچھ نہ کر سکا۔
میں کیکر کے درختوں کے جھنڈ میں سے اس کو لے جاتا ہوا اس چبوترے تک آن پہنچا۔ چاند کی روشنی میں میں نے دوبارہ چبوترے پر نگاہ ڈالی وہ مجسمہ اپنی جگہ چبوترے پر موجود تھا۔ شاید اندھیرے میں مجھے جگہ کے بارے میرا غلط فہمی ہوئی تھی۔ میں نے خود کو تسلی دی۔
''یہ مجسمہ تو اپنی جگہ موجود ہے۔'' وہ پرانا ساچھ فٹ کا مجسمہ تھا۔ جو دھول اور مٹی سے تقریباً اَٹا ہوا تھا۔ اگر یہ حرکت کرتا تو یوں دھول مٹی سے نئے نہ اٹا ہوتا میں نے سوچا۔ نجانے کیوں مجسمہ کو دیکھ کر مجھے راحت محسوس ہوئی، میں نے تفخر کے ساتھ اپنے پاس کھڑے اس بوڑھے کی طرف دیکھا۔ جو منہ کھولے حیرت کا نشان بنا ہوا تھا۔
''میں کہتا نہ تھا کہ وہ میری آنکھوں کا دھوکا ہو سکتا ہے۔ تم۔ تم بوڑھے ہار گئے ہو۔ تم بھی جھوٹے اور تمہاری باتیں بھی جھوٹیں، مجسمہ اپنی جگہ موجود ہے۔''
میں بوڑھے کا کوئی بھی جواب سنے بغیر چبوترے پر چڑھ کر غور سے اس مجسمے کو دیکھنے لگا۔ وہ مجسمہ کافی شاندار بنایا گیا تھا، پتا نہیں میوزیم والوں کو ابھی تک اس کا پتا کیوں نہیں چل سکا تھا۔ نجانے وہ مجسمہ کتنا قدیم تھا اور اس کی قیمت بھی بہت زیادہ ہو سکتی تھی۔ مجسمہ ویسے تو دھول، مٹی سے اَٹا ہونے کے باوجود ٹھیک حالت میں تھا، مگر میں نے غور سے دیکھا تو اس کے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی آدھی نہیں تھی۔ مجھے افسوس ہوا کہ اتنے شاندار مجسمے میں ایک نقص سا پڑ گیا تھا۔
میں بوڑھے کو وہاں سے لے کر بڑے فاتحانہ انداز میں قبرستان سے نکلا۔ مجھے رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا کہ میں یہ سب کچھ روزی کو بتاؤں گا۔ تو اس کا ہنسی کے مارے کتنا برا حال ہوگا۔ بوڑھا بمشکل چل رہا تھا، ایک بڑا ریت کا ٹیلا عبور کرتے ہوئے بوڑھا ہانپنے لگا۔
''مجھ سے اب نہیں چلا جا رہا۔ میں کچھ دیر یہیں بیٹھ کر آرام کروں گا۔''
وہ نیچے ٹیلے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔
میں بوڑھے کو وہیں چھوڑ کر مکان کی طرف چل دیا۔

میں جلد از جلد روزی کے پاس پہنچ کر اسے یہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ بوڑھا کتنا فریبی ہے۔ میں تیز تیز قدم اٹھتا ہوا چھوٹے بڑے ٹیلے عبور کرتا ہوا مکان پر پہنچا۔ رات بہت بیت چکی تھی، چاند اپنی چاندنی کو اب بھی برقرار رکھے کھڑا تھا۔

میں نے چارپائی پر روزی کو دیکھا جو اوندھے منہ پڑی شاید خواب خرگوش کے اب تک مزے لے رہی تھی دور سے اسے اس طرح دیکھ کر میرے دل میں گدگدی سی ہونے لگی تھی۔ تیز تیز قدموں سے چل کر اس تک پہنچ کر اسے چھونے کے لیے میں نے ہاتھ بڑھایا اور میرے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ اس کی گردن ایک طرف ڈھلکی ہوئی تھی، اس کی ناک مڑی ہوئی تھی۔ جس سے بے تحاشا خون بہہ رہا تھا۔ میں نے جلدی سے روزی کو بانہوں میں اُٹھایا۔ اس کے جسم پر شدید تشدد کے نشانات تھے۔ جسم جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا اور گردن کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی، آنکھیں بے تحاشا پھٹی ہوئی تھیں۔

''اوہ، خدایا!'' اُسے کسی نے بڑی اذیت سے مارا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ کی مٹھی سختی سے بند تھی، مجھے لگا جیسے مٹھی میں کوئی چیز دبی ہوئی ہے، میں نے زور لگا کر مٹھی کو کھولا۔

تو...... مجھے لگا جیسے میرا ذہن سُن ہو گیا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت گویا ختم ہو چکی تھی۔

اس کی مٹھی میں راجا کے مجسمے کی وہی چھوٹی آدھی سنگی انگلی تھی جسے میں نے وہاں مجسمے کے ہاتھ میں ٹوٹا ہوا دیکھا تھا۔

میری آنکھوں کے گرد اندھیرا سا چھانے لگا۔ میں وہیں ریت پر گرا اور مجھے کچھ بھی ہوش نہ رہا۔

سورج کی تیز چمکدار دھوپ کی تپش سے میری آنکھ کھلی۔ میں جلدی سے اُٹھا، میں نے اپنے آپ کو اُسی مکان کے پاس اسی ٹوٹی ہوئی چارپائی پر پایا۔ میرے سر میں شدید درد تھا، میں نے بے اختیار ارد گرد نگاہ دوڑائی تو کئی عارضی جھونپڑیاں بنی ہوئی نظر آئیں اور کئی خانہ بدوش عورتیں مرد چلتے پھرتے بھی نظر آئے۔

یک دم مجھے روزی کا خیال آیا تو میں نے چونک کر ادھر ادھر اسے تلاش کرنے کی کوشش کی۔

''تمہاری ساتھی کا صبح سویرے ہی کفن دفن کر دیا گیا ہے۔'' بوڑھا جو میرے پاس جانے کب سے کھڑا تھا۔ میرے یوں بے قرار ہو کر دیکھنے سے وہ فوراً سمجھ گیا کہ میں روزی کو تلاش کر رہا ہوں۔

''رات کے آخری پہر ہمارے سارے خانہ بدوش مرد عورتیں واپس یہاں آ گئے تھے، ہماری خانہ بدوش عورتوں نے ہی تمہاری ساتھی کو غسل و کفن دیا اور سورج نکلنے کے فوراً بعد دفنا دیا گیا۔

بوڑھے نے ساری تفصیل مجھے باور کرا دی۔

روزی اگرچہ بے وفا، بے اعتماد لڑکی تھی، مگر مجھے اس کی موت کا بہت غم تھا۔ گاڑی کی مرمت نور پور شہر سے کروا کے میں واپس اسی راستے سے گزرا۔ دوپہر ڈھل کر شام میں تبدیل ہو چکی تھی، اسی جگہ اسی سڑک پر گاڑی چلاتے ہوئے مجھے وہ بوڑھا پھر دکھائی دیا۔ میں نے گاڑی روکی نہیں، بس ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہنے کا اشارہ کیا۔ جواباً اس بوڑھے نے بھی مسکرا کر اپنا ہاتھ ہلایا۔ مجھے لگا جیسے وہ کہنا چاہ رہا ہو۔

دیکھ لو...... میری باتوں میں کتنی سچائی تھی۔ پوری کہانی سنا کے وہ آدمی خاموش ہو گیا، جیسے اس نے چپ سادھ لی ہو، میرا تو وہ حال تھا کہ بدن کاٹو تو لہو نہیں والا معاملہ تھا۔ یقین مانیے میں اس وقت یقینی بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا ہو گیا تھا۔

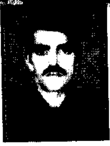
وہ آدمی بغیر کوئی بات کیے اُٹھ کھڑا ہوا اور فوراً وہاں سے نکل گیا۔ میں نے جلدی سے اسے بلانے، اسے روکنے کے لیے قدم اٹھائے مگر وہ کیفے سے باہر نکل کر نجانے کہاں گم ہو گیا۔

وہ دن اور آج کا دن میں نے اسے ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی، مگر وہ آدمی پھر مجھے دکھائی نہیں دیا۔

آپ سے درخواست ہے کہ اگر وہ آدمی آپ کو ملے اور آپ کو اپنی بیتی ہوئی کہانی سنائے تو یہ سوچ کر اس کی پوری کہانی سن لیجیے گا کہ اگر کل کلاں آپ بھی ایسی ہی کسی کہانی کے کردار بن جائیں تو آپ کو بھی سننے والا کوئی موجود ہو۔

☆......☆





خونی بدروح

شاہد سلیم

کچہ موڑ، اسلام آباد سے ایک خونی بدروح کی دل ہلا دینے والی سرگزشت

جس نے ایک سفلی عمل میں رکاوٹ سے جنم لیا تھا

کامران اور شازیہ کی جوڑی بے مثال تھی۔ کامران کا شازیہ کے ساتھ بہت اچھا رویہ تھا۔ وہ دونوں اگر کسی بات پر لڑ پڑتے تو شازیہ ایک اچھی بیوی کی طرح خاموش ہو جاتی تا کہ بات مزید آگے نہ بڑھے، یہی بات کامران کو بہت پسند تھی۔ کامران مارگلہ ٹیکسٹائل ملز میں کام کرتا تھا۔ جس سے ان کا اچھا گزارا ہو جاتا تھا۔ ایک دفعہ کام سے واپسی پر کامران کو کافی دیر ہو گئی، راستے میں ایک پرانا قبرستان ”شاہ غریب بابا“ آتا تھا۔ وہاں سے تو دن کو بھی گزرتے ہوئے ڈر لگتا تھا، مگر کامران ایک نڈر اور دلیر نوجوان تھا۔ ایک مرتبہ رات تقریباً ساڑھے گیارہ بجے جب وہ قبرستان سے گزر رہا تھا تو اُسے دور سے روشنی نظر آئی اور اس روشنی میں سے ایک سایہ سا نظر آیا۔

کامران آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا جب درختوں کی اوٹ لیتے ہوئے وہاں پہنچا تو حیران رہ گیا، کیوں کہ وہاں پر ایک ہندو پنڈت ننگ دھڑنگ بیٹھا اپنی زبان میں کچھ منتر پڑھ پڑھ کر اس آگ پر پھونک رہا تھا جو اس کے آگے جل رہی تھی اور وہ پانی جیسی کوئی چیز آگ میں پھینکتا تو ایک دم وہاں دھواں سا اُٹھتا۔

یہ سب رنگ دیکھ کر کامران کو ایک شرارت سوجھی، اُس نے قریب ہی پڑا ہوا پتھر اُٹھا کر دُور سے آگ میں پھینک دیا تو ایک خوفناک دھماکا ہوا اور ہر طرف اندھیر پھیل گیا اور چیخنے چلانے کی آوازیں ہر سُو آنے لگیں، پھر ان میں سے ایک بلند آواز آئی۔

”اے بدبخت انسان! تُو نے میرے عمل میں خرابی کی اور میری جان چلی گئی، مگر جس بدروح پر میں یہ عمل کر رہا تھا، وہ تمہارا پیچھا مرتے دم تک نہیں چھوڑے گی۔ تمہارے ذریعے وہ انسانوں کا خون پیے گی اور تم سے میرا انتقام بھی لے گی۔“ اس کے بعد سیاہ رنگ کی آندھی سی چلنے لگی۔ کامران خوف کے مارے وہیں ساکت ہو گیا۔ خون اس کی رگوں میں منجمد ہو گیا اور چلنے کی سکت تک نہ رہی۔ رفتہ رفتہ پھر جب آندھی تھمنے لگی اور وہاں صرف دھواں رہ گیا۔ اچانک دھوئیں نے ایک خوفناک شکل اختیار کر لی۔ جس کے کان رشین کتے کے کانوں کی مانند کھڑے تھے اور دانتوں کے درمیان خاصا خلا تھا۔ اس کے منہ سے سفید جھاگ نکل رہا تھا۔ دانت اس کے اتنے نوکیلے اور بڑے تھے کہ جیسے تیز دھار تلوار کی نوک باہر کو نکلے ہوئے۔ اس کی بڑی بڑی سرخ آنکھیں ایک خاص زاویے سے تیز تیز حرکت کر رہی تھیں۔ اس کی ناک کا ایک ہی نتھنا تھا اور اس سے سانپ کی دم باہر کی طرف نکلی ہوئی تھی۔ وہ ہیولائی مخلوق آہستہ آہستہ کامران

کی طرف بڑھنے لگی۔ کامران کو کسی انجانی طاقت نے وہاں رُکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ جب وہ بدروح کامران کے بالکل قریب آئی تو اس کی آنکھیں اور تیزی سے گردش کرنے لگیں۔ کچھ دیر بعد وہ خود ہی پھر دھوئیں کی شکل اختیار کر گئی اور وہ دھواں کامران کے جسم میں حلول کر گیا۔ کامران کو ایک زور دار جھٹکا لگا اور پھر وہ بنا سوچے سمجھے گھر کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتا چلنے لگا۔

☆......☆

دھکیلتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ شازیہ نے کامران کی آنکھوں میں عجیب سی ایک اجنبیت محسوس کی، مگر اس نے اسے نظر انداز کر دیا اور بولی۔

''آج آپ نے اتنی دیر کر دی۔'' کامران نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ پھر بولی۔

''میں نے آپ کے لیے آج آپ کی پسند کی چیزیں بنائی ہیں، آپ کھائیں گے کیا؟'' شازیہ نے اس مرتبہ چہکتے ہوئے کہا۔



شازیہ کی آنکھیں گو کہ نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں، مگر وہ بڑی شدت سے کامران کا انتظار کر رہی تھیں۔ جب اس کی آنکھیں بند ہونے کو آئیں تو دروازے پر زور زور سے دستک ہونے لگی۔ شازیہ نے جھٹ سے آنکھیں کھولیں اور دل میں سوچا کہ کامران تو اتنی زور سے دستک نہیں دیتا، پھر خیال آیا شاید دیر سے آنے کی وجہ سے وہ ایسا کر رہا ہے۔ شازیہ نے دروازہ کھولا تو کامران بڑی تیزی سے شازیہ کو ایک طرف

''گوشت'' کامران نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔ شازیہ سمجھی کہ کامران مذاق کر رہا ہے۔ ایک تو وہ گوشت کھاتا نہیں، دوسرا وہ غرا کر مجھے ڈرا رہا ہے۔ شازیہ نے پھر سوال کیا۔

''اچھا آپ پئیں گے کیا۔'' کیوں کہ اسے پتا تھا کہ کامران سوپ پیتا ہے۔

''خون'' کامران نے بدستور غرائی ہوئی آواز میں کہا۔ شازیہ یکدم گھبرا سی گئی کہ کامران کو کیا ہو گیا ہے؟

جب اس نے کامران کے چہرے کی طرف دیکھا تو خوف سے اس کی گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی، کیوں کہ اس کا چہرہ بگڑا ہوا تھا اور اس کے ہاتھوں پر لمبے لمبے بال نمودار ہو گئے تھے۔ اس کے نوکیلے ناخن بڑھ رہے تھے۔ کامران ایک دم سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور شازیہ کی طرف بڑھنے لگا۔ شازیہ اس کے تیور دیکھ کر بے اختیار چیخنے لگی۔

ادھر کامران کی امی سکینہ جان بھی کامران کے گھر دیر سے آنے کی وجہ سے ٹھیک طرح سے سو نہ سکی تھیں۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی کہ چیخ کی آواز کہاں سے آئی؟ وہ اسے اپنا وہم سمجھ کر لیٹنے ہی والی تھیں کہ چیخ کی گھٹی گھٹی آواز دوبارہ آنے لگی۔ وہ پہچان گئیں کہ یہ آواز تو شازیہ کی ہے۔

ادھر کامران اُٹھا اور ناخن شازیہ کی گردن میں پیوست کر دیے اور آگے بڑھ کر دونوں دانت اس کی گردن میں گاڑ دیے۔ شازیہ کی ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ وہیں دم توڑ گئی۔

بدروح نے اس کا سارا خون پینے کے بعد اپنے تیز اور نوکیلے ناخنوں کی مدد سے اس کا دل نکالنا شروع کر دیا اور جلد ہی اسے نکال کر چبا گئی۔ چند ہی منٹوں میں کام مکمل کر کے وہ تیزی سے اس کمرے سے نکل گئی۔

ادھر کامران کی امی سکینہ جان آہستہ آہستہ چلتی ہوئی جب شازیہ کے کمرے میں گئیں تو دیکھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ جب وہ اندر گئیں تو دہشت اور خوف سے ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ خوف سے ان کے منہ سے چیخ بھی نکل نہیں رہی تھی۔ جب وہ اپنا پورا زور لگا کر چیخیں تو دوسرے کمرے سے اس کی بیٹی اور بیٹے بھاگے ہوئے آئے تو ان کی بھی چیخیں نکل گئیں، کیوں کہ سامنے ہی شازیہ کی کٹی پھٹی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں باہر کو نکلی ہوئی تھی اور ان میں خوف نمایاں طور پر نظر آ رہا تھا۔ سکینہ جان تو وہیں بے ہوش ہو گئیں۔ ان کی بیٹی حمیرا نے انہیں سنبھالا اور انہیں ہوش میں لانے کے جتن کرنے لگی۔ کامران کے دونوں بھائی فیضان اور عدنان بھی شازیہ کی لاش کے نزدیک گئے تو وہ خوف سے کانپنے لگے، پھر وہ جلد ہی کمرے سے باہر آ گئے۔ انہوں نے گھبراتے ہوئے انداز میں جلدی جلدی گھر کی تلاشی لی۔ جب وہاں سے کچھ نہ ملا تو کمرے میں جا کر ٹارچیں اور ریوالور لے آئے۔ گیٹ سے باہر نکل کر انہوں نے اپنی ٹارچیں روشن کر لیں۔ جب ان کی ٹارچوں کی روشنی زمین پر پڑی تو انہیں بڑے بڑے قدموں کے نشانات دکھائی دیے۔ وہ ان ہی کی نقش پر مزید آگے بڑھتے گئے۔ جس جگہ پہ نشانات ختم ہو گئے تو انہوں نے دیکھا کہ وہیں پر کامران اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ ان دونوں نے کامران کو جلدی سے قریب آ کر پکارا۔

''کامران بھائی آپ۔'' تو کامران ایک دم اُٹھ کر کھڑا ہو گیا، اس کے اس طرح ایک دم کھڑا ہونے سے اس کے چھوٹے بھائی گھبرا گئے، پھر جب انہوں نے ٹارچوں کی روشنی کامران کے منہ پر ماری تو دیکھا کہ کامران کا چہرہ بگڑ رہا تھا۔ ان دونوں کے خوف کے مارے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ کامران تیزی سے ان کی طرف بڑھنے لگا۔ پہلے تو وہ خوف سے ساکت ہو گئے، لیکن پھر یکلخت ان میں حرکت پیدا ہو گئی اور وہ دونوں سرپٹ بھاگ کھڑے ہوئے اور اپنے گھر پر ہی جا کے دم لیا۔

وہ بھاگم بھاگ شازیہ کے کمرے میں پہنچے تو وہاں حمیرا اور امی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔ محلے کی بہت سی عورتیں بھی اکٹھی ہو گئی تھیں اور وہ یہ سب کچھ دیکھ کر کافی خوف زدہ سی تھیں۔ وہ کامران کی امی اور حمیرا کے رونے کی آواز سن کر آئی ہوئی تھیں۔ وہاں کی تمام عورتوں کی آنکھیں اشک بار تھیں۔ امی اور حمیرا کہہ رہی تھیں کہ کسی بھیڑیے نے ہماری شازیہ کو مار دیا، مگر انہیں کیا معلوم کہ وہ بھیڑیا کون ہے؟

☆......☆

فیضان اور عدنان کے چلے جانے کے بعد وہ بدروح کامران کو ایک پرانے قبرستان ''باباشیر شاہ ولی'' پہ لے گئی اور وہاں اسے ایک کھنڈر نما قبر میں لٹا دیا۔ کامران بدروح کی مرضی سے ہر کام کر رہا تھا۔ اس کی تمام ذہنی اور جسمانی طاقتیں ختم ہو چکی تھیں۔ وہ کسی فرد کو نہیں پہچان سکتا تھا۔ صبح ہو چکی تھی، مگر سکینہ جان اور کامران کے بچوں کے لیے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ شازیہ کے والدین اور بہن بھائی روتے پیٹتے ہوئے وہاں آئے۔ وہ سکینہ جان سے اس کی موت کے بارے میں تفصیل سے پوچھنے

لگے۔ سکینہ جان نے انہیں ساری بات تفصیل سے بتادی۔ ادھر فیضان اور عدنان پریشان تھے کہ بدروح پہلے کامران کی شکل میں کیوں تھی؟ پھر کسی کو خیال ہی نہ رہا کہ کامران کہاں ہے۔ خیال اس وقت آیا کہ جب وہ جنازہ لے کر جانے لگے۔

کامران کو بہت ڈھونڈا گیا، مگر وہ انہیں کہاں ملنے والا تھا، آخر تھک ہار کر انہوں نے شازیہ کو دفنا دیا۔

☆......☆

شازیہ کی تدفین کے بعد کامران کا پھر خیال آیا۔ جب رات پڑی تو سکینہ جان نے فیضان اور عدنان سے پوچھا کہ کامران کا کچھ پتا چلاؤ، ملنے والوں سے پوچھو۔"

دونوں بھائیوں نے ماں کو رات والا پورا واقعہ سنایا۔ یہ بات سُن کر سکینہ جان کے رونگٹے کھڑے ہوگئے، کیوں کہ انہیں اس بات کا علم تھا کہ شازیہ ہمیشہ دروازہ بند ہی رکھتی تھی اور کامران کے آنے پر ہی کھولتی تھی۔ کیوں کہ کبھی کبھار اسے بھی دیر ہوجاتی تھی، مگر اتنی زیادہ نہیں۔

بدروح کو پھر خون کی طلب محسوس ہوئی۔ اس نے کامران کو اُٹھایا اور وہ گاؤں کی طرف چل پڑا۔ گاؤں کے چوکیدار نے اسے دیکھا تو پہچان لیا۔ اس نے کہا۔ "تمہارے گھر والے تمہیں تلاش کر رہے ہیں۔" مگر وہ ابھی اس سے اتنا ہی کہہ سکا تھا کہ کامران کے ناخن بڑھنے شروع ہوگئے۔ چوکیدار چیخ بھی نہ سکا اور موت کی وادیوں میں چلا گیا۔

بدروح نے اس طرح اب ایک اور شخص کو موت کی وادی میں پہنچا دیا تھا، جس طرح اس نے شازیہ کو موت کی نیند سلا دیا تھا۔ جب صبح سویرے چوکیدار اپنے گھر نہ پہنچا تو اس کی بیوی کو تشویش لاحق ہوگی اور پھر جب تمام لوگ چوکیدار کو ڈھونڈنے لگے تو وہیں قریب ہی جھاڑیوں میں پڑی اس کی کٹی پھٹی ہوئی لاش کو دیکھ کر خوف سے کانپنے لگے۔ شازیہ کی بھی یہی حالت تھی۔ اب پورے گاؤں میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ ہر صبح کو کسی نہ کسی فرد کی کٹی پھٹی ہوئی لاش ملنے لگی تھی۔

☆......☆

سکینہ جان اور اس کے بیٹوں نے پورا گاؤں اور شہر چھان مارا تھا، مگر کامران انہیں کہیں بھی دکھائی نہ دیا۔ پورے گاؤں میں کامران کی گمشدگی کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔

ایک دن اسی گاؤں کا ایک نوجوان شہر سے واپس آرہا تھا تو اسے آنے میں کافی دیر ہوگئی۔ وہ پرانے قبرستان "بابا شیر شاہ ولی" کے راستے سے شارٹ کٹ میں آرہا تھا۔ اس کے پاس پاور فل ٹارچ تھی۔ جب وہ قبرستان کے وسط میں پہنچا تو اسے اپنے قریب ہی آہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ شہریار نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا تو کوئی سایا سا اس کے پیچھے چلا آرہا تھا۔ اسے اس بات کا علم تھا کہ گاؤں میں ہر روز صبح سویرے کسی نہ کسی کی لاش ضرور ملتی ہے۔ اس لیے اسے اپنی موت کا یقین ہوگیا کہ یہی وہ بلا ہے جو بے دردی سے انسانوں کا خون پیتی ہے۔ اُس نے ٹارچ کی روشنی اس ہیولے پر ڈالی تو وہ حیران رہ گیا کہ وہاں تو صرف کامران کھڑا تھا۔ کامران آہستہ آہستہ شہریار کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کا چہرہ بھی خوفناک ہونے لگا۔ شہریار کو پتا چل گیا کہ کامران کے جسم میں کوئی بدروح گھس گئی ہے اور اس کا اگلا شکار میں ہی ہوں۔

کامران کو دیکھتے ہی شہریار نے دوڑ لگادی۔ بدروح تو اس وقت بھوکی تھی۔ اسے بھاگتے دیکھ کر وہ بھی اس کے پیچھے دوڑ پڑی، مگر شہریار تو جیسے بجلی کا بنا ہوا تھا۔ وہ اپنا بچاؤ کرتا اور چیخیں مارتا ہوا گاؤں کی جانب بھاگنے لگا۔ چیخ کی آواز سن کر سب لوگ اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل آئے۔ یہ دیکھ کر بدروح سٹپٹا گئی، چنانچہ وہ وہاں سے نامراد واپس پلٹ گئی۔ لوگوں نے جب شہریار سے بھاگنے کی وجہ دریافت کی تو کہنے لگا کہ "شہر سے آتے ہوئے مجھے کافی دیر ہوگئی تھی، میں پرانے قبرستان "بابا شاہ ولی" کے راستے سے آرہا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے قدموں کی آواز سنائی دی۔ جب میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو کوئی سایا سا میرے پیچھے چلا آرہا تھا۔ میں نے اپنی ٹارچ کا رُخ اس کی طرف کیا تو یکدم حیران ہوگیا کہ وہ کوئی اور نہیں بلکہ کامران کھڑا تھا۔ یہ سن کر سب کو یقین ہوگیا کہ بدروح نے کامران کے جسم پر قبضہ کرلیا ہے۔ لوگوں نے فیصلہ کرلیا کہ جہاں کہیں بھی کامران نظر آئے تو اسے قابو کرنا ہے۔

☆......☆

فیضان اور عدنان نے رات والا واقعہ ابھی تک کسی کو نہ سنایا تھا۔ جب انہوں نے گاؤں والوں کی زبانی سُنا تو انہیں بھی یقین ہوگیا کہ یہ تو واقعی کامران ہے۔ انہی دنوں ہمارے گاؤں میں ایک مشہور بزرگ ماجد حسین آئے ہوئے تھے۔ وہ ہر کسی کی مشکل کو آسانی میں بدل دیتے تھے۔ ان کا اپنا مستقل کوئی ٹھکانہ نہیں تھا، وہ کبھی کبھار ہی اس گاؤں میں دکھائی دیتے تھے۔ ماجد حسین بزرگ کی جلالی آنکھیں، نورانی چہرہ اور سفید داڑھی تھی، وہ اکثر اوقات تسبیح پڑھا کرتے تھے۔ وہ جب اس گاؤں میں تشریف لائے تو سب لوگوں نے انہیں اپنا مسئلہ بتایا۔ بزرگ ماجد حسین فوراً کامران کے گھر گئے۔ سب سے پہلے وہ کامران کے کمرے میں داخل ہوئے اور اپنی آنکھیں بند کرکے وہ کچھ پڑھنے لگے۔ جب انہوں نے آنکھیں کھولیں تو ان کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ پھر وہ بولے۔

''ایک بدروح خون کی پیاسی تھی، ایک شیطان کے پجاری نے اسے انسانی خون کا لالچ دیا اور اسے پرانے قبرستان ''بابا شیر شاہ ولی سرکار'' پہ لے آیا اور وہ اس پر عمل کرکے اپنا غلام بنانا چاہتا تھا، مگر کامران نے اس کے عمل میں خرابی پیدا کی تو وہ پجاری مرگیا، مگر بدروح کے ذہن میں عمل کی وجہ سے یہ بات پہنچ گئی کہ یہ میرا آقا ہے اور اس کے دل میں اپنے آقا کے انتقام کی آگ بھڑک اُٹھی، وہ کامران کے جسم میں سما گئی اور اسے اپنا غلام بنالیا۔'' یہ سن کر سکینہ جان بزرگ ماجد حسین کے قدموں میں گر پڑی اور روتے ہوئے فریاد کی۔

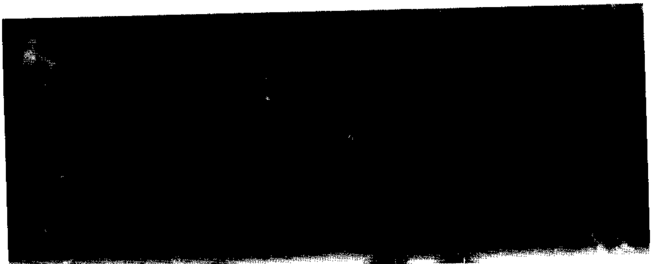
''بابا میرے بیٹے کو بچالو۔''

بزرگ نے کامران کو بچانے کی حامی بھرلی۔ تقریباً آدھی رات کا عمل طے ہوا تھا۔ سکینہ جان اور اس کے دونوں بیٹے درختوں کی اوٹ میں تھے۔ بزرگ پرانے قبرستان ''بابا شیر شاہ ولی سرکار'' کے وسط میں کھڑے تھے۔ ان کے آگے پانی کا ایک ٹب بھرا ہوا رکھا تھا۔ اس ٹب کے اردگرد گول دائرے میں آگ کا الاؤ روشن تھا۔ بزرگ اپنے منہ میں کچھ پڑھ کر پانی پر پھونک رہے تھے۔ کچھ دیر بعد پانی میں سے بھاپ نکلنے لگی۔

بزرگ ماجد حسین زور زور سے آیات پڑھنے لگے اور آنکھیں بند کرلیں۔ جب انہوں نے اپنی آنکھیں کھولیں تو وہ خون کی مانند سرخ تھیں۔ پھر انہوں نے ایک طرف منہ کرکے پھونک ماری تو قبرستان میں ایک ہولناک چیخ سنائی دی اور ایک طرف سے انہیں کامران آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ بزرگ کے پاس آیا اور بولا۔

''کیوں بابا جی آپ کیسے ہیں؟'' بزرگ آگے سے کچھ نہ بولے بلکہ لگاتار آیات پڑھتے رہے، کیوں کہ انہیں اس بات کا علم تھا کہ بدروح میری توجہ کسی اور جگہ پر مائل کرنا چاہتی ہے۔ اسی طرح بدروح کا یہ حربہ ناکام ہوتا ہوا صاف دکھائی دینے لگا۔ پھر بزرگ نے آیات پڑھ کر کامران پر پھونک ماری تو وہ ایک دہشت ناک چیخ کے ساتھ پانی کی جانب بڑھنے لگا۔ سکینہ جان اور اس کے بیٹے خوف زدہ ہو چکے تھے۔ کامران کا چہرہ پوری طرح بگڑ چکا تھا۔ وہ بے اختیار پانی کی جانب لپکنے لگا۔ وہ آگ پر سے گزر کر پانی کے ٹب میں جا بیٹھا اور وہ بے اختیار چیخنے لگا۔ چیخوں کی آواز سن کر گاؤں کے لوگ یہ تماشا دیکھنے کے لیے یکدم اکٹھے ہوگئے۔ وہ بدروح پانی میں بیٹھی تو اس سے مزید اور زیادہ بھاپ نکلنے لگی۔ اس کی چیخوں سے پورا قبرستان لرز کر رہ گیا تھا۔ مجبوراً بدروح کو کامران کا جسم چھوڑنا پڑا۔ جب وہ اپنے اصلی چہرے کے ساتھ کامران کے جسم سے نکلی تو وہاں موجود بھی لوگ خوف سے کانپنے لگے۔ جب وہ بدروح آگ کے پاس گئی تو آگ نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور جلد ہی اسے راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کردیا۔ اس طرح بدروح اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ اس کے ختم ہوتے ہی کامران کو ہوش آیا اور وہ بے چینی کے ساتھ اپنے اردگرد دیکھنے لگا کہ میں اس وقت کہاں ہوں۔ بزرگ ماجد حسین نے اسے پانی کے ٹب سے باہر نکالا۔ کامران کی امی اور بھائیوں نے اسے گلے لگایا اور بزرگ کا شکریہ ادا کیا۔ اس طرح بزرگ نے اپنے وعدے کے مطابق کامران کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بدروح سے چھٹکارا دلا دیا۔ لیکن کامران کی شازیہ بدروح کا نشانہ بن کر اس کی زندگی میں انمٹ خلا چھوڑ گئی تھی، جو تاعمر اس کے ساتھ رہنا تھا۔

☆......☆



قصہ ایک روح کا

انجم فاروق

لاہور سے، ایک روح کی خونی سرگزشت

جبران بخار کی شدت میں بستر پر لیٹا ہوا ایسا محسوس کررہا تھا جیسے گرم گرم بھاپ کے بادلوں میں ہے۔ ٹائی فائیڈ اس کے جسم میں لاوے کی طرح اندر ہی اندر جوش کھا رہا تھا۔ وہ اس کیفیت میں ایک ہفتے سے صاحبِ فراش تھا۔ نازلی جبران اُس کی اطاعت گزار اور فرض شناس بیوی بڑی تندہی سے اس کی تیمارداری میں مصروف تھی۔ وہ ٹھیک وقت پر آ کر اُسے دوا پلاتی تھی اور جب ڈاکٹر جبران کو دیکھنے آتا تو وہ ہاتھ باندھ کر جبران کے سرہانے کھڑی گویا منہ ہی منہ میں اُس کی صحت یابی کی دعائیں مانگتی رہتی۔

اس وقت جبران کن انکھیوں سے اُس کا جائزہ لیتا رہتا۔ اُس کا ستا ہوا چہرہ پہلے سے زیادہ پیلا اور اُداس نظر آتا تھا۔ وہ سوچتا کہ کتنی احمق عورت ہے یہ جس سے پانچ سال قبل شادی کی تھی۔

”تم اس فکر میں گھل رہی ہو کہ میں مرکیوں نہیں جاتا۔“ اُس نے طنزیہ انداز سے اپنی بیوی سے کہا۔ جب وہ صبح کے وقت اُسے دَوا پلانے آئی تھی۔ ”تم میرا مرنا چاہتی ہو، یہی بات ہے نا؟“

”جبران خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔“

”لیکن یہ حقیقت ہے۔“ جبران کو اپنی آواز بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ”تم میرا مرنا چاہتی ہو، لیکن یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ میں ابھی نہیں مروں گا اور بہت جلد صحت یاب ہوجاؤں گا۔ یہ سن کر تمہیں مایوسی ہوگی۔“

”نہیں۔ نہیں تمہارا خیال بالکل غلط ہے۔ جبران تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی لاحق ہے تم خوامخواہ شک کے انگاروں سے کھیل رہے ہو۔“

بخار کی شدت سے اُس کی آنکھوں کے سامنے دُھندسی چھائی ہوئی تھی۔ اس لیے وہ اس لمحے اپنی بیوی کی شکل نہ دیکھ سکا، البتہ اُس کی سسکیاں لے کر رونے کی آواز اُس کے کانوں میں آرہی تھی۔ ”یہ عورت رونے کا کیسا ناٹک کررہی ہے۔“ وہ بڑبڑا کر رہ گیا۔

آٹھویں روز وہ بیدار ہوا تو اُس نے خود میں عجیب وغریب اور پراسرار حیرت انگیز تبدیلی محسوس کی۔ اس کی قوتِ بصارت اور قوتِ سماعت میں اضافہ ہوچکا تھا۔ اُسے اپنا جسم شیشے کی طرح چمکتا ہوا نظر آرہا تھا۔ ایسا شیشہ جسے بھٹی سے نکال کر ابھی سرد نہ کیا گیا ہو۔ اگرچہ اُسے ٹمپریچر بدستور تھا، لیکن اب وہ کیفیت باقی نہ تھی، نہ اُس کی آنکھوں کے آگے دھند چھائی



ہوئی تھی نہ اندھیرا۔ اب وہ ہر چیز پہلے کی نسبت کہیں زیادہ صاف اور اپنے اصلی رنگ و روپ میں دیکھ سکتا تھا۔ کمرے کے کونے میں کھونٹی پر ٹنگی ہوئی اس کی سُرخ ٹائی کا عکس ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں ایسا دکھائی دے رہا تھا جیسے آگ کا لپکتا ہوا شعلہ۔ اُس کی سماعت کا یہ عالم تھا کہ خاصی دُور کی آوازیں اُسے صاف سنائی دے رہی تھیں۔ گھر کی نچلی منزل میں اُس کی بیوی کچن میں کام کر رہی تھی۔ وہاں کی خفیف آوازیں بھی وہ صاف سن سکتا تھا۔

جب اُس کی بیوی نے چولہا جلانے کے لیے ماچس کی تیلی جلائی تو اس کی رگڑ کی آواز اُسے اتنی ہی صاف سنائی دی جیسے اس کی کھڑکی کے باہر پستول داغنے کی آواز۔ وہ اپنی اس حیرت انگیز تبدیلی پر بہت خوش تھا۔ اپنی اس عجیب تبدیلی پر جبران کو ایک لمحے کے لیے گمان گزرا کہ کہیں وہ مر تو نہیں چکا اور یہ موت کا عالم تو نہیں، لیکن اس نے محسوس کیا کہ وہ بستر سے اُٹھ کر چل پھر سکتا ہے اور بلا تکان اوپری منزل کے زینے چڑھ سکتا ہے۔ اس صورت حال میں اُسے مذاق سوجھا کہ دبے پاؤں نیچے کچن میں جا کر نازلی کو ڈرایا جائے، لیکن جب وہ بستر سے اُٹھ کر کھڑا ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اُس کا مادی جسم بدستور بستر پر پڑا ہے اور وہ اپنے مثالی جسم کے ساتھ کھڑا ہے۔ چناں چہ یہ ظاہر تھا کہ اُس کی بیوی اُسے اس حالت میں دیکھ ہی نہ سکے گی۔ اس اثناء میں جب اُس نے دیکھا کہ نازلی اس کے لیے دوا لے کر اوپر آ رہی ہے تو اُسے اس سے بہتر مذاق سوجھا وہ خیال کی سرعت کے ساتھ اپنے بستر پر واپس آیا اور لحاف کے نیچے پڑے اپنے مادّی جسم میں داخل ہو گیا۔ ذرا دیر بعد اُس کی بیوی دوا کی شیشی ہاتھ میں لیے کمرے میں داخل ہوئی۔

نازلی نے جھک کر اس کی گرم پیشانی کو چھو کر دیکھا اور آہستہ سے بولی۔ ''جبران، جبران، کیسی طبیعت ہے اب؟'' جبران نے آنکھیں کھول کر اس انداز سے اُس کی طرف دیکھا جیسے بہت دیر سے

سو رہا ہو۔

''نازلی، نازلی تم نے میری کمپیوٹر شطرنج کی میز اُٹھوا کر زینے کی دوسری جانب رکھوادی ہے۔'' نازلی یہ سن کر بوکھلا گئی اور اس کے ہاتھ سے پانی کا گلاس گرتے گرتے بچا۔ ''جبران'' اُس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ ''تم بستر سے اُٹھ کر نیچے تو نہیں گئے تھے؟ اس بخار کی حالت میں بستر سے اُٹھو گے تو خود کو مارلو گے۔''

''نہیں۔'' جبران نحیف سی آواز میں بولا۔ اُسے خود اپنی آواز دوسرے کمرے سے آتی محسوس ہوئی۔ ''نہیں میں بستر سے اُتر کر کہیں نہیں گیا۔''

''پھر تمہیں کیسے پتا چلا جبران؟'' جبران نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور مسکرا کر آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے سوال کا جواب نہ دے کر اُس نے نازلی کو شش و پنج میں مبتلا کردیا تھا۔

☆......☆

اس کی شروعات اسی طرح ہوئی اور یہ اس کے لیے اتنی آسان بات تھی کہ اُسے تعجب ہوا کہ وہ اب تک اپنی اس صلاحیت کو بروئے کار نہ لاسکا۔ ذرا دیر بعد اُسے پسینا آیا اور بخار کی شدت میں کمی ہوگئی۔ ایک دو روز بعد وہ اس قابل ہوگیا کہ بستر سے اُٹھ کر کھڑکی کے قریب بچھی ہوئی کرسی پر بیٹھ جاتا۔ مہینے کے آخر میں وہ بالکل صحت یاب ہوگیا اور حسبِ معمول کام پر جانے لگا۔ اُس کی شخصیت بھی بڑی حد تک متاثر ہوئی، جسے اُس کے رفقائے کار نے بھی محسوس کیا۔

ایک روز جب کہ جبران لنچ کے بعد دفتر میں صوفہ نما بستر پر لیٹا ہوا اونگھ رہا تھا، اُس نے سوچا کہ وہ اپنی صلاحیت کو ایک بار پھر آزمائے۔ اس نے یہ راز جان لیا تھا کہ وہ اپنے مادّی جسم سے الگ ہوسکتا ہے۔ جس وقت اُس پر قدرے غنودگی طاری ہو، چناں چہ ایک دو منٹ بعد ہی جب اس پر غنودگی چھائی تو وہ بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا، مگر اس کا مادّی جسم بدستور بستر پر پڑا ہوا تھا۔ وہ اُس کے قریب ہو کر اُسے بغور دیکھتا رہا۔ اس کا جسم گہرے گہرے سانس لیتا رہا جس سے پتا چلتا تھا کہ وہ خوابیدہ اور بقیدِ حیات ہے۔

میں مرا نہیں ہوں، اس نے سوچا۔ یہاں میری سخت جان اور لافانی روح کھڑی ہے جو اپنے جسم کو دیکھ رہی ہے۔ جبران کے لیے یہ عمل اتنا ہی آسان تھا جیسے اپنے پاؤں سے جراب یا جوتے اتارنا۔ اس وقت اُسے اپنا دوست اکرم بٹ یاد آیا جو اس کے ساتھ گھنٹوں موت و حیات کے فلسفے پر بحث کیا کرتا تھا۔ اس کا نکتۂ نظر یہ تھا کہ روح جسم سے علیحدہ ہونے کے بعد فنا ہوجاتی ہے۔ روح کا تصور محض سراب یا فریبِ نظر ہے۔ اگر اکرم بٹ زندہ ہوتا تو وہ اُسے ہمیشہ کے لیے قائل کرلیتا۔ اچانک ایک جھماکا سا اُس کے ذہن کی سطح پر ہوا اور اسے جسم اور روح کے الگ ہونے کی قدرت کا سبب سمجھ میں آ گیا۔ اکرم بٹ سے بحث کرتے کرتے ایک مرتبہ اُس نے جنون کے ساتھ ''جسم اور ارواح'' نامی کتاب بڑے شوق سے پڑھی تھی اور پھر اُس میں درج شدہ جسم اور روح کو الگ کرنے والی کٹھن مشقیں بھی شروع کی تھیں، شاید اُن مشقوں کا اثر اب رونما ہوا تھا اور وہ جسم چھوڑنے پر قادر ہو چکا تھا۔

اُس نے فیصلہ کیا کہ اُس کے اس راز کو کوئی نہیں جان سکے گا، حتیٰ کہ وہ اپنی بیوی نازلی کو بھی اس راز میں شریک نہیں کرے گا۔ اس نے سوچا کہ اگر اس کی روح مثالی وجود کی طرح چیزوں کو حرکت دے سکے، انہیں اٹھا کر اِدھر اُدھر رکھ سکے تو وہ اپنی صلاحیت کے ذریعے بڑے دل چسپ اور حیرت انگیز کرتب انجام دے سکتا ہے۔ وہ اپنے دوست احباب اور بیوی کے ساتھ دِل چسپ مذاق کرسکتا ہے، جو اُن کے لیے ناقابلِ فہم ہوں۔ اس عمل کے لیے مضبوط قوتِ ارادی کی ضرورت تھی۔ چناں چہ اس نے اپنی اس قوت سے کام لینے کے لیے باقاعدہ پریکٹس شروع کردی۔ وہ اس حالت میں اپنی میز کے قریب گیا اور اُس کے اوپر رکھے ہوئے پیپر ویٹ کو اٹھانے کی کوشش کی۔ اُسے اپنی انگلیاں یوں محسوس ہوئیں جیسے کُہر میں لپٹی ہوئی ہوں۔ اُس نے بار بار قوت ارادی سے کام لے کر اُسے حرکت دینے کی کوشش کی، شروع میں وہ اُسے

چیچن اتزا، میکسیکو

ماین زبان میں چیچن اتزاءChich en Iza سے مراد لوگوں کے کنویں کے دہانے پر ہے۔ مندروں کا یہ شہر ماین تہذیب کا سیاسی و معاشی مرکز تھا۔ کوکولکن کا اہرام ان میں سے آخری اور سب سے عظیم مندر سمجھا جاتا ہے۔ چوں کہ یوکاٹن جزیرہ نما میں کوئی دریا نہیں، تو تین قدرتی پانی کے کنویں اسے شہر کے لیے اچھا انتخاب بناتے تھے، جن میں سے دو اب بھی موجود ہیں۔ سی نوٹ آف سیکری فائز نامی مقدس کنویں میں مایا کے بارش کے خدا چاق کے لیے نذرانے، برتن، کافور اور بعض اوقات انسان، خصوصاً خوب صورت عورتیں بھی قربانی کے طور پر لائی جاتی تھیں 987 عیسوی میں ایک ٹولٹیک بادشاہ مرکزی میکسیکو سے آیا اور چیچن اتزا کو دارالخلافہ بنایا۔ اس زمانے کا فن اور ثقافت اور ٹولٹیک انداز کا بہترین امتزاج تھی۔ اس شہر کے درمیان میں کوکلن کی عبادت گاہ ایل کیسٹی لو (بمعنی قلعہ) موجود ہے۔ یہ محراب کی صورت میں ہے، جس میں چاروں طرف چوکور صحن اور سیڑھیاں ہیں۔ شمالی سیڑھیوں پر اژدھوں کے مجسمے ہیں اور اندر زائرین کے لیے ایک اونچے کمرے میں بادشاہ کا قیمتی سہرا اور سرخ رنگ میں آراستہ پتھر کے شیر کی شکل کا تخت بھی موجود ہے۔

تھوڑا سا کھسکانے میں کامیاب ہوگیا، پھر دوبارہ کوشش میں اُسے میز سے چار پانچ انچ اوپر اُٹھا کر چند سیکنڈ اُسے روک سکا اور پھر وہ ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ اسی طرح جبران کئی گھنٹے مختلف چیزوں کو کھسکانے اور پکڑ کر اُٹھانے کی مشق کرتا رہا، بالآخر وہ اس قابل ہوگیا کہ اپنے خالی جسم کی انگلیوں کی طرح ہر چیز کو حسبِ منشاء استعمال کرسکتا تھا۔

☆......☆

اس روز سہ پہر کو جب جبران دفتر سے گھر پہنچا تو وہ اپنی بیوی سے بولا۔

''دیکھو نازلی میں اس وقت بے حد تھکا ہوا ہوں اوپر اپنے کمرے میں جا کر سوؤں گا، رات کے کھانے کے وقت جگا دینا۔''

''بہت اچھا۔'' نازی نے جواب دیا اور باورچی خانے میں چلی گئی۔ وہ اپنے اوپر والے کمرے میں گیا اور لباس تبدیل کرکے بستر میں جا گھسا اور ذرا دیر بعد ہی جب اس پر غنودگی طاری ہونے لگی تو وہ اپنے مادی جسم کے خول سے باہر آ گیا اور بستر سے اُٹھ کر نیچے پہنچا۔

ابھی وہ زینے کی آخری سیڑھی پر تھا کہ اُس نے اپنی بیوی کو کسی سے باتیں کرتے سنا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''تم اس وقت چلے جاؤ ندیم، میں تم سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ جب جبران گھر پر ہو تو تم نہ آیا کرو۔ اگر اس کی آنکھ کھل گئی اور اس نے تمہیں دیکھ لیا تو نجانے کیا کر بیٹھے۔'' جبران لپک کر کچن میں پہنچا تو دیکھا اس کی بیوی ہاتھ میں فرائی پین لیے کھڑکی پر جھکی ہوئی ہے اور نیچے لان میں کھڑے ہوئے کسی شخص سے کہہ رہی ہے۔

''خدا کے لیے تم اس وقت چلے جاؤ۔ اس نے تمہیں یہاں دیکھ لیا تو غضب ہو جائے گا۔'' جبران یہ گفتگو سن کر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا تھا۔ اُس نے صبر و ضبط سے کام لیا اور بہت احتیاط کے ساتھ اپنی بیوی کے بالکل پیچھے آ کر اس طرح کھڑا ہوگیا کہ اُس کا جسم اُس سے مس نہ ہو۔ وہ ایک خوب

صورت اور اسمارٹ نوجوان تھا۔ نازلی اُس کی جانب بڑی وارفتگی اور لگاوٹ کی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ مسکراہٹ جو اُس کے ہونٹوں پر رقصاں تھی، جبران نے کبھی ازدواجی زندگی میں نہ دیکھی تھی۔ ''میں جانتا ہوں۔ مجھے سب پتا ہے ڈارلنگ'' وہ نوجوان بولا۔ ''وہ تمہیں مارتا پیٹتا ہے۔ میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کرسکتا۔ وہ اب پہلے سے بھی زیادہ سخت مزاج ہوگیا ہے اور میں نے سنا ہے کہ ٹائی فائیڈ کے بعد تو وہ بالکل خبطی ہوگیا ہے۔''

''ہاں ہاں۔ ڈیئر اب تم دیر نہ کرو اور جلدی سے یہاں سے چلے جاؤ۔'' نازلی نے سرگوشی میں اُس سے کہا اور گھبرائے ہوئے انداز میں پیچھے دیکھا جہاں جبران کھڑا تھا، وہ چونک کر ایک قدم دُور ہٹ گیا۔

''ہم پھر کسی وقت اطمینان سے باتیں کریں گے ندیم، میں جانتی ہوں کہ اب میں زیادہ عرصہ اس کے درشت رویّے کو برداشت نہیں کرسکتی، لیکن تم اس معاملے میں جلد بازی سے کام نہ لو۔ مجھے سوچنے کے لیے ابھی کچھ وقت دو۔''

''ڈارلنگ، تم ابھی اور اسی وقت کیوں نہیں فیصلہ کرلیتیں۔'' اُس نے سرگوشی کی۔

''آج رات کیوں نہیں۔ ہم آج رات ہی کلمہ چوک کے پاس موجود لگژری فلائنگ کوچ کے اڈے سے کراچی روانہ ہوجائیں گے اور پھر وہاں ہوٹل میں ٹھہر کر جہاز کے ذریعے دبئی روانہ ہوں گے۔ اس طرح تمہارے منحوس خاوند سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا حاصل ہوجائے گا دیکھو میں نے فلائنگ کوچ کے دو ٹکٹ حاصل کرلیے ہیں۔ اب مزید سوچنا بے کار ہے۔ اس وقت شام کے سات بجے ہیں، آخری گاڑی اڈے سے رات 12 بجے روانہ ہوگی۔''

نازلی اُس کی بات سُن کر کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگئی پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''اچھا ڈیئر ٹھیک ہے، میں تمہارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں۔ اب تم جلدی جاؤ، جلدی کرو۔'' یہ کہہ کر اس نے جھک کر نوجوان کے ہونٹوں سے ہونٹ ملا دیے۔ لطف سے سرشار ہوکر وہ نوجوان پیچھے ہٹ کر لان کی دیوار کے کنارے چل کے ایک جگہ لگے بینچ پر چڑھ کر دیوار تک جا پہنچا اور پھر دیوار سے دوسری جانب کود گیا۔

جبران غصّے میں سلگتا ہوا واپس اوپر اپنے کمرے میں پہنچا اور اپنے مادّی جسم میں مدغم ہوگیا، پھر وہ نیم غنودہ سا ہوکر اٹھا اور کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرکے عقبی کھڑکی سے کود کر پچھلے کوریڈور میں کود گیا، پھر وہ تیز تیز چلتا ہوا عقبی زینے کے ذریعے بائیں باغ سے گزر کر عقبی گیٹ سے باہر نکلا اور سڑک سے گزرنے والے ایک رکشے کو ہاتھ دے دیا۔ رکشا رک گیا۔ جبران نے اُسے کلمہ چوک کا ایڈریس بتا کر کرایہ طے کیا اور سوار ہوگیا۔

فلائنگ کوچ کے اڈے پر آکر اُس نے رات بارہ بجے روانہ ہونے والی گاڑی میں ایک سیٹ ریزرو کروالی پھر واپس گھر روانہ ہوا۔ وہ کسی کی نظر میں آئے بغیر کمرے میں واپس پہنچ گیا۔ کھانا اُس نے بازار سے کھالیا، تاکہ نازلی کہیں نیند کی تیز دوا نہ ملا چکی ہو۔

رات کا کھانا اس نے کمرے میں طلب کیا اور ڈھک کے رکھ دیا۔ نازلی اُٹھ کر باہر چلی گئی۔ رات کے دس بجے کا وقت تھا۔ وہ بستر پر لیٹ کر وقت کے گزرنے کا انتظار کرنے لگا۔ ساڑھے گیارہ بجے اس کی بیوی نے اُس کے کمرے پر الوداعی نگاہ ڈالی اور پھر گیراج کی طرف بڑھ گئی۔

اس لمحے جبران بھی عقبی گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ جب وہ فلائنگ کوچ کے پاس پہنچا تو سامنے اس کی بیوی نازلی اور وہ خوب صورت نوجوان دل فریب ادا کے ساتھ بس میں سوار ہورہے تھے۔ جبران نے ہلکا پھلکا میک اپ اور مصنوعی داڑھی مونچھوں کے ساتھ چشمہ لگا رکھا تھا۔ اب وہ دونوں بھی اُسے نہیں پہچان سکتے تھے۔ اتفاق سے اُسے نازلی اور نوجوان کی نشستوں سے پیچھے والی سیٹ مل گئی تھی، جو کسی نے کینسل کروائی تھی۔ سفر کے دوران جبران انگاروں پر لوٹتا رہا۔ وہ اپنی بیوی سے ایسی بے وفائی اور بے حیائی کی اُمید نہیں رکھتا تھا۔ چوبیس گھنٹے کے سفر کے بعد وہ کراچی پہنچ گئے اور آگے پیچھے رکشوں میں سوار ہوکر

طے کرنے لگے۔ اگلا رکشا کراچی کے ایک شاندار اور بالا ہوٹل کے سامنے رُکا۔ جبران نے اپنے رکشے کو رُکنے کا اشارہ کیا۔

اس نے اندر جا کر دوسری منزل کی طرف انہیں بڑھتے دیکھ کر ایک کمرہ دوسری منزل پر حاصل کر لیا جو اتفاق سے اُسے اُن کے بالکل سامنے مل گیا۔ اس پر وہ بہت خوش ہوا کہ اُن پر نگاہ رکھنا آسان ہوگا۔

☆......☆

جب جبران کو یقین ہوگیا کہ نازلی اور وہ نوجوان سوگئے ہیں تو وہ اپنے مادّی جسم کے خول سے باہر نکلا اور آہستہ سے کیبن کا دروازہ کھول کر باہر آیا۔ راہ داری میں سوئے ہوئے نگراں کے پاس سے دبے پاؤں نکلا اور نیچے اُترنے والے زینے پر چلا گیا، بعد میں اُسے احساس ہوا کہ اُسے اپنے مثالی وجود کے ساتھ دبے پاؤں چلنے کی ضرورت نہیں۔ وہ کسی کو نظر آ سکتا ہے نہ اُس کے قدموں کی چاپ کوئی سن سکتا ہے۔ چناں چہ وہ بلا خوف وخطر زینے سے نیچے اُترا اور کچن میں پہنچا۔ وہاں ایک لمبی میز کے گرد باورچی اور بیرے کھانا کھا رہے تھے، اُن کے قریب ہی ایک چھوٹی سی میز پر مختلف سائز کے چاقو اور گوشت کاٹنے کی چھریاں رکھی ہوئی تھیں۔ جبران انہیں دیکھنے ہی لگا، لیکن پھر ٹھٹک کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے گوشت کاٹنے والی سب سے لمبی اور تیز دھار چھری کا انتخاب کیا، جس کے ایک ہی وار سے سر تن سے جدا کیا جا سکتا تھا۔ جبران نے آگے بڑھ کر اُسے اُٹھانا چاہا، لیکن دفعتاً اُسے خیال آیا کہ اگرچہ لوگ اُسے نہیں دیکھ سکتے تاہم اُن کی نظروں سے بچ کر چھری اُٹھانا مشکل ہے۔ وہ ابھی کوئی طریقہ سوچ ہی رہا تھا کہ اُن لوگوں میں سے کسی نے بھڑکتا ہوا لطیفہ سنایا جس پر سب لوگ ہنستے ہنستے ایک دوسرے پر جھکے اور جوں ہی سب کی نظریں نیچی ہوئیں، جبران نے چشم زدن میں چھری میز سے اُٹھالی اور وہاں سے لپک کر اوپر آیا۔ دروازے کے قریب بیٹھا ہوا محافظ نیند میں غافل تھا۔ اس وقت اچانک لوڈ شیڈنگ کے باعث لائٹ آف ہوگئی، اسی لمحے جبران نازلی کے کمرے میں داخل ہوگیا۔

جب وہ اندر چلا گیا تو جنریٹر کی لائٹ آن ہوگئی۔ وہ نازلی کے کمرے کے بند دروازے سے کسی بگولے کی مانند اندر گھس گیا تھا۔ چھری اس نے دروازے کی نچلی درز سے اندر دھکیل دی تھی۔ کمرے میں زیرو کا بلب جل رہا تھا، بستر پر صرف نوجوان کمبل اوڑھے سو رہا تھا۔ نازلی اُسے نگاہ دوڑانے پر کہیں نظر نہ آئی۔ جبران نے غصّے کے عالم میں چھری فرش سے اٹھائی اور نوجوان کی طرف بڑھنے لگا۔ اسی لمحے جنریٹر کو جھٹکا سا لگا اور پھر برقی رو کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ کمرے کی کھڑکی سے اندر آنے والی چاند کی روشنی بھی چاند کے بدلی میں چھپ جانے سے اندھیرے میں ڈوب گئی۔

جبران نے غضبناک کیفیت میں لمبی چھری اٹھائی اور ایک ہی وار میں اُس کا کام تمام کر دیا۔ اُس کے حلق سے چیخ نہ نکل سکی، البتہ خون فوارے کی طرح اُس کے حلق سے اُبل رہا تھا۔ وہ اس وقت فرط جوش سے بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اُس نے خون آلود چھری وہیں فرش پر پھینک دی اور کچھ دیر رُک کر اپنا سانس درست کیا، پھر وہ کمرے سے نکلنے کے لیے پلٹا اور اُس کا پاؤں کسی بھاری شے سے ٹکرا گیا، اسی لمحے جنریٹر کی لائٹ بحال ہوگئی اور چاند نے بھی بدلی کی اوٹ سے سر اُبھارا تو کمرہ روشنی سے جگمگا اُٹھا۔ جبران نے جھک کر غور سے دیکھا تو وہ حیران رہ گیا، کیوں کہ وہ......وہ اُس کا بال دار کھال کا سوٹ کیس تھا۔

''اوہ! غضب خدا کا۔'' وہ چلاّیا۔ ''غضب ہوگیا'' اسی لمحے کمرے کے باہر محافظ کے کرسی کھسکانے کی آواز آئی۔

''یہ......یہ......یہ تو میرا کمرہ تھا۔'' وہ بدحواسی میں چلاّیا۔

''یہ میں نے کیا کیا۔'' لائٹ آف ہوتے ہی میں دھوکا کھا گیا اور اپنے ہی کمرے میں داخل ہوگیا، پھر وہ صدمے سے نڈھال ہو کر بستر پر پڑے اپنے جسم کے پاس پہنچا اور گردن پر ہاتھ رکھ کر خون کے اُبلتے ہوئے فوارے کو روکنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔

☆......☆



سوکن

نفیسہ فضل

کراچی سے، ایک سہاگن سے چمٹی ہوئی سوکن کا پراسرار واقعہ

یہ غالباً 1939ء کا واقعہ ہے جو اکثر و بیشتر ہم اپنی امّی کی زبانی سنا کرتے تھے۔ مرحومہ امی جان اپنے کسی ملنے والے یا عزیزوں سے تذکرہ کر رہی ہوتی تھیں۔ اس وقت تو ہم بچے تھے، وہ بھی پہلے کے ناسمجھ بچے۔ آج کل کے بچے تو بہت ذہین ہیں، ہمیں تو بڑے ہونے پر بھی یہ بات نہ معلوم ہو سکی تھی۔

جب امی کی شادی ہوئی تو ان کی عمر 18 برس تھی اور والد مرحوم کی عمر 38 یا 40 سال کے لگ بھگ تھی اور اُن کے پہلے سے ہی چار بچے تھے۔ بیوی کو فوت ہوئے ابھی چھ ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ سب لوگوں کے کہنے پر والد صاحب نکاح ثانی کرنے پر راضی ہو گئے اور ہماری نانی کے کسی جاننے والے نے کسی طرح نانی کو راضی کر کے شادی پر آمادہ کر لیا۔

ہمارے چار ماموں اور چار خالائیں تھیں، لیکن ہماری امی ان سب بہن بھائیوں سے بڑی تھیں اور اللہ بخشے، وہ بہت محبت کرنے والی اور خدمت گزار خاتون تھیں۔ نانی مرحومہ ہمیشہ سے گھومنے پھرنے کی عادی تھیں، کبھی بمبئی تو کبھی شملہ اور اکثر وہ بزرگانِ دین کے مزارات پر حاضری دیتی تھیں اور ہماری امی چوں کہ ان سب میں گھر کی بڑی بیٹی تھیں، اس لیے وہی گھر بار اور چھوٹے بھائی بہنوں کو سنبھالتی تھیں۔ اسی وجہ سے والدہ مرحومہ صرف پانچویں کلاس تک ہی پڑھ سکی تھیں۔ نانی اماں ویسے بھی سخت مزاج تھیں ان کا یہ حال تھا کہ جو کہہ دیا سو وہ پتھر پر لکیر کے مصداق ہوتا تھا۔ ہمارے نانا ابو بھی ان کے آگے نہ بول سکتے تھے۔ وہ غصے اور مزاج کی اتنی تیز اور گرم تھیں کہ اگر کبھی گھر میں سبزی، گوشت ان کی مرضی کے مطابق نہ آتا تو گلی میں پھینک دیتیں، بس یوں جانیے کہ ان کے آگے کسی کی مجال نہیں تھی کہ پَر مار سکے۔

☆......☆

جب والدہ کا رشتہ آیا تو نانی نے بن ماں کے بچوں پر ترس کھاتے ہوئے اس رشتے پر ہاں کر دی۔ امی کے چچا تایا نے اس پر کافی اعتراضات کیے، مگر نانی نے تو ہاں کر ہی دی تھی۔ اس طرح امی بیاہ کر والد صاحب کے گھر دہلی آ گئیں، جہاں انہوں نے آتے ہی گھر اور بچوں کو پوری طرح سے سنبھال لیا۔ سسرال میں تو کوئی اور تھا نہیں، اس لیے والد صاحب بھی مطمئن ہو گئے، کیوں کہ اکثر دفتری امور کے سلسلے میں وہ گھر سے باہر ہی رہتے تھے۔

والدہ صاحبہ بچپن سے ہی صوم و صلوٰۃ کی پابند تھیں۔ گھر میں جس جگہ ان کی نماز کا تخت بچھا ہوا تھا، اس کے قریب ہی اکثر انہیں کسی عورت کا ہیولا نظر آتا تھا۔

والدہ نے جب اس بارے میں والد صاحب کو بتایا تو انہوں نے اسے ان کا وہم قرار دیا اور کہا کہ یہ محض تمہارا وہم ہی ہے۔''

لیکن پھر ایسا ہونے لگا کہ اکثر انہیں کمرے میں آتے جاتے کوئی عورت نظر آتی، جو امی مرحومہ کو اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے گھورتی ہوئی گزر جاتی۔

ایک دن امی جب اپنی تسبیح، جو کہ دیوار پر لگی کھونٹی پر ٹنگی ہوئی تھی، وہ اسے اتارنے لگیں تو ایک عورت جس نے سفید برقع ٹوپی والا پہن رکھا تھا، امی کو دھکا دے کر تیزی سے گزر گئی۔ امی اس اچانک حملے کے لیے ہرگز تیار نہ تھیں، وہ گرتے گرتے سنبھلیں اور انہوں نے پیچھے مڑ کر جو دیکھا تو وہ عورت غائب تھی۔

اکثر ایسا ہوتا کہ جب وہ عورت امی کو نظر آتی تھی تو اس وقت گھر میں کوئی بھی نہیں ہوتا تھا۔

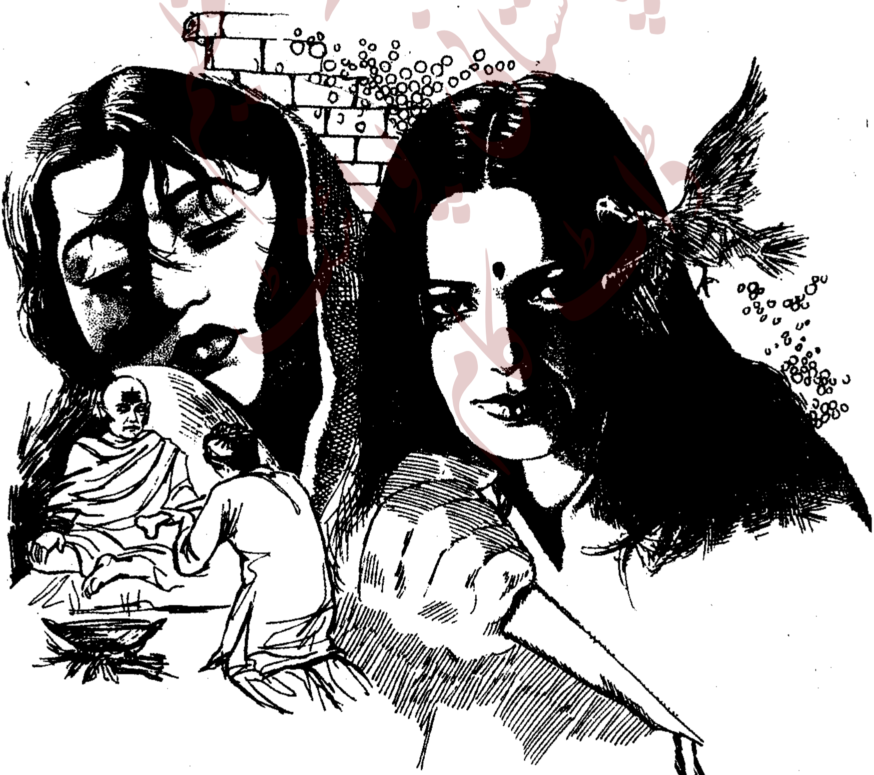
شام کو جب والد صاحب گھر آئے تو والدہ نے انہیں بتایا کہ آج میں نے بہت قریب سے اس عورت کو دیکھا ہے، پھر انہوں نے اس عورت کا حلیہ بتایا تو والد صاحب حیرت سے بولے۔

''ارے...... یہ تو میری مرحومہ بیوی کا حلیہ ہے۔''

جب کہ والدہ صاحبہ نے تو انہیں دیکھا ہی نہ تھا۔ اس واقعے کے بعد پھر کافی عرصے تک انہوں نے کچھ نہ دیکھا۔

☆......☆

ایک مرتبہ گرمیوں کے دن تھے۔ والد صاحب کسی کام سے گئے ہوئے تھے، وہ رات کو گیارہ بجے کے قریب گھر واپس آئے اور ابھی وہ کھانا کھا کر فارغ ہی ہوئے تھے کہ ان کے کسی دوست نے انہیں بلا لیا۔ بچے



سب سو چکے تھے اور صحن میں ان کی چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ والدہ صاحبہ بھی قریب ہی اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھیں، تب ہی والد صاحب واپس آ کر دروازے کو کنڈی لگا رہے تھے کہ والدہ صاحبہ کی دردناک چیخ سے پڑوسی بھی اکٹھے ہوگئے۔ والد صاحب سے پوچھنے لگے ’’کیا ہوا خاں صاحب؟‘‘

والد صاحب حیرانی سے ان کے چہرے کی طرف دیکھنے لگے تو انہوں نے کہا۔ ابھی ہم نے بھابی کی چیخ سنی ہے، تب والد صاحب حیران و پریشان اندر بھاگے، دیکھا تو والدہ پیر پکڑے درد کی شدت سے تڑپ رہی تھیں۔

امی مرحومہ نے بتایا کہ وہ سفید برقعے والی عورت ابھی ابھی میرے پاس آئی تھی اور اس نے میرے پیر کا انگوٹھا پکڑ کر بڑے زور سے کھینچا تھا، جس سے مجھے شدید تکلیف ہوئی ہے اور اب بھی میرے انگوٹھے سے درد ٹپک رہا ہے۔

صبح جب امی نے اٹھنا چاہا تو ان کے سیدھے پیر نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ ڈاکٹر کو دکھایا گیا تو اس نے کوئی مرہم لگانے کے لیے دیا اور پیر کی سکائی کرنے کے لیے کہا۔ نانی اماں کو بھی بلا لیا گیا تھا۔ انہوں نے امی کے انگوٹھے اور پیر پر مرہم لگایا اور سکائی کے لیے کوئلے سلگا کر انگیٹھی چارپائی کے نیچے رکھ دی، پھر وہ خالہ مرحومہ کو امی کے پاس چھوڑ کر واپس چلی گئیں۔ خالہ بھی گھر کے کام کاج میں مصروف ہوگئیں، ابھی انہیں کچھ ہی دیر گزری ہوگی کہ تب ہی انہیں کچھ جلنے کی بُو آئی۔ انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو انہیں بظاہر تو کچھ نظر نہ آیا، لیکن اچانک ہی جب وہ امی کے پاس سے گزریں تو انہیں امی کی چارپائی کے پاس دھواں سا اٹھتا ہوا نظر آیا جو کہ ان کے بستر میں آگ لگنے کی وجہ سے نکل رہا تھا۔ اور اماں اس بات سے بے خبر سکون سے سو رہی تھیں۔

خالہ نے جب یہ صورتِ حال دیکھی تو ایک دم سے شور مچا دیا، نانی کو بھی ان کے گھر سے واپس بلوا لیا گیا اور والد صاحب بھی اپنی تمام مصروفیات ترک کر کے فوری طور پر گھر آ گئے تھے، سب لوگ حیران و پریشان تھے کہ امی کی پوری ٹانگ جل گئی اور انہیں بالکل بھی محسوس نہیں ہوا۔

جب نانی اماں نے یہ حالت دیکھی تو انہوں نے دم درود کیا اور اباجی مرحوم سے کہا کہ فوراً تانگا منگواؤ، میں ابھی اور اسی وقت اسے حافظ صاحب کے پاس لے کر جاؤں گی۔‘‘

نانی کے حکم پر فوراً ہی تانگا منگوایا گیا اور نانی، امّی جان کو لے کر روانہ ہوگئیں، ساتھ ہی ابو بھی گئے۔ جب امی کو لے کر جا رہے تھے تو وہاں راستے میں ہی ایک ہندو جوگی کھڑا ہوا تھا۔ اس نے جب والدہ کو تانگے میں دیکھا تو نانی سے کہا کہ اس کو تم کہاں لے جا رہی ہو، ارے اس کو تو اس کی سوکن چمٹی ہوئی ہے، حالاں کہ اس وقت امی پردے میں تھیں اور صرف ان کے دوپٹے کا پلو نیچے کو لٹکا ہوا تھا، جسے دیکھ کر اس ہندو جوگی نے یہ بات کہی تھی۔

غرض یہ کہ نانی امی کو حافظ صاحب کے پاس لے گئیں۔ حافظ صاحب نے امی کو سامنے بٹھا کر پڑھائی کی اس کے بعد انہوں نے نانی کو بہت ڈانٹا، ساتھ ہی والد صاحب سے بھی انہوں نے کہا کہ میاں نصیر خان صاحب، آپ تو پختہ عمر کے آدمی ہیں، آپ کو تمام حالات کا علم ہے، پھر بھی آپ نے اپنی مرحومہ بیوی کی چھ ماہی کی فاتحہ بھی نہیں کرائی ہے اور دوسرا نکاح کر لیا ہے۔ خیر ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا ہے، یہ تو اللہ کا بڑا کرم ہو گیا ہے آپ پر، لہٰذا آپ فوراً گھر میں فاتحہ درود کرائیں، حافظ صاحب نے امی کا 41 دن کا علاج بتایا۔ حافظ صاحب اپنے عمل کے لحاظ سے اتارے وغیرہ میں بہت مانے ہوئے تھے۔ آج بھی ڈرگ روڈ اسٹیشن کے پاس ان کا چھوٹا سا مزار ہے اور ہزاروں عقیدت مند آ کر اپنی عقیدت کا اظہار فاتحہ خوانی اور پھولوں کی چادر چڑھا کر کرتے ہیں۔

امی نے حافظ صاحب کے کہنے کے مطابق فاتحہ خوانی کی اور غرباء میں کھانا وغیرہ تقسیم کیا۔ اس کے بعد کبھی امی کو ان کی سوکن نظر نہیں آئیں، اس واقعے کے بعد امی تاحیات جب تک وہ زندہ رہیں، اپنے تمام مرحومین کے لیے فاتحہ خوانی اور لنگر کا انتظام کرتی رہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ پاک امی کی مغفرت فرمائے اور انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

☆......☆

دوشیزہ ڈائجسٹ، فروری 2014ء سال گرہ نمبر-2 کی ایک جھلک



☆ نگہت سیما کا دل گداز ناولٹ ''فٹنس کلب'' سباس گل کا ''میاں جی'' اور نشاط خان کے قلم کا جادو ''رُودکوہی'' کا پانچواں حصہ۔

☆ بینا عالیہ کا سلسلہ وار ناول ''تیرے عشق نچایا'' اور عقیلہ حق کا ''آئینہ، عکس اور سمندر'' نئی دلچسپ اقساط کے ساتھ۔

☆ دُردانہ نوشین خان، دلشاد نسیم، شمیم فضلِ خالق، ایڈیسن ادریس مسیح، فرحت صدیقی، گل، سنبل، فرح اسلم قریشی، اسماء اعوان، عقیلہ حق، نزہت جبیں ضیاء، احمد سجاد بابر، تحسین انجم انصاری، غزالہ جلیل راؤ اور حمیرا خان کے یادگار افسانے۔

☆ انتخابِ خاص میں عظمت عزمی کا شاہکار ''سوا نیزہ''

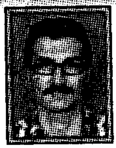
☆ آج کی نامور اداکارہ ''عروسہ صدیقی'' سے سوال ہیں۔

☆ رنگ کائنات میں قدسیہ ندیم لالی کی مسکراتی تحریر ''نان ہے تو جہان ہے''

☆ اس کے علاوہ وہ تمام سلسلے جن کا آپ کو انتظار رہتا ہے۔

☆ تو پھر دیر کس بات کی ہے۔ آج ہی دوشیزہ کا سال گرہ نمبر-2 گھر لے آیئے۔





تیسری منزل

عادل حسین

ایک خالی گھر کے جان لیوا آسیب نے ایک جان لے لی، حالانکہ وہاں......

بعض اوقات کچھ واقعات ہماری زندگیوں میں اس طرح سے اپنے نقش چھوڑ جاتے ہیں جو تا زندگی بھلائے نہیں جاتے۔ یہ واقعہ بھی ایسا ہی ہے جس نے ہماری زندگی میں ایک نہ پُر ہونے والا خلا چھوڑ دیا ہے۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ہمارے مالک مکان نے ہمیں فوری گھر خالی کرنے کا الٹی میٹم دے دیا تھا۔

مہینے بھر کی تلاش کے بعد جو گھر ہمیں کرائے پر ملا تو وہاں کے مقامی لوگ کہنے لگے کہ اس گھر کی تیسری منزل پر تو بہت بھاری اثر ہے۔ مدت سے خالی ہونے کے سبب اس میں آسیب ہو گیا ہے۔ مجبوری کے اس عالم میں کہ جب مالک مکان نے گھر خالی کرنے کا کہہ دیا تھا، یہ مکان ملا بھی تو لوگوں کی باتوں نے نئی مصیبت کھڑی کردی۔ نیا مکان میری فیملی کے حساب سے بہت بہتر تھا، لیکن لوگوں کی زبانی سُن رکھا تھا کہ جس جگہ یہ مکان ہے وہاں آج سے بیس سال پہلے صرف اندھیرے کا راج تھا، بلکہ اس پورے حصّے میں نہ کوئی بندہ تھا اور نہ بندے کی ذات۔ بس اُس جگہ جھاڑیاں ہی جھاڑیاں آباد تھیں۔ کہتے ہیں جہاں آدم زاد نہ ہوں وہاں جن بھوت اپنا بسیرا کر لیتے ہیں۔

ہر ایک کی زبان پر ایک ہی بات تھی، کہ اِس مقام سے لوگ گزرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے اور مغرب کے بعد تو اس جگہ سے گزرنے کا تصور بھی محال تھا۔ بتانے والوں نے بتایا کہ کچھ لوگوں نے یہاں پر سَر کٹا بھی دیکھا ہے۔ جو رات کو اپنا سَر ہاتھ میں لے کر گھوم رہا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی چڑیلیں بھی لمبے لمبے دانت نکالے لوگوں کا پیچھا کرتی ہیں۔

جب سے یہ نیا مکان لیا ہے، میرے ذہن میں سَر کٹے اور چڑیلیں آ کر بس گئی ہیں، خوف مستقل میرے وجود میں بیٹھ گیا ہے۔ چلتے چلتے اپنے سائے کو دیکھ کر بھی گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔ جب جب لوگوں کی بتائی ہوئی باتیں یاد آتی ہیں تو خوف کی کپکپی جسم پر طاری ہو جاتی ہے۔ حالت ایسی ہو جاتی ہے کہ کاٹو تو لہو نہیں۔

گھر میں شفٹ ہونے سے پہلے ہم نے قرآن خوانی کروالی، تاکہ پریشانیوں سے محفوظ رہیں۔ یہ مکان تین منزلہ عمارت تھی، جس کے دو فلور پہلے سے آباد تھے اور ہمارے حصّے میں یہ آخری فلور آیا تھا۔

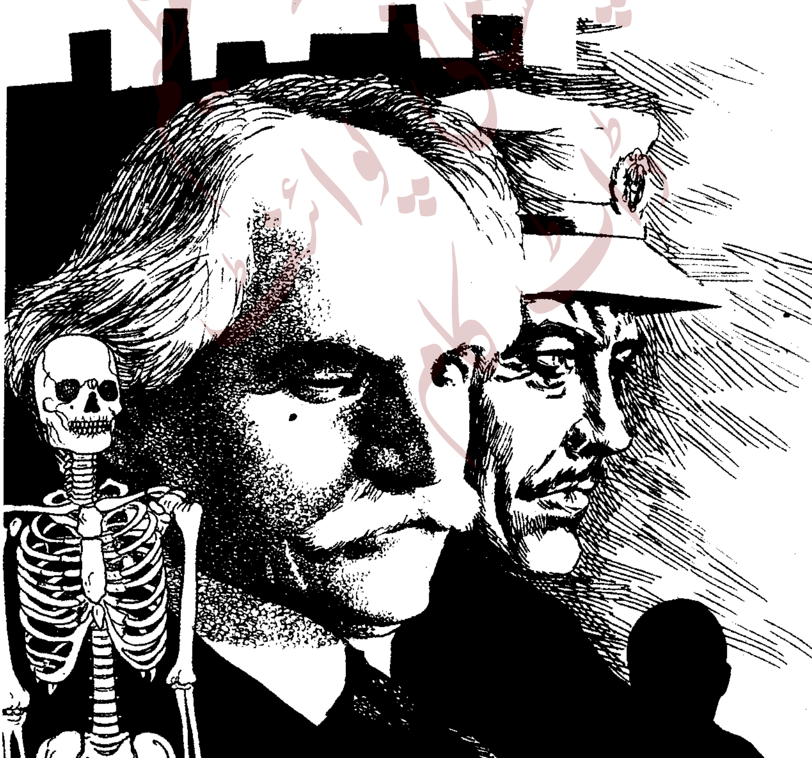
سامان لے کر جب اپنے نئے گھر کے دروازے

پر پہنچے تو سامان اُتارتے ہوئے نئے پڑوسی آ گئے۔ آئے کیا پریشانیوں میں مزید اضافہ کر گئے۔ کہنے لگے کہ ''بھائی کم از کم آس پڑوس کے لوگوں سے پوچھ تو لیتے مکان لینے سے پہلے۔ آپ کو معلوم ہے کہ پُرانے کرائے دار یہاں سے کیوں گئے ہیں اور میری خاموشی پر خود ہی بولنے لگی۔ بے چاری اکیلی رہتی تھی وہ۔ شوہر پچھلے کئی برسوں سے سعودیہ میں ملازم تھا، اولاد کوئی تھی نہیں، تین مہینے بھی نہ ٹکنے دیا اِس گھر کے بھوتوں نے۔ ظاہر سی بات ہے جب بھوت کی جگہ پر قبضہ کرو گے تو وہ تنگ تو کرے گا نا؟ پہلے خود بیمار پڑی، ایسی بیمار کہ میاں کو چھٹیاں لے کر پاکستان آنا پڑا اور اُس بے چارے کو بھی تو اُس کی موت لائی تھی۔ آنا تو بہانہ تھا بس، بے چارا دو ہفتوں ہی میں اللہ کو پیارا ہوگیا۔ عورت کے بھائی فوراً اُس کو یہاں سے لے گئے۔ دو سال ہوگئے مگر آج تک کسی کی ہمت نہ ہوئی جو اس گھر میں آباد ہو سکے۔ آپ جانے کیسے پاگل ہیں جو بنا کسی سے مشورہ لیے یہ گھر لے بیٹھے۔ اللہ پاک آپ کے حق میں بہتر کرے بھائی، ہمارے لائق کوئی کام ہو تو ضرور بتایئے گا۔''

یہ کہہ کر وہ تو چلے گئے، مگر میرے دل میں خوف کو مزید ہَوا دے گئے، ڈر نے میرے دِل میں ایسے قدم جما لیے جیسے میری محبوبہ ہو، سامان کے ساتھ ساتھ خوف بھی ہمارے ساتھ ہی گھر آ گیا۔ یہ خوف میری پوری فیملی کے دِلوں پر قبضہ کر چکا تھا۔

☆......☆

گھر کا دروازہ جونہی کھولا تو کالے رنگ کی بلی خوف ناک چیخ مارتی ہوئی ہمارے اُوپر لپکی، گھبراہٹ میں ہاتھ سے ٹی وی چھوٹ گیا اور زور دار دھماکے سے



اسکرین کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے۔ یہ پہلا نقصان تھا جو گھر کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی ہم نے اُٹھایا تھا۔ بلّی شاید روشن دان سے داخل ہوگئی تھی۔ سامان کو گھر میں سیٹ کرنے میں یوں دِن بیت گیا۔ چار کمروں پر محیط اِس مکان کا ایک بیڈروم شادی شدہ بھائی کے حصّے میں آیا اور دوسرے میں مجھ سمیت دو بھائیوں نے قبضہ کرلیا۔ امی ابو اور بہن ڈرائنگ روم اور ٹی وی لاؤنج میں سونے کی نیت سے لیٹ گئے، لیکن سب کی آنکھیں خوف سے بند ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔ خوف سب کے ساتھ کمبل میں گھسا ہوا تھا کہ کب کوئی بھوت یا چڑیل آئے گی اور ہمارے سینے سے دِل نکال کرلے جائے گی، نیند کسی کو بھی نہیں آرہی تھی۔

رات کے ڈھائی بجے اچانک ہمارے کمرے سے گھڑ گھڑ کرتی خوف ناک آواز آنے لگی تو ہم تینوں بھائی چیخیں مار کر دوسرے کمرے کی طرف دوڑے۔ چیخیں اتنی تیز تھیں کہ باقی سب جو کہ خود خوف میں ڈوبے جاگ رہے تھے اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ ہم تینوں بھائیوں کے چہروں کا رنگ اُڑا ہُوا تھا۔ سب سے چھوٹا بھائی تو واقعی کانپ رہا تھا اور بات ہی کانپنے والی تھی، مجھے اُن پڑوسی کی باتیں یاد آنے لگیں جو سامان اُتارتے وقت ملے تھے۔

ٹوائلٹ کمروں کے دوسری طرف تھے، مگر کسی کی ہمت نہیں تھی کہ کمرے پھلانگ کر وہاں جائے کہ کہیں کوئی بھوت، چڑیل یا سَر کٹا ہمارے انتظار میں بیٹھا ہو۔

پوری رات گھر کے سبھی لوگوں نے خوف کے عالم میں دُعاؤں کا وِرد کرتے ہوئے گزاری۔ صبح ہوتے ہی سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ ایک مولوی صاحب سے رابطہ کیا اور گھر کی ساری کیفیت انہیں بتائی۔ مولوی صاحب نے پانی پر دم کرکے اور چار عدد کیلیں مجھے دے دیں۔ اُن کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق کیلیں گھر کے چاروں کونوں میں ٹھونک دیں اور پانی کا چھڑکاؤ دیواروں پر کردیا۔

یہ سب چیزیں لے کر جب میں گھر پہنچا تھا تو دادا جان بھی گھر سے واپس آچکے تھے۔ پھوپا انہیں چھوڑنے آئی تھیں۔ کیلیں لگانے کے بعد دِل مطمئن ہوگیا کہ انشاء اللہ اب سب ٹھیک ہوجائے گا۔ اسی امید کے سہارے دِن تو گزارا، لیکن رات جب آئی تو خوف کو ساتھ لے کر آئی۔ اُس رات بھی پچھلی رات جیسا ہی ہوا۔ وہی رات کے ڈھائی پونے تین بجے کا ٹائم، وہی عجیب گھڑ گھڑاہٹ والی آوازیں۔ وہی ہماری چیخیں اور وہی جاگ کر اللہ اللہ کرنا۔

اگلے دن مولوی صاحب سے پھر رابطہ کیا تو کہنے لگے کہ ''بھائی اثر رفتہ رفتہ ہی ختم ہوگا۔ اللہ کے کلام میں بڑی طاقت ہے آپ حوصلہ رکھیں۔'' گھر واپس لوٹا تو سب اِسی مسئلے پر گفتگو کررہے تھے اور سب کی ایک ہی رائے تھی کہ رات کو آنے والی آوازیں مخصوص وقت پر ایک ہی کمرے سے آتی ہیں تو اگر جن بھوت ہیں تو کیا صرف ایک ہی کمرے میں ہیں، کہہ تو سب ٹھیک رہے تھے لیکن وہ کمرہ بھی تو گھر کا حصّہ تھا اور گھر میں رہتے ہوئے کسی مخصوص کمرے سے بچنا بھی ناممکن عمل تھا۔ اِس تیسری رات ہم نے وہ کمرہ خالی چھوڑ دیا، ہم تینوں بھائی ٹی وی لاؤنج میں جاگ کر اُس مخصوص وقت کا انتظار کرنے لگے۔

ابھی وہ آواز گونہ شروع ہوئی تھی کہ دسمبر کی اِس رات زبردست گرج چمک کے ساتھ بارش ہونے لگی، زینہ جہاں آکر ختم ہوتا تھا وہاں سے چھت کا کچھ حصّہ اوپر جانے کے لیے کھلا ہوا تھا۔ بارش شروع ہوتے ہی بجلی بھی غائب ہوگئی، ایسے میں جب بادل گرج رہے تھے تو آسمانی بجلی کی گرج مزید خوف پیدا کرنے لگی۔ آسمانی بجلی جب زور سے گرجتی تو ایک سفید سی لہر آسمان سے نکل کر سیدھی میرے گھر کے اسی کھلے ہوئے حصّے سے نیچے تک آجاتی۔ عجیب خوف ہی خوف تھا، سب کے دِل بیٹھے جارہے تھے۔ کچھ دیر میں بارش رُکی تو بجلی بھی آگئی اور پھر وہ وقت بھی آگیا جس کے انتظار میں ہم جاگ رہے تھے، وہی دو دن سے چلنے والے منظر دوبارہ آگئے، وہی خوفناک گھڑ گھڑاہٹ، وہی چیخیں اور وہی دُعاؤں کا وِرد۔ ہم سب ایک کمرے میں جمع ہوکر رات بھر اللہ کو یاد کرتے رہے۔

صبح کا سورج طلوع ہوا تو جان میں تھوڑی جان آئی، دادا جان بڑھاپے میں بھی فجر کی نماز باقاعدگی سے جماعت کے ساتھ اُدا کرتے تھے تو آج ہمیں بھی اللہ یاد آ گیا۔ سوچا کہ دادا کے ساتھ ہی نماز اُدا کریں اور خدا سے دعا کریں کہ مالک اِس عذاب سے ہماری حفاظت فرما۔

جونہی گھر کا مین گیٹ کھولا تو باہر ایک جنگلی کبوتر مُردہ حالت میں پڑا ہوا تھا۔ خون کی تازگی بتا رہی تھی کہ کسی نے ابھی پھینکا ہے۔ دِل میں خیال آیا کہ یہ کبوتر کس نے مار کر یہاں ڈالا ہے۔

نماز میں بھی جنگلی کبوتر نگاہوں کے سامنے آتا رہا، دھیان میں جن بھوت آ کر بسے ہوئے تھے تو اللہ کو یاد کرتے ہوئے بھی وہ میرے ساتھ ساتھ رہے۔

چوتھی رات دادا جان نے فیصلہ صادر فرمادیا کہ آج کی رات میں اکیلا اس کمرے میں لیٹوں گا۔ گھر والوں کے لاکھ منع کرنے اور سمجھانے کے باوجود دادا نے کسی کی نہ سنی، مجھے انجانا سا خوف ستانے لگا کہ دادا دِل کے مریض ہیں، اللہ نہ کرے میرے منہ میں خاک۔ ان کے ساتھ کوئی حادثہ نہ ہوجائے۔

رات کے ڈھائی پونے تین بجے دادا جان نے گھڑ گھڑ گھڑ کرتی آواز کے ساتھ ہی ایک خوف ناک چیخ ماری اور یہ چیخ دادا کی آخری چیخ ثابت ہوگئی۔ دادا کے دِل نے کام کرنا چھوڑ دیا، ہارٹ اٹیک اتنا شدید تھا کہ وہ جانبر نہ ہوسکے۔ گھر میں کہرام بپا ہوگیا۔ دادا کی ضد نے ان کی جان لے لی تھی۔ مگر اب کیا بھی کیا جاسکتا تھا۔

☆......☆

سوئم کے بعد طے یہ پایا کہ فوری طور پر گھر خالی کر کے عارضی طور پر تایا کے گھر رَہا جائے۔

سامان نکالتے ہوئے ہمیں اُس کمرے سے شدید خوف آ رہا تھا۔ گھر میں تب تک رہے جب تک آیت الکرسی کا ورد کرتے رہے۔ سامان ٹرک میں لوڈ کرنے کے بعد ہم نے مالک مکان کے کہنے کے مطابق گھر کی چابیاں اپنے سے نیچے والے کرائے دار کو دینے کے لیے اُن کا گیٹ کھٹکھٹایا تو گھر کے سربراہ گیٹ پر آئے۔

دادا کے انتقال پر افسوس کیا اور اچانک گھر چھوڑنے کی وجہ دریافت کی۔ ہم نے پوری کہانی الف سے ےتک اُن کو وہیں کھڑے کھڑے سُنا ڈالی۔

وہ پوچھنے لگے کہ آواز کس کمرے سے آتی تھی؟ جب میں نے اُنہیں کمرا بتایا تو کہنے لگے کہ اِس کے نیچے تو میرا کمرا ہے، پھر اچانک اپنے سر پر زور سے ہاتھ مارا اور ہمیں ساتھ لے کر ہمارے حصّے کی طرف آگئے۔ گھر کھول کے اندر داخل ہوئے اور کہنے لگے۔

”آواز اِسی کمرے سے ڈھائی تین کے درمیان آتی ہے نا؟“ ہم نے ہاں میں سَر ہلایا تو کہنے لگے کہ ”آؤ میں تمہیں یہ آواز ابھی سُنا دیتا ہوں۔“

اور انہوں نے اپنے بیٹے کو آواز دے کر کہا کہ ”میرا کمرہ کھولو اور پنکھا کھول دینا۔“

بچے نے جونہی پنکھا چلایا تو وہی گھڑ گھڑاہٹ کی آواز آنے لگی جو کہ دو منٹ بعد ختم ہوگئی۔

کہنے لگے۔ ”بیٹا میں روز کام سے دو بجے کے بعد واپس آتا ہوں۔ طبیعت کا سخت ہوں اور گندگی پسند نہیں، تو میرا کمرا بند رہتا ہے۔ رات کو جب کمرے میں جاتا ہوں تو پنکھا چلنے پر یہ آواز پیدا ہوتی ہے اور یہ عجیب سی آواز اِس لیے ہے کہ پنکھے کو گھمانے والے بیرنگ خراب ہوگئے ہیں۔ آج چھٹی اِسی لیے کی تھی کہ پنکھے ٹھیک کروالوں اور رہی بات آپ سے پہلے کرائے دار کی تو اُن کو تو ہارٹ اٹیک ہوگیا تھا، اُن کی باتیں سُننے کے بعد خوف تو ختم ہوگیا لیکن ہمارے دادا ہم سے ہمیشہ کے لیے جُدا ہوگئے۔

مالک مکان کے بیرونِ ملک بسنے کی خبر سن کر ہم نے جیسے تیسے وہ مکان آدھی پیمنٹ دے کر خرید لیا تھا، ہم اِس گھر میں کرائے دار بن کر سات سال رہے اور مکان کی پوری پیمنٹ ادا کیے ہوئے ہمیں چار سال ہو چکے ہیں۔ آج وہ ہمارا اپنا مکان ہے۔

کبھی کبھی اِس مکان کے ابتدائی دنوں کی یاد آتی ہے تو دادا جان شدّت سے یاد آتے ہیں مگر!! جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا، تیسری منزل کا بھوت ہمارے دادا جان کو کھا گیا تھا۔

☆......☆





اپسرا ایا ناگن

محمد سلیم اختر

راولپنڈی سے، ایک یادگار ناگ بیتی، جسے محمد سلیم اختر کے جادوئی قلم نے زندگی دی

دسمبر 1971ء کی پاک بھارت کی ”رسوائی کے بعد“ معاف کرنا، میں اسے جنگ کہتے ہوئے شرماتا ہوں، کیوں کہ وہ مکار سیاستدانوں میں ہوسِ اقتدار کی جنگ تھی...... پاکستان کو کمزور اور سرنگوں کرنے...... اور فوج کو ذلیل کرنے کی جنگ تھی۔ غدّاروں کی چالیں کامیاب ہوگئیں۔ قوم کا سر ندامت سے جھک گیا...... اس پر ہر آنکھ پُرنم تھی، مگر میرا دِل و دماغ ان جذبات سے عاری تھا۔ یہ اندازِ فکر مختلف تھا، کیوں کہ مجھے اپنے بازوؤں کی قوت پر مان تھا۔ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ میرے ہاتھ اپنوں نے باندھے اور غیروں نے میری پیٹھ میں چھرا گھونپا۔ اس لیے میں شرمندہ نہیں ہوں، بلکہ اس بڑھاپے میں بھی میرا دِل جوشِ انتقام سے جلتا ہے کہ اگر میں کھلے ہاتھوں دشمن سے شکست کھا جاتا تو خدا کی قسم میں اس دشمن کو سینے سے لگالیتا، کیوں کہ بہادر ہی بہادروں کی قدر کرتے ہیں، مگر ہمارا دشمن بزدل تھا۔ اسی لیے میں اس سے نفرت کرتا ہوں...... اس وقت یہ بھی کہا گیا کہ اس شکست سے پاکستانی فوجی سپاہیوں کا مورال گر گیا ہے، مگر وہ سب غلط فہمیاں تھیں...... میں اب بھی ریٹائرڈ پاکستانی فوجی ہونے پر فخر محسوس کرتا ہوں......

ہم دسمبر 1971ء کے واقعے کے بعد سرحد پر حالتِ جنگ میں تھے۔ دِن رات موریچوں میں ڈٹے رہنے کی وجہ سے زندگی کافی بور ہو چکی تھی۔ آخر خدا خدا کرکے ہائی کمان کے دِل میں رحم آیا اور ہماری یونٹ کو جولائی کے ابتدائی ہفتے میں ریسٹ پوزیشن میں لایا گیا، جس جگہ ہم نے کیمپ لگایا۔ وہ آموں کا ایک دقیانوسی سا باغ تھا۔ ہر درخت اپنی سوکھی ہوئی ٹہنیوں سے اپنی عمر رسیدگی کا ثبوت پیش کر رہا تھا۔ جب ہم نے کیمپ کو ٹھیک کرنے کے لیے کھدائی شروع کی تو زمین سے انسانی ڈھانچے، ہڈیاں اور کھوپڑیاں نکلنے لگیں۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے یہ کوئی پرانا قبرستان ہے اور یہاں کئی انسانی نسلیں مدفون ہیں۔ ہم نے ایک مربع میل تک اِدھر اُدھر زمین کو کھود کر دیکھا۔ مگر، کہیں بھی مٹی انسانی باقیات سے پاک نہ ملی...... آخر مجبور ہو کر وہیں کیمپ لگالیا، کیوں کہ اِرد گرد کافی دور تک کہیں بھی ایسے سایہ دار درخت نہیں تھے، جہاں ہم جلتے سورج کے نیچے سر چھپا سکیں۔ اس لیے ہم نے تھوڑی سی کھدائی کرکے وہیں کیمپ لگالیا۔ بعض جوان قبرستان کی بے حرمتی کی وجہ سے پریشان ہو رہے تھے، مگر فوج میں ایسی باتوں پر کم ہی دھیان دیا جاتا ہے۔ یہاں

ہمارا کام دین وایمان کے حکم کو بجالانا تھا، شرعی مسائل اور فوجی قانون میں تضاد ایک مجبوری ہوتا ہے۔

کھدائی کے دوران ایک محیرالعقول واقعہ رونما ہوا۔ چند نوجوان ایک مورچہ کھود رہے تھے کہ اچانک ایک جوان کی کھدال ایک انسانی کھوپڑی سے ٹکرائی۔ وہ مورچہ میری نگرانی میں کھودا جارہا تھا۔ جب میں نے ہڈی کے چٹخنے کی آوازسنی تو پلٹ کر دیکھا...... ایک سپاہی ممتاز ایک کھوپڑی کو کھدال سے کھینچ کر زمین سے باہر نکال رہا تھا......

اس نے کھوپڑی کو زمین پر لا پھینکا اور پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے...... ایک سیاہ ناگ جو تقریباً دو فٹ لمبا ہوگا، پھن پھیلائے کھوپڑی سے باہر نکلا...... ممتاز بے چارے کو اس نے کمر بھی سیدھی نہ کرنے دی اور اس کو ڈس لیا۔ اس کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ سب جوانوں نے سانپ سانپ کا شور مچایا، مگر سانپ وہاں نظر نہ آرہا تھا...... یہ واقعہ صرف پندرہ سیکنڈ میں وقوع پذیر ہوا اور میں نے ایک سیکنڈ بھی سانپ سے نظریں نہ ہٹائی تھیں، مگر وہ پھر بھی غائب ہوگیا۔ اسے غائب ہوتے یا یوں سمجھیں کہ ہوا میں تحلیل ہوتے صرف میں نے دیکھا تھا۔ ممتاز کو ڈس لینے کے بعد وہ فوراً ایک سیاہ لاٹھی میں بدل گیا، پھر لاٹھی کا حجم شش جہات میں پھیلنے لگا، حتیٰ کہ دو مربع میل میں اس کا ہالہ سا بن گیا، پھر وہ ہالہ بھی لطیف سے لطیف تر ہونے لگا اور پھر عام فضا اور اس میں کوئی فرق نہ رہا۔ یہ سب کچھ سیکنڈوں میں ہوا۔ میں اس سحر میں اس قدر کھو گیا کہ مجھے سامنے پڑی ممتاز کی اکڑی ہوئی لاش کا بھی احساس نہ رہا۔ ایک نوجوان نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تو میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ کہنے لگا۔

''کیا آپ نے کہیں سانپ کو جاتے ہوئے دیکھا ہے؟'' میں محویت سے نکل آیا۔ اِرد گرد نظر دوڑائی تو تقریباً یونٹ کے تمام جوان سانپ کی تلاش میں سرگرداں تھے اور کچھ ممتاز کی لاش کو حسرت بھری نظرں سے دیکھ رہے تھے۔ اس مجمع میں ایک جوان ایسا بھی تھا



جو اس منحوس کھوپڑی کو اٹھائے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس کو دیکھ کر حیرت سی ہونے لگی کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔

میں نے جو کچھ بھی دیکھا، اس کا ذکر کسی سے بھی نہ کیا، کیوں کہ مجھے خود اپنی عقل پر ہی شک ہونے لگا تھا۔ ممتاز کی موت کو قدرتی حادثہ قرار دے کر لاش اس کے وارثوں تک پہنچانے کا بندوبست ہونے لگا اور میں اس واقعے کو دماغ سے نکالنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ دِن بھر ہم ممتاز کی موت کا غم دِل میں چھپائے مورچے کھودتے رہے، مگر شام کو طوفان بادوباراں نے ہماری دِن بھر کی محنت پر پانی پھیر دیا۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنا شدید طوفان نہیں دیکھا۔ شام ڈھل گئی، رات آ گئی مگر طوفان میں کمی نہ آئی۔ اندھیرا اس قدر گہرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ ہوا اس قدر تیز تھی کہ دیوقامت درختوں کے بڑے بڑے ٹہنے ٹوٹ ٹوٹ کر ہوا کی خوفناک چیخوں میں اضافہ کر رہے تھے۔ جب بجلی چمکتی تو پرانے کھنڈرات ایسے منہ کھولے نظر آتے، جیسے ان میں ہزاروں بدروحیں قید ہوں اور اب قدرت کے غیر مرئی ہاتھ نے ناگہاں انہیں آزاد کر دیا ہو۔ تیز ہوا کے ساتھ بارش بھی اس قدر طوفانی تھی، جیسے قدرت نے آسمان کے تمام دروازے کھول دیے ہوں۔ ہمارے فوجی ٹرک میں پانی ہر سمت سے اندر آ رہا تھا اور ہمارے بستر اور وردیاں سب بھیگ گئی تھیں۔ جب بارش سے بچاؤ کی کوئی صورت نہ رہی تو ہم تھک ہار کر گاڑی کی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ گاڑی لحظہ بہ لحظہ پانی میں ڈوب رہی تھی، کیوں کہ لڑائی کے دوران فوجی گاڑیوں کو گڑھا کھود کر دبا جاتا ہے، تاکہ دشمن کی بمباری سے گاڑی کے انجن اور پہیوں کو نقصان نہ پہنچے۔ ہماری گاڑی ضرورت سے زیادہ زمین میں دھنسی ہوئی تھی۔ ہم چار جوان تھے۔ ہمارے پاس صرف وائرلیس کا سامان تھا اور ہمارا مشن ڈپو کی تمام یونٹوں کے ساتھ رابطہ قائم رکھنا تھا۔ اشرف جو وائرلیس آپریٹر تھا...... مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

''استاد جی۔ کیا طوفانِ نوح کے وقت ایسی بارش ہوئی تھی؟''

میں نے کہا۔ ''بھئی میں اس زمانے میں موجود نہ تھا، مگر کتابوں میں پڑھا ہے کہ شدید بارش ہوئی تھی۔ خدا نے فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ آسمان کے تمام دروازے کھول دو اور اہلِ زمین پر خوب پانی برساؤ۔ زمین کو حکم دیا کہ تمہارے اندر جو پانی ہے اس کو نکال کر باہر پھینک دو۔ خدا کے حکم سے شدید بارش برسنے لگی اور سمندر کا پانی زمین پر چڑھ دوڑا، حتیٰ کہ آسمان اور زمین کا پانی مل کر تمام خشکی پر چھا گیا اور خطۂ ارض سارے کا سارا زیرِ آب آ گیا۔''

میرا یہ وعظ سن کر اشرف نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''استاد جی! اگر آج بھی ایسا ہی ہو گیا تو پھر ہم کہاں جائیں گے؟''

ڈرائیور اسلم نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''میں گاڑی چلا کر بھاگ جاؤں گا، گھبرانے کی ضرورت نہیں۔''

مجھے اس کی بات پر بے ساختہ ہنسی آ گئی، مگر ہنسی کے ساتھ میرے ذہن میں قرآن مجید کی ان آیات کا ترجمہ آ گیا جن کا مطلب یوں ہے۔

''آپ بھاگ کر کہاں جائیں گے، زمین کے کنارے بہت وسیع ہیں، تم لوگ ان کناروں سے نہیں نکل سکتے اور نہ آسماں کو چھو سکتے ہو۔''

اور واقعی ہم زمین کے کناروں سے نکل کر اپنی حیات قائم نہیں رکھ سکتے۔ میرا دماغ ابھی انہیں بھول بھلیوں میں الجھا ہوا تھا کہ بجلی چمکی اور آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ بادل جو گرجا تو اس کی آواز صور اسرافیل سے کم نہ تھی۔ چند لمحوں کے لیے ہماری سماعت، گویائی اور بصیرت سلب ہو گئی۔ جب قدرت نے ہمارے لرزتے ہوئے جسموں پر رحم کھا کر یہ چیزیں واپس دیں تو مارے خوف کے ہمارا خون خشک ہو گیا۔ ہمارے کیمپ میں ایک بڑا آتشیں گولہ رقص کر رہا تھا۔ وہ ایسے لگتا تھا جیسے کسی دیوتا کی روح جوشِ انتقام میں اپنا شکار تلاش کر رہی ہے۔ ہم سب کی آنکھیں خوف کے مارے پتھرا گئیں۔ شاید قدرت کو ابھی ہمارا جینا منظور تھا۔ اس لیے وہ جہنمی شعلہ اٹھکیلیاں کرتا ہوا ہم سے دُور ہٹنے لگا، پھر یک لخت لپک کر اس نے ایک آم کے درخت کو اپنی

پلیٹ میں لے لیا۔ بہت بڑا دھماکہ ہوا اور ہماری جان میں جان آئی۔ اس بوڑھے درخت نے اپنی جان دے کر ہمیں بچالیا تھا۔ اشرف نے سہمی ہوئی آواز میں کہا کہ ”ہمیں اس قبرستان کو اکھاڑنے کی سزا ضرور ملے گی۔“

آگ کا وہ شعلہ جسے ہم نے آسمانی بجلی سمجھا تھا، بعد کے واقعات نے اسے ایک بدروح سمجھنے پر مجبور کردیا۔ ہم نے خدا خدا کرکے رات کاٹی اور جب صبح ہوئی تو اِرد گرد پانی ہی پانی تھا۔ ہم اس پانی میں سے اپنی چیزیں ڈھونڈ رہے تھے کہ ہم نے ایک گڑھے میں انسانی لاش دیکھی۔ جب ہم نے غور سے اس کا معائنہ کیا تو وہ ہمارے ہی یونٹ کے ایک نوجوان کی لاش تھی۔ جب میں نے اسے غور سے دیکھا تو میری رگوں میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑ گئی، کیوں کہ وہ لاش اسی جوان کی تھی جس نے کل کھوپڑی اٹھائی ہوئی تھی اور جب میں نے اِردگرد کا گہری نظر سے مشاہدہ کیا تو وہ منحوس ہڈیوں کا سر وہیں پڑا ہوا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ دو سُوراخ، جو کسی زمانے میں آنکھیں ہوتی ہوں گی مجھے گھور رہے تھے......

مجھے یہ اعتراف ہے کہ اس وقت مجھ پر خوف کی شدت سے کپکپی طاری ہوگئی۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو اس کا یہی حال ہوتا۔ میں نے اپنی مردانگی کو للکارا، مگر وہ کاسۂ استخواں میرے لیے چیلنج بن گیا تھا۔ میں نے اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی...... دِل میں کہا کہ ایک نہ ایک دِن مرنا تو ہے، پھر کیوں نہ اس سربستہ راز کو فاش کردوں۔ یہ سوچتے ہوئے میں نے وہ کھوپڑی اُٹھالی۔ اس کو ہاتھوں میں اٹھاتے ہی تمام خوف میرے رگ و پے سے کافور ہوگیا اور مجھ پر ایک وجدانی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس کیفیت میں بجلی کی طرح یہ خیال آیا یہ کھوپڑی کسی حسین لڑکی کی بھی ہوسکتی ہے، پھر یہ شک یقین میں بدلنے لگا۔ حتیٰ کہ میرا یقین پختہ ہوگیا کہ سچ مچ کی لڑکی میرے سامنے کھڑی ہے۔ میں اس کے حسن اور خوب صورتی کی تعریف نہیں کرسکتا اور نہ مجھے ضرورت ہے کہ اس کے یاقوتی ہونٹوں، نرگسی آنکھوں اور قدوقامت پہ خامہ فرسائی کروں، مگر یہ ضرور کہوں گا کہ

اس کی آنکھوں میں ایک ایسی کشش تھی کہ ان میں ڈوب جانے کو جی چاہ رہا تھا...... میرے ساتھی لاش کے گرد ماتم کناں تھے اور مجھ پر عشق و مستی کے دورے پڑ رہے تھے، آخر کار میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر اس کھوپڑی کو ساتھیوں کی نظروں سے بچا کر ایک مخصوص جگہ دفن کر دیا، تا کہ میں کسی وقت تنہائی میں آ کر اس کو نکال کر اس سے لطف اندوز ہو سکوں...... جب میں نے اس کو اپنے آپ سے جُدا کیا تو تصوراتی دوشیزہ کا نشہ بھی کافور ہو گیا اور میں نے محسوس کیا کہ میں ایک عالم سے نکل کر دوسرے عالم میں داخل ہو گیا ہوں۔ اب مجھے اس حقیقی دنیا سے نفرت سی ہونے لگی تھی، جس میں چاروں طرف خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ جب میں نے دوبارہ لاش کو دیکھا تو خوف نے مزید اپنے پنجے میرے دِل میں گاڑ دیے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک دِن میری لاش بھی کسی گڑھے میں تیر رہی ہو۔

ڈاکٹر نے لاش کا معائنہ کرنے کے بعد کہا کہ یہ سیاہی سانپ کے ڈسنے سے مرا ہے۔ اس واقعے کو بھی یونٹ نے قدرتی حادثہ سمجھ کر کفن کا انتظام شروع کر دیا، مگر مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی میری رگوں سے خون چوس رہا ہے۔ میں سخت اذیت میں مبتلا تھا۔ جب مجھ میں قوتِ برداشت نہ رہی تو خیال آیا کہ مرنا تو ہے ہی...... یوں اذیت سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کے بجائے کیوں نہ ایک حسین تصوّر میں کھو کر مروں۔ ایسا حسین تصور مجھے کھوپڑی کو ہاتھوں میں لینے سے ہی ہو سکتا تھا۔ آخر جب مجھ میں ضبط کا یارا نہ رہا تو میں تقریباً رات کے دو بجے اپنے بستر سے اُٹھا اور جہاں وہ کھوپڑی دفن تھی اس طرف چل پڑا۔

چاند کی اس دن شاید بیس سے اوپر کی تاریخ تھی، کیوں کہ جب میں نے مشرق کی طرف دیکھا تو چاند افق پر پھیلی ہوئی بدلیوں میں ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ خون میں نہایا ہوا ہو۔ ہلکی ہلکی ہوا ایسے چل رہی تھی جیسے کسی کے غم میں سسکیاں بھر رہی ہو۔ مجھے کائنات کی ہر شے کسی کے غم میں نوحہ کناں نظر آ رہی تھی۔ میرے تن بدن میں بھی آگ لگی ہوئی تھی۔ جیسے میری رگوں میں کسی نے آگ بھر دی ہو۔ میں غیر ارادی طور پر اِس کھوپڑی کی طرف بڑھنے لگا۔ جب میں اس بوڑھے آم کے درخت کے پاس پہنچا۔ جہاں دِن کو میں نے وہ کھوپڑی دفن کی تھی۔ میں نے درخت کے نیچے ایک شبیہ دیکھی تو میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی لڑکی تھی جو مجھے اس کھوپڑی کو چھونے سے نظر آئی تھی۔ وہ میرے قریب آ گئی، اب اس کی آنکھوں میں دعوتِ گناہ کے بجائے بے پناہ پیار تھا...... وہ اس وقت بہت ہی خوب صورت نظر آ رہی تھی...... اُس کے سانسوں کی مہک جب میرے چہرے سے ٹکرائی تو میری تکلیف میں اضافہ ہو گیا اور مجھ پر بے خودی کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ وہ سیاہ لباس میں بہت ہی حسین لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اک جادو سا تھا جو مجھے مدہوش کر رہا تھا۔ اس کی جھیل جیسی آنکھوں میں بے پناہ پیار ٹھاٹھیں مار رہا تھا...... دِل نے چاہا کہ میں اسے بانہوں میں سمیٹ لوں...... میں بے اختیار ہو کر اس کی طرف بڑھا ہی تھا...... کہ اسی وقت میری ماں کی صورت میری آنکھوں میں آ گئی اور میں نے ان کی زبان سے نکلے ہوئے یہ الفاظ واضح طور پر سُنے کہ...... ''بیٹا میں نے تمہیں ایسی تربیت تو نہ دی تھی۔''

میرا سر ندامت سے جھک گیا اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے شرم کے مارے آنکھیں بند کر لیں...... چند لمحوں کے بعد میں نے آنکھیں کھولیں تو مارے خوف کے میرے جسم سے خون خشک ہو گیا، کیوں کہ میرے سامنے ایک سیاہ ناگ اپنا پھن پھیلائے میری طرف بڑھ رہا تھا...... شاید میری زندگی ابھی باقی تھی۔ اس لیے میری زبان پر قرآنی آیات کا ذکر آ گیا میں آیت الکرسی اور قرآن کریم کی آخری دو سورتیں تلاوت کرتا ہوا پیچھے ہٹنے لگا۔ میرے اس ورد ہی سے وہ سانپ وہی پر کھڑا رہ گیا۔ اس کے بعد مجھے یاد ہے کہ میں کانپتا اور ہانپتا ہوا آ کر بستر پر لیٹ گیا۔ اس کے بعد کی مجھے کچھ خبر نہ تھی۔ تیسرے دِن اسپتال میں میری آنکھ کھلی تو پتا چلا کہ میں پورے دو دن بے ہوش رہا ہوں۔ مجھے چھٹی دے کر گھر بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد ہماری یونٹ کی پوزیشن بھی ان سانپوں کی وجہ سے وہاں سے بدل دی گئی تھی۔

☆......☆



ناگ اور ناگن

الماس فاطمہ ارمان

کراچی سے، عقل وفہم کو کند کرتی، ایک ناگن کی کتھا

وہ سردیوں کی ایک سخت رات تھی۔ لوگ گھروں میں شام ڈھلتے ہی دبکے ہوئے تھے، تیز ہوائیں جسم کے خون کو جما رہی تھیں۔ اس وقت جیون داس کی حویلی میں ہُو کا عالم تھا، لیکن وقفے وقفے سے جیون کی پتنی جمنا کے سسکنے کی آواز آرہی تھی، جیسے وہ بہت ہی کرب میں مبتلا ہے۔ وہ واقعی بہت ہی کرب میں یہ رات بتارہی تھی۔



جیون اس بات سے بے نیاز حویلی سے الگ بیٹھک میں ناچ گانے کی محفل جمائے ہوئے تھا۔ ساتھ ہی شراب کا دور پورے زور سے چل رہا تھا۔ آج یہ محفل یہاں اس لیے سجی ہوئی تھی کہ جیون پندرہ سال کے بعد کسی نومولود بچے کی شکل دیکھنے والا تھا۔ اُس کی دوسری بیوی جمنا اُسے حویلی کا وارث دینے والی تھی، محفل شراب رقص ابھی جاری تھی کہ ایک چیخ ہوا کے دوش پر بلند ہوئی اور محل کے کمرے میں جمنا نے ایک بچے کو جنم دیا، جس کی شکل دیکھ کر دائی کے اوسان خطا ہو گئے۔ جوانی کی عمر سے بڑھاپے تک اتنی خوف ناک شکل اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

وہ کوئی بچہ نہیں تھا، بلکہ وہ تو پورا سانپ تھا، یعنی اُس کی شکل جیون داس کی طرح اور دھڑ سانپ کے جیسا تھا۔ دائی تو اسے دیکھتے ہی حویلی سے ننگے پیر اور بغیر دوپٹے کے بھاگ پڑی۔ بچے کی لال زبان سے سیاہ رنگ کا گندہ سا لیس نکل رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی، مگر جمنا اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی، ایسا لگ رہا تھا کہ آج اُس کی بہت بڑی جیت ہوئی ہے۔

یہ انڈیا کے ایک گاؤں جلالی کا واقعہ ہے۔ اس گاؤں میں ایک ٹھاکر جیون داس کا راج تھا، جو بہت ہی ظالم وجابر اور انتہائی شرابی کبابی حکمران تھا۔ یہ غریبوں پر بڑا ظلم کرتا تھا، خاص طور پر مسلمانوں پر۔ عیش وعشرت کے لیے اُس کے پاس سب کچھ تھا، مگر وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھا۔ گوپی جو اُس کی پہلی بیوی تھی، اُس نے اپنا ہر طرح کا علاج کرایا، مگر وہ جیون کو اولاد یعنی تخت کا وارث نہ دے پائی تھی۔

جیون کو ہرن کے شکار کا بہت شوق تھا، وہ اپنے پالتو کتوں کے لیے ہرن کا شکار کر کے اُن کے آگے گوشت ڈال کر انہیں بھنبھوڑ کر کھاتے ہوئے دیکھ کر بہت خوش ہوتا تھا۔ ایک روز اُس نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شکار کا پروگرام بنایا۔ اس نے اپنے تمام دوستوں سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ شکار پر چلیں، لیکن ہر کسی نے بہانہ بنا کر منع کر دیا، کیوں کہ یہ سخت سردی کا موسم تھا اور اس موسم میں رات بھی جلد ہی ہو جاتی ہے۔ دوستوں کے منع کرنے پر وہ اکیلا ہی شکار کے لیے چل دیا، لیکن شکار اس کے ہاتھ نہ آیا، پھر اسی مصروفیت میں اُسے پتا بھی نہ چلا کہ سورج غروب ہو گیا ہے اور جنگل میں اندھیرا چھا چکا ہے۔ سخت تاریکی کے باعث وہ گاؤں کی جانب جانے والا راستہ بھٹک گیا تو اُس نے اپنے گھوڑے کو ایک درخت کے ساتھ باندھا اور یہ سوچ کر آگے کی طرف پیدل چلنے لگا کہ شاید کوئی ایسی جگہ مل جائے، جہاں وہ رات گزار سکے۔ ابھی وہ تھوڑی دور ہی چلا تھا کہ اُسے ایک مقام پر روشنی سی نظر آئی۔ قریب جانے پر اسے پتا چلا کہ یہ ایک ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی ہے۔ وہ بے دھڑک اس کے اندر داخل ہو گیا، وہاں اُس نے دیکھا کہ ایک بے انتہا خوب صورت لڑکی ایک کھٹیا پر سو رہی ہے، اُس کے بال اتنے بڑھے ہوئے تھے کہ کھٹیا کے سرہانے سے نیچے لٹکے ہوئے تھے۔ چہرہ تو چندے آفتاب چندے ماہتاب تھا۔ اس وقت وہ سکون کی بہت گہری نیند سو رہی تھی۔ اسے دیکھ کر جیون کے پاؤں جیسے زمین پر ہی جم گئے۔ اس سے پہلے اُس نے اتنی حسین عورت نہیں دیکھی تھی، وہ حیران تھا کہ اس جنگل میں یہ اکیلی عورت کیسے آرام سے سو رہی ہے۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اُسے کسی چیز کے سرسرانے کی آواز سنائی دی۔ پیچھے مڑ کر جو اس نے دیکھا تو ایک کالا سانپ، جو کافی بڑا تھا، اُس دوشیزہ کے پلنگ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ جیون داس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ ہولسٹر سے پستول نکال کر اُس پر فائر کر دیا۔ گولی کی آواز سے وہ لڑکی اُچھل کر اُٹھ بیٹھی، پھر اُس نے سانپ کو تڑپتے ہوئے دیکھا اور اس کے دیکھتے ہی دیکھتے تھوڑی دیر بعد وہ مر گیا۔ مرے ہوئے سانپ کو دیکھ کر وہ لڑکی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''اے مورکھ! تو نے یہ کیا کیا...... تو نے اُسے کیوں مار دیا؟''

''پاگل لڑکی یہ تمہیں ڈس لیتا۔ تم کون ہو؟ اور اس ویرانے جنگل میں کیا کر رہی ہو؟'' ٹھاکر نے اس کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔

وہ لڑکی دراصل کوئی دوشیزہ نہیں تھی، بلکہ وہ ایک ناگن تھی۔ اِچھادھاری ناگن اور یہ سانپ اُس کا ناگ تھا۔ آج اماوس کی رات تھی، یہ ان کے ملن کی رات تھی۔ آج اُس کا ساتھی بھی اُس کی طرح انسان کے روپ میں آ جاتا، اگر وہ اس سے ملن کر لیتا۔ اماوس کی رات میں ان

کا ملن بہار عروج پر ہوتا تھا، اس لیے اماوس کی رات ناگ دیوتاؤں کی رات کہلاتی ہے۔

اس جوڑے کو اس ویرانے میں رہتے ہوئے دو سو سال ہو گئے تھے۔ ناگن تو انسانی روپ میں آ چکی تھی، لیکن اُس کے ناگ یعنی جو شیش ناگ تھا، اُسے آج ملن کر کے انسانی روپ دھارنا تھا، مگر جیون داس نے اس سے پہلے ہی اُسے مار دیا تھا۔ ناگن نے جب یہ صورت حال دیکھی تو اس نے سوچا "اگر میں نے اس شخص کو یہ بتا دیا کہ میں ایک ناگن ہوں تو وہ مجھے بھی گولی مار دے گا۔" پھر اسی لمحے اُس نے میٹھی چھری بن کر جیون داس سے اپنے ناگ کے انتقام کی ٹھان لی۔ وہ جیون کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "بابو میں اس دنیا میں اکیلی ہوں میری ماں بہت پہلے مر چکی ہے اور باپو اس جنگل میں ایک مندر ہے، وہ وہاں کا پجاری تھا، ابھی چند مہینے پہلے ہی وہ بھی مر گیا۔ اب گاؤں کے لوگوں نے مندر کی صاف صفائی کے لیے مجھے رکھا ہوا ہے، میں مندر ہی میں سوتی ہوں، مگر آج جنگل میں گھومنے کے لیے نکل پڑی تھی کہ راستہ بھول گئی اور جب رات ہو گئی تو میں اس کُٹیا پر سو گئی۔ اب تم بھی یہیں سو جاؤ، رات سخت اندھیری ہے، ورنہ کوئی جنگلی جانور تمہیں کھا جائے گا۔ آؤ تم بھی میرے ساتھ اسی کُٹیا پر سو جاؤ۔"

چل چل کر جیون بھی بہت تھک چکا تھا، بس یہی لمحہ تھا جب دونوں میں ملن ہو گیا۔ اماوس کی رات تھی، ناگ اور ناگن کے ملن کی رات، لیکن آج ایک انسان اور ناگن کا ملن ہو گیا تھا۔

☆......☆

صبح جب پرندوں کے چہچہانے پر جیون کی آنکھ کھلی تو ناگن، جس نے اپنا نام جمنا بتایا تھا، وہ اپنی جگہ پر موجود نہ تھی۔ جیون اسے نہ پا کر بڑا پریشان ہوا، پھر اس نے باہر نکل کر جمنا کو آواز دی تو ایک جانب سے جیون کو نسوانی ہنسی کی آواز سنائی دی، پھر اُس نے قدم آگے بڑھا دیے۔ چند قدم چلنے کے بعد اس نے دیکھا تو جمنا سامنے جھرنے پر برہنہ بدن نہا رہی تھی۔ جمنا کو سرد پانی سے نہاتا دیکھ کر جیون کو سردی سی لگنے لگی۔ جھرنے کا یخ پانی دور کھڑے جیون کو سردی کا احساس دلا رہا تھا۔ اس کا سنہری بدن صاف و شفاف پانی میں چمک رہا تھا، جیسے پانی میں سچا موتی جگ مگ کرتا ہے۔ نہانے کے بعد جمنا مسکراتی ہوئی جیون کے پاس آئی اور بولی۔

"بابو تم بھی نہا لو نا۔"

"نہیں بھئی نہیں، میں تو اس ٹھنڈے پانی میں ہی جم جاؤں گا۔" جیون نے قدم پیچھے کی طرف ہٹاتے ہوئے کہا۔ ناگن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"اچھا آؤ میرے ساتھ چلو۔"

تھوڑی دور چلنے کے بعد ایک چھوٹا سا ناگ دیوتا کا مندر آ گیا اور جمنا اس کے اندر داخل ہو گئی، پھر اس نے جیون کو پرساد دیا۔

"بابو...... لو تم یہ کھاؤ۔" پرساد میں حلوہ، مٹھائی اور انڈے تھے۔ جیون نے پیٹ بھر کر حلوہ کھایا اور جمنا نے سب انڈے چٹ کر لیے۔

"جمنا تم اکیلی اس جنگل میں رہ کر کیا کرو گی؟ تم میرے ساتھ گاؤں چلو، وہاں میں تم سے بیاہ کر کے اپنے دل کی رانی بنا لوں گا۔ تمہارے حسن نے تو مجھے تمہارا اسیر کر دیا ہے۔" یہ سن کر جمنا نے اس کے ساتھ رہنے کی حامی بھر لی۔

اس طرح جمنا جیون کی زندگی میں اس کے دل کی رانی بن کر آ گئی۔

☆......☆

جمنا جس وقت حویلی میں داخل ہوئی، تو حویلی کے آس پاس کے جانور اور پرندے چیخ رہے تھے۔ جمنا مسکراتی ہوئی حویلی کے اندر داخل ہو گئی، جیون کی پہلی بیوی گوپی جمنا کو دیکھ کر ڈر سی گئی، اُسے جمنا کی آنکھوں میں ایک وحشت ناک چمک محسوس ہوئی تھی، مگر وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔

جمنا...... رات کے آخری پہر، جب جیون شراب پی کر گہری نیند سو جاتا تو وہ اپنا اصلی روپ دھار کر جنگل کی طرف روانہ ہو جاتی۔ جہاں اُس نے اپنے ساتھی پرکاش کے ٹکڑے گڑھے میں دبا رکھے تھے۔ اُن ٹکڑوں کو وہ سینے سے لگا کر اپنے من کی پیاس بجھاتی۔ وہ اُس وقت کی منتظر تھی کہ جب پرکاش کا جنم دوبارہ ہوتا، کیوں کہ ویسے تو جیون کے گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی، لیکن اگر پریشانی تھی تو اس کے بھوجن کرنے کی، کیوں کہ وہ زندہ کبوتر اور

دوسرے پرندوں کے انڈے، چوہے اور اسی طرح کی دیگر چیزیں کھانے کی عادی تھی۔ وہ اکثر رات میں اپنا پیٹ بھرتی تھی۔ اب اس کے آنے کے بعد گاؤں والوں کو ایک پریشانی لاحق ہوگئی تھی کہ اب اس گاؤں کے ہر گھر سے انڈے، چوزے، کبوتر اور مرغیاں غائب ہو رہی تھیں۔ گاؤں والے اس صورت حال سے سخت پریشان تھے۔

اِدھر جمنا کے پیٹ میں جیون کا بچہ پرورش پا رہا تھا، جیون اس بات پر بہت خوش تھا کہ جمنا اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ ادھر جمنا بھی بہت خوش تھی، کیوں کہ جیون کے بچے کی شکل میں پرکاش کو دوبارہ جنم ملنے والا تھا۔ اس کٹھن مرحلے کے لیے اُس نے ناگ دیوتا کی پوجا پورے آٹھ مہینے ایک ٹانگ پر کھڑے ہوکر کی تھی۔ حمل کے دوران اُس نے پرکاش کی تمنا ہر وقت کی تھی اور اُس کے ڈھانچے کو سینے سے لگا کر اُس کی تپسیا بھی کی تھی۔ اُسے ناگ دیوتا سے پوری امید تھی کہ اب پرکاش دوبارہ جنم لے گا اور وہ وقت اب قریب آ چکا تھا۔ ہوائیں بہت تیز چل رہی تھیں اور ہوا میں ایک عجیب سی مہک اور سرسراہٹ تھی۔

بچے کو جنم دلوانے کے لیے گاؤں کی سب سے پرانی اور تجربہ کار دائی کو بلایا گیا تھا۔ جمنا کے منہ سے عجیب طرح کا ہرے رنگ کا تھوک نکل رہا تھا اور بے انتہا دل دہلا دینے والی سسکیاں نکل رہی تھیں، پھر دائی نے جو بچہ جنوایا وہ اُسے دیکھ کر خود ہی دہشت سے کانپ گئی، کیوں کہ بچے کی جگہ ایک سانپ نے جنم لیا تھا، جس کا دھڑ سانپ کی طرح کا اور شکل جیون داس کی تھی۔ پوری حویلی خوف اور دہشت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جیون آدھی رات کو جب گھر آیا، تو اُسے لگا جیسے اُس کے پیچھے سانپ پھنکار رہا ہے۔ اُس نے نشے کی حالت میں حویلی میں قدم رکھا اور کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

''ارے جمنا رانی! تم کیسی ہو؟''

''ٹھاکر تمہاری جمنا نے بیٹا پیدا کیا ہے، کیا تم دیکھو گے نہیں؟''

''ارے جمنا تم نے تو ہمیں خوش کر دیا۔ میرے گھر بیٹا پیدا ہوا ہے، جلدی سے دکھاؤ مجھے کہاں ہے؟''

وہ لالٹین لے کر آگے بڑھا اور روشنی پڑتے ہی وہ اُچھل کر دور ہٹ گیا۔ جمنا کے برابر میں پڑا ایک شیش ناگ پھنکاریں مار رہا تھا۔

''جمنا یہ کیا؟ یہ ناگ میرے بچے کو ڈس لے گا۔ مجھے میرا بچہ دو۔'' اُس نے بچے کے منہ پر سے کپڑا ہٹایا، جس کی شکل جیون کی طرح اور دھڑ سانپ کی طرح کا تھا۔

''جیون یہ رہا تمہارا بچہ، میں جمنا نہیں اِچھا دھاری ناگن ہوں اور یہ میرا...... میرا شیش ناگ پرکاش ہے جس کو تم نے گولی مار دی تھی، وہ میرا ساتھی تھا۔ وہ اماوس کی رات تھی اور اس رات ہمارا ملن ہونا تھا، مگر تو نے مجھے میرے شیش ناگ سے جدا کر دیا، اب تیرے حمل سے میں نے اپنے ساتھی کو دوبارہ جنم دیا ہے، مگر جب تک تجھے ڈس کر اور اس بچے کو زندہ جلا کر میں اپنا انتقام نہ پورا کرلوں گی، اس وقت تک میرے پرکاش اور مجھے دوبارہ مکتی نہیں ملے گی۔ وہ اور شیش ناگ بُری طرح پھنکار رہے تھے۔ حویلی اُن کی پھنکاروں سے گونج رہی تھی۔ یہ ماجرا دیکھ کر تمام نوکر اور جو لوگ گھر میں موجود تھے، حویلی سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ جیون ایک طرف کھڑا دہشت سے کانپ رہا تھا اور اپنا بچاؤ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اُسے پتا تھا کہ اب وہ زندہ نہیں بچے گا...... بس اس ہی لمحے اُس نے قریب رکھی ہوئی لالٹین بستر کی طرف اُچھال دی، جہاں جمنا اور شیش ناگ براجمان تھے۔ جلتی ہوئی لالٹین بستر پر گری تو اس نے آگ پکڑ لی اور اس کے ساتھ ساتھ تمام چیزوں نے بھی آگ پکڑ لی جو اس کے ساتھ رکھی ہوئی تھیں۔ جیون اور جمنا نے بہت کوشش کی وہ اس آگ سے نکل جائیں، مگر آگ اس شدت کی تھی کہ شیش ناگ، جمنا اور جیون تینوں اس آگ کی لپیٹ میں آ گئے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پوری حویلی جل کر راکھ ہوگئی۔

جس کمرے میں جمنا اور شیش ناگ نے جنم لیا تھا، وہاں ناگ اور ناگن پتھر کے بن گئے تھے، جو کالے سیاہ رنگ کے تھے۔ کئی برس تک لوگ اس جگہ آ کر ان کی پوجا کرتے رہے، پھر وہاں پر ایک بہت بڑا مندر بن گیا۔ اس طرح جیون داس کو لوگ بھول گئے، مگر اس ناگ اور ناگن کو نہیں۔ وہ آج بھی ان کی لوک کہانیوں میں اپنے لازوال عشق کے سبب زندہ ہیں۔

☆......☆





زہریلا انتقام

جاوید راہی

جلال پور بھٹیاں، حافظ آباد سے، سبز زہر میں تیرتی، نفرت اور محبت کی ایک عجب کتھا

انگریز کی نوکری کرنا بھی بڑے دل گردے کا کام ہے۔ مسٹر برکلے نے میری معمولی سی شکایت پر میرا تبادلہ بڑے اسٹیشن سے برانچ لائن کے ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر کر دیا۔ میں کوشش کے باوجود اپنا تبادلہ نہ رکوا سکا۔ ہوا یہ کہ



شہر کا ایک معروف زمیندار فضل دین جو انگریز آفیسر کا وفادار تھا کراچی جانے کی غرض سے اسٹیشن پر آیا تو میں اس کی خدمت اس کی مرضی کے مطابق نہ کر سکا، کیوں کہ فرسٹ کلاس ویٹنگ روم کی مرمت کے باعث وہ جگہ استعمال کے قابل نہ رہی تھی۔ مستری وہاں کام کر رہے تھے، میرے کمرے میں اتنی گنجائش نہ تھی کہ میں فضل دین اور اس کے ساتھ آئے بہت سے آدمیوں کو کرسیاں پیش کرتا۔ گاڑی آئی اور وہ اس میں سوار ہو گیا۔ گاڑی چلی گئی تو قلی عبدالرحمٰن میرے پاس بڑا ہی افسردہ سا چہرہ لے کر آ گیا۔

''بابو جی یہ اچھا نہیں ہوا'' اس نے اسٹول پر بیٹھتے اور سگریٹ سلگاتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

''کیوں کیا ہوا'' میں نے رقم کا اندراج کرتے ہوئے چونک کر اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''چوہدری فضل دین بُرے تاثر لے کر گیا ہے۔''

''وہ کس لیے؟'' میں نے کتاب بند کرتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے اسے بوگی میں سوار کرایا ہے۔ اس نے بڑے تیکھے انداز میں کہا تھا کہ تمہارا اسٹیشن ماسٹر کچھ زیادہ ہی خود اعتماد ہو گیا ہے۔ میں جا رہا ہوں اس کا بھی بندوبست کرتا آؤں گا'' اتنا کہہ کر عبدالرحمٰن سگریٹ کے کش لگانے لگا اور میں پریشان ہو گیا۔

وہی ہوا جس کا مجھے خدشہ تھا۔ تیسرے روز میرے تبادلے کے آرڈر آ گئے اور میری جگہ محراب کا اسٹیشن ماسٹر بخشی ایشور داس آیا تھا۔ اس نے ہندو ہوتے ہوئے بھی ایسے حالات میں میرے تبادلے پر افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ دو روز تک چارج نہیں لیتا۔ اگر میں اپنا ٹرانسفر رکوا سکتا ہوں تو کوشش کر دیکھوں، کیوں کہ جس طرح بیٹھے بٹھائے مصیبت میرے گلے پڑی تھی، یہی حال اس کا تھا۔ میں تو اکیلا تھا، مگر اس کے سب بچے تعلیم حاصل کر رہے تھے اور کئی دوسرے مسائل بھی اسے درپیش ہوں گے میں نے شہر کے بااثر لوگوں سے رابطہ قائم کیا مگر ہر طرف سے ناکامی ہوئی اور میں نے دلبرداشتہ ہو کر چارج چھوڑ دیا اور اپنے خدا کو یاد کر کے سامان اکٹھا کیا اور فضل دین کو کوستا ہوا بخت پور چلا آیا۔

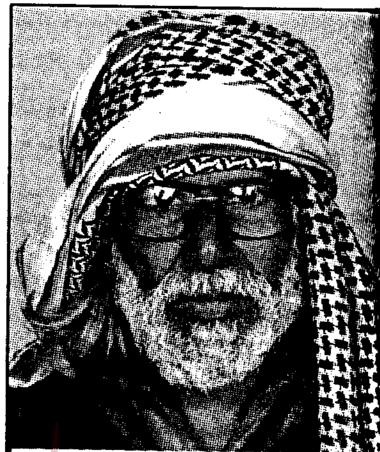
☆......☆

میرے پہنچتے ہی مجھے وہاں ہر چیز بالکل تیار ملی۔ اسٹیشن ماسٹر نذر علی اس تبادلے پر بہت خوش تھا، مگر میں اس کے برعکس خاصا پریشان، کیوں کہ اکثر میں اپنے گھر ایک ماہ میں دو تین چکر لگا لیتا تھا، پیچھے کام چل جاتا تھا اب یہ بات ناممکن تھی۔ یہاں دن میں صرف دو بار میل گاڑی رُکتی تھی یا پھر تھرو کا زور تھا، چھوٹی سی عمارت اور چھوٹا سا پلیٹ فارم دو عدد بینچ، ایک پانی کا نل، دو عدد مٹی کے تیل سے روشن ہونے والے کھمبے اور دو ہی سگنل یا پھر وہاں پر موجود پانچ چھ سرکاری ملازمین کے کوارٹر تھے جو اسٹیشن کی عمارت میں بنا دیے گئے تھے۔

بخت پور چھوٹا سا قصبہ تھا، اس کی آبادی تقریباً پانچ سات ہزار افراد پر مشتمل تھی اسٹیشن کے ساتھ ساتھ دور تک کیکر کے بوڑھے درختوں کا سلسلہ تھا جو شہر میں سے ہوتا ہوا جنگل میں گڈمڈ ہو جاتا۔ اسٹیشن چوں کہ بخت پور کی آبادی سے ذرا فاصلے پر تھا اس لیے یہاں وہی لوگ تھے جن کا واسطہ اسٹیشن سے یا پھر سرکاری محکموں سے تھا، مثلاً محکمہ جنگلات، محکمہ انہار وغیرہ۔ بڑی جلد ہم لوگ ایک دوسرے کے واقف کار ہو گئے۔ شہری آبادی میں ڈاک خانہ تھا، دو وقت ڈاک دینے اور لینے والا آتا یا پھر کچھ مسافر، یہ کل کائنات تھی بخت پور کی۔

میرا کوارٹر جو چھوٹے چھوٹے تین کمروں پر مشتمل تھا، اسٹیشن کی عمارت سے ذرا ہٹ کر بنایا گیا تھا۔ یہاں میرا عملہ ایک کانٹے والا اور ایک جھاڑو والا تھا۔ ٹکٹ میں خود دیتا اور خود ہی گاڑی گزارتا اور ٹکٹ وغیرہ چیک کرتا۔ رات کو بتیاں بھی پریتم روشن کرتا، بیچارہ صفائی سے لے کر میرے ذاتی کام تک بھی کرتا تھا، چند ہی روز میں اس نے میرے گھر کا بھی سارا کام اپنے ذمے لے لیا۔ یہاں میں یہ ذکر کرتا چلوں کہ بخت پور تحصیل بصیر نگر میں تھا اور اسے پولیس اسٹیشن بھی وہی لگتا تھا یا پھر ریلوے پولیس کی کبھی کبھار گشت ہوتی جو ایک گاڑی سے اُترتی اور دوسری میں سوار ہو کر واپس چلی جاتی۔

صبح گاڑی گزار کر میں لمبی تان کر سو جاتا، اس دوران پریتم میرے کمرے کے باہر بیٹھا اونگھتا رہتا۔ شام کی گاڑی اکثر رات کو آتی، بعض اوقات کئی گھنٹے لیٹ ہوتی تو اسٹیشن پر تھوڑی سی رونق ہو جاتی تو مختلف لوگوں سے مل بیٹھنے کا موقع مل جاتا۔ بخت پور میں یوں تو ساری قومیں آباد تھیں مگر ہندو زیادہ تھے۔ ملک میں اس بات کا



اسٹیشن ماسٹر طارق علی سخاوت

تاثر عام تھا کہ مسلمان اپنے لیے الگ ملک چاہتے ہیں، اس حوالے سے بھی ہم مسلمانوں کو ستم ظریفی کا سامنا تھا۔

نذر علی نے جاتے جاتے بتایا کہ یہاں ہندو بڑے کینہ پرور ہیں، ان سے ذرا ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے، کیوں کہ ہماری آزادی کو یہ تعصب کا رنگ دیتے ہیں۔ مجھے یہاں آئے ہوئے تقریباً تین ماہ ہو چکے تھے، لیکن کوئی بھی ایسی صورت حال میرے لیے باعث پریشانی نہ بنی تھی۔ اس دوران میرے والد اور چھوٹا بھائی میرے پاس دو بار چکر لگا گئے تھے۔ میرے والد صاحب نے میری ٹرانسفر کی بہت کوشش کی مگر ناکام ہو گئے۔ میری والدہ اور سب سے بڑی بہن میری شکل دیکھنے کو ترس گئے تھے، مگر میں مجبور تھا۔

☆......☆

اس روز موسم ذرا ابر آلود تھا۔ ساون شروع ہو چکا تھا، اس لیے بارش وقفے وقفے سے ہو جاتی تھی۔ گاڑی لیٹ تھی مسافر ٹکٹ لے کر اس کے انتظار میں تھے کچھ تو چھپر کے نیچے کھڑے تھے اور کچھ کھڑکی کے باہر باتوں میں معروف تھے، میں سبز اور سرخ جھنڈی بغل میں دبائے دروازہ بند کرتا ہوا ٹکٹ گھر سے باہر نکل آیا تھا، کیوں کہ مسافروں میں ہلچل شروع ہو گئی تھی جو شاید دور سے گاڑی کا ہیولا دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد گاڑی اسٹیشن پر آ کر رُک گئی، کچھ لوگ نیچے اُترے اور باقی سوار ہو گئے۔ میں ٹکٹ دیکھ کر فارغ ہوا، گارڈ سے ضروری بات چیت کی اور گاڑی روانہ کروادی۔ چند چھابڑی فروشوں اور پریتم کے سوا سارا پلیٹ فارم سونا ہو گیا۔ میں اپنے دفتر میں آ کر اندراج کرنے بیٹھ گیا۔ اتنے میں پریتم اندر آیا، اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ اس نے مجھے مخاطب کیا۔

''بابو جی! ادھر صندوق پڑا ہے''

''کدھر؟'' میں نے دریافت کیا۔

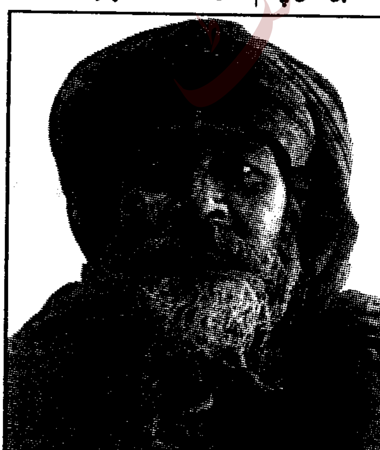
''نل کے سامنے والی کرسی کے نیچے'' پریتم نے بتایا۔

''کوئی سواری بھول گئی ہے شاید۔'' میں نے جلدی جلدی کنڈی لگاتے ہوئے خود سے کہا اور پریتم کے ساتھ ہو لیا۔

واقعی وہاں درخت کے نیچے بڑا سا آہنی صندوق پڑا ہوا تھا جس کے دونوں جانب بڑے بڑے دیسی تالے لٹک رہے تھے۔ میں نے اسے ہلا کر دیکھا تو وہ بڑا وزنی معلوم ہوا۔

''پریتم! کوئی سواری جلدی میں بھول گئی ہے، اسے اٹھا کر دفتر میں لے چلتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے بابو جی'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ہم دونوں بڑی مشکل سے وہ صندوق اٹھا کر دفتر میں لائے۔ میں نے ضروری تصور کیا کہ اس کا میمو کاٹ دوں، تا کہ یہ بات ریکارڈ میں آ جائے۔ کام کرتے کرتے اچانک میرا دھیان اس صندوق کی طرف پلٹ جاتا، یہی حال پریتم کا بھی تھا۔ اس کے چہرے سے یوں



سبز موت کا شکار ہونے والا رام پریتم

محسوس ہوتا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے مگر کہہ نہیں پاتا۔ میرے اور اس کے درمیان کوئی پردہ نہیں تھا، مگر اس کے باوجود ہم دونوں اس صندوق کے بارے میں متجسس تھے کہ آخر یہ کون بھول گیا ہے اور اس میں ہے کیا؟ میں کام کرنے کے دوران سواریوں کا جائزہ لیتا رہا جو مجھ سے ٹکٹ لے کر گئی تھیں یا جو ٹرین میں سے اُتری تھیں، مگر میرا ذہن اپنے طور پر کچھ بھی فیصلہ نہ کر سکا۔

میں نے اس صندوق کے بارے میں حکام کو جان بوجھ کر اطلاع نہیں دی تھی کہ شاید اس کا کلیم جلد آجائے اور میں اس کے مالک کے سپرد کر کے جان چھڑواؤں، مگر تین دن کے طویل انتظار کے بعد ہم دونوں کے ذہن اس پراسرار صندوق کی وجہ سے پریشان ہو چکے تھے۔ پریتم ہندو تھا وہ اپنی فطری سوچ کی مجبوری کے باعث ہر پل مجھے صندوق کے بارے میں گمراہ کرتا رہتا اس نے مجھے اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ صندوق کو کم از کم کھول کر دیکھ ہی لیا جائے۔ میں نے پریتم کو کہا کہ وہ صندوق میرے کوارٹر میں لے جائے تاکہ آسانی سے اسے کھولا جائے۔ میں کہنے کو تو یہ بات کہہ گیا مگر ایک خوف سا تھا میرے دل میں۔ ٹرین نکال کر میں نے سارا کام ختم کر لیا اور کوارٹر کی طرف چل پڑا، وہاں پریتم میرا منتظر تھا جس کی آنکھوں میں حرص کی چمک صاف طور پر دیکھی جا سکتی تھی۔ اس نے قفل توڑنے کا سامان پہلے ہی تیار کر رکھا تھا۔ میں نے کوارٹر اچھی طرح بند کر لیا اور پریتم کی طرف دیکھا جو میرے اشارے کا منتظر تھا۔ جھٹ اس نے بڑی سی سلاخ تالے میں پھنسائی اور تالا منہ پھاڑ کر ہنسنے لگا۔ دوسرے کا بھی اس نے یہی حال کیا، پھر میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو میں نے اسے ڈھکنا اٹھانے کو کہا۔

جب صندوق کھلا تو ہم دونوں کے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔ صندوق میں گہرے سبز رنگ کی مٹی بھری پڑی تھی اور درمیان میں ایک چھوٹا سا سوراخ تھا جو شاید مٹی کے نیچے تک جاتا تھا۔ مٹی کے اوپر جس چیز نے ہم کو چونکا دیا وہ گہرے سیاہ رنگ کا کوئی بدبودار مادہ تھا جس کی ناگوار سی بُو صندوق کھلتے ہی میرے کوارٹر کے اندر سرایت کر گئی۔ صندوق کے اندر ڈھکنے پر کوئی سمجھ نہ آنے والی اوٹ پٹانگ عبارت لکھی تھی۔ پریتم کے چہرے پر خوف کے آثار پھیلتے جا رہے تھے۔ میں نے سنبھلتے ہوئے بڑی لاپروائی سے پریتم کو مخاطب کیا۔

”پریتم یہ کیا بکواس ہے، چلو اس کو بند کرو، پتا نہیں کسی نے کیا ٹونہ ٹوٹکا کیا ہے، مجھے بھی چار روز سے پریشان کر رکھا ہے۔“

”بابو جی یہ کسی مہان شکتی یوگی کا کام لگتا ہے۔ پتا نہیں یہ کیا بلا ہے۔“ پریتم نے صندوق بند کرتے ہوئے کہا۔ میں نے بڑی مشکل سے وہ صندوق اس کے سر پر رکھوایا اور کہا کہ اسے دور لے جا کر پھینک آؤ۔

پریتم کے جانے کے بعد میں نے کوارٹر کا دروازہ اور کھڑکیاں سب کھول دیں، تاکہ وہ گندی سی بدبو باہر نکل جائے۔ خدا معلوم وہ کیسی بدبو تھی جس نے میرا دماغ ماؤف کر ڈالا تھا۔ تھوڑی دیر بعد پریتم بھی آ گیا جس نے بتایا کہ وہ صندوق کو بڑے ڈھائے کے پار پھینک آیا ہے۔ یہاں میں عرض کر دوں کہ بڑا ڈھایا بخت پور کی آخری حد تھی، کیوں کہ یہاں سے نشیبی علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس بات کو کئی ہفتے گزر گئے۔ ہم دونوں اس بات کو فراموش کر گئے۔

☆......☆

اس دوران شہر میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ہوا یوں کہ رات کی تاریکی میں کسی نامعلوم بلا نے دھرم شالا کے برہم چاری اجیت پر حملہ کر دیا۔ اس کے پورے جسم پر گہرے سبز رنگ کے بڑے بڑے داغ اُبھر آئے تھے اور وہ تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ اس واقعے کی وجہ سے پورے بخت پور میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ اس سنگین صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے بصیر نگر پولیس کی نفری بھی پہنچ گئی تھی، مگر انسپکٹر سودیش ورما کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا اور لاش کا کریا کرم کر دیا گیا۔

پریتم اجیت کو جلانے کی رسم میں، میں بھی شامل تھا۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ برہم چاری کے جسم پر اُبھرنے والے سبز رنگ کے بڑے بڑے دھبوں کو جن سے سیاہی مائل مادہ خارج ہو رہا تھا، دیکھ کر خوف آتا تھا۔ میں نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے بتایا کہ ہو سکتا ہے کہ اجیت کو کسی زہریلی چیز نے کاٹ لیا ہو۔ پریتم رام رام کرتا صفائی کرنے لگا۔

اس واقعے کو ابھی زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ اسی طرح ایک اور روح فرسا حادثہ رونما ہوا۔ شادی گھر کا منتظم ریشم سنگھ جو علاقے کا مانا ہوا پہلوان تھا، اسی حالت میں پایا

گیا۔ وہ شادی گھر کے قریب اکھاڑے میں اوندھے منہ پڑا تھا اور اس کے پورے جسم کا وہی حشر تھا جو چند روز قبل برہم چاری اجیت کے جسم کا ہوا تھا۔ پورے بخت پور میں اس دوسری موت کو بھگوان کا انتقام قرار دے دیا گیا۔ قصبے کے بھی لوگ اس اچانک صورت حال سے اتنے پریشان ہو چکے تھے کہ گھروں سے باہر نکلتے گھبراتے۔ ہر ایک کے ہونٹوں پر سبز موت کا تذکرہ تھا، رات کو دلیر قسم کے نوجوانوں نے پہرہ دینا شروع کر دیا، مگر اس کے باوجود تیسرے روز بھی ایک خوبرو نوجوان جو قریبی گاؤں سے حصولِ تعلیم کے لیے بخت پور آیا ہوا تھا، اس پراسرار موت کی نذر ہو گیا۔ وہ بھی اپنے چھوٹے سے مکان میں اکیلا رہتا تھا۔ ان تینوں کے بعد دیگرے اموات کی ایک چیز مشترکہ تھی، جو بھی اس کا شکار ہوا وہ اپنی اپنی جگہ اکیلا رہتا تھا۔ جب اس کی لاش جلائی جاتی تو اس میں سے ناقابلِ برداشت بدبو اٹھتی، جسے بڑی مشکل سے وہاں کھڑے لوگ قبول کرتے، کیوں کہ ان رسوم کو تو بہر صورت نبھانا ہوتا تھا۔ اب تو بخت پور کے لوگ پولیس کو بھی اطلاع نہ کرتے، کیوں کہ پولیس نے دوسری بار یہ کہہ کر کارروائی کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ کسی زہریلی چیز کی کارستانی معلوم ہوتی ہے۔

☆......☆

گاڑی کے گزر جانے پر چند سواریاں اس انتظار میں گیٹ پر کھڑی تھیں کہ میں ان کے ٹکٹ دیکھ کر انہیں جانے کی اجازت دوں مگر میں بڑے کیکر کے نیچے بیٹھی اس عورت کو دیکھ رہا تھا جو گیٹ کی بجائے اس طرف جا بیٹھی تھی، کیوں کہ رات کے وقت کسی عورت کا وہاں جا بیٹھنا بالکل خلافِ توقع تھا۔ ایک سواری کے اصرار پر میں اس عورت کو چھوڑ کر ٹکٹیں دیکھنے لگا۔ سب لوگ چلے گئے، اب میں اور پریتم پلیٹ فارم پر اکیلے کھڑے تھے یا وہ عورت کیکر کے نیچے لاپروائی سے بیٹھی تھی۔ میں نے ہمت کر کے پریتم کو اس کی طرف بھیجا تاکہ وہ پتا کرے کہ وہ عورت ٹرین سے اُتری ہے یا جانا چاہتی ہے۔ اگر جانے کے لیے کہے تو کہہ دینا کہ اب کوئی گاڑی یہاں نہیں رُکے گی۔

پریتم کیکر کی طرف بڑھ گیا۔ میں اس کے آنے کا انتظار کرنے لگا، تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا، مگر اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔

”کیا بات ہے پریتم؟“ ”جی وہ بیٹھی روئے جا رہی ہے۔ میرے بار بار اصرار پر بھی اس نے کچھ نہیں بتایا، بابو جی! وہ تو مجھے کوئی مصیبت زدہ عورت لگتی ہے، آپ خود جا کر معلوم کریں کہ کیا ماجرا ہے۔“

میں سر ہلاتا ہوا اس طرف چل پڑا۔ واقعی وہ عورت بیٹھی سسکیاں لے رہی تھی۔ میں نے از راہِ ہمدردی اُسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس جگہ ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ میں اس کو صحیح طور دیکھ نہ سکا، مگر میں نے یہ ضرور محسوس کیا کہ وہ اٹھارہ بیس سالہ لڑکی ہے اور مسلسل روئے جا رہی ہے۔ میں نے گلا کھنکار کر صاف کیا اور اُسے مخاطب کیا۔

”محترمہ! آپ کو کوئی مسئلہ درپیش ہے تو آپ بتائیں شاید میں آپ کی کوئی مدد کر سکوں۔“

”آپ میری کیا مدد کریں گے۔ میں تو ہوں ہی بد نصیب، میرا خاوند مجھے بیاہ کر پونا لے جا رہا تھا، مگر ویران اسٹیشن پر چھوڑ کر خود گاڑی میں سوار ہو گیا ہے۔“ کہتے کہتے وہ پھر سسکیاں لینے لگی۔

”آپ روئیں مت سب ٹھیک ہو جائے گا“ میں یہ بات روانی سے کہہ گیا۔

”اگر آپ اجازت دیں تو میں یہاں رات بسر کر لوں۔“ اس نے روتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

”آپ بھی کمال کرتی ہیں، اس ویرانے میں آپ رات بسر کریں گی۔ آئیں میرے ہمراہ اور مجھ پر مکمل بھروسا کریں۔“

”شکریہ“ یہ کہتے ہوئے وہ اُٹھ کر میرے ساتھ چلنے لگی۔ جب وہ میرے آفس میں آئی تو میری آنکھیں ساکت ہو کر رہ گئیں۔ بتی کی روشنی میں میرے سامنے ایک اپسرا بیٹھی تھی، ہلکے آسمانی رنگ کی ساڑی میں ملبوس اور سونے سے لدی ہوئی وہ واقعی نئی نویلی دلہن تھی۔ مانگ میں بھرا سیندور، مہندی بھرے ہاتھ، پاؤں میں قیمتی زری کی بنی جوتی، اس کے دلہن ہونے کا ثبوت پیش کر رہی تھی۔ آپ فکر نہ کریں میں آپ کے خاوند کو ہر حالت میں تلاش کروں گا۔ میں نے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ اس نے اپنی جھکی آنکھیں اُٹھا کر میری طرف دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی چمک کا احساس ہوا جیسے سخت گرمی میں شدید دھوپ کی تمازت ہو، لمحہ بھر کے نظروں کے تصادم نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

پریتم دفتر کے باہر کھڑا اس بات کا انتظار کر رہا

تھا کہ اسے کوئی حکم جاری کروں، اسی احساس کے پیش نظر میں نے اسے دودھ لانے کا کہا۔ وہ ''جی اچھا'' کہتا ہوا کوارٹر کی طرف چلا گیا۔

میں اس لڑکی سے بات کرنے کا کوئی جواز تلاش کرنے لگا۔

''آپ کے میاں کا آپ سے کوئی جھگڑا ہو گیا تھا جو اس نے یہ حرکت کی؟''

''کوئی بات نہیں ہوئی بس مجھے انہوں نے اسٹیشن پر اُترنے کا حکم دیا اور میں اُتر گئی۔ جب گاڑی روانہ ہوئی تو وہ بھاگ کر سوار ہو گئے اور میں اسٹیشن پر اکیلی رہ گئی'' اس نے ساڑی کا پلو سر پر درست کرتے ہوئے جواب دیا۔

''بڑا بے حس انسان ثابت ہوا ہے۔'' میں نے رجسٹر میں حساب چڑھاتے ہوئے کہا، پھر اسے مخاطب کیا۔ ''آپ کہاں کی رہنے والی ہیں؟

''حیدر آباد کے قریب ایک چھوٹا سا قصبہ ہے میر پور، ہم وہاں رہتے ہیں...... ہم لوگ'' اس نے مدھم سی آواز میں بتایا، اتنے میں پریتم چھاگل میں دودھ لے آیا۔ میں نے دودھ پیالی میں ڈال کر لڑکی کے آگے رکھ دیا اور اس سے اس کا نام دریافت کیا۔

''میرا نام لاجونتی ہے'' اس نے پیالی ہاتھ میں لیتے ہوئے نام بتایا۔

''آپ ایسا کریں دودھ پی کر پریتم کے ساتھ کوارٹر میں جائیں اور آرام کریں میں صبح کوئی بندوبست کروں گا اور ہاں پریتم! تم دیوی جی کو چھوڑ کر میرا بستر دفتر میں لے آنا'' پھر میں نے لاجونتی کو مخاطب کیا۔ ''آپ کوارٹر کا دروازہ اندر سے اچھی طرح بند کر لیں جب تک آپ یہ اچھی طرح یقین نہ کر لیں کہ باہر سے آنے والا ہم دونوں میں سے کوئی ایک ہے، دروازہ مت کھولیں۔'' اس نے جواب میں سر ہلا دیا۔ دودھ ختم کر کے وہ پریتم کے ہمراہ کوارٹر کی طرف چلی گئی اور میں اس کے بارے میں سوچنے لگا کہ خدا جانے اس کے میاں نے اسے کس جرم کی پاداش میں یہاں بے یار و مددگار چھوڑ دیا ہے۔'' پریتم بھی ہندو دھرم کا تھا، اس لیے میں نے کسی بات کا سامنے کرنے سے پہلے ہی اپنا بستر دفتر منگوا لیا۔

لاجونتی نے جو پتا پونا اور میر پور کا بتایا تھا، اس پر میں نے ہر ممکن رسائی کی، مگر ادھر سے کوئی جواب نہ آیا، اُدھر لاجونتی بے فکر میرے کوارٹر میں رہتی تھی۔ اسے آج تیسرا روز تھا۔ میں بھی اس کے آنے پر گھر کے کام سے بے نیاز ہو چکا تھا، وہ ہر کام بغیر بتائے کر رہی تھی۔ جیسے وہ شروع سے میرے ساتھ رہتی آ رہی ہو، ایک بات جس نے مجھے چونکا دیا تھا، وہ دودھ کی زیادتی تھی یعنی پہلے صرف ایک ڈوئی پیمانہ آتا اب تین آنے لگے تھے، کیوں کہ لاجونتی صرف دودھ پی کر ہی گزارا کرتی۔ اسے کھانے کے لیے کہا گیا تو اس نے بتایا کہ اسے معدے کی تکلیف ہے، اس لیے وہ صرف دودھ ہی پی سکتی ہے۔ میں اس کے جواب سے مطمئن ہو گیا۔ میں جب بھی کوارٹر میں آتا، لاجونتی کی آنکھوں میں اپنے لیے محبت کے آثار پاتا، مگر وہ ایک ہندو لڑکی تھی اور میں ایک مسلمان تھا، اس کے باوجود میرے دل کے کسی کونے میں اس کے لیے گداز سی کرن نمودار ہو رہی تھی، جسے میں کوشش کے باوجود نہ دبا سکا۔

بخت پور میں لوگ اس آفت کی وجہ سے اتنے پریشان تھے کہ انہیں دوسرے کام میں مداخلت کرنے کی فرصت نہیں تھی، ورنہ پتا نہیں لاجونتی کے معاملے میں مجھے کیا کرنا پڑتا، ویسے بھی پریتم کے علاوہ کسی کو اس کی خبر نہ تھی۔ آخری گاڑی گزر جانے کے بعد میں پریتم کو بتی گودام کی نگرانی کا کہتا ہوا کوارٹر کی طرف چلا کہ لاجونتی کی خیریت وغیرہ دریافت کر لوں۔ بتی گودام میں جو سامان بک ہوتا تھا، میں وہ رکھوا دیتا تھا تاکہ وہ محفوظ رہے۔ جب سامان زیادہ ہوتا تو پریتم کو اُدھر ہی رہنا پڑتا، تاکہ کوئی نقصان نہ ہو پائے۔ لاجونتی نے میری آواز سن کر دروازہ کھول دیا۔ اس کے چہرے پر نرم سی مسکراہٹ تھی، میں اندر داخل ہو گیا تو اس نے دروازہ بند کر دیا۔ لاجونتی! بڑی حیرت کی بات ہے کہ ابھی تک تمہارے کسی رشتے دار یا عزیز نے تمہارا پتا نہیں کیا، میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''میری قسمت بابو جی!'' اس نے کھڑے کھڑے جواب دیا، ''آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔''

''نہیں لاجونتی رہنے دو کیوں تکلیف کرتی ہو۔''

''چائے تو میں نے بنا رکھی ہے'' لاجونتی نے مسکرا کر جواب دیا اور کمرے سے نکل گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دودھ اور میں چائے کی پیالی پکڑے ان خدشات کی بات کر رہے تھے کہ ابھی تو صرف اس بات کا پریتم کو پتا ہے۔ اگر کسی اور کو علم ہو گیا تو میرے لیے مصیبت آ جائے گی۔

لاجونتی کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی، میں نے پہلی بار ہمت کر کے اس کے بازو کو پکڑ کر ہلایا۔

''کیا بات ہے تم فکر نہ کرو۔ میں تمہاری خاطر سب کچھ سہ لوں گا۔'' اس کا بازو میرے ہاتھ میں تھا اور میرے سارے جسم میں ایک ملائم سی سرسراہٹ کا احساس گونج گیا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں نے کسی سانپ کو پکڑ رکھا ہو۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ اور سوچتا، لاجونتی جلدی سے پیالی اٹھا کر باہر نکل گئی اور میں شرمندہ سا ہو کر رہ گیا۔ میں تھوڑی دیر اور بیٹھا اور پھر اسے دروازہ بند کر لینے کا کہتے ہوئے باہر نکل آیا۔

چاروں طرف خاموش سناٹا اور گہرا اندھیرا پھیلا ہوا تھا، اسٹیشن پر نصب لیمپ کی مدھم روشنی کا شعلہ ہوا کے دوش پر رقص کناں تھا۔ میں لاجونتی کے خیالوں میں گم آہستہ آہستہ اسٹیشن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بتی گودام کے باہر پریتم زمین پر بستر بچھائے بیٹھا اپنی چھوٹی سی ناریل کی حقی سے کش لگا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور لاجونتی کی خیریت پوچھی، میں اسے بتاتا ہوا اپنے آفس میں آ گیا۔ میرا بستر وہ بڑی میز پر لگا دیتا تھا جو یہاں دفتری کام کے لیے رکھی تھی۔ وہ میرے پیچھے اندر آ گیا، کیوں کہ وہ روز مجھے دبا کر سوتا تھا۔ آج بھی اس نے میری لیٹتے ہی میری ٹانگوں کو دبانا شروع کر دیا تھا۔

''بابو جی! ہم لوگ کہیں کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔ آپ نے اس کے پریوار کو پتر بھی لکھے ہیں، پرنتو کوئی جواب نہیں آیا۔''

ہاں پریتم میں اس مسئلے پر کئی بار سوچ بیٹھا ہوں۔ صبح ایک بار پھر خط لکھوں گا۔ تم جاؤ اور خبردار ہو کر لیٹنا۔

''اچھا بابو جی'' کہتا ہوا وہ باہر نکل گیا اور میں نے کمرہ اندر سے بند کر لیا۔

☆......☆

رات کا پچھلا پہر شروع ہو چکا تھا اور وہ بستر پر لیٹی بے چینی سے کروٹیں بدل رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے جسم کی نقاہت مزید بڑھ گئی ہے۔ وہ ایک ہیجانی سی کیفیت میں مبتلا ہو کر اٹھی، اس کی آنکھیں انگاروں کی مانند روشن ہو گئیں، اس کے منہ سے گہرے سبز رنگ کا غبار سا خارج ہونے لگا۔ رات کی تاریکی میں کوارٹر کا دروازہ کھلا اور سبز غبار میں مدغم نسوانی سایہ لہراتا ہوا اسٹیشن کی طرف بڑھنے لگا۔ بتی گودام کے باہر پریتم دن بھر کا تھکا ہوا بے خبر پڑا سو رہا تھا۔ وہ نسوانی سایہ تھوڑا سا جھکا اور پھر پریتم کے جسم کے اوپر سبز غبار پھوار کی مانند پڑا اور وہ بلبلا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کے سامنے لاجونتی کھڑی تھی، جس کی سرخ انگارہ آنکھیں پریتم پر مرکوز تھیں اور پریتم کا جسم اس سبز غبار میں گم ہونے لگا تھا۔ پریتم نے لاجونتی کا جسم سمٹتے ہوئے دیکھا اور پھر اس کے سامنے ایک خوف ناک سبز ناگن پھن پھیلائے جھوم رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی کشش نے پریتم کو بے سدھ کر ڈالا تھا۔ اب وہ ناگن پریتم کے جسم پر رینگنے لگی تھی۔ اس کے خوف ناک دانت بار بار پریتم کے جسم میں پیوست ہو رہے تھے اور پریتم کا جسم چونے کی طرح پھٹتا جا رہا تھا۔ رات بھیگ رہی تھی۔ وہ نسوانی سایہ اس سبز غبار میں دوبارہ نمودار ہوا اور شانِ بے نیازی سے بڑھتا ہوا دوبارہ کوارٹر کی طرف بڑھنے لگا۔

☆......☆

پریتم کی لاش بتی گودام کے باہر پڑی تھی اور میرے اردگرد مقامی لوگوں کا ہجوم تھا، جو مجھ سے طرح طرح کے سوالات کر رہے تھے، کیوں کہ پریتم کے جسم پر بھی وہی نشانات تھے جو اس سے پہلے ملنے والی لاشوں کے جسم پر نمایاں تھے۔ وہی سبز رنگ کے بڑے بڑے گڑھے اور ابھرے ہوئے گلے سڑے پھوڑے، جن سے سبز رنگ کا لیس دار مادہ بہ رہا تھا۔ میں اپنے ذہن پر زور دے رہا تھا کہ رات کے کس پہر یہ خوف ناک واقعہ پیش آیا، مگر میرا ذہن کسی بھی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ پولیس آئی اور اسے بھی پراسرار حادثہ قرار دے کر چلی گئی۔

میں پریشان سا کوارٹر میں آیا اور لاجونتی سے تبادلہ خیال کرنے لگا۔ وہ میری باتوں کا جواب اوں ہاں کر کے دیتی رہی۔ میں پریتم کی وفاداری کے قصے بیان کرتا رہا۔ لاجونتی کا چہرہ سپاٹ تھا اور اس پر کسی تاثر کا کوئی ثبوت نہیں نظر آ رہا تھا۔ میں اور کچھ دیر رُکتا، مگر مجھے ہیڈ کوارٹر پریتم کی موت کی اطلاع دینا تھی اور پریتم کا متبادل بندوبست بھی کرنا تھا۔ ویسے بھی میرا اپنا دل خوف زدہ تھا کہ میں بھی اس پراسرار بلا کے نرغے میں نہ آ جاؤں۔

اس واقعے کو کئی روز بیت گئے تھے، مگر میں بڑا چوکنا رہتا، پریتم کی جگہ جو کوٹری سے ملازم آیا تھا، وہ ایک عمر رسیدہ شخص اور عیسائی تھا۔ جوزف نام تھا اس کا،

خاموش طبع یہ بزرگ ہر کام بتانے پر کرتا، ورنہ بیٹھا خلاؤں میں گھورتا رہتا جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو۔

''جوزف''

''جی بابو جی!'' اس نے چونک کر جواب دیا۔

''جاؤ کوارٹر کی صفائی کر آؤ اور لاجونتی سے پوچھتے آنا کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دے۔''

گاڑی گزر جانے کے بعد میں نے بھی حساب بند کیا اور کوارٹر کی طرف چل پڑا چند لمحوں تک میں دروازہ پیٹتا رہا پھر دھکا دے کر اندر داخل ہو گیا۔

''لاجونتی!'' میری آواز نے کوارٹر کی گمبھیر خاموشی توڑی مگر کوئی جواب نہ ملا۔ جب میں سونے کے کمرے میں آیا تو میں نے دیکھا کہ زمین پر ساڑی بکھری پڑی ہے، مگر لاجونتی کہیں موجود نہیں ہے۔ اس کی سب چیزیں اپنی اپنی جگہ پڑی تھیں اور وہ ساڑی بھی جو اس نے پہن رکھی تھی۔ سارے کوارٹر میں میں اسے تلاش کر کے پھر باہر نکل آیا مگر لاجونتی کہیں نظر نہ آئی۔ میں پریشان ہو کر پلیٹ فارم کی طرف چل پڑا۔ ''جوزف تم جب صفائی کرنے گئے تھے تو لاجونتی کوارٹر میں تھی۔''

''جی بابو جی!'' جوزف نے بتی کا شیشہ صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''کیوں بابو جی خیریت تو ہے نا۔''

''کچھ نہیں بس وہ کوارٹر میں نہیں ہے، میں یہ کہتا ہوا رجسٹر کھول کر کام کرنے لگا۔

☆......☆

کئی روز ہو گئے، مگر لاجونتی کا کوئی پتا نہ چلا۔ میرے ذہن میں طرح طرح کے خیال اُبھر اور ڈوب رہے تھے، مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ پایا۔

اُدھر بخت پور میں پھر سے سبز موت کی کارروائیاں شروع ہو چکی تھیں۔ لوگ ڈر کے مارے بھاگ رہے تھے۔ بصیر نگر سے پولیس کی نفری مکمل طور پر بخت پور میں آ چکی تھی، مگر وہ بھی اس کا سراغ لگانے میں ناکام ہو چکی تھی۔

''بابو جی! کہیں لاجونتی بٹیا بھی تو اس بلا کا شکار نہیں ہو گئی جو آج تک اس کا پتا نہیں چل سکا۔''

جوزف کیا کہا جا سکتا ہے'' میں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا، ''اچھا جاؤ بتیاں روشن کر آؤ۔'' جوزف باہر نکل گیا اور میں لالٹین کی روشنی میں حساب جوڑنے لگا۔

ایک عجیب سی بُو میرے ذہن سے ٹکرائی۔ میں نے چاروں طرف گھوم کر دیکھا اور دوبارہ کام میں لگ گیا، پھر یکدم مجھے کوئی خیال آیا اور میں نے اُٹھ کر دفتر کا دروازہ اندر سے اچھی طرح بند کر لیا۔ تھوڑی دیر گزری ہو گی کہ وہ ناگوار سی بُو پھر مجھے محسوس ہوئی، اس بار مجھے یہ بُو اپنے بالکل قریب سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ جب میں نے غور کیا تو کمرے میں ہلکا ہلکا سبز غبار سا اُڑتا ہوا دکھائی دیا جس میں سبز ذرات جل بجھ رہے تھے۔ میں خوف زدہ ہو گیا اور مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے موت رقص کرتی نظر آنے لگی۔ میں خوف سے چیخ اُٹھا، مگر میری سماعت سے ٹکرانے والی آواز نے مجھے ساکت کر دیا۔

''طارق! گھبراؤ مت میں لاجونتی ہوں، جس کے احساس کی خوشبو اب بھی تمہارے دل کے کسی گوشے میں مچل رہی ہے'' پھر وہ سبز غبار ایک جگہ اکٹھا ہونے لگا، چند ساعتیں گزرنے کے بعد لالٹین کی مدھم روشنی میں لاجونتی کا چمکیلا جسم اپنی پوری رعنائی کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔

''طارق! تم میرے لیے پریشان تھے نا، لو میں آ گئی ہوں، تمہیں اس اذیت سے نکالنے کے لیے، کہ میں کہاں چلی گئی تھی۔ طارق! میں انتقام ہوں۔ انسان کے جسم میں گردش کرتے گرم گرم خون کا، جس نے مجھے یہ روپ دھارنے پر مجبور کیا۔ کاش وہ یوگی میرے ساتھی کو اپنا جاپ پورا کرنے کے لیے پورن ماشی کی رات ہلاک نہ کرتا اور مجھے قید کر کے یہاں نہ پھینکتا تو میں کبھی ایسا نہ کرتی۔ تمہارے طرزِ عمل اور محبت نے مجھے انسان سے نفرت کے باوجود اس سے محبت کا بھی درس دیا ہے۔ میں تمہاری حد سے نکل کر باہر جا رہی ہوں، مگر تم مجھے ہمیشہ یاد آتے رہو گے اور ہاں پریتم کا مجھے اس لیے دُکھ نہیں کہ وہ تمہیں غلط مشورے دیتا تھا، جس کی سزا میں نے اس کے لیے یہی تجویز کی تھی۔ اب میں جا رہی ہوں۔'' کہتے ہوئے لاجونتی اٹھی اور میرا ہاتھ تھام کر ہونٹوں پر لگا لیا۔ مجھے اپنے پورے وجود میں ایک جھرجھری سی اُٹھتی محسوس ہوئی وہ غبار ایک دم سمٹ کر ناگن کا روپ اختیار کر گیا اور میری آنکھوں کے سامنے دیوار کے سوراخ میں گم ہو گیا۔ میرے ہاتھ پر سبز نشان چمک رہا تھا۔ میں نے سرد آہ بھرتے ہوئے اپنا ہاتھ آنکھوں کو لگا لیا اور میری آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو نکل کر اس سبز داغ میں جذب ہو گئے۔

☆......☆

دوشیزہ کے قارئین متوجہ ہوں

اپنے قارئین کے لیے ایک تحفۂ خاص

☆ وہ قارئین جو کہ دوشیزہ کو پڑھتے ہیں اور اسے سنبھال کر رکھتے ہیں۔

اُن خاص قارئین کے لیے......

دوشیزہ کے ابتدائی شماروں کے ساتھ اپنا نام اور شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی جتنی جلدی ہوسکے ادارے تک پہنچادیں۔

جلد منعقد ہونے والی دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کی شاندار تقریب میں، آپ کو آپ کا تحفہ آپ کے پسندیدہ مصنفین کے ہاتھوں دیا جائے گا۔

مکھنی



ارشد علی ارشد

ابوظبی سے خیال اور حقیقت کی قید سے آزاد دوشیزہ کی ایک حیرت انگیز، ناقابلِ فراموش سرگزشت

ایک مافوق الفہم اسرار بھری عجوبہ داستان

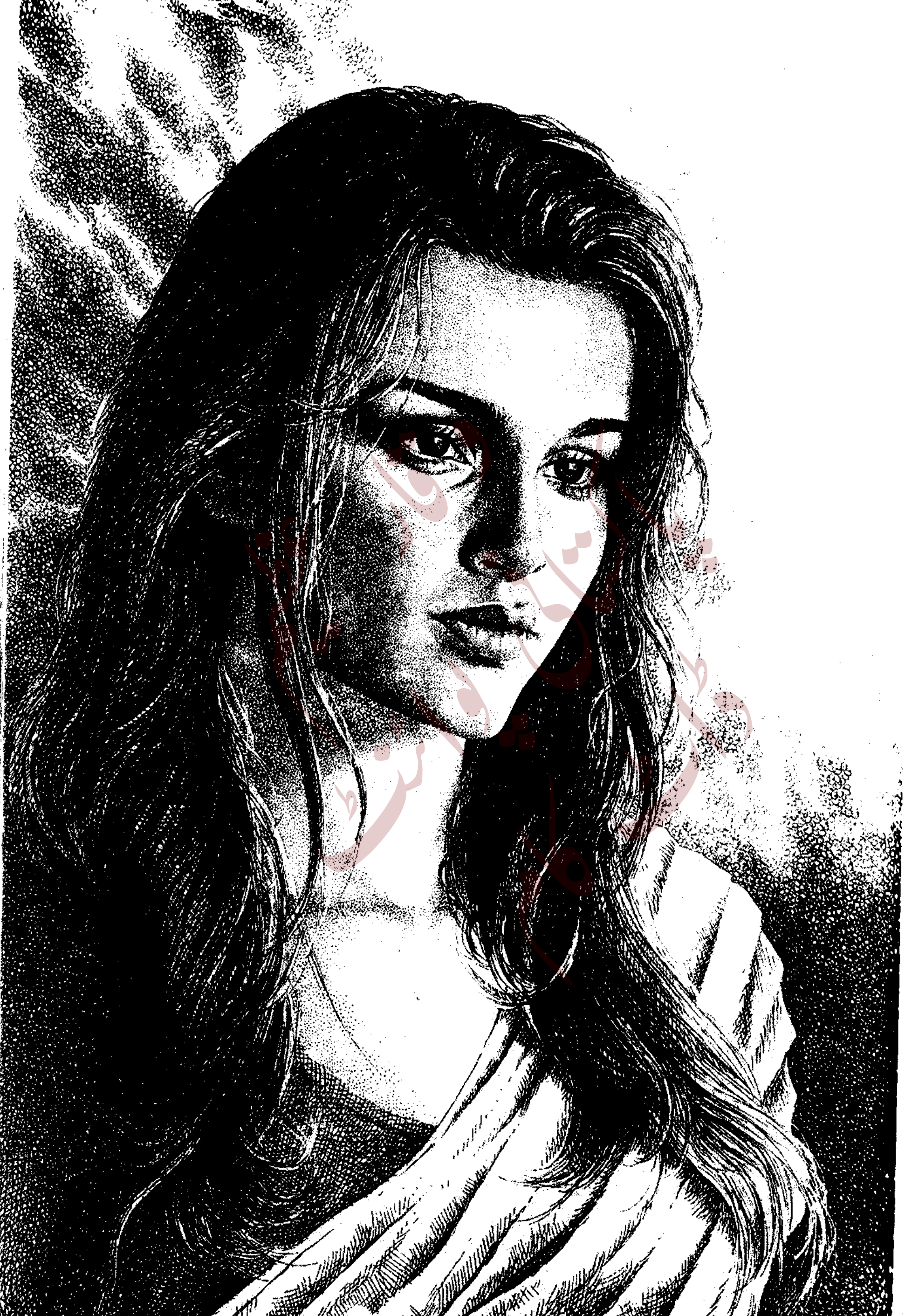
قسط نمبر 11

گزشتہ قسط کا خلاصہ

کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز پر مکھنی سوچوں کی دنیا سے لوٹ آئی۔ کمرے میں ایک خوب صورت نوجوان داخل ہوتا ہے جو اپنا نام امن چند دولتانی بتاتا ہے۔ وہ مکھنی سے کہتا ہے کہ اس کا نام مہک ہے اور آج اس نے پورے تیرہ ماہ اور دس دنوں بعد مکمل ہوش وحواس میں بات کی ہے۔ اس سے پہلے وہ استعارات میں گفتگو کرتی رہی ہے۔ امن اسے بتاتا ہے کہ وہ اس وقت ضلع گھوٹکی کے نواحی گاؤں گوٹھ چندھن میں ہے۔ مکھنی امن سے پوچھتی ہے کہ اس سے پہلے وہ کہاں تھی؟ امن سوال سن کر خاموش ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کے تایا اور بابا نے بتانے سے منع کیا ہے۔ امن مکھنی سے کہتا ہے کہ وہ اس کی آمد کا ذکر بابا سے نہ کرے۔

کچھ دیر بعد پچاس پچپن برس کا ایک شخص اور ایک عورت کمرے میں داخل ہوتے ہیں جو بتاتے ہیں کہ وہ امن کے بابا چندھن دولتانی اور اس کی مما ہیں۔ دونوں میاں بیوی اسے کمرے سے باہر لا کر کرسی پر بٹھا دیتے ہیں اور وہاں موجود سب لوگ مکھنی کے سامنے نیچے زمین پر بیٹھ جاتے ہیں۔ مکھنی کو دودھ سے غسل دیا جاتا ہے اور اس پر پھول نچھاور کیے جاتے ہیں۔ مکھنی یہ سب دیکھ کر حیران و پریشان ہے۔ امن مہک (مکھنی) کو بتاتا ہے کہ انکل فہیم اس سے ملنے آئے ہیں۔ مکھنی یہ کہہ کر انکار کر دیتی ہے کہ جب تک وہ اپنے بارے میں جان نہیں لیتی وہ کسی سے نہیں ملے گی۔

امن اس کو سب کچھ بتانے کی حامی بھرتا ہے اور انکل فہیم سے ملنے کے لیے اصرار کرتا ہے۔ اس کی بے چارگی دیکھ کر مکھنی انکل فہیم سے ملنے کے لیے رضامند ہو جاتی ہے۔ انکل فہیم مکھنی کو بتاتے ہیں کہ اس نے انہیں لاہور بھیجا تھا کہ وہاں مٹی کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں ہیں ان میں ایک ڈھیری ویران ہے۔ اس پر خودرو جھاڑیاں اُگ آئی ہیں اور عرصہ ہوا وہاں کسی نے صفائی ستھرائی نہیں کی۔ تم اس کی صفائی کرو اور اس کے بعد مینار پاکستان جاؤ، انکل فہیم کہتے ہیں کہ میں نے بہت تلاش کیا لیکن مجھے کہیں بھی مٹی کی ڈھیریاں نہیں ملیں۔ تب مکھنی دیوار کو پردۂ اسکرین میں تبدیل کر کے مینار پاکستان کا منظر اور ایک قبرستان دکھاتی ہے، جسے دیکھ کر فہیم پریشان ہو جاتا ہے اور باقی لوگ مکھنی کے سامنے سجدہ



ریزہو جاتے ہیں۔ ملکھنی غصے میں انہیں کمرے سے نکل جانے کا کہتی ہے۔
امن ملکھنی کو نہیم انکل کے بارے میں بتاتا ہے کہ وہ اولاد کے لیے چار شادیاں کر چکے ہیں۔ انہوں نے آپ کے سامنے دکھڑا بیان کیا تھا، تبھی آپ نے انہیں لاہور بھیجا تھا۔ تب ملکھنی امن سے کہتی ہے کہ میں تم لوگوں کے ڈرامے کا کردار بنتی جارہی ہوں، مجھے میری پہچان کرواؤ۔ امن ملکھنی کے کمرے میں آنا چھوڑ دیتا ہے۔ ملکھنی کو تشویش ہوتی ہے، پھر اسے پتا چلتا ہے کہ امن ایک ہفتے کے لیے کراچی چلا گیا ہے۔ ملکھنی امن کے بابا سے کہتی ہے کہ ''میں اس تین کنال کے گھر سے باہر جانا چاہتی ہوں، تاکہ دیکھ سکوں باہر کی دنیا کیسی ہے، سفید یا سیاہ۔'' امن کے بابا یہ سن کر حیران ہوتے ہیں۔ ملکھنی کہتی ہے کہ ''میں انسان ہوں، مجھے تم لوگوں نے خدا بنا رکھا ہے۔ میرے سامنے یوں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جیسے تم لوگ مسلمان نہیں بت پرست ہو۔'' پھر ملکھنی ان سے پوچھتی ہے کہ آپ لوگ جانتے ہیں کہ بدھ مت کون ہیں، کیا ہیں؟ پھر وہ دیوار کو پردۂ اسکرین میں تبدیل کرتی ہے جس پر ایک فلم سی چلنے لگی تھی۔

(اوراب آگے پڑھیے)

روشن اسکرین میں ماضی بعید کا کوئی پرانا دور چل رہا تھا۔ میں نے وہاں موجود افراد پر نگاہ دوڑائی، بیشتر کی سانسیں رک گئی تھیں۔ جن کی چل رہی تھیں، وہ بھی معمول کی رفتار سے تیز تھی۔ کمرے میں نامعلوم سا اندھیرا چھا گیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے ہم سینما ہال میں موجود ہیں۔ میں نے امن کے بابا کی طرف دیکھا تو وہ بھی مجھے ہی دیکھ رہے تھے۔ ہماری نگاہیں ٹکرائیں تو انہوں نے فوراً نگاہیں جھکا لیں۔ میں نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''نیچے مت دیکھیے، سامنے کی طرف دیکھیے۔ اسکرین پر 563 قبل مسیح کا زمانہ نظر آرہا ہے۔ عجیب بات ہے نا، کہ اکیسویں صدی میں ہم 563 قبل مسیح کا زمانہ دیکھ رہے ہیں۔'' میری آواز کمرے میں اسکول ٹیچر کی طرح گونج رہی تھی۔ اُس زمانے میں زرتشت اپنے نظریات کا پرچار کررہا تھا۔ آپ لوگ تو جانتے ہیں کہ زرتشت کون تھا۔'' میرے سوال پہ گمبھیر خاموشی چھائی رہی۔ میں گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ میرے سامنے غالباً امن کے چچا تھے۔ میں نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

''آپ کو معلوم ہے؟'' وہ خوف سے سمٹ گیا۔ گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''نن...... نہیں...... مم...... میں نہیں...... جانتا۔'' میں نے ان کے شانے پر ہلکی سی چپت رسید کی اور کھڑی ہو کر کہا۔

''نہیں جانتے تو ڈرتے کیوں ہیں، غور سے دیکھو اور سنو گے تو سب جان جاؤ گے۔ وہ بھی جو نظر آرہا ہے اور وہ بھی جو نظر نہیں آرہا ہے۔'' میں قدم بڑھا کر روشن اسکرین کے پاس چلی گئی۔ جہاں ایک جھیل کا منظر روشن تھا۔ ''یہ یورومیا جھیل ہے، جو کہ آذربیجان میں پڑتی ہے۔ یورومیا جھیل کے مغربی کنارے پر ایک قبیلہ آباد تھا۔ اس کا نام بھی یورومیا قبیلہ تھا۔ زرتشت اسی قبیلہ میں پیدا ہوا تھا۔'' میرے منہ سے جیسے ہی الفاظ خارج ہوئے نومولود بچے کے رونے کی تیز آواز گونجنے لگی۔ ساتھ بھاگتے دوڑتے قدموں اور عجیب زبان کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ ''یہ زرتشت کی پیدائش کا دن ہے۔ اس لیے یورومیا قبیلہ میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔'' میرے ذہن میں بھی ہلچل سی مچ رہی تھی، یوں لگتا تھا جیسے تیز ہوا چلنے والی ہے۔ میں نے سر کو جھٹکا دے کر بات جاری رکھی۔ ''کچھ عرصہ قبل تک مؤرخین زرتشت کا زندہ وجود تصور نہیں کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ ایک خیالی کردار ہے۔ مجھے ٹارزن کی طرح خوامخواہ کی شہرت مل گئی ہے، مگر وقت کے ساتھ ساتھ تحقیقات کا پیمانہ وسیع ہوا تو بہت سے دلائل وشواہد ایسے ملے کہ آج کے مؤرخین اور محققین اسے ایک حقیقی شخص ماننے پر مجبور ہوگئے ہیں۔''

میں لحظہ بھر رکی، اسی لحظہ بھر میں اسکرین کا منظر بدلا اور آگ کے تڑتڑاتے شعلے بلند ہونے لگے۔ عورتوں کی ایک بار پھر چیخیں نکل گئیں۔ مدھم اندھیرا ذرا روشنی میں بدل گیا۔

''تم عورتیں اتنی بزدل کیوں ہوتی ہو۔ بات بات پر چیخ پڑتی ہو۔ یہ آگ یہاں ہے یہاں'' میں نے زور زور سے دیوار کو انگلی سے ٹھکورا۔ ''کمرے میں نہیں آنے والی یہ آگ، آرام سے بیٹھی رہو۔ میری بات کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ یہ آگ ہے اس دور کی آریہ قوم کا مقدس معبود، صرف آگ ہی نہیں ہوا، روشنی، صاف ستھرا آسمان اور فرحت بخش چھم چھم برستی بارشیں بھی اس بدبخت قوم کے معبود تھے، آریہ قوم بری طرح مظاہر پرستی کا شکار تھی۔ سورج کو آسمان کی آنکھ اور روشنی کو

قارئین کو مطلع کیا جاتا ہے کہ پچھلے شمارے میں مکھنی کی قسط نمبر 10، قسط نمبر 11 کے طور پر اس لیے شائع کی گئی تھی
چونکہ بعض مقامات پر طباعت کی مس پرنٹنگ کی وجہ سے قارئین تک مکمل قسط نہیں پہنچ سکی تھی

آسمان کی اولاد سمجھا جاتا تھا۔ وارونا آسمانی دیوتا کی حیثیت سے ان کا سب سے بڑا خدا تھا۔ اس کے علاوہ ''متھرا'' جسے روشنی کا دیوتا سمجھ کر پوجا جاتا تھا۔ وہ بھی بڑے خدا میں شامل تھا۔ اس دور میں زرتشت پیدا ہوا۔ جس نے شعور میں آتے ہی اعلان کر دیا کہ میں نے سات خواب دیکھے ہیں۔ ساتوں خوابوں میں مجھے بشارتیں دی گئی ہیں۔''

''ارے یہی تو ہے زرتشت'' میں نے گردن گھما کر اسکرین کو دیکھا تو وہاں ایک مجمع کے سامنے نوجوان کھڑا ہوا تھا۔

''سنو۔ سنو یہ کیا کہہ رہا ہے۔'' آواز گونج رہی تھی۔

''لوگو میرا نام ہی زرتشت ہے۔ میں نے سات خواب دیکھے ہیں اور مختلف بشارتیں پائی ہیں۔ آپ لوگ جانتے ہو بشارتیں پانے والا کون ہوتا ہے۔'' سوال پہ لوگ ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرنے لگے۔ زرتشت کی گول گول آنکھیں انہیں بار بار گھور رہی تھیں۔ مجمع میں سے نہ سمجھ میں آنے والی متفرق آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

مجمع سے کوئی واضح جواب نہ پا کر زرتشت اونچی آواز میں بولا۔

''خواب میں پیغمبروں کو بشارتیں دی جاتی ہیں۔ اس لیے میں زرتشت اللہ کا پیغمبر ہوں۔'' زرتشت کے اس اعلان پر لوگوں کی آوازیں غیر ہو گئیں۔ کوئی بھی شخص اس کی بات ماننے کو تیار نہ تھا۔ اس کی پیروی کرنے والا ایک بھی شخص پیدا نہ ہوا۔ اسکرین پر مناظر بدلتے رہے۔ زرتشت اپنی تعلیم کو خاص و عام تک پہنچانے میں مصروف نظر آیا۔ وقت اور حالات بدلتے رہے، حتیٰ کہ دس سال بیت گئے، مگر ان دس برسوں میں زرتشت کا صرف ایک عقیدت مند شخص قائل ہوا۔ اب زرتشت کا کھلتا ہوا چہرہ پژمردہ نظر آ رہا تھا۔ اسے اپنے لوگوں سے اس بے رُخی اور بے حسی کی توقع نہیں تھی۔ مایوس ہو کر اس نے زادِ سفر باندھا اور مشرقی ایران کے صوبہ خراسان چلا گیا۔

''اگر آپ لوگوں نے خراسان نہیں دیکھا تو دیکھ لو۔ خراسان کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔'' میں نے رُک کر دیکھا کہ سخت گیر اشارے کے ڈرے سہمے شاگرد خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں کوئی سوال کرنے کی ہمت نہیں تھی۔



بحالت مجبوری مجھے مسلسل بولنا پڑا۔ "یہ جو شخص زرتشت کو مل رہا ہے اس کا نام شامب ہے۔ یہ کشمار شہر کا حکمران ہے۔ اس لیے زرتشت کو لوگوں تک اپنی بات پہنچانے کے لیے انتہائی آسان ہونے لگی۔ اس نے مظاہر پرست آریہ قوم کا عقیدہ رد کر دیا۔ زرتشت نے جس خدا کی تعلیم دینا شروع کی وہ خالص توحید کا عقیدہ تھا۔ زرتشت کا خدا نہایت مہربان اور غفور و کریم تھا۔ وہ کل کائنات کا خالق و مالک تھا۔ تمام تر صفات اسی کے نام کی تھی۔ زرتشت نے لوگوں میں عقیدۂ توحید کو رائج کر دیا تھا، مگر بعد میں لوگ پھر سے کفر و شرک میں ڈوب گئے، جب زرتشت ایران میں اپنے نظریات کی تبلیغ و اشاعت میں پوری تندہی سے سرگرم تھا۔ اسی وقت نیپال اور بھارت کے سرحدی علاقے میں ساکیا قبیلہ حکمران تھا۔" میں نے اسکرین کی طرف دیکھا۔ منظر بدل رہا تھا۔ زمانہ 563 قبل مسیح کا تھا اور نیپال و بھارت کا سرحدی علاقہ نظر آرہا تھا۔ ساکیا قبیلہ کے جس راجہ نے گنگا کے شمالی کوہستانی علاقے میں قبائلی ریاستوں کا انتہائی مضبوط وفاق قائم کر رکھا تھا۔ اس راجہ کا گھر دیکھو۔ انتہائی وسیع، خوب صورت اور بارعب۔ میں خود بھی یہ گھر دیکھ کر حیران ہو رہی تھی، گھر میں ہر طرف چہل پہل نظر آنے لگی تھی، ہر چہرہ فرطِ حیرت سے کھلا جا رہا تھا۔ میرا جی چاہا، ان سے پوچھوں کہ یہ "اتنے خوش کیوں نظر آرہے ہیں۔" مگر یہ سوچ کر نہ پوچھا کہ انہوں نے کون سا بتا دینا ہے۔ یہ کام مجھ ہی کو کرنا تھا، اس لیے میں نے کہا۔ "راجہ کا وسیع گھر اس لیے خوشی سے ناچ رہا ہے کہ وہاں ایک بچے کی ولادت ہوئی ہے۔ جس کی خوشی میں میٹھا تقسیم ہو رہا ہے، گیت گائے جا رہے ہیں اور رعایا کو کھانا کھلایا جا رہا ہے۔" اسکرین پر ایک گول مٹول بچہ نظر آرہا تھا۔ جو خوشی سے قلقاریاں مار رہا تھا۔ میں نے امن کے بابا کے پاس بیٹھ کر نرم لہجے میں کہا۔

"اس بچے کو دیکھ کر دل میں کچھ خاص محسوس ہوتا ہے؟" انہوں نے چونک کر پہلے مجھے اور پھر اسکرین کو دیکھا۔

"آپ مرد بھی ہیں، اور پڑھے لکھے بھی۔ ایسی معمولی باتوں پر ڈرنا آپ کو زیب نہیں دیتا۔"

"مہک جی۔ میرے گھر کی عورتیں انتہائی خوف زدہ ہیں۔ کیا یہ اسکرین بند ہو جائے گی۔" وہ خوف سے بولے۔

میں نے کہا "جس مقصد کے لیے روشن ہوئی ہے وہ تو دیکھ لیں۔"

"جی۔ جی۔ آپ نے بتایا نہیں۔"

"کیا......؟"

"اس بچے کو دیکھ کر دل میں کچھ خاص محسوس ہوتا ہے؟"

"نہیں......"

"آپ بتانا ہی نہیں چاہتے۔ خیر......" میں اُٹھ کر اسکرین کے قریب چلی گئی۔

"اس بچے کا نام گوتم ہے۔ اسے گوتما کے نام سے بھی پکارا جانے لگا۔" اسکرین پر دیکھتے ہی دیکھتے بچہ جوان ہو گیا۔ "یہ کوئی عام بچہ نہیں۔" میں نے بلند آواز میں کہا۔ "یہ بدھ کا لقب پانے والا گوتم ہے۔ بدھ یعنی روشن ضمیر۔" گوتم جوان ہو چکا تھا اور فکر کی دنیا میں بھٹکنے لگا۔ برہمنوں کے پاس گیا تو فلسفہ حاصل کیا، لیکن اس سے دل مطمئن نہیں ہوا۔ سوچ کے در مزید وا ہو گئے۔ اپنے اندر کو مطمئن کرنے کے لیے چھ سالوں تک مسلسل شدید قسم کی ریاضتیں کیں کی مگر دل ہے کہ مانتا ہی نہیں۔ آخر غور و خوض کے لیے مراقبہ شروع کیا۔ آپ لوگ غور سے دیکھو اور دھیان دو۔ یہ گوتم بدھ ہے، جو مراقبے میں بیٹھا ہوا ہے۔ یہ زندگی کو سمجھنے کے لیے بے چین ہے اور اس کے لیے ہر قسم کا جتن کر رہا ہے۔" منظر بدلا تو گوتم مراقبے سے نکل آیا تھا اور اب اک طرف چپ خاموش کھڑا ہو کر سامنے سے گزرنے والے جنازے کو بغور دیکھ رہا تھا۔ جنازے کے پیچھے اُداس، سر جھکائے، خاموش بہت سے لوگ جا رہے تھے۔ میت کو مرگھٹ لے جایا گیا۔ جہاں اسے جلایا گیا۔ آگ کے بلند شعلوں میں گوشت پوست کا انسان جو زندہ تھا تو اکڑ کر غرور اور فخر سے چلتا تھا، لمحوں میں راکھ کا ڈھیر بن گیا تھا۔ گوتم بدھ نے سر کو جھٹکا دیا۔ بس یہی ہے زندگی۔ چلتے ہوئے مختلف سوچیں اس پر حملہ آور تھیں۔ اچانک اس کی نظر ایک بوڑھے شخص پر پڑی۔ یہ شخص انتہائی مشکل سے چل پا رہا تھا۔ اسکرین کا یہ منظر انتہائی دُکھی اور افسردہ تھا۔ بوڑھے شخص کی قوت سلب تھی۔ کندھے جھکے ہوئے تھے، قوتِ بینائی اور سماعت دونوں مفقود تھی۔ محسوس ہو رہا

اس شخص کی زندگی کی شام ہو چکی ہے، عنقریب اسے بھی مرگھٹ کی طرف لے جایا جائے گا۔ جوانی کا سارا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ وہ قدم جو چٹانوں کو پاٹ لیا کرتے تھے، اب منوں بھاری ہو چکے تھے۔ گوتم بدھ کی گہری پُرسوچ آنکھیں اس کا مطالعہ کر رہی تھیں، زندگی کے بارے میں وہ بہت کچھ سیکھ رہا تھا۔ وہ آگے چلنے لگا۔ دل پر وجدان کے کئی دروا ہو رہے تھے۔ گوتم کے دھیرے دھیرے قدموں کے ساتھ اسکرین کے منظر یوں چلنے لگے جیسے دھیمی رفتار سے گاڑی چلتی ہے اور اطراف کے مناظر ہولے ہولے پیچھے کی طرف سرکتے ہیں۔ گوتم اب ایسے شخص کو دیکھ رہا تھا، جو کسی موذی مرض کا شکار تھا۔ مرض اتنا تکلیف دہ تھا کہ وہ درد سے کراہ رہا تھا۔ گوتم سوچوں کے حصار میں قید آگے بڑھ گیا۔ آج تقدیر اسے گوتم سے بدھ تک کا سفر کروانے پر تلی ہوئی تھی۔ گوتم حاکم خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ اس کی پوشاک میں ہیرے جواہرات جڑے رہتے تھے۔ جب تیز روشنی میں پوشاک کا سرا چمکا تو کمرے میں روشنی سوا ہو گئی۔ اس وقت میں امن کے تایا کے قریب کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے بیٹھ کر اس سے پوچھا۔

"گوتم اب کہاں جائے گا۔"

"جی۔" اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

میں نے انتہائی سادہ سا سوال پوچھا ہے۔ آپ اتنے حیران کیوں ہیں۔

"جی......وہ......مہک جی۔"

"اُف میرے اللہ......" میں جھنجلا کر رہ گئی۔ ساٹھ پینسٹھ سال کا بوڑھا شخص بھی مجھے مہک جی کہہ کر پکار رہا ہے۔

میں نے اپنا سوال پھر دہرایا...... "گوتم اب کہاں جائے گا!"

"مجھے نہیں معلوم مہک جی۔" اس کا جواب سن کر میرا جی چاہا کہ اس کی کھوپڑی پر کھڑی ہتھیلی کی زوردار ضرب لگاؤں۔ جس سے کھوپڑی بیچ سے دو ٹکڑے ہو جائے۔ اس کا دماغ باہر نکال کر میں اس کے اندر زور کی پھونک ماروں اور ایک بات اس کے ریشوں میں بھر دوں۔ کہ "جو لوگ تاریخ کو فراموش کر دیتے ہیں، ان کا مستقبل بھی ہمیشہ تاریک رہتا ہے۔" میں نے اسکرین کو دیکھ کر خود ہی بتانا شروع کیا۔ "گوتم اب ایک جوگی کے پاس جائے گا، جو اسے چند قدم آگے مل گیا۔ تارک الدنیا، جوگی کے چہرے پر انتہا کا سکون تھا۔ گوتم اسے دیکھ کر حیران رہ گیا، ایک فقیر، پھٹے پرانے کپڑوں والا تارک الدنیا جوگی اس قدر پرسکون کیوں ہے۔ ایک نئی سوچ اس پر حملہ آور ہوئی۔ اس سوچ نے اسے گوتم سے بدھ تک سفر کی نئی راہ سونپ دی۔ آخر ایک رات آئی سیاہ کالی تاریک رات جب رات کا تاریک منظر آیا تو کمرہ بھی گھپ اندھیرے میں ڈوب گیا۔ پراسراریت میں گراں قدر اضافہ ہو گیا، مجھے تیز سانسوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

تاریک رات میں گوتم نے اپنی جواں سال خوب رو بیوی اور کم سن بچے پر ایک نظر ڈالی اور انہیں سوتا چھوڑ کر اپنی شاہانہ زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ ہیرے جواہرات کی پوشاک اُتار دی اور سر کے بال منڈا کر انسان کو اس کی معراج تک پہنچانے کے لیے ایک الگ دنیا کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس سفر میں اس نے ان تھک محنت کی۔ اس نے اتنے جتن کیے کہ فکر اور سوچ نے اسے ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا دیا۔ وہ سالہا سال مارا مارا پھرتا رہا، مگر میں جس چیز کا متلاشی تھا، وہ اس سے ہنوز دور تھی۔

اسکرین پر مناظر بدلتے رہے۔ ہر منظر میں گوتم مختلف گیٹ اپ میں دکھائی دیا۔ گویا ماہ و سال گزر رہے ہیں، یک لخت اسکرین پر دریائی لہریں ٹھاٹھیں مارنے لگیں۔ لہریں اس قدر منہ زور تھیں کہ انہیں کمرے میں آنے کا گمان ہونے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے بھرا ہوا پانی حیرت سے بُت بنے ان تمام لوگوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گا۔ عورتیں ایک بار پھر چیخ اُٹھیں۔ میں ایک عورت کے پاس بیٹھ گئی۔

"ڈر لگ رہا ہے؟" دہشت زدہ ماحول میں میری اسرار بھری آواز سن کر وہ خوف سے سمٹنے لگی۔ دونوں گھٹنے اس کے سینے سے جا لگے تھے۔ "روایتی عورتیں ہو تم سب۔ ڈرو مت...... یہ دریا گنگا کی لہریں ہیں۔ دریا گنگا تو معلوم ہے ناں آپ کو۔"

"جی......جی معلوم ہے۔"

''تو پھر ڈر کس بات کا......؟ ان کی طغیانی سے خوف نہ کھاؤ۔ ان کے سامنے بند باندھ رکھا ہے، یہ یہاں تک کبھی بھی پہنچ نہیں پائیں گی۔'' میں نے تسلی آمیز انداز میں اس کا شانہ تھپتھپایا۔ وہ بچوں کی طرح اوپر نیچے سر ہلانے لگی۔ یہ نیر بخارا دریا ہے، منظر بدلا تو ایک گاؤں نظر آیا۔ اس گاؤں کا نام گیا ہے۔ گیا صوبہ بہار میں واقع ہے۔ منظر پھر بدلا، گاؤں کے درمیان ایک برگد کا بڑا درخت نظر آنے لگا۔ برگد کے بڑے درخت کے نیچے گوتم بدھ مراقبے کی حالت میں بیٹھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ غور و فکر میں محو تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ برگد کے درخت تلے آج اسے محنت کا ثمر ملنے والا ہے۔ آج اس پر اللہ مہربان ہونے والا ہے، یکا یک گوتم کا دل آئینے کی طرح صاف نظر آنے لگا۔ دل میں بے تحاشہ روشنی بھر گئی، یہ اتنی تیز روشنی تھی کہ گوتم بند آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ نیکی اور بدی کا سارا معاملہ اس پر افشا ہو گیا، گوتم نے سالہا سال جس کی جستجو کی۔ جس کے تعاقب میں شاہانہ زندگی کو ٹھوکر ماری، جس کی فکر میں وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا، وہ چیز اس پر منکشف ہونے لگی۔ تیز روشنی میں بدی اور نیکی کے سارے اسلوب اس کے دل میں اُترنے لگے۔ پورا ایک مہینہ وہ اسی مراقبے میں منہمک روشنی کو دیکھتا رہا اور زندگی کے مقصد کو پاتا رہا۔ اس نے محسوس کیا کہ چالیس سالوں کی محنت کا مجموعہ پا لیا ہے۔ آنکھیں کھولیں تو اپنی تبلیغ کی نشر و اشاعت میں مگن ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے شاگردوں اور چیلوں کی تعداد ہزاروں میں ہو گئی۔ اسکرین کا یہ منظر انسانی سروں سے بھرا ہوا نظر آنے لگا۔ یہ سب گوتم بدھ کے پرستار تھے۔ گوتم بدھ نے ویدک دیوتاؤں کو ختم کر دیا۔ قربانی کو ممنوع قرار دیا۔ ذات پات، جیسے برہمن اور شودر وغیرہ کے امتیازات کو ختم کر دیا۔ برہمنوں کی مذہبی بالادستی کو رد کر دیا، جہاں صرف سنسکرت زبان میں تعلیم دی جاتی تھی وہاں لوگوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دینے کا رواج پروان چڑھایا۔

''گوتم بدھ کے فلسفے نے روح کو بھی رد کیا۔ اس کے نزدیک کسی بھی شخص کی ذات کا کوئی وجود نہیں، بس ہر شخص میں چند صفات اور انفرادی خصوصیات ہوتی ہیں۔ صفات اور خصوصیات کا مجموعہ ایک ذات بنا دیتی ہے۔ جب یہ مجموعہ بکھر جاتا ہے تو ذات بھی فنا ہو جاتی ہے، یعنی انسان موت کی حالت میں چلا جاتا ہے۔ گوتم بدھ کے ہاں ذات کی نفی، ذات کے اثبات کے حق سے زیادہ قریب ہے۔'' بات کرتے ہوئے مجھے خیال آیا اپنے سامنے بیٹھے گونگے بہرے، اشخاص سے بھی کچھ پوچھا جائے۔ کیوں کہ اسکرین تو آف ہو چکی تھی، بس وہ میرے بولنے کی وجہ سے خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ''گوتم کا یہ فلسفہ درست ہے۔''

''کون سا فلسفہ مہک جی......'' امن کے تایا نے پوچھا تو مجھے انتہا خوشی ہوئی۔ اسکرین کے بند ہو جانے کے بعد ان میں حوصلہ پیدا ہو گیا تھا۔

''روح کو رد کرنے کا فلسفہ۔''

''یہ غلط فلسفہ ہے مہک جی۔''

''غلط کیوں ہے۔'' میرے اگلے سوال پر وہ خاموش ہو گیا۔ ''بولیے ناں...... آپ خاموش کیوں ہو گئے ہیں۔''

''جی وہ مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ کیسے مدعا بیان کروں۔''

''مہک جی، اگر آپ باہر جانا چاہ رہی ہیں تو میں لے چلتا ہوں۔'' امن کے تایا نے یک لخت موضوع ہی بدل دیا۔ مگر میرے ذہن میں چند مزید باتیں اُترنے لگی تھیں، میں نے بہتر جانا کہ انہیں بھی آگے پہنچا دوں۔ میں نے امن کے تایا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''میں کسی اور دن آپ کے ساتھ روح کے بارے میں بات کروں گی، فی الحال آپ گوتم بدھ کے بارے میں سنیے، جس نے تارک الدنیا جوگی کی طرح گوشہ نشینی اختیار نہیں کی۔ بلکہ وہ سرِ محفل رہا...... وہ اپنے نظریات و عقائد لوگوں کے اوصاف و قلوب میں بڑی مہارت کے ساتھ داخل کرتا رہا۔ ہندوستان کی اکثریت بدھ مت کو قبول کرنے لگی، چوں کہ لوگوں کی زیادہ تعداد برہمنوں کی مذہبی اجارہ داری سے عاجز تھی، اس لیے وہ جوق در جوق گوتم بدھ کی رسم و رواج کے خلاف بلند سرائے احتجاج میں شامل ہوتے گئے، گوتم بدھ بہت خوش قسمت رہا۔ اسے اپنے نظریات و عقائد کی تشہیر کے لیے اشوک، کنشک اور ہرش جیسے مہاراجوں کی سرپرستی بھی حاصل ہو گئی تھی۔ گوتم نے اپنے الگ مذہب کا

اعلان تو نہیں کیا، مگر لوگوں نے اسے بدھ مت کا الگ مذہب بنا کر اسے دیوتا کے عہدے پر فائز کر دیا۔ گوتم بدھ انسان سے خدا بن گیا۔ لنکا، کشمیر، گندھارا، ہمالیہ کے علاقے، مغربی جنوبی ہند، برما، ملایا سماٹرا، گوتم بدھ کا مذہب بنا کر پھیلتا چلا گیا، حتیٰ کہ اشونی جیسے حاکم نے تخت شاہی پر بیٹھ کر اس کا مذہب قبول کیا۔''

گوتم بدھ نے 563 قبل مسیح میں ہمیشہ محبت اور امن کا درس دیا تھا، مگر آج کا بدھ مت مذہب اور اس کے چیلے انتہائی ظالم اور سفاک ہیں۔ خصوصاً مسلمانوں کے معاملے میں۔ آج کا بدھ مت پنڈت بھی کسی مسلمان کو گاجر مولی کی طرح کاٹنے سے نہیں چوکتا، کیوں کہ انہیں اسلام سے اپنے وجود کا خطرہ محسوس ہو رہا ہے، اسلام تیزی سے پھیلنے والا مذہب ہے جس نے دوسرے تمام مذاہب کو جھوٹا اور من گھڑت ثابت کر دیا ہے۔ دوسرے بہت سے مذاہب کی طرح آج بدھ مت بھی بے شمار فرقوں میں بٹ چکا ہے۔

یہ دن پراسراریت میں گزرا تو اگلا دن میرے لیے کچھ نئے انکشافات لے کر نمودار ہوا۔ غالباً صبح دس بجے کا ٹائم تھا، کمرے کی حبس زدہ فضا مجھے مسلسل اذیت دے رہی تھی، باغ میں کھلی فضا کی خاطر جانے کے لیے میں کمرے سے باہر نکل آئی۔ گھر کے بیشتر افراد ابھی تک سو رہے تھے، ایک کمرے سے مجھے امن کے تایا کمل چند کی آواز سنائی دی، جھانک کر دیکھا تو امن کے بابا بھی محو گفتگو تھے۔

''قدم چند! مجھے ڈر لگنے لگا ہے''

''کس بات کا ڈر بھائی صاحب!'' قدم چند نے چونک کر بڑے بھائی کمل چند کو دیکھا۔ کمل چند اس خاندان کا سربراہ تھا۔ تین کنال کے گھر میں جتنے بھی افراد بستے تھے، چھوٹے یا بڑے سبھی اس کا انتہائی احترام کرتے تھے۔ بظاہر وہ انتہائی سمجھ بوجھ والا بردبار شخصیت کا مالک تھا۔ گھر والوں سے اس کا رکھ رکھاؤ بھی سگی اولاد کی طرح تھا، مگر مجھے لگتا تھا کہ یہ اس کا ظاہر ہے، باطن کچھ اور ہے۔ قدم چند کو بڑے بھائی کے منہ سے ڈر کی بات سن کر حیرت ہو رہی تھی۔

''قدم چند مجھے مہک جی سے ڈر لگنے لگا ہے۔'' کمل چند کی بات سن کر قدم چند ہی نہیں میں بھی الرٹ ہو گئی۔

''مہک جی سے۔'' قدم چند کی حیرت دُگنی ہو گئی۔ ''میں سمجھا نہیں بھائی صاحب!''

''قدم چند! کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم غلطی پر ہیں۔''

''ایم سوری بھائی صاحب!'' میں آپ کی بات سمجھ نہیں پایا۔

''قدم چند جو قیاس ہم نے مہک جی کے بارے میں اخذ کر رکھے ہیں۔ وہ محض قیاس ہی نہ ہوں۔''

''ایسا نہیں ہو سکتا بھائی صاحب!'' قدم چند کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا۔ ''مہک جی تو بہت پہلے ہمارے سارے قیاس سچ ثابت کر چکی ہیں، آپ کو یاد نہیں؟ مہک جی نے ہمیں جو بھی بتایا، یا جتایا...... وہ سب سچ ثابت ہوا، یہ اور بات ہے کہ کچھ اشارے ہم سمجھ نہ پائے اور اپنا نقصان کروا بیٹھے۔''

''تم کچھ بھول رہے ہو قدم چند!'' قدم چند بھائی کی بات سن کر پھر سے چونک پڑا۔ ''وہ کل کی بات تھی قدم چند، جب مہک جی مراقبے کی حالت میں تھیں، آج وہ اس کیفیت سے باہر آ چکی ہیں، کل وہ بے خودی میں بولتی تھیں، آج وہ جو بھی کہتی ہیں پورے ہوش و حواس میں کہتی ہیں، تم نے کل کی باتوں پر غور کیا......؟''

''جی ہاں بھائی صاحب! نہ صرف غور کیا، بلکہ بہت سی باتوں کو سمجھا بھی، مگر ایک بات آپ بھی بھول رہے ہیں۔''

اس بار سوالیہ نشان کمل چند کے چہرے پر نظر آیا۔

''کوئی عام لڑکی ہاتھ کے ایک اشارے سے پتھر کی سپاٹ دیوار کو روشن نہیں کر سکتی۔ اکیسویں صدی کے جدید دور میں 563 قبل مسیح کا انتہائی قدیم زمانہ ہم نے کسی فلم کی طرح دیکھا۔ کوئی عام لڑکی اس طرح حرف بہ حرف ٹھیک ٹھیک تاریخ نہیں بتا سکتی، بھائی صاحب آپ اور میں نے گوتم بدھ اور زرتشت کے بارے میں فقط سنا رکھا ہے، یا تھوڑا بہت پڑھا ہوا ہے، مگر مہک جی نے تو اسے دیوار پر فلم کے کرداروں کی طرح جیتا جاگتا لا کھڑا کر دیا۔ قدم چند انہی باتوں نے مجھے الجھا رکھا ہے، میں رات کے دو بجے تک باہر لان میں ٹہلتا رہا۔ سوچ در سوچ میرا ذہن الجھتا رہا۔ مہک جی کی کچھ باتیں

ہمارے خلاف جاتی ہیں، مگر کھلے دل سے سوچا اور سمجھا جائے تو......'' وہ لحظہ بھر رُک کر بولے...... ''وہ بالکل دُرست ہیں۔''

''بھائی صاحب! آپ مجھ سے عمر اور تحمّل دونوں میں بڑے ہیں، مگر میری درخواست ہے، مہک جی کے بارے میں کچھ اور مت سوچیے۔ بس یہ یقین کر لیجیے کہ وہ ویسی ہی ہیں، جیسا ہم نے ان کے بارے میں سوچ رکھا ہے......''

''وہ سب ٹھیک ہے قدم چند! مگر مہک جی کے منہ سے بہت سی باتیں ایسی نکل رہی ہیں جو ہماری حنا کو بری طرح متاثر کرنے لگی ہیں، کل کی باتوں میں سے بہت سے باتوں نے مجھے دہلا کر رکھ دیا۔ میرا ضمیر بھی بہت تڑپا، اسی تڑپ نے میری نیندیں حرام کر دی ہیں۔''

''گستاخی معاف بھائی صاحب! مہک جی جس مقام پر ہیں، وہاں وہ کچھ بھی کہہ سکتی ہیں، ہم بھلا کون ہوتے ہیں ان کی باتوں کو دل پر لینے والے۔ آپ یہ تو بہت اچھی طرح جانتے ہیں، وہ جو کہتی ہیں اس کے پس پردہ ہمارے فائدے کی ہی بات ہوتی ہے، آپ کو مکھن چند والی بات یاد ہے۔'' سوال پر چند لمحے خاموشی رہی، میں مکمل توجہ سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ طویل سانس کے بعد کمل چند کی آواز آئی۔ ''ہاں قدم چند! بہت اچھی طرح یاد ہے۔ مکھن چند کراچی کی پارٹی سے نئی ڈوپنگ کے لیے جا رہا تھا۔ ہم سب جانتے ہیں۔ بزنس کے معاملے میں میرے بیٹے مکھن چند کی سمجھ بوجھ سب پر حاوی ہے۔ اس لیے نہ مجھے کوئی اعتراض تھا نہ آپ کو اور نہ ہی لال چند کو کوئی اعتراض تھا۔ مگر جس سے مکھن چند کراچی کے لیے گھر سے نکلنے لگے مہک جی آ گئی، اس نے مکھن چند کو بازو سے پکڑ کر کہا۔''

''اس پار مت جاؤ، اُس پار جانے کے لیے ایک ہی راستہ ہے۔ اس راستے میں آگ کا دریا آتا ہے، دریا میں ڈوب کر اس پار اُترنا ہے، تم آگ میں ڈوب کر صحیح سلامت اس پار نہیں پہنچ سکتے۔''

ہاں بھائی صاحب! تب ہم کچھ سمجھ نہ پائے تھے۔ مہک جی کا اصل مدعا کیا ہے، وہ کیا کہنا چاہتی ہیں، مگر مکھن چند کراچی گیا تو وہ پارٹی ایک نمبر کی فراڈ نکلی، مکھن چند جیسا فصیح و بلیغ دماغ والا بزنس مین بھی ایسا پھنسا کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ ایک کروڑ بیس لاکھ کا مالی نقصان بھی اٹھایا اور مشکلوں سے جان خلاصی بھی ہوئی، تب ہمیں پتا چلا مہک جی وہاں جانے سے کیوں روک رہی تھی۔ وہ کون سے آگ کے دریا کی بات کر رہی تھی۔ فراڈ پارٹی زیرزمین دنیا کا خطرناک گروہ تھا، جن کے چنگل سے نکلنا آگ کا دریا عبور کرنے کے مترادف تھا، ہم سب کی جانیں ناک کی نوک پر آ گئی تھیں۔

''بھائی صاحب! آج بھی وہی مہک جی ہیں، کل وہ مراقبے میں کہتی تھی، آج ہوش و حواس میں کہتی ہیں، مگر جو بھی کہتی ہیں، ہمارے ہی بھلے کے لیے کہتی ہیں۔'' قدم چند نے کمل چند کا تسلی دینے کے انداز میں ہاتھ سہلایا۔

دونوں بھائیوں کی گفتگو میرے لیے سوچ کے نئے دروا کر گئی۔ میں مراقبے میں تھی اور اس حالت میں بہت کچھ ایسا کہہ گئی تھی جو ان لوگوں کے لیے سودمند ثابت ہوا تھا۔ بات کچھ کچھ میرے ذہن میں اُتر رہی تھی۔ یہ تیسرا واقعہ تھا جو میرے علم میں آیا تھا۔ اس سے پہلے انکل فہیم اور جنگل کی لڑکی والا واقعہ بھی مجھے یاد ہے۔ ان کا حد سے زیادہ احترام دینا، ہاتھ جوڑ کر باادب باملاحظہ کھڑا ہونا، سوچتے سوچتے میں ایک خیال سے اُچھل پڑی۔ ''کہیں یہ لوگ بھی گوتم بدھ کی طرح میری پوجا نہ کرنے لگیں۔ کہیں میں بھی انسان سے دیوتا کے روپ میں نہ ڈھل جاؤں؟'' یہ سوچتے ہوئے دوپہر سر پر آ گئی۔ کھڑکی سے پار کڑک دھوپ پورے جوبن پر تھی، لان کے درخت پژمردہ اور مرجھائے ہوئے لگ رہے تھے۔ چلچلاتی دھوپ نے پودوں کو کملا دیا تھا۔ گرمی کی تپش عروج پر تھی۔ اچانک میں نے نرملا کو دیکھا۔ نرملا کمل چند کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی، چودہ پندرہ سال کی خوبرو لڑکی، یوں تو میں اسے ہر روز دیکھتی ہوں، مگر آج وہ کچھ پریشان سی لگ رہی تھی۔ اس کی حرکات و سکنات میں عجیب سی اضطراری اور پراسراریت جھلک رہی تھی۔ میں اس کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ اسے عقبی دروازے سے باہر نکلتے دیکھ کر چونک پڑی، جس انداز میں اس نے دروازہ پار کیا تھا اس سے میں کھٹک گئی۔ میں فوراً باہر نکلی اور نرملا کے پیچھے ہو لی۔ تین کنال کے گھر سے میں پہلی بار باہر نکلی تھی، باہر مکمل ویرانہ تھا۔ یہ گھر الگ تھلگ بنا ہوا تھا۔ زمین ریتیلی تھی، مگر اس میں کہیں کہیں جھاڑی نما درختوں کے جھنڈ نظر آ رہے تھے۔ میں نے تیز قدموں سے نرملا کو تاڑ لیا۔ وہ بار بار مجھے مڑ کر دیکھ رہی تھی، حواس باختہ نظروں سے ماحول کو دیکھتے ہوئے تیز قدموں سے چلی جا رہی تھی،

میں نے محسوس کیا کہ دوپٹے سے اس نے چہرہ اس حد تک ڈھانپ رکھا تھا کہ کوئی بھی آنے جانے والا شخص اسے پہچان نہیں سکتا تھا۔ میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا۔ نرملا کسی سے ملنے جا رہی ہے۔ اور وہ کوئی لڑکی نہیں لڑکا ہو سکتا ہے، جس سے ملنے کے لیے وہ اتنی احتیاط برت رہی ہے۔ نرملا آدھا گھنٹہ مسلسل چلتی رہی، مختلف گلیاں، موڑ اور کئی کھیت ہم نے پار کیے، آخر وہ ایک بڑے سے درخت کے پاس جا کر رک گئی، درخت کی اوٹ میں رہ کر وہ بار بار اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی، بالکل واضح تھا کہ اسے کسی کا انتظار ہے، رفتہ رفتہ انتظار پریشانی اور بے چینی میں بدلنے لگا۔ وقت انتہائی سست روی سے گزر رہا تھا۔ جہاں نرملا کھڑی تھی وہاں سے فرلانگ بھر دور ذیلی سڑک گزر رہی تھی۔ سڑک سے کبھی کبھی کوئی سواری یا پیدل چلنے والے آدمی نظر آ جاتے تھے، ورنہ اس طرف مکمل ویرانی اور خاموشی تھی۔ انتظار بھی طویل ہونے لگا تو مجھے لگا نرملا دوپٹے میں منہ چھپائے رو رہی ہے۔ اب اس کے پاس جانا ضروری ہو گیا۔ مجھے اپنے سامنے پا کر نرملا یوں اچھلی جیسے اسے گیارہ ہزار وولٹ کا کرنٹ لگا ہو۔ اس کے جواں سال خوب صورت چہرے پر حیرت اور پریشانی جم کر رہ گئی۔ میں نے اس کا جائزہ لیا۔ وہ پسینے سے شرابور تھی، اس کا جسم خوف سے کانپنے لگا۔ گرم دوپہر، تپتی دھوپ، لرزتا وجود اور ننگے پاؤں...... پیار، محبت کی حد پار کر کے عشق کی سرحد پر آ کھڑا ہے۔

''نرملا......'' میں نے اسے پکارا، مگر وہ سکتے میں کھڑی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا وہ حیرت سے بت بن گئی ہے۔ نہ کوئی حرکت کر سکتی ہے اور نہ ہی بول سکتی ہے، میں نے آگے بڑھ کر اسے جھنجوڑا۔

''نرملا۔''

''ہوں...... ہوں...... مم...... مہک جی...... آپ......''

''ڈرو مت...... خود کو سنبھالو......'' اس نے درخت کا سہارا لے رکھا تھا۔ میں نے دیکھا اس کی ٹانگیں تھر تھر کانپ رہی ہیں...... ''بیٹھ جاؤ نرملا'' میں نے اسے شانوں سے پکڑ کر نیچے بٹھا دیا اور خود بھی اس کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گئی۔

''نرملا! وہ نہ ملا تو کیا کرو گی......؟'' ایسا سوال جو اس کی توقع سے بالکل ہٹ کر تھا۔ خشک لبوں کو جنبش دینا اس کے لیے ممکن نہ رہا۔ ''بولو نرملا...... وہ نہ ملا تو کیا کرو گی۔''

''مر...... مر جاؤں گی......''

''مر جاؤ گی یا خود کو مار دو گی......'' اگلے سوال پر وہ خاموش ہو گئی، چہرے پر گہری سوچ اور فکر تھی...... ''نرملا...... جواب دو...... وہ نہ ملا تو مر جاؤ گی یا خود کو مار دو گی......''

''ایک ہی بات ہے...... مر جاؤں...... یا......'' تھوڑا سا توقف ہوا...... پھر بولی...... ''خود کو مار دوں......''

''ایک ہی بات نہیں نرملا...... بہت، بہت بڑا فرق ہے۔'' پھر سے خاموشی اور گہری سوچ......

''خود کو مار دوں گی۔''

''ہار گئی ہو نرملا...... پیار تمہارے بس کا روگ نہیں...... واپس پلٹ جاؤ، تمہارے حق میں یہی بہتر ہے۔''

''مم...... میں سمجھی نہیں۔''

''گھر سے کس ارادے سے نکلی ہو...... اس سے ملنے آئی ہو یا اس کے ساتھ بھاگ جانے کے لیے۔''

''وہ...... وہ ہمارے گھر ایک بار رشتہ بھیج چکا ہے، ڈیڈ نہیں مانے...... اس لیے۔''

''نرملا! گھر چلی جاؤ۔ پلٹ جانا تمہارے لیے اچھا ہے، بات مانو گی تو فائدے میں رہو گی، بصورت دیگر تیرے کھاتے میں صرف نقصان لکھا ہوا ہے۔'' ایک بار پھر خاموشی اور گہری سوچ۔

''کیا سوچ رہی ہو۔''

یہی کہ آپ کا کہنا ہمیشہ درست ثابت ہوا ہے۔ گھر نہ پلٹی تو نقصان اٹھاؤں گی۔ لگتا ہے مجھے میرا پیار ملنے والا نہیں۔''

''مایوسی بھرا لہجہ اور اُداسی بھرا چہرہ...... پیار کرنے والوں کے حصے میں اکثر یہی آتا ہے۔''

''نرملا تُو ابھی نہیں جانتی پیار کیا ہوتا ہے، اور جو پیار کو جانتی ہی نہیں تو اس کے لیے سب یکساں ہے، وہ ملے یا نہ ملے۔''
''نن......نہیں مہک جی......وہ......''
''نرملا گھر جاؤ......جس دن پیار کو سمجھنے لگ گئی میں وعدہ کرتی ہوں۔ اُس سے ملوادوں گی۔'' میرے لہجے کی سنجیدگی کو نرملا نے بھانپ لیا، اس لیے خاموشی سے سر جھکائے واپس پلٹ گئی۔
''رُکو......'' میں نے پیچھے سے اُسے آواز دی تو اس نے پلٹ کر میری جانب دیکھا۔ میں چل کر اس کے پاس پہنچی...... ''یہ پہن لو، کوئی ننگے پاؤں دیکھے گا تو تمہارے بارے میں کیا سوچے گا۔''
''اور آپ......آپ مہک جی۔''
''میری فکر مت کرو......'' میں نے دائیں بائیں دیکھا...... ''مجھے یہاں کون جانتا ہے، اجنبی شہر کے اجنبی لوگ، میرے بارے میں کچھ غلط سوچ بھی لیا تو مجھے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔''
نرملا کے جانے کے پندرہ منٹ بعد لمبے بالوں والا اسمارٹ سا لڑکا گھبرایا ہوا وہاں پہنچا۔ اس کی اضطرابی حالت اور بے قرار نگاہیں بتا رہی تھیں کہ وہ کس کا متلاشی ہے۔ آگے پیچھے، دائیں بائیں بے چین اور پریشان نگاہیں دوڑ رہی تھیں۔
اس کے چہرے پر پریشانی اور مایوسی کے آثار تھے، نرملا نے کہا تھا تیار ہو کر سوٹ کیس کے ساتھ آئے گا، مگر یہ چلتے ہوئے مجھے دیکھ رہا تھا۔ آگے دیکھتا تو قدم تیز کر لیتا اور دائیں بائیں دیکھنے پر آہستہ، میں اس کے بہت نزدیک ہو گئی تھی، مگر اس نے مجھے دیکھا نہیں۔ اس بار جب وہ پیچھے دیکھتے ہوئے آگے چلنے لگا تو میں اس کے سامنے کھڑی ہو گئی، میرے ہاتھ کی روک نے اسے اچھلنے پر مجبور کر دیا۔
''سو......سوری......وہ میں......دیکھ نہ سکا۔'' کچی عمر کا لڑکا ہے، سترہ اٹھارہ برس کا سجیلا نوجوان، چہرے کی جلد لڑکیوں ایسی تھی۔ داڑھی اور مونچھوں کے بال ابھی پوری طرح نمودار نہیں ہوئے، چست جینز اور بلیو ہاف آستین شرٹ میں ملبوس تھا۔ میری گہری نگاہوں کی تاب نہ لا کر سائیڈ سے گزرنے کی کوشش کی تو میں نے اس کی کلائی پکڑ لی......اسے زور کا کرنٹ لگا۔
''نرملا کو تلاش رہے ہو۔'' اس بار وہ حواس باختہ ہو گیا۔ حلق خشک اور ہونٹ سوکھ گئے۔ مجھے لگا وہ کچھ بھی کہنے سے قاصر ہو چکا ہے۔ میں نے کلائی کو زور سے دبایا تو اس کے منہ سے بے اختیار سسکی نکل گئی۔
''مرد ہو کر لڑکی سے کلائی نہیں چھڑا سکتے ہو۔ نرملا کو بھگا کر کیسے لے جاتے......کسی مرد نے رستہ روک لیا تو جینز کے پائنچے باندھنا پڑیں گے۔ ورنہ ساری گندگی ٹخنوں سے باہر نکل آئے گی۔'' میں نے اس کے سینے پر سیدھی ہتھیلی کی ضرب رسید کی۔ وہ بری طرح لڑکھڑا گیا۔ گرمی پہلے سے سوا تھی، اوپر سے گھبراہٹ نے اس کا برا حشر کر دیا تھا۔ میں نے انتہائی تلخ لہجے میں پوچھا۔ ''سوٹ کیس کہاں ہے؟''
''جی......وہ......آپ کون ہیں۔''
''سوال نہیں، جواب......صرف جواب چاہیے مجھے......سوٹ کیس کہاں ہے؟''
''نہیں......نہیں لا سکا......میں......نرملا کو یہی بتانے آیا تھا۔ مم......''
''آگے بولو۔ خاموش کیوں ہو گئے ہو؟''
''ہم بھاگ کر غلطی کریں گے......''
''غلطی کیوں......پیار نہیں کرتے اُس سے......؟''
''کر۔ کرتا ہوں۔'' اس نے آستین سے پیشانی کا پسینا صاف کیا اور اِدھر اُدھر دیکھا۔
''پھر۔ جب پیار کرتے ہو تو غلطی کیسی، رشتے سے انکار ہو جائے تو دو پریمی بھاگ کر کورٹ میرج ہی کرتے ہیں۔''
''میرا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ ہم......ہم بھاگ کر کہاں جائیں گے؟ کیا کریں گے؟ کہاں رہیں گے؟''
''رب کی دنیا بہت بڑی ہے، تم ہمت تو کرو۔'' اس بار وہ خاموش ہو گیا۔ وہ مجھے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں لے

س کی ناک پر چمکنے والے پسینے کو انگلی سے ہٹانا چاہا تو دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔
''تم اتنے ڈرتے کیوں ہو......'' وہ خاموش رہا تو میں نے دوسرا سوال کیا۔ ''تمہارا نام کیا ہے۔''
''عزیز الرحمٰن!'' مختصر جواب دے کر وہ پھر چپ ہو گیا۔
''عزیز الرحمٰن! نرملا کے ساتھ کورٹ میرج کرو۔ کرائے پر گھر لو اور محنت مزدوری کرو، نرملا گھر اور تمہارے بچے سنبھالے گی اور تم گھر کے چولہے کی فکر کرنا۔ زندگی کی گاڑی چل پڑے گی۔'' میری باتوں سے وہ مزید گھبرایا گیا۔
''نرملا کہتی ہے۔ وہ مجھے نہ ملا تو میں مر جاؤں گی، تمہارا کیا ارادہ ہے۔''
''میں نرملا سے بہت پیار کرتا ہوں۔''
''کتنا......؟ زمین و آسمان جتنا......؟''
''اس سے بھی زیادہ......''
''زمین و آسمان بہت بڑے ہیں پاگل، کسی مالک کی ایک فیکٹری جل جائے تو اس کا ہارٹ فیل ہو جاتا ہے، اگر تمہیں تمہارا آسمان اور زمین نہ ملے تو جی پاؤ گے۔'' وہ الجھن کا شکار ہو رہا تھا۔ میں نے لہجے میں تلخی پیدا کر کے کہا۔ ''چپ مت رہو۔ جواب دو۔ زمین و آسمان کو آگ لگ جائے تو کیسے جی پاؤ گے۔''
''مر جاؤں گا۔'' یک دم پر اعتماد لہجے میں بولا۔
''مر جاؤ گے یا خود کو مار دو گے؟''
''ایک ہی بات ہے؟''
''ایک ہی بات نہیں ہے۔ بہت فرق ہے۔ جواب دو۔''
''خود کو مار دوں گا۔'' اس بار بھی اس کے لہجے میں خود اعتمادی تھی۔
میں نے خنجر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''نرملا تمہیں کبھی نہیں ملے گی، لو اپنی کلائی یا شہ رگ کاٹ دو۔''
وہ خوف زدہ ہو کر اس کی جانب سرکا۔
''عزیز الرحمٰن! پیار میں خود کو مار دینا سب سے آسان کام ہے، تم وہ بھی نہیں کر سکتے تو پیار کے دعوے دار مت بنو۔''
''گھر جاؤ ماں کے ہاتھ سے دودھ پیو اور سو جاؤ۔'' میرے کہتے ہی وہ واپس پلٹا اور دھیرے دھیرے چل پڑا۔ چند قدم چلنے کے بعد رک کر اس نے مڑ کر مجھے دیکھا۔ میرا دھیان اسی کی طرف تھا، وہ واپس پلٹ آیا۔
''پیار میں سب سے آسان کام خود کو مار دینا ہے، تو سب سے مشکل کام کون سا ہے۔''
''مر جانا...... مر جانا سب سے مشکل کام ہے۔''
''میں سمجھا نہیں...... مر جانا یا مار دینا...... دونوں کا انجام تو موت ہی ہے۔''
''سادہ سی بات ہے عزیز الرحمٰن...... پانی کے ساتھ زہر کی گولی لی اور موت کی آغوش میں چلا گیا۔ چوہے مار چار گولیاں نگلیں پھر بندہ ٹائیں ٹائیں فش...... یہ کون سا مشکل کام ہے۔ مگر مر جانا...... بہت ہی مشکل ہے، کسی کی یاد میں اتنا تڑپو...... کہ ہر عضو درد سے چیخ جائے۔ نہ کھانے کا ہوش ہو نہ پینے کا، نہ اس جہاں کا نہ اس جہاں کا...... شہر، جنگل اور صحرا سب برابر ہو جائیں اور گھٹ گھٹ کے وقت نزع آ پہنچے مگر لبوں پر محبوب کا نام مچل رہا ہو...... اور...... بس......'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے، مجھے خاموش کروا دیا۔ ''میں فرق سمجھ گیا...... میں واقعی نرملا سے پیار نہیں کرتا...... جس دن کرنے لگوں گا اب اسی دن آپ کے سامنے آؤں گا۔'' عزیز الرحمٰن جانے کے لیے پلٹا تو میں نے اسے آفر دی۔
''رکو عزیز الرحمٰن'' وہ رک گیا مگر میری طرف پلٹا نہیں، میں چل کے اس کے قریب گئی۔
اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''میں وعدہ کرتی ہوں...... اب جب بھی میرے پاس آؤ گے، نرملا تمہارے حوالے کر دوں گی......'' عزیز الرحمٰن چلا گیا۔
میں جب گھر میں داخل ہوئی تو تقریباً پورے گھر کو اپنا منتظر پایا۔ ان کے چہروں سے پریشانی ہویدہ تھی، قدم چند

کے چہرے پر ہوائیں اُڑ رہی تھیں وہ حواس باختہ انداز میں میری جانب لپکا۔
''مہک جی...... آپ...... کہاں چلی گئی تھیں۔'' میں نے اسے، پھر گھر والوں کو دیکھا، گرمی کی وجہ سے ان کے بدن بھیگ رہے تھے۔
''آپ لوگ اس قدر پریشان کیوں ہیں؟''
''آپ کی وجہ سے مہک جی۔'' قدم چند فوراً بولا۔
''میری وجہ سے کیوں......'' اس بار وہ خاموش رہا، کمل چند تھوڑا سا آگے بڑھ کر بولا۔
''مہک جی! آپ کو گھر میں نہ پاکر ہم سب پریشان ہو گئے تھے۔''
''بھئی آپ سب لوگ گھر سے باہر جاتے ہیں۔ مرد اپنے آفسز جوائن کرتے ہیں، بچے اسکول و کالج جاتے ہیں، عورتیں شاپنگ کے لیے بازار بھی جاتی ہیں، اگر میں پانچ منٹ کے لیے باہر نکل گئی تو کون سی قیامت آن ٹپکی کہ آپ تمام لوگ پریشان ہو گئے۔''
میں نے باری باری سب لوگوں کو دیکھا۔ نجانے یہ لوگ کون سی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ ہمیشہ میرے سامنے باادب باملاحظہ ہو جاتے ہیں، نہ اونچا بولتے ہیں نہ عام فہم کوئی حرکت کرتے ہیں، لگے بندھے انداز میں کھڑے رہتے ہیں...... میں نے کمل چند کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ ''میں چار پانچ سال کی بچی نہیں ہوں...... گھر سے باہر کہیں جاؤں تو خواہ مخواہ آپ لوگ پریشان مت ہو جایا کریں۔''
میری نگاہ قدم چند کی طرف اٹھی تو اسے اپنے ننگے پاؤں کو گھورتا ہوا پایا۔
''آپ لوگوں کا گھر بالکل الگ تھلگ ہے، راستے میں نشیب و فراز بھی ہیں، خاردار جھاڑیاں اور عجیب و غریب جڑی بوٹیاں بھی ہیں، انہی میں الجھ کر چپل ٹوٹ گئی تھی، باہر ہی پھینک آئی ہوں۔''
''مہک جی! آپ نے خوامخواہ تکلیف اٹھائی، مجھے کہا ہوتا، میں گاڑی میں لے جاتا۔''
''کہا تو تھا، بھول گئے آپ۔'' میں نے کہا تو قدم چند نے نگاہیں جھکالیں۔ میں انہیں ہکا بکا چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔
میں نے محسوس کر لیا تھا کہ مجھے جلد سے جلد اپنی پوزیشن واضح کر لینی چاہیے۔ ورنہ جانے انجانے میں پتا نہیں میں کیا سے کیا بن جاؤں، گھر کا کوئی بھی فرد مجھے میری اصلیت بتانے سے رہا، لہٰذا مجھے خود ہی ہاتھ پاؤں مارنے پڑیں گے۔ جس طرح چند روز پہلے میں نے چھپ کر دونوں بھائیوں کی گفتگو سنی تھی، اس طرح کی جاسوسی مجھے بہت کچھ اندر کی باتیں بتا سکتی تھی۔ گھر کے بڑے ہونے کے ناتے کمل چند اور قدم چند ہی میرے لیے سودمند ثابت ہو سکتے ہیں۔ میں نے انہیں ٹارگٹ پر رکھ لیا۔ موقع ملتے ہی اگلی گفتگو سننے کی کوشش میں لگ گئی، مگر اس بار جو کچھ میں نے سنا، میں اپنا سر پکڑ کر رہ گئی۔ قدم چند کمل چند کے کمرے کی طرف تیز قدموں سے جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر غیر معمولی جوش تھا۔ چہرے کے تاثرات چغلی کھا رہے تھے کہ آج اسے بہت بڑی خوش خبری ملی ہے۔ وہ جیسے ہی بالائی منزل پر واقع کمل چند کے کمرے میں داخل ہوا...... میں بھی، اس کی ٹوہ میں اس کے پیچھے ادھر پہنچ گئی، کمل چند کے بیڈروم کے سامنے اسٹڈی روم تھا۔ اس سے ملحق دو مزید کمرے تھے، اس طرف تین کمرے تھے، میں احتیاط سے وہاں یوں بیٹھ گئی جیسے پاؤں میں موچ آ گئی ہے۔ مبادا کوئی فرد کسی کمرے سے اچانک نکلے تو بہانہ تراشا جا سکے، بیڈروم کا دروازہ اندر سے لاک نہیں تھا۔ میں نے دباؤ ڈال کر آہستگی سے دروازہ نیم وا کر دیا۔ قدم چند کی خوشی سے لبریز آواز میں نے سنی۔
''صاحب بھائی، ابھی ابھی فہیم کا لاہور سے فون آیا ہے۔''
''قدم لگتا ہے تمہارے دوست نے تمہیں کوئی بہت بڑی خوشخبری سنادی ہے۔''
''ہاں بھائی صاحب بالکل۔''
''اچھا...... کیا فہیم نے لاہور کے قبرستان میں مٹی کی ڈھیری کو پالیا ہے۔''

''بھائی صاحب نہ صرف مٹی کی ڈھیری کو پالیا ہے بلکہ وہ سب کچھ پا چکا ہے جس کے لیے وہ سالہا سال سے ترس رہا تھا۔''

''مطلب......؟''

''مطلب یہ کہ بھائی صاحب...... کہ مہک جی نے ایک بار پھر معجزہ کر دکھایا ہے۔''

''اوہ......'' کمل چند کی اوہ کے ساتھ ہی مجھے لگا کوئی اس طرف آ رہا ہے، میں فوراً اسٹڈی روم میں داخل ہوگئی۔

داخل ہوتے وقت جو آخری بات میرے کانوں میں پڑی اس سے میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ باہر قدموں کی چاپ واضح ہونے لگی۔ شاید کوئی اسٹڈی روم کی طرف بڑھ رہا ہے، میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، کوئی ایسی چیز جسے میں لینے کا بہانہ بناؤں۔ کتابوں کی بڑی بڑی الماریاں، گلدان، میز، کرسیاں اور صوفے، ٹیبل لیمپ اور شوپیس کی الماری میں فولڈ کتابوں کی ایک الماری کے پاس کھڑی ہوگئی۔ میری پیٹھ دروازے کی طرف تھی، مگر کان باہر قدموں کی چاپ کی جانب متوجہ تھے۔ قدموں کی آواز بالکل دروازے کے پاس سنائی دی، مگر آنے والا آگے نکل گیا۔ میں نے سکون کی سانس لی اور جو کتاب غیر غیر ارادی طور سے اٹھالی تھی، وہ واپس رکھ دی۔ تھوڑا سا توقف کے بعد میں خارجی دروازے کی طرف بڑھی، مگر دروازے کے پاس پہنچتے ہی میرے دماغ میں ایک دھماکہ ہوا۔ میرے قدم وہیں تھم گئے، میں تیزی سے پلٹی اور وہ کتاب دوبارہ اٹھالی جو واپس رکھ دی تھی۔ اس بار میں نے جوں ہی کتاب اٹھائی تو میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے دوبارہ کتاب کو الٹ پلٹ کے دیکھا۔ یہ کتاب یہاں اس گھر میں...... مجھے اپنی آواز بھی اجنبی لگ رہی تھی، حیرت کا مکہ میرے دماغ کو مسلسل گھورنے لگا۔ کتاب چھوٹی تپائی پر رکھ کر میں نے لائبریری کی ساری کتابیں دیکھ لی تھیں۔ میں جیسے جیسے کتابیں دیکھتی رہی میری حالت دگرگوں ہوتی رہی، حتیٰ کہ ٹانگوں میں ارتعاش اُمڈ آیا۔ دل کی دھڑکن تیز تیز چلنے لگی، میں نے جس کتاب کو بھی اُٹھایا اس نے میرا دل مٹھی میں بھرلیا اور یہ مٹھی بڑی سخت تھی جس سے دل دُکھنے لگا۔ ایک دراز کھولی تو اس میں ایک کتاب سرخ کپڑے میں لپٹی ہوئی دکھائی دی، اُٹھا کر دیکھا تو مجھے لگا میں پاگل ہو جاؤں گی۔ یہاں سب کچھ میری سوچ اور اندازے کے الٹ ہو رہا تھا۔ میں نے دراز سے ملنے والی کتاب کو سرسری سا دیکھا، دیکھنے کے بعد دوپٹے کے نیچے کیا، سب سے پہلے جو کتاب اٹھائی تھی اسے بھی اٹھایا اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ قدم چند اور کمل چند کی آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں، مگر وہ کیا کہہ رہے تھے مجھے اب اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میں جلد سے جلد اپنے کمرے میں پہنچنا چاہتی تھی۔ کمرے میں پہنچتے ہی میں نے اندر سے دروازہ لاک کیا اور دونوں کتابیں اپنے سامنے ٹیبل پر رکھ دیں۔ کچھ دیر میں شش و پنج میں رہی کہ کون سی کتاب پہلے اُٹھاؤں، چند سیکنڈ کے بعد میں نے دراز سے ملنے والی کتاب اٹھالی۔

کتاب کی نوعیت تو میں جان گئی تھی، مگر مجھے دھڑکا تھا کہ شاید اس کی زبان میں نہ پڑھ پاؤں، لیکن میرا خدشہ غلط ثابت ہوا۔ میں نے جہاں سے اسے کھولا زبان روانی سے چلنے لگی، جس طرح لفظ بہ لفظ میری زبان پہ اُتر رہا تھا، اس سے میں نے نتیجہ اُخذ کیا کہ میں اس کتاب کو پہلے بھی کہیں پڑھتی رہی ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ فی الوقت وہ وقت مجھے یاد نہیں آ رہا۔ نگاہیں کتاب کی سطروں پر بھاگ رہی تھیں۔

''اے قید خانہ کے رفیق و متفرق معبود اچھے یا ایک معبودِ حق جو سب سے زبردست ہے وہ اچھا...... تم لوگ تو خدا کو چھوڑ کر صرف چند بے حقیقت ناموں کی عبادت کرتے ہو جن کو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے (آپ ہی) ٹھہرا لیا ہے خدا تعالیٰ نے تو ان (کے معبود ہونے) کی کوئی دلیل (عقلی یا نقلی) بھیجی نہیں۔ (اور) حکم (دینے کا اختیار صرف) خدا ہی کا ہے (اور) اس نے حکم دیا ہے بجز اس کے کسی کی عبادت مت کرو یہی (توحید کا) سیدھا طریقہ ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔''

میں نے الفاظ پر غور کیا۔ ہر لفظ کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے بعد جب اس کی تشریح میں سوچا تو میرا دماغ آہستہ آہستہ وسیع ہونے لگا۔ میں نے چند ورق آگے پڑھنا شروع کر دیا۔

''اور یہ لوگ آپ سے روح کو (امتحاناً) پوچھتے ہیں، آپ فرما دیجیے کہ روح میرے رب کے حکم سے بنی ہے۔''
روح کا ذکر آیا تو میں ٹھہر گئی۔ مجھے لگا جیسے میرے اندر قطرہ قطرہ پانی جمع ہو رہا ہے۔ جب پانی قطرے کی صورت میں دل کی زمین پر گرنا شروع ہوا تو اس کا گیلا پن پھیلتا گیا۔ میرا دماغ کھلنے لگا میں نے پھر سے پڑھنا شروع کر دیا۔
''اُسی کی ملکیت ہیں جو چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جو چیزیں زمین میں ہیں اور جو چیزیں ان دونوں کے درمیان میں ہیں اور جو چیزیں تحت الثریٰ میں ہیں۔''
میں پڑھتی جا رہی تھی اور پھر دماغ روشن ہوتا جا رہا تھا۔ زمین کے اندر جو تر مٹی ہے، اسے ثریٰ کہتے ہیں تحت الثریٰ سے مراد وہ چیزیں جو زمین کی تہ میں ہیں۔ میرے وجود میں عجیب و غریب سنسنی پھیلنے لگی۔ جب میں نے آگے پڑھا تو سوچ کی اتھاہ گہرائیوں میں گر گئی۔
''اور اس نے تمہارے لیے رات اور دن اور سورج اور چاند کو (اپنا) مسخر (قدرت) بنایا اور ستارے (بھی) اس کے حکم سے مسخر ہیں۔ بے شک اس میں (بھی) عقلمند لوگوں کے لیے چند دلیلیں (موجود) ہیں۔''
جس طرح سفید دیوار پر اسکرین روشن ہوتی رہی ہے، اسی طرح ایک اسکرین میرے اندر بھی روشن ہونے لگی، میں نے اسکرین کی طرف دھیان دینے کی بجائے کتاب کو پڑھنے پر توجہ مرکوز رکھی۔
''لوگو اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا تاکہ تم اس کے عذاب سے بچو، اسی نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے مینہ برسا کر تمہارے کھانے کے لیے انواع و اقسام کے میوے پیدا کیے، پس اور کسی کو اللہ کا ہمسر نہ بناؤ۔''
ٹھک ٹھک ٹھک...... میں آگے پڑھنا چاہتی تھی مگر میرے دل کے دروازے پر دستک ہونے لگی۔ جھانکا تو اسکرین کو روشن اور متحرک پایا، میں نے بے اختیار آنکھیں بند کر لیں، باہر کے مناظر کھلی آنکھوں سے دیکھے جاتے ہیں، مگر اندر جھانکا جائے تو بند آنکھوں سے سب کچھ واضح نظر آتا ہے۔ اسکرین میں جو منظر دکھائی دے رہا تھا، اس میں بہت سارے لوگ جمع تھے۔ تمام لوگوں کے چہروں پر پریشانی اور فکرمندی واضح تھی۔ میں کسی مرد کے ساتھ گاڑی میں سوار لوگوں کے ہجوم کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بہت زیادہ دھیان دینے کے بعد بھی میں مرد کو پہچان نہ پائی۔ اس کے چہرے پر چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی رنگ گورا اور قد لمبا تھا، ناک درمیان سے تھوڑی سی پچکی ہوئی تھی، سر کے بال چھوٹے چھوٹے تھے۔ نفیس شلوار قمیص میں وہ بہت خوب صورت سا لگ رہا تھا، مگر میں اسے پہچاننے سے معذور تھی۔ ہم لوگ ہجوم میں چلے گئے۔ ہجوم والوں نے ہمارے گرد دائرہ بنا لیا، میں لوگوں سے باتیں کرنے لگی، پھر ہم ایک طرف چل پڑے وہاں تین کڑاہیاں رکھی ہوئی تھیں جن میں کوئلے جل رہے تھے، یہاں کچھ باتیں ہوئیں، اس کے بعد میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جب میں ننگے پاؤں آگ میں کود پڑی اور آگ کو پاؤں سے مسل کر سرمہ بنا دیا۔
خوف سے میں نے آنکھیں کھول دیں، میرا پورا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ میری حالت ابتر ہو گئی، میں نے فوراً کتاب بند کر کے کپڑے میں لپٹی اور دونوں کتابیں اٹھا کر سیف میں رکھ دیں۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لے کر خود کو نارمل کیا، پھر غسل کے لیے باتھ روم میں گھس گئی۔
امن کراچی سے لوٹ آیا تھا۔ اس نے آتے ہی میرے کمرے میں حاضری دی، پہلے تو حسب معمول ہاتھ جوڑے آنکھیں بند کیں اور دل ہی دل میں کچھ پڑھا۔ جب اس مشغلے سے فارغ ہوا تو میں نے پوچھا۔
''امن آپ بنا بتائے کراچی چلے گئے۔''
''مہک جی! میں نے آپ کو نہ صرف بتایا تھا، بلکہ جانے کی اجازت بھی لی تھی۔ آپ کی اجازت کے بنا میں اتنا لمبا سفر نہیں کر سکتا۔'' امن کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے، مگر مجھے اس کی اجازت والی بات یاد نہیں تھی، میں مزید کسی بحث میں پڑنے کے عام موضوع پر لوٹ آئی۔
''امن میں نے آپ کو بہت یاد کیا۔ آپ کی کمی نے بے چین کیے رکھا۔''

''مہک جی میری خوش قسمتی ہے کہ آپ نے مجھے یاد رکھا۔ میں آپ کی یاد میں رہا، اسی لیے مجھے کراچی میں بے حد عزت ملی، میرا مان بڑھا اور قدر و منزلت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ بہت شکریہ مہک جی۔ مگر......''

''مگر کیا امن......''

''مگر آپ بے چین کیوں تھیں۔''

''اپنے سوالات کا جوابات پانے کے لیے...... امن آپ نے مجھ سے کچھ وعدے کیے تھے۔ یاد ہیں ناں؟''

''مہک جی......'' امن نے کہتے ہوئے تذبذب میں پہلو بدلا۔ میں تڑپ کر بولی۔

''امن آپ کے سوا اس گھر میں میرا کوئی دوسرا مددگار نہیں۔''

''آپ کا مددگار......'' لہجے میں حیرت کا عنصر غالب تھا۔ ''میں حیران ہوں مہک جی...... اور سمجھنے سے قاصر بھی، مدد دینے والی کو مدد لینے کی کیا ضرورت ہے......؟''

''سمجھ تو مجھے بھی نہیں آئی امن۔ میں ایک عام سی لڑکی ہوں، جس کے ساتھ ضروریاتِ زندگی کے سب تقاضے موجود ہیں، پھر میں کسی کو کیسے درد دے سکتی ہوں۔'' میں نے امن کی طرف دیکھا وہ الجھی ہوئی نگاہوں سے مجھی کو دیکھ رہا تھا۔

''امن میں جاننا چاہتی ہوں، جس مدد کی تم بات کر رہے ہو اس کی نوعیت کیا ہے۔ یا آپ لوگ مجھے کیا سمجھ رہے ہو...... میرے روبرو ہاتھ کیوں جوڑے جاتے ہیں، آنکھیں بند کر کے کیا پڑھا جاتا ہے۔ امن...... میں بہت الجھ گئی ہوں، میں بے اختیار دو چار قدم چل کر امن کے قریب ہوگئی۔ ہمارا بیچ کا فاصلہ بہت کم رہ گیا۔ ''امن میں ساری زندگی آپ کی احسان مند رہوں گی...... پلیز مجھے میری ذات کی پہچان کرادو، ورنہ میں ٹکڑے ٹکڑے ہو جاؤں گی، ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاؤں گی، امن پلیز میری مدد کرو۔'' اس بار میں خود پر قابو نہ رکھ سکی اور اپنے ہاتھوں میں اپنا سسکتا چہرہ چھپا لیا۔ آنسو میری انگلیوں کی درزوں سے نکلنے لگے۔

''مہک جی...... مہک جی...... کیا کر رہی ہیں آپ؟ پلیز مہک جی...... ایسا مت کیجیے......'' امن کی گھبرائی ہوئی آواز سن کر میں نے چہرہ اوپر اٹھایا۔ امن کو حد درجہ گھبرایا ہوا اور خوف زدہ پایا۔ میں نے دوپٹے سے آنسو صاف کیے اور غیر ارادی طور پر آگے بڑھ کر امن کے ہاتھ تھام لیے۔ ''امن میں تمہاری منت کرتی ہوں، میری مدد کرو۔ اگر تم نے بھی انکار کر دیا تو میری نسیں پھٹ جائیں گی، میرے دماغ پر بے تحاشہ بوجھ ہے، میں اس بوجھ کی تاب نہیں لاسکتی۔'' امن دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ آنکھوں میں رچی حیرت پریشانی اور فکر میں بدل گئی، میں خاموش ہوئی کہ شاید وہ کچھ بولے، مگر اس کے خشک ہونٹ ایک دوسرے سے چپک گئے تھے، چند منٹ خاموشی کی نذر چلے گئے۔ کمرے کی فضا انتہائی مکدر ہوگئی۔ ضبط کرنے کے باوجود میرے گالوں سے آنسو لڑھکنے لگے، تبھی میں نے ایک خوش آئند بات دیکھی۔ امن کا ہاتھ میکانکی انداز میں اوپر اٹھا۔ میں نے امن کی طرف دیکھا، مجھے محسوس ہوا جیسے وہ یہاں نہیں کہیں اور ہے، مگر اس کا دھیرے دھیرے اُٹھنے والا ہاتھ میرے چہرے کی طرف بڑھ چکا تھا۔ امن نے اپنے ہاتھ سے میرے آنسو اچک لیے۔ پہلی بار جلتے ہوئے زخموں پر مرہم لگی، روتے روتے ایک دم خوشی کا احساس عجیب سماں باندھ گیا، مگر خوشی کے لمحات کی مدت انتہائی مختصر تھی۔ امن کو یک دم کرنٹ لگا۔ وہ مدہوشی سے ہوش میں آیا۔ اپنا ہاتھ واپس کھینچا اور دو قدم پیچھے ہٹ کر نگاہیں جھکا لیں۔

''امن!'' میں نے بھاری مگر مضبوط لہجے میں اسے پکارا۔ ''میری جانب دیکھو امن۔'' دوسری پھر تیسری پکار پر اس نے نگاہیں اٹھائیں۔ ''یقین کرلو امن میں ایک معمولی سی عام لڑکی ہو۔ آج تم نے مجھے چھو کر بھی دیکھ لیا...... دیکھو۔'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اوپر اٹھایا۔ ''اپنا ہاتھ دیکھو اسی طرح صحیح سلامت ہے، نہ جلا نہ کٹا نہ معذور ہوا۔ اب تو یقین کرلو امن۔ میں بہت دُکھی لڑکی ہوں۔''

''مہک...... وہ دھیرے سے بولا......'' جذبات میرے قابو سے باہر ہونے لگے۔

☆......☆

(اس حیرت انگیز اور اسرار بھرے ناقابلِ فراموش سلسلے کی اگلی کڑی آئندہ ماہ پڑھیے)

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خُدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو اِن وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہر حال محدود ہے۔ اِن ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کر دیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اِس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات ٹوکن منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اِس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)......مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)......منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)......اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' 110، آدم آرکیڈ، شہید ملت روڈ۔ کراچی

☐ سمعیہ خان۔ بٹگرام

○ محترم بابا جی! السلام علیکم۔ خدا آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے، میرے ایک جاننے والے نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا کہ آپ خلق خدا کی قرآنی آیات کے ذریعے خدمت کرتے ہیں یہ بھی بتایا کہ آپ بہت سے پیچیدہ مسائل کا حل بہت آسانی سے نکال لیتے ہیں۔ وضائف اور تعویذ بھی دیتے ہیں۔ خدا کے لیے میرے مسئلے کا بھی حل نکال دیجیے جو میں آپ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ یہ مسئلے میں اپنے جاننے والے سے لکھوا رہی ہوں، پلیز قبول کیجیے گا۔ بابا جی میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری شادی ابھی تک نہیں ہوئی ہے، پہلے بہت رشتے آتے تھے میرے لیکن اب تقریباً ایک سال سے میرے لیے کوئی رشتہ نہیں آیا، لیکن جب کوئی ایک آدھ رشتہ آتا ہے تو کوئی نہ کوئی رکاوٹ آجاتی ہے۔ جب ماں مان جاتی ہے تو باپ نہیں مانتا، جب والد مان جاتا ہے تو بھائی یا کوئی نہ کوئی درمیان میں رکاوٹ ڈال دیتا ہے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ مجھ سے چھوٹی بہن کا بھی رشتہ ابھی تک نہیں آیا ان کے لیے بھی کوئی وظیفہ دیں تا کہ ان کا بھی رشتہ ہو جائے اور وہ اپنے گھر میں خوشحالی کی زندگی بسر کریں۔ بابا جی اصل میں، میں خوب صورت بھی ہوں، لیکن میرا قد چھوٹا ہے اور جسم سے بھی ذرا پتلی ہوں، پلیز میرے لیے کوئی وظیفہ دیں تا کہ میں موٹی ہو جاؤں اور میرے رشتے کے لیے بھی کوئی آسان سا وظیفہ بتا دیجیے گا اور میری بہن کے لیے بھی کوئی آسان سا وظیفہ دے دیں تا کہ ہمارا رشتہ ہو جائے اور ایسا رشتہ کہ درمیان میں پھر بھی کوئی رکاوٹ نہ آئے اور ایسا رشتہ کہ ہم دونوں بہنوں کو اپنے اپنے شوہر پسند ہوں ہم دونوں ان کے ساتھ ہمیشہ خوش و خرم زندگی گزاریں، بابا جی اگر آپ نے ہم دونوں بہنوں کو کوئی آسان سا وظیفہ دیا تو ہم آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولیں گے، بابا جی میری عمر 27 سال ہے اور چھوٹی بہن کی عمر 20 سال ہے، پلیز ہم دونوں کو آسان سا وظیفہ دیں اور بابا جی میرے اس مسئلے کو فروری کے شمارے میں جگہ صادر فرمائیے، پلیز خدا آپ کو اپنی امان میں رکھے۔ والسلام۔

☆ بیٹی سمعیہ! بہت سہل وظیفہ دے رہا ہوں۔ نماز کی ادائیگی پابندی کے ساتھ کرو گی تو ضرور مثبت نتائج حاصل ہوں گے۔ نماز فجر کے بعد ایک بار سورۂ احزاب پڑھو اور دعا کرو۔ والدہ سے کہو حسبِ استطاعت صدقہ خیرات ضرور کیا کریں، وظیفہ کی مدت ایک ماہ ہے معذوری کے دن بعد میں شمار کر کے وظیفہ کی مدت پوری کرو۔ اللہ حامی و ناصر ہو۔

☐ حیا۔ شبقدر

☆ بیٹی حیا! اللہ تمہیں خوشیاں عطا فرمائے، تمہاری بھابھیوں کو رشتہ نہ ہونے پر مذاق نہیں اُڑانا چاہیے، بہت بری بات ہے کل کو ان کی اولاد پر بھی یہ وقت آسکتا ہے جو شخص کسی کا دل دُکھاتا ہے اللہ اس کو ضرور سزا دیتا ہے، تم دُکھی مت ہو نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو، بہتر ہوگا مجھ سے تعویذ منگوالو، ان شاء اللہ کلام الٰہی کی برکت سے ضرور کرم ہوگا۔

☐ ک۔ د۔ ف۔ ع۔ بٹگرام

☆ بیٹے! تمہاری خواہش کے مطابق مسئلہ شائع نہیں کیا جا رہا ہے، میں تمہیں بہت واضح حالات بتا رہا ہوں جہاں نوکری کر رہے ہو وہاں صرف وقت ضائع ہوگا حاصل کچھ نہ ہوگا۔ بہتر ہے کہ رزق کہیں اور تلاش کرو۔ امتحان میں کامیابی کے لیے سب سے ضروری محنت ہے پھر اللہ سے دعا کرو کہ تمہیں تمہاری محنت کا پھل عطا ہو، بکثرت پڑھو "نصر من اللہ وفتح قریب"

☐ بشریٰ۔ کراچی

○ السلام علیکم بابا جی! میرے شوہر کا نام شاہد اور اُن کی والدہ کا نام حاجرہ ہے میرا نام بابا جی بشریٰ سلطانہ ہے اور میری والدہ کا نام صابرہ سلطانہ ہے۔ بابا جی میرا مسئلہ ہے کہ شادی کو 15 سال ہو گئے مگر سکون نہیں ہے۔ شوہر کے روزگار کا مسئلہ ہے باہر جا کر کام کرنا چاہتے ہیں مگر کاغذات واپس آجاتے ہیں اور یہاں پر کام کے لیے ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں۔ میرے شوہر پر 5 لاکھ کا قرض بھی ہے جو کہ لوگ اب تقاضہ کرنے لگے ہیں میں اور میرے شوہر بہت پریشان ہیں کیوں کہ ان کی تنخواہ میں بھی گزارہ نہیں ہوتا ہے۔ میں کرائے کے مکان بدل بدل کر پریشان ہو گئی ہوں۔ بابا جی اگر میں شادی کے 15 سال سے شروع کروں تو بہت لمبا خط ہو جائے گا جو

جو پریشانیاں ہم میاں بیوی پر آئی ہیں لیکن میں مختصر کر کے لکھ رہی ہوں۔ باباجی میری پریشانی کب ختم ہوگی باباجی میں چاہتی ہوں کہ میرے شوہر کا باہر جانے کا کوئی وسیلہ بن جائے۔ تاکہ میرے سب مسئلے بھی حل ہو جائیں اور میری سب سے بڑی خواہش کہ میرا اپنا گھر ہو جائے حالانکہ باباجی میرے پلّے کچھ بھی نہیں ہے مگر اللہ سے بہت امید ہے۔ باباجی میں قرآن پڑھتی ہوں اگر آپ مجھے کوئی وظیفہ دیں تو عشاء کے بعد مجھے ٹائم ملتا ہے، بابا جی آپ میرا جواب سچی کہانیاں میں دیجیے گا، میں گھر کا ایڈریس لکھ رہی ہوں آپ مجھے مختصر جواب بھجوا دیجیے گا۔ کیوں کہ سچی کہانیاں میرے گھر نہیں آتا میں نے اپنی ایک سہیلی کے گھر دیکھا تھا۔ باباجی یہ بھی بتایئے گا کہ کوئی بندش یا جادو تو نہیں ہے جس سے میرے شوہر کا باہر جانے کا کام نہیں ہوتا۔ باباجی میرا جواب ضرور ضرور دیجیے گا، میں انتظار کروں گی۔

☆ بیٹی بشریٰ تم اپنے گھر کے پتے پر خط منگوانا چاہتی تھیں مگر تم نے جوابی لفافہ یا پتا تحریر نہیں کیا لہٰذا مجبوراً جواب سچی کہانیاں میں دے رہا ہوں۔ تمہارا مسئلہ رزق کی تنگی ہے تو بیٹی اس کے لیے ضروری ہے کہ نماز کی پابندی تم دونوں میاں بیوی کرو۔ درود شریف بہت پڑھو روزانہ اپنے ہاتھوں سے چڑیوں کو دانہ اور پانی دو۔ بعد نماز عشاء ایک بار سورۂ واقعہ پڑھو اور دعا کرو۔ ان شاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ ماریہ۔ کراچی

☆ بیٹی ماریہ! بیٹی کے معاملے میں گھر والوں سے مشورہ کر کے قدم اٹھاؤ بچی سے ضرور پوچھو کہ وہ کیا چاہتی ہے معاملہ ختم تو ایک لمحے میں ہوسکتا ہے آخر حد تک جوڑنے کی کوشش ہونی چاہیے لیکن اگر شوہر ہی ذمہ داری لینے کو تیار نہیں تو پھر بچی کو اپنے ساتھ رکھنے ہی میں بھلائی ہے۔ بیٹے کو نرمی سے سمجھاؤ جو یہاں کچھ نہیں کرسکتا وہ کہیں بھی کچھ نہیں کرسکتا۔ اصل میں گھر کے حالات کی وجہ سے وہ فرار چاہتا ہے بہر حال تم نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ نماز فجر اور عشا کے بعد 3-3 تسبیح الحمد شریف کی پڑھو اوّل و آخر درود شریف پھر دعا کرو۔ بروز جمعہ فجر کے بعد ایک بار سورۂ رحمٰن ترجمے کے ساتھ پڑھو اور دعا کرو۔ حسب استطاعت صدقہ خیرات ضرور کرو مدت ایک ماہ ہے۔

□ ثناء حمید۔ کراچی

☆ بیٹی ثناء! اللہ تمہیں مکمل صحت عطا فرمائے۔ بہت پریشانی اور تکلیف سے گزری ہو مجھے اندازہ ہے۔ بیٹی کبھی یہ مت سوچنا کہ نقصان یا دکھ اللہ کی طرف سے سزا ہے۔ اللہ تبارک تعالیٰ بہت غفور الرحیم ہے۔ وہ تو اپنے بندے کی بھلائی چاہتا ہے تمہارے نصیب میں تکلیف اٹھانا تھا لہٰذا تم نے تکلیف اُٹھائی اللہ سے دعا کرو کہ وہ تم پر اپنا رحم فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو تاکہ تمہیں صبر آئے اور شیطانی خیالات سے بھی جان بچی رہے۔ تم سے جو تھوڑی سی غلطی ہوئی وہ یہ کہ حمل ٹھہرنے کے بعد تم نے مجھے مطلع نہیں کیا۔ بہر حال اپنی صحت کا بہت خیال رکھو۔ حسب استطاعت صدقہ خیرات ضرور کرو۔ بکثرت یا قدوس کا ورد کرو۔ بعد نماز عشاء ایک بار سورۂ واقعہ ضرور پڑھو۔ مجھے حالات سے آگاہ رکھو۔ تعویذ حفاظت کے ساتھ رکھو۔

□ فاطمہ رضوی۔ کینیڈا

☆ بیٹی فاطمہ! اللہ تمہیں اولاد کی خوشیاں دکھائے اور قرض سے نجات دلائے۔ بیٹے سے کہو اگر ممکن ہو تو امریکہ جانے کی کوشش کرے، وہاں نوکری کے مواقع کینیڈا سے بہت بہتر ہیں اور پھر وہاں سے دبئی کی کوشش فائدہ مند ثابت ہوگی۔ اولاد کے لیے میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ مجھ سے تعویذ منگوالو تفصیل سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے معلوم کرسکتی ہو۔ بیٹی کچھ نہ کچھ صدقہ ضرور کرتی رہا کرو۔ اس عمل سے رزق میں برکت پیدا ہوتی ہے، ”یا رزاق“ کا بہت ورد کیا کرو۔ 15 دن بعد مجھے حالات سے مطلع کرو۔

□ ص۔ کلی سیداں

☆ بیٹی! موت برحق ہے ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے، لہٰذا اس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ انسان اپنے اعمال اتنے اچھے رکھے کہ دنیا سے منہ موڑتے وقت اس کو کوئی پشیمانی نہ ہو دنیا تو عارضی قیام گاہ ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے انسان اپنے گھر سے نکل کر کام کاج کے لیے جاتا ہے اور وقت مکمل کر کے واپس لوٹ

آتا ہے اسی طرح انسان اللہ کی طرف طے کردہ وقت ختم ہونے پر لوٹ جائے گا۔ بیٹی حقائق سے آنکھیں موندنا یا ڈرنا عقلمندی نہیں پابندی سے نماز ادا کیا کرو۔ قرآن ضرور پڑھا کرو اللہ کی راہ میں خرچ کرو، رشتے ناطوں کا خیال رکھو، انسانوں کی عزت کرو، قرآن ترجمے سے پڑھنا شروع کرو تمہارا سارا خوف زائل ہو جائے گا۔

□ سرمد علی۔لاہور

o بابا جی میں نے 3 ماہ قبل آپ کو خط لکھا تھا میں بے روزگاری کی وجہ سے بہت پریشان تھا آپ نے مجھے تعویذ دیا تھا اور ورد بتایا تھا۔ میں شرمندہ ہوں کہ آپ کو دیر سے مطلع کر رہا ہوں مگر مجھے 2 ماہ قبل اپنی پسند کی جگہ نوکری مل گئی ہے۔ میں اللہ کے بعد آپ کا جتنا شکریہ ادا کروں کم ہے۔ میری والدہ اور بہنیں بھی آپ کو دعائیں دیتی ہیں۔ بابا جی پوچھنا چاہتا تھا کہ تعویذ کا کیا کروں؟ اور جو ورد آپ نے دیا تھا کیا وہ جاری رکھوں؟ اس کے علاوہ بابا جی کچھ رقم آپ کو ہر ماہ ارسال کرنا چاہتا ہوں میری طرح پریشان لوگوں کی ضرور مدد کر دیا کریں۔

☆ بیٹے سرمد! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ تم قابل تھے محنتی تھے اللہ سے مدد کے طلب گار تھے کامیابی تو ملنی ہی تھی، مجھے سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ تم نے دوسروں کی مدد کا سوچا، کاش سب کی سوچ ایسی ہو جائے کہ کسی ایک انسان کی ذمہ داری اگر لے لی جائے تو شاید لوگوں کو ہاتھ پھیلانا ہی نہ پڑے بہر حال تعویذ تلف کر دو۔ ورد جاری رکھو نماز میں کوتاہی مت کرنا۔ والدہ کی خوب خدمت کرو اور بہنوں کی ذمے داری خوش اسلوبی سے ادا کرنا اللہ تمہیں بہت نوازے گا۔

□ شجاعت احمد۔U-K

o بابا جان 7 سال قبل یہاں آیا تھا۔ شروع میں تو بڑی پریشانی دیکھی مگر اب اللہ کا کرم ہے۔ بابا جان میرا ایک دوست ہے جس نے برے وقتوں میں میری بہت مدد کی۔ عادت کا بھی بہت اچھا ہے۔ اس کی گوری بیوی تھی، جو ڈیڑھ سال پہلے اس کو چھوڑ گئی۔ دو بچے تھے۔ وہ بھی ماں کے پاس ہیں، وہ ان کی ذمے داری خاتون کی طرح اٹھا رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میری چھوٹی بہن کی اس سے شادی ہو جائے۔ میری بہن پاکستان میں ہے۔ آپ جو بھی وظیفہ دیں گے وہ کرے گی۔ بابا جی والد تو میرے حیات نہیں۔ میں چاہتا ہوں والدہ کی زندگی ہی میں بہنوں کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاؤں۔ ویسے بھی گھر میں صرف خواتین ہی ہیں، اچھے داماد آ جائیں تو میرا بوجھ بھی کم ہو گا۔ میری بہن یونیورسٹی جاتی ہے اور شام میں گھر واپس آتی ہے۔ اس حساب سے مختصر وظیفہ عنایت کیجیے۔

☆ بیٹے شجاع! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے، نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو، مجھے گھر کا پتا ارسال کر دو میں تعویذ تیار کر کے ارسال کر دوں گا۔ کالج یا یونیورسٹی جانے والی بچیوں کے پاس وظیفہ کرنے کا وقت مشکل سے ہی ہوتا ہے، مختصر سا ورد تعویذ کے ساتھ دے دوں گا ان شاء اللہ کرم ہو گا۔ تم مجھے اپنے دوست کا مکمل نام مع والدہ ارسال کر دو۔

□ زوار شاہ۔پشاور

o بابا جی! میں کاروباری آدمی ہوں مگر روز بروز کاروباری حالات خراب ہو رہے ہیں۔ آپ کو پشاور کے تو حالات کا پتا ہی ہے، ہم لوگ اپنی جانوں کی حفاظت کریں یا کاروبار پر توجہ دیں پھر بھتہ مانگنے والوں سے کچھ بچتا ہی نہیں۔ بابا جی بڑی پریشانی ہے خدا کے لیے کچھ بتائیں۔ ان حالات میں زندہ رہنا ہی مشکل لگتا ہے کیا ہمارے شہر میں بھی امن ہو گا بھی یا نہیں۔

☆ بیٹے زوار! مجھے بھی یہی دُکھ ہے کہ ان بوڑھی آنکھوں نے یہ حالات بھی دیکھنے تھے۔ دل بہت دُکھتا ہے۔ رب العزت سے بہت دعائیں کرتا ہوں کہ اللہ ہمارے ملک کو امن کا گہوارہ بنا دے ہر شہر کے بسنے والے سکون سے زندگی بسر کر سکیں خاص طور سے خیبر پختونخوا پر اللہ کا خاص کرم ہو۔ اللہ ہمارے حکمرانوں کے دل میں اپنا خوف پیدا کر دے۔ پاکستان میں عدل قائم ہو۔ بیٹے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ روزانہ بعد نماز فجر سورۂ مزمل کی تلاوت کرو اور اپنے کام کی جگہ پر جا کر سب سے پہلے سورۂ بقرہ کی کچھ آیات ضرور پڑھا کرو۔ یہ اپنی عادت بنا لو۔ آیات کا ترجمہ بھی ضرور پڑھا کرو۔ بیٹے نفسانفسی اور شیطانی قوتوں سے بچنے کے لیے قرآن مجید سے

بہترین کوئی ڈھال نہیں۔ حسبِ استطاعت صدقہ خیرات ضرور کیا کرو مجھ سے رابطے میں رہو۔

□ رضوانہ۔ چکوال

☆بیٹی رضوانہ! تمہاری خواہش کے مطابق تمہارا مسئلہ شائع نہیں کیا جا رہا ہے حالات یقیناً بہت مشکل ہیں مگر بیٹی یاد رکھو مشکلوں کا مقابلہ کرنا ہی زندگی ہے۔ مسائل سے کبھی مت گھبرانا۔ ڈٹ کر ان کا مقابلہ کرنے والے ہی کامیاب ہوتے ہیں بہتر ہوگا مجھ سے تعویذ منگوالو۔ تعویذ کے لیے مجھے کچھ تفصیل درکار ہوگی وہ فون کر کے سچی کہانیاں کے دفتر میں لکھوادو۔ اپنا پتا بھی ضرور لکھوادینا تاکہ تعویذ ارسال کیا جاسکے۔ بیٹی اللہ پر بھروسا رکھو مجھے یقین ہے کہ وہ تم پر ضرور رحم فرمائے گا۔

□ زرینہ۔ کراچی

o بابا صاحب! السلام علیکم! بعد سلام عرض یہ ہے' میں نے آپ کے بارے میں بہت سنا ہے۔ اللہ آپ کو اسی طرح خلقِ خدا کی خدمت کرنے کی توفیق عطا کرے۔ (آمین!) میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری شادی کو نواں سال ہے اور اولاد کی نعمت سے محروم ہوں۔ میں نے اور میرے شوہر نے ٹیسٹ بھی کروائے۔ میرے شوہر کی رپورٹ تو صحیح ہے لیکن میری رپورٹ میں کچھ مسئلہ ہے۔ بہت علاج کروائے لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ آپ کو بڑی امید سے یہ خط لکھ رہی ہوں۔ برائے مہربانی کوئی ایسا وظیفہ بتایئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اولاد کی نعمت سے نواز دے۔ (آمین!) مجھے دُعاؤں میں ہمیشہ یاد رکھیں۔ مہربانی کر کے میرے خط کا جواب جلد از جلد دیجیے' شکریہ۔

☆بیٹی زرینہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ میں تمہیں یہی نصیحت کروں گا کہ جلد از جلد مجھ سے تعویذ منگوالو۔ آئندہ خط مجھے جوابی لفافے پر مکمل پتے کے ساتھ لکھو تاکہ تفصیل سے جواب دیا جاسکے۔

□ نوری عظمت۔ اسلام آباد

o باباجی! السلام علیکم! میرا ایک مسئلہ تو کافی حد تک حل ہوگیا ہے آپ کی دُعا سے، دوسرا مسئلہ روزگار کا تھا۔ بابا جان! میرا شوہر بہترین کاریگر ہے کڑھائی کا، مگر انہیں کوئی کام دینے کے لیے تیار نہیں۔ قرضہ بڑھ رہا ہے جس کی وجہ سے گھر میں کشیدگی رہتی ہے' لڑائی جھگڑا رہتا ہے۔ آپ نے سورۂ رحمٰن پڑھنے کے لیے کہا تھا ایک مہینے تک' تو وہ میں نے پورا کر دیا۔ ناغے کے دن پورے کر کے۔ باباجی! میرا مسئلہ حل کر دیں' میں تمام عمر آپ کو دُعائیں دوں گی۔ بابا جان! میرا ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ مجھے ڈیڑھ مہینے پہلے گھٹنے کے نیچے بائیں پاؤں میں شدید درد ہوا پھر وہ نیچے سے لے کر اوپر کی جانب پھیل گیا جس کی وجہ سے میرا چلنا دوبھر ہوگیا ہے۔ کافی علاج کے بعد پتا چلا کہ عرق النساء کا درد ہے پھر میں بھائی کے ہاں چلی گئی۔ وہ میرا ہومیو پیتھی کا علاج کروا رہے ہیں۔ درد اتنا شدید ہوتا ہے کہ نماز بیٹھ کر پڑھنا بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ اب میں بچوں کے پاس واپس آ گئی ہوں۔ آپ میرے لیے دُعا کرا دیں' میں تاحیات آپ کو دُعا دوں گی۔

☆بیٹی نوری! اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتی رہو۔ پیر گرم رکھنے کی کوشش کرو۔ جب درد محسوس ہو تو متاثرہ جگہ پر ہاتھ رکھ کر 7 بار سورۃ الناس پڑھو اور دُعا کرو۔ سورۂ رحمٰن پڑھنا جاری رکھو، کرم ہوگا۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ نوشین اقبال۔ کراچی

o باباجی! السلام علیکم! میں آپ کی محفل میں پہلی مرتبہ شرکت کر رہی ہوں۔ امید کرتی ہوں کہ آپ ضرور جواب سے نوازیں گے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں پڑھتی ہوں مگر بے حد محنت کے باوجود ہر دفعہ کم نمبر آتے ہیں جس کی وجہ سے مجھے شرمندگی اور دکھ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ برائے مہربانی کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ میں اس دفعہ کے امتحان میں اچھے نمبر لے سکوں اور میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے والدین میری کوئی بات نہیں مانتے اور والد تو وہم کے مریض ہیں۔ ہر بات پر صاف انکار کر دیتے ہیں۔ میں اُن کے لحاظ میں کوئی بات نہیں کرتی۔ میں ہی نہیں' میرے بھائی بھی اس بات سے کافی پریشان ہیں۔ آپ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ میرے والد ہر بات سمجھ اور مان جائیں' ان کا وہم ختم ہو جائے۔ آپ کا بہت احسان ہوگا۔

☆بیٹی نوشین! اللہ تعالیٰ تمہیں کامیابی عطا فرمائے۔ (آمین!) روزانہ رات کو 8-7 بادام پانی میں

بھگو دو اور نہار منہ اچھی طرح چبا کر کھالو اور ایک گلاس گرم دودھ بھی ضرور پیو۔ نمازِ فجر کے بعد 11 بار سورۃ فاتحہ پڑھو۔ اپنے والد کی صحت یابی کے لیے دُعا کرو اور کسی بھی بات پر بحث مت کرو۔ یہی مناسب ہے۔ وظیفہ تم امتحان کے بعد بھی جاری رکھ سکتی ہو۔

☐ راحیلہ۔ آسٹریلیا

o بابا جی! اپنی دوست کی وساطت سے آپ کا پتا چلا وہ کراچی میں رہتی ہے، میری پریشانی سے آگاہ ہے لہٰذا آپ سے رابطہ کرنے کا مشورہ دیا۔ بابا جی میں اپنے تین بچوں کے ساتھ 21 سال سے دیارِ غیر میں ہوں بچے چھوٹے تھے جب شوہر نے چھوڑ دیا سب نے واپس پاکستان جانے کو کہا مگر میں جانتی تھی وہاں جا کر باپ اور بھائیوں پر بوجھ بن جاؤں گی لہٰذا پردیس میں رہنا ہی بہتر لگا۔ محنت کر کے ہڈیاں ٹوٹ گئیں، بچوں کی ہر ضرورت پوری کی مگر بابا جی میری بیٹی نے بہت برا کیا اس کی عمر 18 سال ہے۔ وہ مجھے چھوڑ کر اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ رہتی ہے۔ بہت سمجھایا، روئی مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس کے چھوٹے بہن بھائیوں پر بھی بُرا اثر پڑ رہا ہے۔ پاکستانی کمیونٹی میں بھی مذاق بنتا رہتا ہے مجھے اس اذیت سے نجات دلایئے۔ بس آپ ہی سہارا ہیں۔

☆ بیٹی راحیلہ! مجھے تمہارے دُکھ اور پریشانی کا اچھی طرح اندازہ ہے جہاں دونوں والدین مل کر تربیت کر رہے ہوتے ہیں بچے اکثر وہاں بھی نافرمانی کر جاتے ہیں تم تو پھر تنہا ساری ذمہ داریاں اٹھاتی رہی ہو۔ ایسے میں کہیں نہ کہیں چوک ہو ہی جاتی ہے اور جس معاشرے میں تم ہو وہاں بچوں کے ایسے رویوں کو غلط نہیں سمجھا جاتا بہر حال دُکھی مت ہو اس کو سمجھاؤ دین کا حوالہ دو سزا اور جزا کے بارے میں بتاؤ۔ وقت لگے گا مگر وہ تمہارے پاس لوٹ آئے گی جس قدر جلد ممکن ہو مجھ سے تعویذ منگوالو۔ ایک بیٹی کے لیے اور دوسرا گھر میں رکھنے کے لیے۔ اللہ سب خیر کرے گا۔

☐ اسمارا پروین۔ حیدرآباد

o بابا جی! السلامُ علیکم! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں سر ٹیڑھا رکھتی ہوں، بالکل سیدھا نہیں رکھ سکتی۔ دائیں کندھے کی طرف سر کا زیادہ جھکاؤ ہوتا ہے۔ سب مجھے کہتے ہیں کہ سر سیدھا رکھا کرو۔ میں تھوڑی دیر کے لیے سر تو سیدھا کر لیتی ہوں مگر پھر یاد نہیں رہتا اور سر ٹیڑھا رکھنا شروع کر دیتی ہوں حالانکہ سر سیدھا رکھتے ہوئے مجھے کوئی درد وغیرہ نہیں ہوتا۔ میری بچپن سے ٹیڑھا سر رکھنے کی عادت ہے، شاید پیدائشی ہو۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، سب کہتے تھے کہ تم بچپن میں بہت بیمار ہوئی تھیں اور مجھے شاید پولیو بھی ہو گیا تھا پھر میں ٹھیک ہو گئی تھی۔ پتا نہیں، میں سر کو ٹیڑھا کیوں رکھتی ہوں؟ جب کوئی نارمل آدمی سر سیدھا رکھتا ہے تو اس کی گردن میں کوئی ہڈی ظاہر نہیں ہوتی جو گردن کو موڑنے سے نظر آتی ہے مگر جب میں سر سیدھا رکھتی ہوں تو وہ ہڈی ظاہر ہوتی ہے۔ جب سر ٹیڑھا رکھتی ہوں تو وہ ظاہر نہیں ہوتی۔ پلیز بابا جی! آپ کوئی ایسا وظیفہ دیں کہ میں سر بالکل سیدھا رکھوں۔ میں بہت احساسِ کمتری کا شکار ہوں۔ ہر وقت سر پر دوپٹا اوڑھے رکھتی ہوں کہ کوئی میرا نقص نہ جان جائے۔ سب جاننے والے مجھے کچھ نہ کچھ کہتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے میں احساسِ کمتری کا شکار ہو گئی ہوں۔ پلیز بابا جی! میرا مسئلہ ضرور حل کیجیے گا۔ میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میں عام سی شکل وصورت کی لڑکی ہوں جبکہ میری دو بہنیں خوب صورت ہیں۔ میری ناک سانولی ہے اور ٹھوڑی بھی سانولی یعنی کالی ہے اور میرے چہرے کا رنگ مختلف ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ میرے چہرے کا رنگ بالکل ایک جیسا ہو جائے، بے شک سانولا ہو یا سفید۔ میری آنکھیں بڑی اور پلکیں لمبی ہو جائیں۔ پلیز بابا جی! آپ کوئی ایسا حل بتائیں کہ میری دونوں خواہشیں پوری ہو جائیں، سر سیدھا رکھنے کی اور خوب صورت ہونے کی۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔

☆ بیٹی اسمارا! تمہیں اس سے پہلے بھی براہِ راست جواب دے چکا ہوں۔ تمہیں علاج کی ضرورت ہے، کسی اچھے ڈاکٹر سے رجوع کرو۔ میں ادویات پر دَم کرنے کے لیے دُعا بتا دوں گا۔ یہی مسئلہ اہم ہے اس پر توجہ دو۔

☐ شہناز مغل۔ شہداد پور

o محترم بابا صاحب! السلام علیکم! یہ مسئلہ میری بڑی بھابی کا ہے جن کی عمر 35 سال ہے۔ اُن کی شادی کو 14 سال ہو گئے ہیں۔ جب سے شادی ہوئی ہے، تب

سے اکثر بیماری رہتی ہیں۔ ہر دوسرے مہینے میں ان کا گلا خراب ہوجاتا ہے۔ وہ اخلاق کی بہت اچھی ہیں۔ بات کرتے ہوئے اس طرح نظر آتی ہیں جیسے اُن کو کوئی بیماری نہیں ہے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کے واسطے اُن کو کوئی ایسی دوا یا وظیفہ بتادیں جس سے اُن کی بیماری دور ہوجائے۔ ہم آپ کے شکر گزار ہوں گے۔ گلے کی تکلیف کے لیے جو دوائی آپ دیتے ہیں، اسے منگوانے کا طریقہ کار بتادیں۔

☆بیٹی شہناز! اللہ تعالیٰ تمہاری بھاوج کو مکمل شفا عطا فرمائے۔ (آمین!) مریضہ خود نمازِ عصر کے بعد ایک بار سورۃ یٰسین پڑھ کر پانی کی ایک پیالی پر دَم کرے اور دُرود شریف کا وِرد کرتے ہوئے تین سانسوں میں یہ پانی پی لے۔ ان شاء اللہ، افاقہ ہوگا۔ مدت 90 دن ہے۔ ٹانسلز کی دوا منگوانے کے لیے آفس فون کرلو۔ کوئی قریبی عزیز کراچی میں ہو تو دفتر سے منگوالو۔

☐ مصطفیٰ غلام۔ رانی کوٹ

o جنابِ عالی باباجی! السلام علیکم! میرے والد صاحب بوڑھے ہیں، انہیں عرصۂ دراز سے گلے کی بیماری تھی۔ وہ بڑھاپے کی وجہ سے بار بار اسپتال نہیں جاسکتے تھے۔ دیسی علاج بھی بہت کرواچکے تھے مگر اس بیماری سے انہیں چھٹکارا نہیں ملتا تھا۔ ہمارے علاقے کا ایک نیک بندہ عمرہ کرکے واپس آیا تو کراچی سے آپ کی دوا بھی لیتا آیا۔ اللہ تعالیٰ اس کا بھلا کرے، اس دوا کے استعمال سے میرے اباجی کو اس بیماری سے چھٹکارا مل گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو نیک اَجر دے۔ (آمین!) میری اور میرے اباجی کی طرف سے آپ کا شکریہ۔

☆بیٹے مصطفیٰ! اللہ تعالیٰ کا شکر اَدا کرو کہ شفا دینے والی ذات اسی کی ہے۔ اس کے نام پر حسبِ توفیق صدقہ خیرات بھی کرتے رہو اور نماز کی پابندی بھی کرو تو اللہ تعالیٰ ہر مصیبت سے بچائے گا۔

☐ حسنہ جاوید۔ مظفر گڑھ

o محترم باباجی! السلام علیکم! ہمارے گھر کے حالات تو پہلے ہی خراب تھے مگر اب تو ہر طرف سے مصیبتوں نے گھیر لیا ہے۔ گھر کے اخراجات پورے نہیں ہوتے۔ ہم پہ قرضہ بھی بہت ہے خاندان والوں کا بھی اور سرکاری بھی اور میرے والد اپنے قرضوں اور جوان بیٹیوں کو بیاہنے کے لیے ہر وقت فکرمند رہتے ہیں۔ گھر میں برکت بھی نہیں۔ جو کچھ آئے، پل میں غائب ہوجاتا ہے۔ برائے مہربانی آپ ہماری مشکل حل کردیں۔ کوئی وظیفہ وغیرہ بتائیں جو میں یا میری امی کرسکیں۔ ہم نماز بھی پڑھتے ہیں اور دُعا بھی کرتے ہیں مگر گھر میں برکت نہیں ہوتی۔ میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہم سب خاندان والوں کو سب ہی برا بھلا کہتے ہیں۔ اب مزید برائی برداشت نہیں ہوتی۔ برائے مہربانی حل بتائیں اور باباجی! آپ کوئی ایسا وظیفہ بھی بتادیں کہ میرے بھائی کی کہیں اچھی جگہ نوکری لگ جائے۔ آپ کے عمر بھر ممنون رہیں گے۔

☆بیٹی حسنہ! کسی کو موقع ہی مت دو کہ وہ تمہارے گھریلو معاملات میں مداخلت کرے۔ اگر یہ چاہتی ہو کہ ہر شخص کی نظروں میں اچھی بنی رہو تو ممکن نہیں۔ کسی کے ساتھ برائی مت کرو۔ نماز پابندی کے ساتھ ادا کرو۔ والدہ سے کہو کہ نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۂ رحمٰن پڑھیں اور دُعا کریں۔ سورۂ رحمٰن نہایت مبارک سورۃ ہے۔

☐ ماہم بتول۔ کوئٹہ

o محترم باباجی! السلام علیکم! ''سچی کہانیاں'' میں لوگوں کے مسائل اور آپ کے بتائے ہوئے حل پڑھ کر میں نے سوچا کہ میں بھی اپنا مسئلہ آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ میری شادی کو پندرہ ماہ ہونے والے ہیں۔ میرے شوہر کا روزگار نہیں ہے جس کی وجہ سے میں سخت پریشان ہوں اور دوسرا یہ کہ انہیں اپنی ذمے داریوں کا بھی احساس نہیں ہے۔ میرے سسر ہی میرا گھر چلا رہے ہیں۔ ان میں ضد بھی بہت ہے۔ مجھ سے تو خاص طور پر ہر بات میں ضد کرتے ہیں۔ مجھے کوئی ایسا حل بتائیں جس سے ان کو روزگار بھی مل جائے اور ان کی ضد بھی ختم ہوجائے۔ میں آپ کو بہت دعائیں دوں گی۔

☆بیٹی ماہم! رزق کا وعدہ اللہ تعالیٰ کا ہے۔ جب انسان پریشان ہوتا ہے تو اس کا مزاج خراب ہو جاتا ہے۔ نماز کی پابندی رکھو اور نمازِ عصر کے بعد سورۂ قمر آیات 1 تا 13 پڑھو اور دعا کرو، کرم ہوگا۔ مدت 21 دن ہے۔

☐ امینہ غنی۔ ایبٹ آباد

o بابا جی! السلام علیکم! جب میں نے آپ کا ارسال کردہ وظیفہ پڑھنا شروع کیا تو ایسے لگا جیسے کسی نے میرے گرد حصار باندھ رکھا ہو لیکن آہستہ آہستہ اس میں کمی ہوگئی۔ میرے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ میں دو دن اس سے بات نہیں کرتی ہوں تو بے چین ہو جاتی ہوں لیکن آپ کے وظیفے سے صبر آتا گیا۔ آپ کا دیا ہوا وظیفہ پڑھ رہی ہوں پورے چالیس دن میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی مگر ایک رات پتا نہیں' کیسے بہک گئی اور اسے فون کر دیا۔ اب اس نے خود بتایا ہے کہ اس کے پاس میری وہ ساری باتیں جو رات میں نے کی تھیں' سب ریکارڈ ہیں۔ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تمہارے منگیتر کو یہ سب بتادوں گا۔ بابا جی! مجھے پتا ہے کہ یہ کام جو میں کر رہی ہوں' گناہ ہے؟ مجھے احساس ہے کہ میں اپنے آپ کو تباہ کر رہی ہوں مگر میں اب یہ داغ مٹانا چاہتی ہوں۔ میں ایک عزت دار گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ میرے امی ابو بہت اچھے ہیں۔ ان کو دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ اگر ان کو پتا چل گیا تو کیا ہوگا؟ وہ مجھ پر بے حد اعتماد کرتے ہیں۔ میں ان کی لاڈلی بیٹی ہوں۔ بابا جی! پلیز' میرے لیے کچھ کیجیے ورنہ میں مر جاؤں گی۔ بابا جی! میرے دل پر بہت بوجھ ہے۔ آپ کو خط لکھتی ہوں تو دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ بابا جی! میری ساری باتیں پڑھ کر آپ کو بھی دکھ ہوگا۔ پلیز' مجھے ڈانٹیے مگر میرے لیے کچھ کیجیے۔ مجھے بتائیں کہ میں کیا کروں؟ کیسے چھٹکارہ پاؤں اس لڑکے سے؟ یہ وظیفہ کب تک پڑھوں؟ ساری باتیں لکھ دی ہیں۔ آپ میرے لیے خاص دعا کریں کہ مجھے اس لڑکے سے نجات ملے۔

☆ بیٹی امینہ! تمہیں اس بات کا اندازہ ہے کہ تم کیا غلطی کر بیٹھی ہو۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ تمہیں محفوظ رکھے۔ (آمین!) فوراً قطع تعلق کر لو۔ تمہارا خط صرف اس لیے شائع کر رہا ہوں تاکہ دوسری بچیوں کو احساس ہو کہ یہ وقتی کھیل تماشے کتنے نقصان دہ ہوتے ہیں۔ نمازِ فجر اور ظہر کے بعد سورۃ فتح آیت 29' 100-100 بار پڑھو اور دعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ عاطف شاہ۔ ملائیشیا

o محترم بابا جی! السلام علیکم! کئی سال سے میری خواہش یہاں کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کرنے کی تھی اسی لیے میں نے آپ سے براہِ راست وظیفہ منگوایا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ وظیفے کے دوران ہی یہ کام ہو گیا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ بابا جی! اللہ تعالیٰ آپ کو نیک اَجر عطا کرے اور لمبی عمر عطا فرمائے تاکہ آپ اسی طرح لوگوں کے کام آتے رہیں۔ (آمین!)

☆ بیٹے عاطف! میرا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ دلوں کی مراد پوری کرنے والی ذات باری تعالیٰ کی ہے' بس اس کا شکر ادا کرتے رہو۔ نماز کی پابندی برقرار رکھو اور اپنے دوستوں کو بھی نماز کی تلقین کرنا۔

□ کاظم بٹ۔ جہلم

o بابا جی! السلام علیکم! میں آپ کو بڑی امیدوں سے خط لکھ رہا ہوں۔ آپ ضرور کوئی بہتر حل بتائیں گے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں اپنی کزن سے محبت کرتا ہوں لیکن اس کے والدین عرصۂ دراز سے فوت ہو چکے ہیں اور اس کے دو بھائی ہیں جو ہمیشہ اس کے متعلق غلط سوچتے ہیں۔ میں نے اسی سال گریجویشن کیا ہے اور میرا تعلق اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے ہے جبکہ اس کے بڑے بھائی نے ایک ماہ قبل اپنی دوسری شادی کرنے کے لیے اس کا رشتہ کسی غیر مناسب جگہ پر کر دینے کی کوشش کی جو نہ بن سکا۔ بابا جی! دراصل حقیقت یہ ہے کہ تقریباً دو سال پہلے میری اسی کزن سے میرا نکاح تھا جو خاندانی چپقلش کی وجہ سے نہ ہو سکا اور انہوں نے نکاح سے ایک دن قبل فون پر منع کر دیا تھا جس کے باعث ان لوگوں سے ہمارا جھگڑا بھی ہو گیا تھا۔ اسی وجہ سے ہمارے گھر والوں نے انا کا مسئلہ بنایا ہوا ہے اور ان سے کوئی رابطہ نہیں رکھا۔ ابھی تک بات الجھی ہوئی ہے۔ بہت پریشان ہوں۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ مجھے فکر ہے کہ کہیں اس کا غیروں میں رشتہ نہ ہو جائے۔ بابا جی! آپ جلد مجھے کوئی وظیفہ بتائیں تاکہ میرا مسئلہ حل ہو جائے۔ آپ کی مہربانی ہوگی۔

☆ بیٹے کاظم! اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ تمہاری دعا قبول فرمائے۔ نماز میں گڑگڑا کر دعا کیا کرو۔ نمازِ فجر کے بعد سورۃ الاعراف آیت 26' □ 99 بار پڑھو اور دعا کرو۔ وظیفہ نہایت سہل دے رہا ہوں تاکہ اپنے کاموں

کے ساتھ بھی وظیفہ جاری رکھ سکو۔ حاجت قبول ہونے تک وظیفہ جاری رکھو۔

□ سعید احمد۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ

o محترم بابا جی! السلام علیکم! میرے بہنوئی پر فالج کا اٹیک ہوا ہے اور زیادہ حملہ دماغ پر ہوا۔ اب چھ ماہ سے ان کا علاج ہو رہا ہے اور اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ پہلے سے کافی بہتر ہیں۔ اٹیک ان پر دائیں سائیڈ پر ہوا تھا۔ سہارے کے بغیر چل تو لیتے ہیں لیکن ابھی صحیح طور پر چل نہیں سکتے۔ اس کے علاوہ بازو بھی فی الحال صحیح طور پر حرکت نہیں کر سکتا۔ باتیں کرتے ہیں تو کبھی کبھی سمجھ میں آجاتی ہیں لیکن بعض اوقات باتیں بالکل سمجھ میں نہیں آتیں جس کی وجہ سے میری بہن کافی پریشان ہیں۔ محترم بابا جی! کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ میرے بہنوئی بالکل ٹھیک ہو جائیں۔ وظیفے کی اجازت ان کی والدہ کو دی جائے۔ بابا جی! اس مسئلے کا حل فوری دے دیا جائے تاکہ میرے بہنوئی جلد از جلد صحت یاب ہو سکیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو تمام نیکیوں کا اجر عطا فرمائے۔ (آمین! ثم آمین!)

☆ بیٹے سعید! اللہ تعالیٰ تمہارے بہنوئی کو مکمل صحت عطا فرمائے۔ ان کی والدہ سے کہو کہ نماز کی پابندی کی کوشش کریں۔ نمازِ عصر اور نمازِ مغرب کے بعد 7-7 بار سورۂ نصر اور سورۂ فلق پڑھیں اور دعا کریں۔ یَامُجیب کا کثرت سے ورد کریں۔ انشاء اللہ مکمل شفا ملے گی۔ مدت 41 دن ہے۔

□ شمیمہ نقوی۔ لاہور

o بابا صاحب! میں اکثر آپ سے اپنے مسئلوں کے سلسلے میں رابطے میں رہتی ہوں۔ دو ماہ قبل میرا بیٹا اور بہو اسٹوڈنٹ ویزے پر لندن گئے حالاں کہ بیٹے نے یہاں نوکری کے لیے بہت کوشش کی مگر کامیابی نہ ملی، تھک ہار کر دونوں میاں بیوی لندن چلے گئے۔ بہت کوشش کے باوجود اب تک کوئی ڈھنگ کی جاب نہیں ملی۔ بہت پریشانی ہے۔ آپ مجھے پڑھنے کے لیے کچھ بتا دیں تاکہ بچے مشکل سے نکل آئیں۔

☆ بیٹی! اللہ تمہارے بچوں کو کامیابی عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ نمازِ عشاء کے بعد ایک بار سورۂ کہف پڑھو اور دعا کرو۔ کوشش کرو کہ ہر جمعرات کو کچھ نہ کچھ رقم ضرور خیرات کر دیا کرو۔ وظیفے کی مدت 41 دن ہے۔

□ اریشہ خان۔ اٹک

o بابا جی! میری عمر 16 سال ہے اور مجھے گلے میں شدید تکلیف رہتی ہے۔ آپ گلے کی جو دوا دیتے ہیں وہ مجھے بھی ارسال کر دیں، بڑی مہربانی ہوگی۔

☆ بیٹی اریشہ! اللہ تمہیں مکمل شفا دے۔ تھوڑی سی تفصیل درکار ہے۔ تمہیں گلے میں کب سے تکلیف ہے؟ کسی خاص موسم میں ہوتی ہے؟ تفصیل سے خط لکھو تاکہ جواب دیا جا سکے۔

□ سہیل شاہ۔ حضرو

o بابا جی! مجھے کوئی بہت مجرب وظیفہ دیجیے تاکہ مجھے جلد از جلد نوکری مل جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ اب اپنے والد کا سہارا بن جاؤں۔ وہ بہت ضعیف ہیں اور بڑے بھائیوں کے رویے نے ان کو بہت دکھ دیا ہے۔ وہ سب سے خفا رہتے ہیں۔ بات بھی نہیں کرتے۔ میں انہیں خوش رکھنا چاہتا ہوں۔

☆ بیٹے سہیل! تمہاری خواہش اللہ ضرور پوری کرے گا کیوں کہ تمہاری نیت بہت اچھی ہے۔ بیٹے! نماز کی پابندی رکھو اور جس قدر ممکن ہو ''یا مالک الملک'' کا ورد کیا کرو۔ بعد نماز فجر ایک بار سورۂ رحمٰن ضرور پڑھو۔ ان شاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔

□ صائم۔ مقام نامعلوم

☆ بیٹی صائم! اللہ تمہیں خوش اور مطمئن رکھے۔ نماز کی پابندی کامیاب زندگی کے لیے بہت ضروری ہے۔ دو باتوں پر عمل کرو گی تو اپنا مستقبل محفوظ کر لو گی۔ سب سے پہلے نماز کی پابندی کی عادت ڈالو۔ کوشش کرو منگیتر سے فون پر رابطہ کم ہو۔ زیادہ بات چیت سے حالات ہمیشہ خراب ہوتے ہیں۔ نمازِ عشاء کے بعد 7 تسبیح ''لاحول ولاقوۃ الا باللہ'' کی پڑھو اور اپنے اوپر دم کر لیا کرو۔ مجھے ایک ماہ بعد حالات سے مطلع کرو۔

□ شہرین بلوچ۔ دادو

o بابا سائیں! میرا مسئلہ بہت عام سا ہے۔ وہی عمر کی زیادتی اور شادی نہ ہونا۔ میرا تعلق درمیانے طبقے سے ہے جہاں والدین اولاد کو اچھی تعلیم و تربیت تو دیتے ہیں

مگر جہیز کے نام پر دینے کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔ لوگ آتے ہیں، کہتے ہیں، ہمیں پڑھی لکھی اور سگھڑ لڑکی چاہیے مگر یہ اندازہ کرنے کے بعد کہ جہیز کے نام پر ان کے ہاتھ کچھ نہ لگے گا، پلٹ جاتے ہیں۔ بابا سائیں! ایسے منافق لوگ بہت دکھ دیتے ہیں۔ میں پابندی سے نماز اور قرآن پڑھتی ہوں۔ جانتی ہوں کہ صرف اللہ سے ہی مانگنا چاہیے۔ آپ کو خط لکھنے کا مقصد صرف اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا ہے۔ میں جانتی ہوں، آپ پڑھے لکھے اور بہت سمجھدار انسان ہیں جو لوگوں کے جذبات کو سمجھتے ہیں۔ اللہ آپ کو صحت اور تندرستی عطا فرمائے۔

☆ بیٹی! خوش رہو۔ تمہاری خوبیاں وہی محسوس کرے گا جو خود مکمل ہوگا۔ دُکھی مت ہو، اچھے لوگوں کو اچھے لوگ ہی ملتے ہیں۔ بے شک معاشرتی رویے اب دل دکھانے لگے ہیں مگر بیٹی! یقین رکھو، اچھے لوگ بھی بہت ہیں۔ برے لوگ کم ہوتے ہیں مگر دُکھ دیتے ہیں اس لیے بہت لگتے ہیں۔ تم اللہ سے دعا کرتی رہو۔ بہت جلد کرم ہوگا۔ بکثرت یااللہ کا ورد کیا کرو۔

□ شاہجہاں بیگم۔ کوٹری

o بابا جی! میرے میاں ایک ادارے میں معمولی سی نوکری کرتے ہیں۔ تنخواہ بہت کم ہے۔ بچوں کا ساتھ ہے۔ مہنگائی نے تو کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ پارٹ ٹائم جاب کے بعد بھی مہینے کی 15 تاریخ تک ایک ایک روپیا خرچ ہوجاتا ہے، پھر ادھار لینا پڑتا ہے۔ بابا جی! ہمارے جاننے والے بھی ہمارے جیسے ہی ہیں لہٰذا مانگتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ روز روز کی پریشانی نے مجھے حد سے زیادہ چڑچڑا بنا دیا ہے اور میرے شوہر بے تحاشا کام کرنے کی وجہ سے بہت کمزور ہوگئے ہیں۔ بابا جی! میں بے صبری نہیں مگر امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی، کیا ہوگا؟ کیسے ہوگا؟ بچے بھی سہمے سہمے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی تو میں خود کو اتنا بے بس محسوس کرتی ہوں کہ رونے بیٹھ جاتی ہوں۔ بتائیے، کیا کروں؟

☆ بیٹی شاہجہاں! اللہ تمہیں ہمت دے۔ تم نے جو کچھ لکھا، وہ سب درست ہے۔ انسان کی زندگی انسان نے ہی تنگ کردی ہے۔ بیٹی! اللہ سے ہمت اور صبر مانگو۔ یہ وہ دولت ہے جو ہر کسی کو نصیب نہیں۔ بہت پیسا، بہت آسائشیں رکھ کر بھی لوگ بے سکون ہیں مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ایک وقت کھاتے ہیں تو دوسرے وقت کی خبر نہیں ہوتی مگر اللہ ان کا بندوبست کرتا ہے لہٰذا معاملات اللہ کے سپرد کرو۔ نماز ادا کیا کرو اور ہر نماز کے بعد 3 تسبیح پڑھو۔

○ وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا ۗ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيرًا ○

اول و آخر دُرود شریف 3-3 بار پھر حاجت بیان کرو۔ مدت 2 ماہ ہے۔ مجھ سے رابطے میں رہو۔

□ شہزاد عمر۔ کمالیہ

o بابا جی! میں ایک بہت اہم مسئلے کے ساتھ آپ کو خط لکھ رہا ہوں بابا جی میری بیوی بہت زبان دراز ہے اور میرے گھر والوں کی عزت بھی نہیں کرتی۔ گھر جنت کے بجائے دوزخ کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ حالات میرے بس سے باہر ہوتے جارہے ہیں۔ مجھے گھر میں داخل ہوتے ہی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں کسی جلتی ہوئی آگ میں کود گیا ہوں۔ سب مجھے دوسری شادی کا مشورہ دیتے ہیں مگر میں نہیں چاہتا کہ میں اپنی بیوی کو چھوڑ کر دوسری شادی کرلوں۔ ماں باپ بالکل ہماری زندگی کو ہمارے حال پر چھوڑ چکے ہیں۔ بابا جی میں بہت پریشان ہوں۔ مجھے بتائیے کہ کیا کروں کہ میری بیوی راہِ راست پر آجائے یا مجھے استخارہ کرکے بتادیجیے کہ کیا دوسری شادی میرے حق میں بہتر ہوگی۔ شادی کو سات سال ہوچکے ہیں اور میرے تین بچے ہیں۔ اسی مہینے جواب دے کر مطلع کریں۔ بہت احسان ہوگا۔

☆ بیٹا شہزاد! یقیناً میں تمہاری پریشان بہت اچھے طریقے سے سمجھ سکتا ہوں مجھے لگتا ہے تم گھر پر زیادہ وقت نہیں دے پاتے اسی لیے حالات اس نہج پر پہنچ چکے ہیں۔ خیر کوئی بات نہیں تمہیں نماز کی پابندی کرو اور ''یا سمیع، یا حفیظ'' کی تسبیح ہر نمازِ عشاء کے بعد تین تین بار پڑھو۔ استخارہ کرلیا گیا ہے۔ دوسری شادی تمہارے حق میں بہتر نہیں ہے۔ فوری طور پر مجھ سے تعویذ منگوالو۔ ان شاء اللہ بہت جلد خدا حالات معمول پر لے آئے گا۔

سخن آباد

غزل

آتشِ عشق میں کود کے پڑنا چاہا
غیظِ محبوب سے دامن کو بھرنا چاہا
ایک سنجیدہ روایت کے تسلسل کے لیے
اس نے پتے کی طرح ٹوٹ کے گرنا چاہا
آتشِ شوق نے مجھ کو ابھارا جس دم
میں نے نمرود کے رُخسار پہ جڑنا چاہا
میں نے اِک بار اسے پیار سے دیکھا تھا مگر
اس نے دس بار برے عشق میں مرنا چاہا
اس نے طوفان میں تنکے کا سہارا لے کر
ساحلِ عشق پہ آرام سے ترنا چاہا!
کیا عداوت تھی اسے، کانٹوں سے لڑتے لڑتے
اس نے گلشن کے ہر اِک پھول سے لڑنا چاہا
وہ تبسم، وہ تکلم، وہ ترحم تیرا
ایک بیمار سے کس زور سے لڑنا چاہا
صید کی جیت ہوئی، ہار گیا کیوں صیاد
تم نے تبریزی کس ناز سے مرنا چاہا

شاعر: ڈاکٹر شاہ محمد تبریزی، کراچی

مجھ کو آواز دے

شہرِ دل میں عجب خامشی ہے بسی
بے صدا ہو گئے جتنے تھے ساز بھی
اب تو آتی نہیں کوئی آواز بھی
اے مرے ہم نفس اے مرے ہم نشیں
مجھ کو آواز دے
خامشی کا فسوں ٹوٹنا چاہیے
جبر جیسا بھی ہو بولنا چاہیے
ورنہ ہوگا یہی شہرِ آشوب میں
دب کے رہ جائے گی
میری آواز بھی تیری آواز بھی
اے مرے ہم نفس، اے مرے ہم نشیں
مجھ کو آواز دے

شاعر: دستگیر شہزاد، ٹوبہ ٹیک سنگھ

سرد ہواؤں کو خصوصی تاکید

جاتے برس کی سرد ہواؤ
پیا ملن کی پیاس بجھاؤ
اس کی ایک جھلک دکھلا کے
پھر چاہے جدھر کو رخ کر جاؤ
اگلے برس جب میرے گھر میں
چوتھے موسم کی خوشبو لے کر
مجھ سے ملنے آؤ تو
ایک گلابی پتے پر
اس کا پتا بھی لکھ لانا
دیکھو دیر نہیں کرنا
جلدی آنا
تب تک میں ایسا کرتی ہوں
پچھلے برس کے سپنے سارے
کاغذ کی ناؤ پر رکھ کر
دریا کو دے آتی ہوں

شاعرہ: شفق عنایت، کراچی

محبت

بدنام زمانے میں محبت نہیں کرتے
دل والے تو دشمن سے بھی نفرت نہیں کرتے
اِک بار جس کو چاہا، سدا اُس کے رہے پھر
ہم لوگ امانت میں خیانت نہیں کرتے
تنہائی میں کرتے ہیں یاد آنسو بہا کر
ظاہر کبھی ہم اپنی عبادت نہیں کرتے
وقت آنے پر معلوم یہ ہوجائے گا تم کو
ہم صرف دکھاوے کی محبت نہیں کرتے

شاعر: ارسلان بخش عرف سنی، بنوں سٹی

عشق آتش

نہ آسمان دے گا سایہ
نہ زمین پناہ دے گی
نہ کر محبت یہ تیری ہستی مٹا دے گی
روئے گا تُو چھپ کر تنہائی میں
یہ آتشِ عشق تیری روح جلا دے گی

شاعرہ: ثانیہ بھٹی، سیالکوٹ

"دعا"

دل دھڑکتا ہے مگر بات نہیں پہلے سی
اب جو ہنستی ہوں مگر بات نہیں پہلے سی
تُو نے چاہا تو بہت ٹوٹ کے ہم کو ظالم
مگر اب وہ بات! بات نہیں پہلے سی
ایک مدت سے جینا چھوڑ دیا ہے ہم نے
جب سے زندگی! زندگی نہ رہی پہلے سی
دنیا کو سمجھتی تھی میں رنگین بہت ہے
رنگ تو بہت ہیں مگر رنگینی نہیں پہلے سی
ہر خوشی میں کرتی ہوں میں خوشیاں تلاش
مگر وہ چاہت وہ طلب نہیں پہلے سی
اب تو اِک ہی دعا خدا سے مانگتے ہیں ناز
دے ہمیں زندگی مگر نہ دے پہلے سی

شاعرہ: ثمینہ ناز، اورنگی کراچی

غزل

کیسی جاگی ہے آرزو مجھ میں
تُو نظر آئے تُو ہی تُو مجھ میں
ہاتھ تُو نے چھڑالیا جب سے
جم گیا ہے مرا لہو مجھ میں
جس کی تجھ کو تلاش رہتی ہے
ویسی دُنیا ہے ہوبہو مجھ میں
شہر ہی شہر میرے باہر ہے
دشت پھیلا ہے چار سُو مجھ میں
آنکھیں تمثیلہ بھیگی رہتی ہیں
کوئی بہتی ہے آب جُو مجھ میں

شاعرہ: تمثیلہ لطیف، جودھالہ، سیالکوٹ

غزل

ہمیں منظور ہے جو بھی سزا دیں گے
اگر وہ نفرتیں دِل سے مٹادیں گے
ضرورت گر پڑی تو دیکھنا لوگو!
لہو دے کر چراغوں کو جلادیں گے
ہم اپنی لاڈلی سے روز کہتے ہیں
تمہیں ہم یہ کھلونا کل دِلادیں گے
ہم اپنے پیار کو مٹنے نہیں دیں گے
ہر اک دیوار رستے کی گرادیں گے
ہمارا جُرم ہے سُولی پہ لٹکادو
محبت کے لیے جاں بھی گنوادیں گے
غموں کی دھوپ بھی تم تک نہیں پہنچے
مرے آنسو تمہیں ہر پَل دُعا دیں گے
کروگے ناز عادل کی محبت پر
تمہاری زندگی جنت بنادیں گے

شاعر: عادل حسین، کراچی

تمہارے خواب

میرے گھر کے دریچوں پر
ہمیشہ کی طرح اکثر
ستارے رقص کرتے ہیں
میرے کمرے کی کھڑکی پر
کئی مہتاب اُترے ہیں
میری آنکھوں کے اندر بھی
تمہارا عکس رہتا ہے
کئی گرداب اترے ہیں
تمہارے خواب اترے ہیں

شاعرہ: فریدہ فری یوسف زئی، لاہور

تیری یاد میں

کبھی رُک گئے کبھی چل دیے
کبھی چلتے چلتے بھٹک گئے
یونہی عمر ساری گزار دی
کبھی نیند میں کبھی ہوش میں
تو جہاں ملا تجھے دیکھ کر
نہ نظر ملی نہ زباں ہلی
یونہی سر جھکا کے گزر گئے
کبھی زلف پر، کبھی چشم پر
کبھی تیرے حسیں وجود پر
جو پسند تھے میری کتاب میں
وہ شعر سارے بکھر گئے
مجھے یاد ہے کبھی ایک تھے
مگر آج ہم ہیں جُدا جُدا
وہ جُدا ہوئے تو سنور گئے
ہم جُدا ہوئے تو بکھر گئے

شاعر: ایم اشفاق بٹ، لالہ موسیٰ

تیری میری پریم کہانی

ہر پت جھڑ میں
جب رنگ برسیں
اور کوئل گیت سناتی ہو،
ایسے میں جیون، یاد گلی
کے بند کواڑ بجا ہو
آواز نہیں آتی کوئی
کسی آہٹ کا بھی عکس کوئی
جب نظر نہیں آتا جاناں!
تو یاد بول کے پھول ہیں جو
سرسوں کی زردی بنتے ہیں
اور سرسوں کی زردی پر بھی
تیرے میرے سائے جاناں!
پھر دور دور تک چلتے ہیں
نخ رات کے ٹھنڈے فلک تلے
جب تارے تار بجاتے ہیں
چندا جب آہیں بھرتا ہے
اور خوابوں کی چندا بڑھیا
جو گت گت کات چلاتی ہے
تجھے دیکھتی ہے، مجھے دیکھتی ہے
اور ہجر کا چرخہ گت گت گت
چلتا ہی چلتا جاتا ہے
اور وقت کہیں رُک جاتا ہے
پت جھڑ، ساون بن جاتا ہے
اور یاد بول پہ نئے نئے......
پھر پھول سبھی کھل جاتے ہیں
ہم یادوں میں مل جاتے ہیں

شاعر: شہزاد کنول، شارجہ، دبئی

سفر رہ گیا

اِس جاتے سال میں پل بھر کو
گزرے دنوں کے بارے میں سوچنا
تمہیں کھو کے کیا میں نے پالیا
تیرے بعد کیا مجھے مل گیا
میری آنکھ میں نمی سی ٹھہر گئی
میرے دل میں درد سا جم گیا
تیرے ساتھ ہنسی بھی بچھڑ گئی
تیرے ساتھ سکوں بھی رُخصت ہوا
میرا دامن ہے خالی اِس طرح
جیسے ٹوٹا ہو شیشہ فریم کا
تیرے بعد ہے یوں خالی گھر میرا
جیسے موت کے بعد جسم رہ گیا
آبلہ پا ہوئی اِس سفر میں
میں ختم ہوئی سفر رہ گیا
اِک اور سال بھی بچھڑ گیا
اک اور دسمبر بھی گزر گیا

شاعرہ: بشریٰ سعید احمد، لاہور

جواب دو

جانے افلاس نے اجاڑے ہیں اور گھر کتنے
آنکھ نے دیکھنے ہیں ابھی دلخراش منظر کتنے
بےکسوں کے نصیب میں ہیں عتاب کہاں تک
اہلِ زمیں نے دیکھنے ہیں ان خداؤں کے قہر کتنے
کتنی ماؤں کی گود تم لوٹو گے ابھی اور
استبداد کے آقاؤ! اُجاڑو گے اور نگر کتنے
برقِ غضب ڈھاؤ گے دنیائے رنگ و بو پر کب تک
خاکستر کرو گے اور گل و ثمر کتنے
اور دیکھنے ہیں خوں آشام مناظر ابھی کتنے
اور اٹھنے ہیں معصوموں کے جنازے شام و سحر کتنے
پابند قفس رکھو گے تم طائرانِ چمن کب تک
اے صیادوں کاٹو گے اور بال و پر کتنے
اثر فرما ہے ہر سو ہوسِ اقتدار عاجز
رہزنی کرتے پھرتے ہیں اب بھی رہبر کتنے

شاعر: ڈاکٹر صغیر احمد عاجز، سوہاوہ۔ جہلم

غزل

سارا جہان لگنے لگا ہے دھواں مجھے
اب تیرے بعد یار سکوں ہے کہاں مجھے
شاید لکھی ہیں میرے مقدر میں ٹھوکریں
تو آتا راس کیسے کوئی آشیاں مجھے
شاید کسی کے خون کی لالی ہے دور تک
لگنے لگا ہے لال تبھی آسماں مجھے
تُو ہے امیر شہر تو فریاد سن مری
جگ کے ستم پہ کرنے دے آہ و فغاں مجھے
کیسے اُڑوں کہ کاٹ دیے دونوں پَر مرے
کیسے پکاروں تجھ کو کیا بے زباں مجھے
کتنا فراخ دل ہے اسے دیکھ تو نوید
کہنے لگا ہے اپنے وہ دونوں جہاں مجھے

شاعر: نوید سہیل لاکھو، ہوسڑی

غزل

اپنے معیار سے آگے نہیں گئے
ہم کوچۂ یار سے آگے نہیں گئے
بھلا دیتے تمہیں بس میں اگر ہوتا
دِل کے اختیار سے آگے نہیں گئے
ایسا نہیں کہ تجھ سے گلے نہ تھے
ہم صبر کی دیوار سے آگے نہیں گئے
وہ بھی ضد کے دائرے میں رہا قید
ہم بھی انا کے حصار سے آگے نہیں گئے
عامر دیکھ حکمت میرے خدا کی
روز و شب مدار سے آگے نہیں گئے

شاعر: عامر زمان عامر، ڈی آئی خان





روشنی والے

احمد سجاد بابر

لودھراں سے خیر و شر کی ازل سے جاری آویزش کی کتھا

بادلوں نے چاند پر پردہ ڈال دیا تھا، ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا، رات سرسراتی ہوئی گلی کوچوں میں در آئی تھی۔ سردیوں کی اس یخ بستہ رات میں ٹھنڈی ہوا بھی رگوں میں لہو منجمد کیے جا رہی تھی اور بلند و بالا درخت سر پٹخ رہے تھے۔ ہوا کی طوفانی کیفیت خوف ناک سماں باندھے ہوئی تھی، یوں لگتا تھا کہ جیسے بہت ساری بدروحیں مل کر بین کر رہی ہوں۔ اماوس کی اس کالی رات میں ایک سایہ آگے کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ ایک ننگ دھڑنگ تنومند شخص تھا، جس کے پورے جسم پر محض ایک لنگوٹ کسا ہوا تھا اور ماتھے پر قشقہ ہوا کھنچا تھا۔ اپنے پورے جسم پر بھبوت مل کر جانے وہ کہاں چلا تھا، اس کے پاؤں میں پڑی کھڑاؤں ٹک ٹک کی خوف ناک آواز پیدا کر رہی تھیں۔ وہ جوں جوں آگے بڑھ رہا تھا، فضا میں مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی آوازوں میں اشلوک اور بھجن کی آوازیں تیز ہو رہی تھیں، ساتھ میں گھنٹیوں کی مدھم آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ وہ لحیم شحیم شخص جلد ہی ایک شمشان گھاٹ پر بنے مندر کے پاس پہنچ گیا اور پھر ایک دم سے جیسے تمام آوازیں ساکت ہو گئیں۔ ہر طرف گھنی خاموشی کا پہرہ چھا گیا، ایسی خاموشی جو جسم کے رویں رویں میں خوف بن کر اتر جائے۔ یہاں تو دن کے اجالے میں بھی کوئی نہیں آتا تھا، کجا کہ یہ شخص جو رات کے کالے اندھیروں میں یہاں آ پہنچا تھا، ہر طرف ادھ جلی بکھری ہڈیوں کے درمیان گدھ موجود تھے جو ہڈیوں کو نوچ رہے تھے۔ اس ماحول میں بڑے بڑوں کا پتا پانی ہو جائے، مگر وہ پجاری نما شخص لاپروائی سے یہاں تک آن پہنچا تھا...... اس نو وارد نے اس تعفن زدہ ماحول میں پہنچ کر ہاتھ باندھے اور پھر زمین پر گر پڑا۔

"اے کنڈلی مندر کے مہان پجاری، یہ سیوک، آپ کا داس حاضر ہے، اس کی حاضری سوئیکار کرو، اسے شکتی دان کر دو......" وہ زمین پر ماتھا ٹیکے گڑگڑا رہا تھا کہ اچانک فضا میں تیز روشنی کا ایک جھماکا ہوا اور زمین پر گرا ہوا شخص ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆☆

یہ صدیق آباد نامی گاؤں تھا جس میں مسلمانوں کی آبادی اکثریت میں تھی۔ گاؤں کے مشرق میں گھنا جنگل تھا، جس کے پار ایک گہری ندی اور ندی کے دوسری طرف شانتی نگر گاؤں تھا جو مکمل طور پر ہندو آبادی پر مشتمل تھا۔ جنگل کے ساتھ ہی شمشان گھاٹ اور کنڈلی کا مندر تھا، جہاں ہندو اپنی رسومات ادا کیا کرتے تھے۔ دونوں گاؤں کے باشندے جنگل میں



لکڑیاں جمع کرنے اور مویشی چرانے آیا کرتے تھے، اس طرح یہ جنگل دونوں گاؤں کے لیے ایک مشترکہ سرحد کا کام دیتا تھا۔ کئی مہینوں سے صدیق آباد کے باسیوں پر روز قیامت ٹوٹ رہی تھی اور وہاں عجیب وغریب واقعات کا ہونا معمول بن چکا تھا۔ پہلے پہل جب جنگل سے چرواہوں کی لاشیں ملنا شروع ہوئیں تو گاؤں والوں نے اس طرف جانا چھوڑ دیا، اس کے بعد بھولے بھٹکے مسافروں کی اودھڑی ہوئی لاشوں نے خوف و ہراس پھیلا دیا۔ رات بھر جنگل سے خوف ناک چیخوں کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔ جب جنگل کی طرف سبھی نے جانا بند کر دیا تو پھر گاؤں سے اِکا دُکا افراد غائب ہونے لگے اور ان کی لاشیں جنگل سے ملنے لگیں اس طرح کہ ان کے جسم میں خون کا ایک بھی قطرہ نہ ہوتا تھا، لیکن ان کے باقی جسم پر بھی کوئی نشان یا زخم نہیں ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی درندے نے اس کے گلے میں اپنے دانت گاڑ کر سارا خون چوس لیا ہو، پھر انسانوں کے ساتھ ساتھ مویشیوں کی باری بھی آنے لگی تو گاؤں کے باسیوں میں تشویش کی لہر دوڑتی چلی گئی۔ ہر ایک اس کا شکار تھا جو گلی کوچوں میں پھر رہا تھا، وہ بھی اور جو گھر میں بند تھا وہ بھی۔ ہر کسی کے چہرے پر ایک اَن دیکھا خوف تھا، گلیاں سرِ شام ہی ویران ہو جاتیں، کچھ گھرانے صدیق آباد چھوڑنے کی کوشش کر چکے تھے، مگر رات بھر بیل گاڑیاں ہانکنے کے بعد انہوں نے صبح ہونے پر دیکھا کہ وہ گاؤں کے باہر ہی کھڑے ہیں تو ان کے چہرے زرد پڑ گئے، جانے وہ کس شیطانی چنگل میں پھنس چکے تھے!!

آخر کار گاؤں والوں نے گاؤں میں پہرے کا سلسلہ شروع کرنے کا فیصلہ کیا اور پھر ہر گھر سے ایک ایک فرد چن کر پچاس جوانوں کی ٹولی بنائی گئی، جس میں سے آٹھ افراد کا روز پہرہ ہوتا تھا، جو گاؤں کے داخلی اور خارجی راستوں پر نظر رکھتے تھے، مگر اس سے کوئی فرق نہ پڑا، سوائے اس بات کے کہ اس مرتبہ چند پہرے دار بھی اس عفریت کی لپیٹ میں آگئے، کسی نے بھی نہ کسی کو آتے دیکھا اور نہ ہی جاتے ہوئے، مگر پراسرار طور پر پہرے داروں کی لاشیں جنگل کے شروع میں پڑی ملیں۔ ان کے جسم سے بھی خون کی آخری بوند تک غائب تھی۔ صدیق آباد کے باشندے خوف سے لرز اُٹھے، مگر انہوں نے پہرہ جاری رکھنے کا فیصلہ کیا اور مساجد میں دعاؤں کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔

☆☆☆☆

وسیم عرف چھیما نام تھا اس کا، صدیق آباد کا سب سے پھرتیلا نوجوان، وہ گاؤں کی کبڈی ٹیم کا سب سے تیز کھلاڑی تھا اور...... اس وقت وہ ہی گاؤں کے باہر پہرے پر مامور تھا۔ یہ راستہ قبرستان کی طرف جاتا تھا۔ چھیمے کو بھوت پریت سے کبھی ڈر نہیں لگا تھا، اس وجہ سے اس نے خود سے پہرے کے لیے گاؤں کی یہ سمت چنی تھی۔ رات دبے پاؤں گزرتی جا رہی تھی۔ اس وقت گاؤں کے ہر کونے پر ایک ایک جوان موجود تھا۔ ان سب کے پاس ایک دوسرے کو چوکنا کرنے کے لیے وسل اور تحفظ کے لیے مضبوط لاٹھی تھی۔ وہ ایک اندھیری رات تھی، دور دور تک کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ چھیما ایک جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھا ہوا تھا اور گرد و پیش پر اس کی بھرپور نظر تھی۔ وہ پہرہ اس عزم کے ساتھ دیتا تھا کہ گاؤں کو اس مصیبت سے نجات دلانی ہے جس کی لپیٹ میں وہ بلا وجہ آچکے تھے۔ اس وقت اس کی نظر جنگل سے آنے والے راستے پر مرکوز تھی، اچانک اسے ایک آہٹ سنائی دی، اس نے لاٹھی پر اپنی گرفت مضبوط کی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آہٹ کا منبع تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگا، مگر اندھیرے میں اسے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ وسیم کو محسوس ہوا کہ اس کے سامنے سے کچھ بجلی کی طرح گزرا ہے، وہ جو چیز بھی تھی، اسے نظر نہ آسکی تھی چھیما جھاڑی کے عقب سے نکلا اور قبرستان جانے والے راستے کی طرف لپکا، کوئی ضرور تھا جو قبرستان کی طرف گیا تھا۔ چھیمے نے دبے پاؤں مگر برق رفتاری سے قبرستان کی طرف بڑھنا شروع کیا، اس وقت وسل بجانے کا مطلب اس چیز کو چوکنا کرنا تھا، لہٰذا اس نے سب کچھ اپنے بل پر کرنے کا فیصلہ کیا، آج کچھ بے نقاب ضرور ہونے والا تھا۔ قبرستان کے قریب ہی ایک جگہ سے دیوار ٹوٹی ہوئی

تھی جس کی وجہ سے چھیمے کو شارٹ کٹ مل گیا، وہ آہستگی سے قبرستان میں داخل ہوگیا، اس کا دل ایسے دھڑک رہا تھا جیسے پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا، عجب طرح کے واہمے اس کے دل میں اٹڈر ہے تھے۔ قبروں کے پیچھے چھپتا ہوا وہ آگے بڑھ رہا تھا، اچانک وہ اس کے سامنے کھڑا تھا!!

جانے وہ انسان تھا یا کوئی درندہ، اندھیرے میں وہ اندھیرے ہی کا حصہ لگ رہا تھا، اس کی کمر چھیمے کی طرف تھی اور وہ اپنے ہاتھوں سے ایک قبر کو پھاڑ رہا تھا، اس کے ہاتھ کدال کی طرح چل رہے تھے۔ اندھیرے میں اس کا وجود بھاری بھرکم نظر آرہا تھا، اس کے سارے جسم پر گھنے بال اس کی ہیبت ناکی میں اور بھی اضافہ کررہے تھے۔ اس کے منہ سے غیر انسانی آواز اور غراہٹیں بھی نکل رہی تھیں۔ چھیمے کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا تھا، اچانک وہ وجود جھٹکے سے واپس مڑا، شاید اس کی حسیات نے کسی اور کی موجودگی محسوس کرلی تھی۔ چھیما کو لگا جیسے اس کا دل خوف سے پھٹ جائے گا، اس کی ٹانگوں سے جان نکل رہی تھی...... ریچھ جیسے جسم پر انسانی مشابہت والا چہرہ، اور دو تیز دانت کسی درندے کی طرح اس کے منہ کے دہانے سے جھانک رہے تھے۔ اس نے اپنے نوکیلے پنجے میں چھیمے کی گردن دبوچ لی اور اسے فضا میں بلند کرکے کسی دھوبی کی مانند اسے زمین پر مارا۔ یہ عمل اس نے کئی بار کیا۔ وہ کسی جناتی طاقت کا مالک تھا، آخر چھیمے کا زندگی سے بھرپور جسم چیتھڑوں میں بٹ گیا!!

☆☆☆☆

اس کا نام آتمارام تھا۔ کنڈلی کے مندر میں کالی ماتا کے خوں آشام مجسمے کے سامنے وہ آلتی پالتی مارے آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا اور وہ زیرلب مخصوص منتروں کا جاپ جاری رکھے ہوئے تھا۔ اس کے چاروں طرف ایک حصار کھنچا ہوا تھا جو اس کے تحفظ کی ضمانت تھا۔ یہ حصار اسے منتر کی طاقتوں سے محفوظ رکھے ہوئے تھا۔ کالی آتماؤں نے آخری دم تک کوشش کرنی تھی کہ وہ اس کے قبضے میں نہ آپائیں، مگر وہ آتمارام کا اس وقت تک کچھ نہ بگاڑ سکتی تھیں، جب تک کہ وہ اس سفید دائرے میں موجود تھا۔ آج اس کے چالیس روزہ عمل کی آخری شب تھی اور یہ اس کے لیے اہم ترین رات تھی، اسی وجہ سے آتمارام کی تمام توجہ منتر کے جاپ پر تھی!!

اچانک فضا میں زوردار کڑاکا ہوا، یوں لگا جیسے کسی نے مندر کے درودیوار کو ہلا دیا ہو۔ مندر کا فرش جھٹکے کھانے لگا اور دیواریں جیسے گرنے کو پر تولنے لگیں، آتما رام نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں، اسے لگا جیسے زلزلہ آ گیا ہے، قریب تھا کہ وہ حصار سے باہر چھلانگ لگا کر مندر سے باہر بھاگتا، کسی ان دیکھی طاقت نے اسے جھٹکے سے حصار کے اندر گھسیٹ لیا، اس کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''آتمارام، جاپ مکمل کرو، کیوں اپنے جیون کے بیری ہوئے ہو، یہ کیول دھوکہ ہے، پلید آتماؤں کا چھل ہے، سیما سے باہر پیر دھرے تو تمہارا کریا کرم ہوا سمجھو بالک...... بدھی سے کام لو''

ایک غیرانسانی آواز آتمارام کے کانوں میں پڑی تو وہ سمجھ گیا کہ یہ اس کے پہلے سے قابو کیے ہوئے متر ہیں جو اس کی رکھشا کررہے ہیں، لہٰذا وہ خود پر قابو پا کر دوبارہ حصار میں بیٹھ گیا اور آنکھیں بند کرتے ہوئے اپنا ادھورا جاپ شروع کردیا۔ اسے احساس تھا کہ اگر آج اس کی طاقتیں اس کی مدد نہ کرتیں تو وہ اس وقت خارش زدہ کتے کی طرح گلیوں میں بھٹک رہا ہوتا، یہ سوچ کر اسے خوف سے جھرجھری سی آگئی۔

اس کے حصار میں بیٹھتے ہی ہر طرف مکمل سکوت چھا گیا جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ رات سرسراتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ آتمارام کی دھڑکنیں زیروزبر ہورہی تھیں، اچانک ایک زوردار دھاڑ مندر کی فضا کو مرتعش کرگئی۔ یہ کسی جنگلی ریچھ کی چیخ تھی، جس میں وحشت اور جنون بھرا ہوا تھا، یوں لگ رہا تھا کہ درندہ وحشی اور بے قابو ہوچلا ہے۔ آتمارام نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں، ایک طوفانی دھکے کے ساتھ مندر کے اندرونی کمرے کا دروازہ کھلا اور بے شمار دیوہیکل جنگلی ریچھ دانت نکوسے، چنگھاڑتے، اپنی تھوتھنیوں سے کف اڑاتے آتمارام کی طرف دوڑے۔ ان کی مجنونانہ

طاقت سے زمین لرز رہی تھی۔ ریچھ آندھی اور طوفان کی طرح آتمارام کی طرف دوڑ رہے تھے، یوں لگ رہا تھا کہ بس ایک لمحے کے بعد وہ آتمارام کے چیتھڑے اڑا دیں گے، اس کا بدن ریزہ ریزہ کر دیں گے، آتمارام کے پاس بس چند ہی لمحے تھے جو اس کی زندگی کی ضمانت تھے۔ اس نے حصار سے باہر مندر کے داخلی دروازے کی طرف چھلانگ لگائی، اس وقت اس کے اعصاب پر صرف موت کا خوف طاری تھا، اسے ایسے لگا جیسے وہ کسی دیوار سے ٹکرائی گیند کی طرح واپس حصار کے اندر کی طرف پلٹا ہے، اسی لمحے ریچھ حصار کے پاس پہنچے اور ایک دم سے غائب ہو گئے، ہر طرف گہری خاموشی تھی جیسے لحہ بھر پہلے وہاں کچھ بھی نہ تھا، نہ ہی چنگھاڑتے ہوئے ریچھ تھے اور نہ ہی وحشت بھرا شور...... آتمارام کی سانسیں ابھی تک اس کے قابو سے باہر تھیں۔

''تمہیں کہا بھی تھا آتمارام کہ وہ طاقتیں مزاحمت کریں گی، اپنا زور دکھائیں گی، جن کو تم قابو کرنا چاہ رہے ہو، مورکھ مت بنو، نچلے بیٹھ کر جاپ مکمل کرو، یہ سب کیول نظر کی چھایا ہے، چھل اور فریب ہے۔''

مندر کی دیواروں سے کنڈلی کے مہا پجاری کی آواز پھوٹی اور آتمارام نے اپنا سر تھام لیا، تھوڑی دیر بعد اس نے بمشکل خود کو سمیٹا اور اپنا جاپ شروع کیا۔ جتنی بڑی طاقتوں کو وہ قابو کرنا چاہ رہا تھا، اتنی ہی کٹھنائیاں زیادہ تھیں۔ اس نے دل میں تہیہ کر لیا کہ اس بار کچھ بھی ہو جائے وہ کان نہیں دھرے گا۔ رات سرکتی جا رہی تھی، خلافِ توقع کچھ بھی نہ ہوا، آتمارام کا جاپ اختتام کی طرف بڑھ رہا تھا، گہری خاموشی کا پہرہ تھا، آتمارام کی کامیابی تھوڑے ہی فاصلے پر تھی، اچانک مندر میں مترنم گھنٹیوں کی آواز گونجنے لگی، ساتھ ہی پائل کی چھنک سنائی دی، تیز خوشبو کے جھونکے پر آتمارام نے آنکھیں کھول دیں، سامنے جیسے کوئی اپسرا چلی آ رہی تھی، دنیا جہان کا حسن اس مہ جبیں میں سمٹ آیا تھا۔ اس لیے ہر قدم کے ساتھ پاؤں کی پائل کھنک جاتی اور اس حسن کی دیوی کے جسم میں لوچ کی ایک لہر اٹھتی جو ندی کی شفاف سطح پر موجِ آب کی طرح سفر کرتی جاتی، آتمارام جیسے پلکیں جھپکنا بھول گیا تھا۔

''اُٹھیے مہاراج، داسی حاضر ہے، آپ کی تپسیا سوئیکار ہوئی......''

''کون ہو تم'' آتمارام کے ہونٹوں سے فقط اتنا ہی نکل پایا۔

''میں وہ آتما ہوں جسے اپنا بنانے کی خاطر آپ نے اتنی کڑی تپسیا کی ہے، آپ کا جاپ مکمل ہوا، آج سے آپ اس دھرتی کے سب سے شکتی مان انسان ہیں۔'' اس اپسرا نے ادب سے گردن کو خم دے کر کہا۔

آتمارام کا دل جیسے پسلیوں کو توڑ کر باہر نکلنے لگا، اس کا سپنا پورا ہونے جا رہا تھا، فخر کے احساس کے ساتھ اس کی گردن اکڑ گئی، ایک فلک شگاف قہقہہ اس ہونٹوں سے نکلا۔

''آتمارام، تُو اس سنسار کا پردھان ہے، تیرے برابر کوئی نہیں آج سے......''

آتمارام کی ہذیانی ہنسی اور فخریہ قہقہے ہر طرف گونج رہے تھے، اس نے باہر جانے کے لیے قدم اٹھایا اور وہ ایک جھٹکے کے ساتھ حصار کی اندر کی طرف گرا جیسے کسی اَن دیکھی طاقت نے اسے دھکا دیا ہو، اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ اپسرا جانے کہاں چلی گئی، اب اس کے سامنے کوئی نہ تھا، بس ہولناک سناٹا اس کو تک رہا تھا، اور مندر کی سیلن زدہ دیواریں اس ماحول کو اور بھی ہیبت ناک بنا رہی تھیں۔

''یہ...... یہ کیا تھا......'' اس کے منہ سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکلے۔

''شاید جاپ مکمل نہیں ہوا، ایک بار پھر میری شکتیوں نے مجھے بچایا ہے۔'' اس نے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے سوچا۔

آتمارام نے ہمت جمع کرتے ہوئے دوبارہ جاپ شروع کر دیا۔ اس مرتبہ سب کچھ ایک سکون کے ساتھ ہوتا چلا گیا، آخر کار آتمارام نے منتر کا آخری اشلوک مکمل کیا اور چاروں طرف شور اور چیخوں کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں، جیسے لاکھوں آتمائیں مل کر شور کر رہی ہوں، آہستہ آہستہ شور و غل کم ہوتا چلا گیا اور کنڈلی مندر میں ایک بار پھر مکمل خاموشی چھا گئی۔

''آتمارام، تمہیں بدھائی ہو، تم نے وہ کچھ پا لیا ہے جس کے لیے جانے کتنے دیوانے یہاں اپنی جان سے گذر گئے تھے، اب تم سیما پار کر سکتے ہو اور اپنی نئی شکتی سے ملاقات کر سکتے ہو...... تمہاری نئی شکتی، مہان شکتی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔'' کنڈلی مندر کی نمناک فضا میں مہا پجاری کی آواز گونجی۔

''مہاراج آپ کی سور کھشا سے ہی میں سپھل رہا ورنہ شاید میں اس سے یہاں دکھ بھی نہ رہا ہوتا، دیوی کے قدموں میں خون کی بلی کا انتظام بھی آپ کرتے رہے۔''

''آتمارام، وہ تو پلید مسلوں کا خون تھا جو کالی ماتا پر روز چھڑکنا ضروری تھا، بس تم اب جلدی اس شبھ کام کا آغاز کر دو جس کے لیے ہم سب نے تمہیں سویکار کرایا ہے، تا کہ ہماری صدیوں کی منوکامنائیں پوری ہو سکیں، مگر روشنی سے بچ کر رہنا آتمارام، ہم اندھیرے والے ہیں، کالے سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں ہی ہماری شکتی اور جیون ہے۔'' مہا پجاری کی آواز میں خون کی پیاس رچی ہوئی تھی۔

☆☆☆☆

''بھائیو، آپ کو معلوم ہے کہ ہم کس مصیبت کا شکار ہیں اور اسی کے حل کے لیے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں۔''

سادہ سے لباس اور سر پر عمامہ لیے ہوئے نورانی چہرے والے بزرگ نے کھڑے ہو کر تدبر سے بات کا آغاز کیا۔

صدیق آباد کے امام مسجد شاہ عالم، جسے سب احترام سے بابا جی کہتے تھے، کے طلب کرنے پر سب مسجد میں جمع تھے۔ گاؤں کی بڑی چوپال کے سامنے موجود مسجد اس وقت صدیق آباد کے باسیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔

''بابا جی، پہرے کے باوجود نقصان ٹل نہیں رہا۔ جانے کون سی بلا، کون سا درندہ ہمارے درپے ہے کہ جو نہ تو نظر آتا ہے اور نہ ہی اس کے پاؤں کے نشان کسی نے دیکھے ہیں، کیا خبر وہ اُڑ کر آتا ہے یا وہ کوئی بدروح ہے، ہر توڑ کر لیا ہے، مگر ہمارے سر سے یہ بلا نہ ٹلی۔'' گاؤں کے نمبردار نے تشویش سے لبریز لہجے میں بات کو آگے بڑھایا۔

''شاہ صاحب، اب تو قبرستان سے لاشیں بھی غائب ہونے لگی ہیں۔ ہر تازہ قبر صبح کو کھلی ملتی ہے اور مردہ غائب ہوتا ہے۔ میں نے ساری ساری رات جاگ کر دیکھ لیا ہے، مگر کچھ نظر نہیں آیا، چھیمے کی لاش بھی قبرستان سے ہی ملی ہے، جسم میں بھی خون کا ایک بھی قطرہ نہیں تھا۔'' گاؤں کے قبرستان کے گورکن نور محمد نے خوف زدہ لہجے میں کہا تو مسجد میں سکوت چھا گیا، سب لوگ سوچوں میں گم تھے۔

''مجھے لگتا ہے چوپال میں کھڑے برگد کے درخت میں کچھ ہے......'' یوں لگا جیسے کسی نے بیچ چوراہے میں بم پھاڑ دیا ہے، سبھی ایک دم چونک پڑے۔ یہ شیرو تھا، صدیق آباد کی والی بال ٹیم کا کپتان، سب اسے اپنی چستی کی وجہ سے گولی کے نام سے پکارتے تھے۔

''اوئے گولی، بجھارتیں نہ ڈال، صاف صاف بات کر۔'' نمبردار نے بے چینی سے بے اختیار کھڑے ہوتے ہوئے جوش سے کہا۔

''وہ جی...... بس مجھے کئی بار رات کو شک سا ہوا تھا کہ قبرستان کی طرف سے کوئی سایہ سا آیا اور برگد کے پیڑ میں گم ہو گیا، جب میں نے آنکھیں مل مل کے دیکھا تو مجھے کچھ بھی نظر نہیں آیا۔'' شیرو نے جھجکتے ہوئے بات کی۔

''گولی بیٹا، تمہیں وہم ہوا ہوگا، نیند کی لہر آئی ہو گی تمہیں، یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی چیز برگد کے پیڑ پر گئی اور وہاں سے گم ہو گئی۔'' مجمع سے بیک وقت کئی آوازیں آئیں۔

''ٹھہرو...... شاید شیرو ٹھیک کہہ رہا ہو، مجھے لگتا ہے یہ شیطانی طاقتوں کا کوئی کھیل ہے۔ بھید بھرے واقعات بتاتے ہیں کہ معاملہ کچھ اور ہے، خیر دیکھتے ہیں...... فی الحال تو چوپال میں تین جوانوں کی باری لگا دو جو برگد کے پیڑ اور اس کے ارد گرد کی جگہ پر کڑی نظر رکھیں۔'' بابا جی کی بات پر کئی چہرے پھیکے پڑ گئے۔

''پر بابا جی، ہم کیسے مقابلہ کریں گے ان دیکھی طاقتوں کا۔ ہمارے پہرے داروں کو پہلے بھی کچھ نہیں نظر آیا تھا اور اب بھی نظر نہیں آئے گا۔ میرا خیال ہے ہمیں کسی سفلی عامل کی خدمات حاصل کرنی چاہئیں۔''

کسی نے یہ کہا ہی تھا کہ بابا جی تڑپ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے چہرے کا رنگ سرخ پڑ گیا اور تسبیح کے

دانوں پر ان کے ہاتھ تیز تیز چلنے لگے، واضح طور پر وہ دکھ اور غصے کی کیفیت میں نظر آ رہے تھے۔

''مجھے دکھ ہوا ہے یہ بات سن کر......'' بابا جی بولے تو ان کے لہجے میں آنچ دیتا ٹھہراؤ تھا۔

''ہم سب روشنی والے مذہب کے پیروکار ہیں۔ ہم اس نبی ﷺ کے امتی اور اس روشن کتاب کے ماننے والے ہیں، جس میں قیامت تک کے مسائل کا حل موجود ہے۔ وہ کتاب جس کا وزن پہاڑ نہ سہار سکتے تھے، مگر انسان کے دل نے جس وزن کو سہار لیا، آج اس دل میں محض خوف، اندیشے اور وسوسے ہیں...... کیوں کہ اس میں قرآن کا نور نہیں رہا...... میرے ساتھ آؤ تم سب لوگ'' یہ کہتے ہوئے بابا جی مسجد سے باہر کی طرف بڑھے۔ ان کے چہرے پر سنجیدگی کے بادل تھے۔ وہ شخص جس نے سفلی عامل بلانے والی بات کی تھی، شرمندہ شرمندہ سا سب کے پیچھے پیچھے تھا۔ سارا اکٹھ بابا جی کے ساتھ ساتھ تھا، سب کے چہروں پر تجسس تھا کہ بابا جی کیا کرنے لگے ہیں۔

بابا جی مضبوط قدموں چلتے ہوئے برگد کے درخت تک پہنچے، جو مسجد کے عین سامنے چوپال میں اپنی آن بان کے ساتھ کھڑا تھا۔ یہ ایک وسیع گھیرے پر محیط درخت تھا جو صدیوں پرانا تھا۔

''شیرو مٹی کے کوزے میں مجھے پانی لا کر دو۔'' بابا جی نے گولی سے کہا۔

گولی مسجد کی طرف دوڑا اور چند ہی لمحوں میں مٹی کے آب خورے میں پانی لے آیا۔ بابا جی نے اس پانی پر کچھ پڑھ کر دم کیا اور ایک نظر برگد کے پیڑ پر ڈالی۔ برگد میں کچھ سرسراہٹوں کی آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ صدیق آباد کے باسیوں کے چہرے پر گہرا خوف نظر آ رہا تھا۔ بابا جی نے آب خورے سے پانی چلّو میں لیا اور اس کے چھینٹے برگد کے پیڑ پر پھینکے، اچانک برگد کے پیڑ سے غیر انسانی چیخوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔

''معاف کر دیں شاہ صاحب، ہمیں نہ بھسم کریں، ہم آپ کی بنتی کرتے ہیں۔'' برگد کے درخت کے اندر سے اور شاخوں سے آوازیں بلند ہوئیں۔

''تم نے یہاں کیوں بسیرا کر رکھا ہے۔ کیوں معصوم لوگوں کی جان لے رہے ہو؟'' بابا جی نے پھر مزید چھینٹے برگد کی طرف اچھالے۔

''ہائے، اُف، مر گئے بابا جی، ہمیں جانے دیں، ہم آتمارام کی شکتیاں ہیں، اسی کے حکم سے کر رہے ہیں۔''

برگد کی شاخیں زور زور سے ہلیں، جیسے ان میں چھپی طاقتیں بھاگنا چاہتی ہوں، مگر کوئی رکاوٹ ان کے راستے میں ہو۔

''تم جانتے ہو کہ میں اپنے رب کے حکم سے یہیں تم سب کو جلا سکتا ہوں، مگر جا کر آتمارام کو بتا دو کہ آئندہ صدیق آباد کا رخ تک نہ کرے ورنہ زندہ واپس نہیں جائے گا۔'' بابا جی کے الفاظ ختم ہوتے ہی جیسے ہزاروں پرندے پر پھڑپھڑاتے ہوئے شاخوں سے اڑ گئے، ہر طرف گھنا سکوت چھا گیا۔ گاؤں والوں کے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے، ان کے چہروں پر خوف بھی تھا، بابا جی کے چہرے پر ایک الوہی سکون تھا، صدیق آباد کے باسی منہ کھولے حیرت سے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

''بابا جی یہ کیا تھا سب......'' نمبردار کے لبوں سے ٹوٹے ہوئے جملے نکلے۔

''مجھے شک تو تھا، مگر میں یہ سب کسی جنگلی درندے کی خوں آشامی سمجھ کر اس طرف دھیان نہیں دے سکا، یقین مجھے شیرو کی بات سے ہوا، میں اکیلے میں ان کا توڑ کرنا چاہتا تھا، مگر تم لوگوں کو دکھانے کے لیے ساتھ لانا پڑا کہ قرآن سے زیادہ طاقتور کلام روئے زمین پر کوئی اور نہیں ہے۔ اس پانی پر میں نے باوضو ہو کر صرف معوذتین پڑھی ہیں یعنی کہ سورۂ فلک اور والناس۔ معوذتین کا نزول مدینے میں ہوا، جب ہمارے پیارے نبی ﷺ پر جادو کرایا گیا، یہ سورہ سحر اور آسیب کا توڑ ہیں اور کالی ماتا کی طاقتوں کے لیے تو صرف حروف مقطعات ہی کافی ہیں، وہ حروف جو کائنات کے مالک کا بھید ہیں، جو مختلف سورتوں کے شروع میں موجود ہیں، مجھے یقین ہے کہ اب آتمارام باز آ جائے گا۔'' بابا جی نے تحمل سے گاؤں والوں پر نظر ڈالتے ہوئے تفصیل سے سمجھایا تاکہ ان کے دل سے خوف دور ہو جائے۔

''مگر بابا جی، آتمارام کے یہ سب کرنے کا مقصد کیا ہے، پہلے بھی تو وہ موجود تھا، اس سے پہلے تو کبھی ایسا

نہیں ہوا؟'' نمبردار نے متوحش لہجے میں پوچھا۔
''پہلے آتمارام محض شعبدے باز تھا، مگر اب اس پر کالی طاقتوں نے ہاتھ رکھ دیا ہے اور مقصد بھی سامنے آ جائے گا، تم لوگ فکر مت کرو۔'' باباجی نے رسان سے کہا۔
گاؤں کے باسیوں کے چہروں پر اب واقعی سکون چھلک رہا تھا!!

☆☆☆☆

آتمارام کی آنکھیں بند تھیں، وہ کسی نئے جاپ میں مصروف تھا۔ یہ کنڈلی مندر کا بڑا ہال تھا جس میں کالی دیوی کا بت ہیبت ناک انداز میں ایستادہ تھا، اچانک فضا میں ایک زوردار سراٹے کی آواز گونجی، آتمارام نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں، اسے ایک لمحے کو سمجھ نہیں آیا کہ کیا ہوا ہے، اسی لمحے مندر کی چھت سے کئی سیاہ رنگ کے خوف ناک بندر قلابازیاں کھاتے ہوئے آتمارام کے سامنے آگرے۔ ان کی آنکھیں دہک رہی تھیں اور منہ سے تکلیف دہ آوازیں نکل رہی تھیں جیسے وہ سخت اذیت میں ہوں۔ وہ آتمارام کے سامنے لوٹ پوٹ رہے تھے۔
''اوہ، اوہ..... کالی کی بلوان شکتیوں، مہان کالی آتماؤں، ہنومان کے بڑے مندر کے سیوکو..... تم یہاں کیسے آگئیں، تمہیں تو میں نے صدیق آباد میں بھیجا ہوا تھا.....'' آتمارام ایک جھٹکے سے ہڑبڑا کر کھڑا ہوا، اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔
''مہاراج، ہمیں شما دے دو۔ ہم جل رہے ہیں، ہم وہاں نہیں جائیں گے۔ وہاں روشنیوں والے ہیں، ہمیں روشنی کے کوڑے مار مار کر وہاں سے نکالا گیا ہے، ہم وہاں گئے تو وہ ہمیں روشنی کی گپھا میں قید کر دے گا، جس کی دیواروں سے ہم سر ٹکرا ٹکرا کر مر جائیں گے۔'' ایک موٹے تازے سیاہ بندر کے منہ سے گھگھیاتی ہوئی آواز نکلی۔
''کون ہے وہ، کون ہے، ہم سے بڑا بلوان کون آگیا وہاں..... آتمارام جس کے قبضے میں کالے سمندروں کی کالی گہرائیوں میں رہنے والی مہان شکتیاں ہیں..... کس نے ہمارا راستہ کاٹنے کی کوشش کی ہے.....'' آتمارام مارے حیرت اور غصے کے حال میں جلتے توے پر پانی کے قطرے کی طرح ناچ رہا تھا۔
''مہاراج، وہ روشنی والا ہے، ہمیں وہاں نہ بھیجنا مہاراج، ورنہ آپ ہم سے محروم ہو جائیں گے، وہ مہان شکتی کا مالک ہے۔'' بڑے بندر کے منہ سے ایک بار پھر تکلیف میں ڈوبی آواز نکلی۔
''جاؤ، چلے جاؤ تم سب، ابھی آتمارام اتنا کمزور نہیں ہوا، ابھی بہت کچھ ہے میری پٹاری میں۔'' آتمارام نے بندروں کی طرف ہاتھ جھٹکا اور تمام بندر وہاں سے غائب ہوگئے۔
''کیا کیا جائے، کیسے نمٹا جائے ان مسلوں سے.....'' آتمارام نے بڑبڑاتے ہوئے خود کلامی کی، وہ بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔
''افریقہ کے جنگلوں کی دلدلوں میں سڑاند میں پلنے والی شکتی کو بلاتا ہوں، وہ کچھ بتائے گی۔'' آتمارام نے آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھا اور اپنے سامنے ہاتھ کو زور سے جھٹکا تو زمین ایک دھماکے سے شق ہوگئی اور ہال میں دھواں بھر گیا۔ جب دھواں چھٹا تو سامنے ایک عجیب الخلقت، ہیبت ناک بڑھیا موجود تھی، جس کا جھرّیوں بھرا سیاہ چہرہ، لمبے دانت اور سر پر بالوں کی جگہ سانپوں کے گچھے اسے خوف ناک بنا رہے تھے اور سانپ اپنی زبانیں لپلپا رہے تھے۔
''مجھے بھینٹ دو آتمارام، کیوں بلایا ہے مجھے تم نے۔'' بڑھیا کے منہ سے بھاری سی آواز نکلی۔
''یہ لو دلدل کی شکتی، پہلے تم اپنی بھینٹ لو.....'' آتمارام نے ایک چاقو سے اپنی انگلی میں چیرا دیا جس سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگیں، خون دیکھ کر بڑھیا کے چہرے پر چمک آگئی اور اس نے اپنے سر سے ایک سانپ کا منہ آتمارام کی انگلی پر ٹکا دیا۔ سانپ نے آتمارام کا خون پینا شروع کر دیا، تھوڑی دیر بعد آتمارام نے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا، بڑھیا کے چہرے پر اب مکمل سکون تھا۔
''پوچھو آتمارام، کیا پوچھنا ہے؟''
''دلدلی شکتی، مجھے بتاؤ کہ میں صدیق آباد کا منصوبہ کیسے مکمل کر سکتا ہوں؟ مہان پجاری خود اس میں دلچسپی لے رہے ہیں۔'' آتمارام نے بے کل لہجے میں دلدل کی شکتی سے پوچھا۔
''آتمارام..... تمہیں مہاراج پجاری نے پہلے بھی کہا تھا کہ روشنی والوں سے بچ کر چلنا، مگر تم نے اس کی

پروا نہیں کی اور تم طاقت کے نشے میں چُور ہو گئے۔ تمہیں تو پہلے صدیق آباد کے باباجی کا توڑ کرنا چاہیے تھا۔ وہ اس علاقے میں روشنی کی بڑی طاقتوں کے نمائندے ہیں اور خود بھی مہان ہیں۔'' بڑھیا نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے استہزائیہ انداز میں آتمارام کو گھورا۔

''مگر صدیق آباد میں باباجی سے ٹکرائے بنا کیسے کچھ کیا جا سکتا تھا، یہ تو انت ہونا ہی تھا۔'' آتمارام نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اب اس کا کیول ایک ہی اُپائے ہے...... بس ایک اور آخری۔''

''وہ کیا ہے اے مہان شکتی، مجھے بتاؤ، اس منصوبے کی کامیابی مجھے دیوتاؤں کی آشیرباد دلوا دے گی، بتاؤ نا مجھے۔''

آتمارام کا لہجہ ملتجیانہ ہو گیا، اسے پتا تھا کہ وہ ایک مہان شکتی سے بات کر رہا ہے، جس کی افریقہ کے سیاہ جنگلوں پر حکومت ہے۔

''تم گھور اندھیرے کی شکتیوں کو وہاں مت بھیجو......'' بڑھیا کا لہجہ پراسرار ہو گیا۔

''تو پھر، کس کو بھیجوں؟''

''تمہارے پاس ہے نا ایک اور شکتی...... جو تم نے ابھی کچھ ماہ پہلے قابو کی ہے، کالی کی آنکھوں کی شکتی۔ یاد رکھو آتمارام، کیول آنکھوں کی شکتی ہی روشنی سے بنی ہوتی ہے، اسے بلاؤ اور اپنے کام میں لاؤ، وہی مقابلہ کر پائے گی...... مگر وہ بھی محض باباجی کو صدیق آباد کی حدود سے باہر لا سکتی ہے، مگر اس سے اگلا معرکہ تم نے خود لڑنا ہے۔''

''مگر...... مگر...... وہ تو میری سانس مالا کی شکتی ہے، اگر وہ ناکام ہو گئی تو پھر مجھے اپنے جیون کا بلیدان دینا پڑے گا۔'' آتمارام نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''وہ بہت بڑی شکتی ہے آتمارام، وہ زیر کر لے گی روشنی والوں کو...... تم چنتا مت کرو، مگر یہ بھی یاد رکھنا کہ جب روشنی والے ماتھے ٹیکے ہوئے ہوتے ہیں، تب ان کو نہیں چھیڑا جاتا......!!'' بڑھیا نے دانت نکوس کر کہا اور پھر زمین میں واپس دھنستی چلی گئی، اب وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

''ٹھیک ہے، دیکھتا ہوں، تُو مجھ سے کیسے بچتا ہے شاہ عالم...... انت وجے آتمارام کی ہی ہوگی۔'' آتمارام نے دانت کچکچا کر کہا۔

☆☆☆☆

رات کا پچھلا پہر تھا، باباجی اپنے حجرے میں عبادت میں مصروف تھے۔ صدیق آباد مکمل طور پر خاموشی کے پہرے میں تھا۔ دور کہیں کتوں اور گیدڑوں کی آوازیں ماحول میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں، اچانک حجرے کے دروازے پر مدہم سی دستک ہوئی۔

''آ جاؤ، دروازہ کھلا ہے، فقیروں کے دروازے کبھی بند نہیں ہوتے۔'' باباجی نے چونکے بنا کہا۔

دروازہ ایک چرچراہٹ کی آواز سے کھلتا چلا گیا، مگر اندر کوئی آتا دکھائی نہ دیا۔

''کیوں آئے ہو عبدالمالک؟''

باباجی نے اپنی داہنی طرف گردن موڑ کر کسی غیر مرئی ہستی سے کہا۔

''مرشد، ایک اہم خبر پہنچانے کا حکم ملا تو حاضر ہوا۔'' حجرے کے اندر ایک مؤدبانہ آواز گونجی۔

''ہاں ہاں بولو، میں سن رہا ہوں عبدالمالک''

''مجھے حکم ملا ہے کہ آپ کو بتا دوں، صدیق آباد کے خلاف سازش ایک نئے موڑ پر آ پہنچی ہے، آتمارام نے اپنی ایک خاص طاقت کو روانہ کر دیا ہے۔ آپ چوکنا رہیے گا۔''

''میرا مالک ہے نا عبدالمالک، سب کو پالنے والا، حافظ اور نگہبان...... اسی کی اجازت سے تو یہ سانسیں رواں دواں ہیں، ٹھیک ہے عبدالمالک، میری طرف سے حضرت صاحب کا شکریہ ادا کر دینا۔'' باباجی نے مطمئن انداز میں اس نہ نظر آنے والے وجود کو مخاطب کیا اور پھر حجرے کا دروازہ بند ہوتا چلا گیا، جیسے کوئی واپس گیا ہے اور باباجی نے سر جھکا کر دوبارہ عبادت شروع کر دی۔

☆☆☆☆

اگلی صبح کا آغاز صدیق آباد میں ایک خوف ناک واقعے سے ہوا۔ صدیق آباد کے چاروں طرف ہزاروں خوف ناک اور عام جسامت سے دوگنی چمگادڑیں نمودار ہوئیں جو اپنے منہ سے ٹرچ ٹرچ کی خوف ناک آوازیں نکال کر صدیق آباد کو حصار میں لیے ہوئے تھیں لیکن وہ گاؤں کے اندر نہیں آ پا رہی تھیں اور کسی نادیدہ دیوار سے

ٹکرا کر صدیق آباد کی حدود سے باہر ہی اڑنے پر مجبور تھیں، مگر صدیق آباد کے کئی کسان جو صبح صبح کھیتوں کو جا رہے تھے، ان کی لپیٹ میں آ گئے تھے اور اب ان کی خون چوسی ہوئی لاشیں کھیتوں میں پڑی ہوئی تھیں۔ پورا گاؤں اس وقت چوپال میں جمع تھا اور بابا جی کے چہرے پر تفکر کی لکیریں نمایاں تھیں۔

''بابا جی، اس طرح تو ہم گاؤں تک محصور ہو کر رہ جائیں گے، آخر کب تک؟'' بابا تھو نے بابا جی کی طرف دیکھا۔

''میرے بچو، یہ نور اور ظلمت کی وہ جنگ ہے جو صدیوں سے جاری ہے۔ ہم اس جنگ سے منہ نہیں موڑ سکتے۔ مجھے گاؤں سے باہر جا کر آخری لڑائی لڑنا ہوگی اور یہ چال بھی صرف مجھے گاؤں سے باہر بلانے کے لیے ہے، تم گھبراؤ مت، رات جتنی بھی کالی ہو، محض روشنی کی ننھی سی کرن اس کا پردہ چاک کر دیتی ہے۔'' بابا شاہ عالم کے لہجے میں اطمینان اور اللہ پر توکل جھلک رہا تھا۔

''بابا جی، یہ سب کیوں ہو رہا ہے، ہم نے کیا بگاڑا ہے کسی کا؟'' شیرو نے بابا جی کو دیکھ کر بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بگاڑنے کے لیے تو اتنا ہی کافی ہے کہ ہم اس دھرتی پر روشنی کے نمائندے اور روشنی پھیلانے والے کے امتی ہیں اور روشنی کا وجود اندھیروں سے بھلا کب برداشت ہوا ہے۔ کالی دیوی کی طاقتوں کا منصوبہ صدیق آباد کو مسلمانوں سے خالی کروا کر اس مسجد کی جگہ پر ایک مندر تعمیر کرنے کا ہے اور یہ ساری کش مکش اسی کے لیے جاری ہے، مگر اپنے گھر کی حفاظت خود گھر والا کرے گا، وہی ہمیں راستہ دے گا، میں گاؤں سے باہر جا رہا ہوں، کوئی میرے پیچھے مت آئے اور خبردار گاؤں سے باہر قدم مت نکالنا۔''

بابا جی نے گاؤں کے خارجی راستے پر قدم بڑھائے۔ ایک ہجوم نے ان کے پیچھے لپکنا چاہا، مگر بابا جی نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا۔ اب ایک نیا معرکہ بپا ہونے جا رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

جونہی بابا جی صدیق آباد سے باہر آئے تو چاروں طرف اڑتی چمگادڑیں یکدم ایسے غائب ہوئیں جیسے ان کا وجود ہی نہ تھا یا وہ محض فریب نظر تھیں۔ سامنے ایک وسیع میدان تھا جہاں گاؤں کے لڑکے بالے مختلف کھیل کھیلا کرتے تھے۔ اس میدان میں اس وقت بابا جی تنہا کھڑے تھے۔ ان کے دائیں ہاتھ میں چمکدار سفید پتھروں کے دانوں والی ایک تسبیح تھی اور بائیں ہاتھ میں عصا تھا اور دور تک کچھ بھی نہ تھا، صرف سرکنڈوں سے گزرتی ہوا سنسناہٹ پیدا کر رہی تھی، اچانک بابا جی کے سامنے سے زمین پھٹی اور دھواں نکلنے لگا، پھر یہ دھواں کسی بگولے کی طرح اٹھا اور آسمان کی وسعتوں تک بلند ہو گیا، اس کے بعد اس دھوئیں نے بگولے کی طرح اپنی جگہ پر چکرانا شروع کیا اور چاروں طرف تیز آندھی چلنے لگی، یوں لگ رہا تھا جیسے ساری ہوا اس بگولے کے اندر کی طرف کھنچ رہی ہے۔ درخت جڑوں سے اکھڑ کر بگولے کے اندر جا رہے تھے۔ ہر طرف طوفان کا کان پھاڑ دینے والا شور تھا، لیکن بابا جی اپنی جگہ پر مضبوطی سے کھڑے تھے۔ ان کے ہونٹوں پر ایک سادہ سی مسکراہٹ کے سوا کچھ نہ تھا۔ ''بند کرو اپنی یہ شعبدے بازی آتما رام، تمہارے سامنے اللہ تعالیٰ کا بندہ کھڑا ہے کوئی کالی ماتا کا پجاری نہیں جو تمہاری یہ پھونکیں اس کا قدم اکھاڑ دیں گی۔'' بابا جی نے جلال بھرے لہجے میں کہا۔ اچانک بگولا دوبارہ زمین میں سما گیا اور ہر طرف پھر سکوت چھا گیا۔

''کوئی اور شعبدہ ہے تمہاری پٹاری میں تو وہ بھی لے آؤ آتما رام۔'' بابا جی کے اطمینان میں ذرا سا بھی فرق نہیں پڑا تھا۔ اچانک بابا جی کے چاروں طرف خوفناک آگ بھڑک اٹھی، جو ایک دائرے کی شکل میں بابا جی کی طرف لپک رہی تھی۔ بابا جی نے محض اپنی تسبیح کا اشارہ کیا اور آگ غائب ہوگئی، پھر اچانک ہی ایک اور بگولا زمین سے نکلا اور جب وہ بگولا تھما تو سامنے آتما رام کھڑا تھا۔ پاؤں میں کھڑاؤں، گلے میں بھاری بھرکم منکوں کی مالائیں اور جسم پر صرف ایک لنگوٹ، اس کی آنکھوں میں غیظ و غضب کی چنگاریاں تھیں۔

''آ گئے تم آتما رام...... اچھا کیا، آج یہ روز روز کی کِل کِل ہی ختم ہو جائے گی۔'' بابا جی نے آتما رام کو گھورا۔

''شاہ عالم، تمہیں پتا ہی نہیں ہے کہ تم کس کے

سامنے کھڑے ہو...... اور تم ہمارے سپنوں کے بیچ کی آخری دیوار ہو، تمہارا گرنا بہت ضروری ہے، پھر صدیق آباد کی مسجد کی جگہ پر ایک مہا مندر تعمیر ہوگا اور مجھے انت جیون مل جائے گا۔'' آتمارام نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''تم پر معصوم لوگوں کے خون کا بدلہ واجب ہے، اس کا تم سے حساب لیا جائے گا کالی کے پجاری...... تُو اپنے ترکش کے تمام تیر آزما لے پہلے۔'' بابا جی کے چہرے پر اب سختی تھی، شاید انہیں صدیق آباد کے باسیوں کی لاشیں یاد آ رہی تھیں۔

''لو پھر سنبھلو شاہ عالم......'' یہ کہہ کر آتمارام نے ہوا میں قلابازی کھائی اور ایک دیو ہیکل شیر کے روپ میں ڈھل گیا، شیر نے فضا سے ہی بابا جی پر حملہ کر دیا، اس سے پہلے کہ شیر بابا جی تک پہنچتا، بابا جی نے اپنے عصا کا اشارہ کیا اور شیر ایک دھکے سے زمین سے ٹکرایا۔ شیر کے منہ سے ایک زوردار دھاڑ نکلی اور وہ دوبارہ انسانی روپ میں آ گیا۔

''آتمارام اپنی جون میں ہی رہو تو زیادہ بہتر ہے۔ تم خود کون سا درندے سے کم ہو۔'' آتمارام نے زمین سے مٹی اٹھائی اور اس پر کچھ پڑھ کر بابا جی کی طرف پھینکی۔ مٹی کا ہر ذرہ خوف ناک اژدہے میں تبدیل ہو گیا۔ ان اڑتے ہوئے اژدہوں کے منہ سے پھنکار کے ساتھ چنگاریاں بھی نکل رہی تھیں، مگر کوئی بھی چنگاری بابا جی تک نہیں پہنچ رہی تھی، اب آتمارام کے چہرے پر پریشانی نظر آ رہی تھی، کیوں کہ اس کا ہر وار خالی جا رہا تھا۔

''تم میرے سامنے کچھ بھی نہیں ہو آتمارام اور کوئی منتر ہے تو وہ بھی آزما لو۔'' بابا جی کے لہجے میں ایک للکار تھی۔

''آتمارام، اب وار کرو، شاہ عالم کے گرد حصار نہیں رہا، جلدی کرو۔'' اچانک آتمارام کے کانوں میں کالی کی مہان شکتی کی آواز گونجی۔

آتمارام نے فوراً زمین سے مٹی اٹھائی اور بابا جی کی طرف اچھال دی۔ مٹی تیز ہوا میں تبدیل ہو کر طوفان کی مانند بابا جی سے ٹکرائی اور بابا جی جو اطمینان سے کھڑے تھے، قلابازیاں کھاتے ہوئے زمین سے ٹکرائے۔ ان کی آنکھوں میں حیرت تھی، جانے کیسے ان کا حصار ختم ہو گیا تھا۔ انہوں نے آیت کریمہ کا ورد کرنا چاہا تو ان کا دماغ بھک سے اڑ گیا، انہیں کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے......'' انہوں نے اپنے آپ سے سرگوشی کی۔

''ہاہاہاہا۔'' آتمارام کے فلک شگاف قہقہے چاروں طرف بلند ہو رہے تھے۔''

''شاہ عالم، اب تم آزما لو مجھ پر اپنے ترکش کے تمام تیر...... اور تھک جاؤ تو مجھے بتا دینا، تمہیں گندی نالی کے کیڑے کی طرح سسکا سسکا کر ماروں گا۔'' آتمارام لہجے میں حقارت تھی۔

''مرشد، اللہ سے توبہ کیجیے، آپ نے تکبر بھرا جملہ کہا اور اللہ کے حکم سے آپ کا حصار ختم کر دیا گیا۔''

بابا جی کے کانوں میں عبدالمالک کی آواز گونجی اور پھر بابا جی زمین پر لیٹے لیٹے ہی سجدے میں جا گرے۔

''مرے مالک، میرا یہ مطلب ہرگز نہ تھا، مجھے معاف کر دیجیے مالکِ کریم، تیرے ہی صدقے سے تو تمام طاقتیں ہیں، مجھے بخش دیجیے مالک!!''

اسی لمحے آتمارام نے حصار کی عدم موجودگی کے باعث اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے بابا جی کی طرف اشارہ کیا تو فضا میں سیکڑوں خنجر نمودار ہوئے اور بابا جی کی طرف لپکے، مگر بابا جی کے قریب پہنچتے ہی وہ گولی کی طرح واپس پلٹے اور حیران کھڑے آتمارام کے جسم میں پیوست ہو گئے۔ آتمارام کے جسم سے خون کے فوارے ابل پڑے اسی وقت وہ زمین پر گر پڑا اور پھر گرتے ہی اس کے جسم میں آگ بھڑک اٹھی، اس کی بجھتی آنکھوں میں حیرت ثبت تھی!!

''میں نے تم سے کہا بھی تھا آتمارام، روشنی والوں نے ماتھا ٹیکا ہوا ہو تو انہیں مت چھیڑنا۔''

آتمارام کے کانوں میں افریقہ کی دلدلوں کی شکتی کی آواز گونجی اور پھر اس کے جسم میں بھڑکتی ہوئی آگ اور بھی تیز ہو گئی۔

روشنی والے کو کوئی خبر نہیں تھی کہ اس کے سامنے کیا ہو رہا ہے، وہ تو بدستور سجدے میں گرا اپنے روٹھے رب کو منا رہا تھا۔

☆......☆



ایک کہانی

حمیرا خان

شاہ کوٹ سے ایک مصنف کی لرزہ خیز داستانِ خاص

"بابا...... بابا جانی آپ کہاں ہیں؟" وہ کہانی لکھنے میں بری طرح مگن تھا، تبھی اس کے چھوٹے بیٹے دانیال کی آواز نے اس کی سوچوں کا تسلسل توڑ دیا۔

"میں یہاں ہوں بیٹا ڈرائنگ روم میں۔ ادھر آؤ، کیا چاہیے تمہیں؟؟" اس نے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے اونچی آواز میں اپنے بیٹے کی پکار کا جواب دیا۔

"لائٹ آف کریں میں تنگ ہو رہا ہوں۔" دانیال عرف دانی نے وہیں سے جواب دیا۔ اس کی بات سن کر عدنان کے چہرے پر الجھن اور حیرت کے تاثرات نظر آنے لگے اور تبھی اس کے ذہن میں یہ بات بھی آئی کہ اس کی بیوی اور بچے اوپر کی منزل پر بنے کمرے میں سوئے تھے، جبکہ دانی کی آواز تو ساتھ والے کمرے سے آرہی تھی، وہ مکمل تنہائی حاصل کرنے اور بیوی بچوں کے ڈسٹرب نہ ہونے کے خیال سے نیچے کی منزل میں آبیٹھا تھا۔ اس کی بیوی اور تینوں بچے سرِ شام ہی پڑ کر سو گئے تھے، اس کا بھی تھکن سے برا حال تھا مگر اسے آج ہر حالت میں اپنی اسٹوری مکمل کرنا تھی، کیوں کہ وہ پہلے ہی بہت لیٹ ہو گیا تھا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ جس گھر میں وہ پچھلے ایک سال سے رہ رہے تھے، اس کے مالک مکان نے اپنی کچھ مجبوریاں بتا کر گھر خالی کرنے کا کہہ دیا تھا۔ وہ بامروت انسان مالک مکان کی خود ساختہ مجبوریوں سے اتنا متاثر ہوا کہ یہ بھی نہ کہہ سکا کہ اتنی جلدی وہ کہاں اپنا بسیرا کریں گے، فوراً ہی دو چار جاننے والوں کو گھر کی تلاش کا ذمہ دے دیا اور اس کی خوش قسمتی ہی تھی کہ پندرہ دن کے اندر ہی انہیں ایک مناسب مکان، انتہائی مناسب کرائے پر مل گیا۔ وہ فوراً وہاں شفٹ بھی ہو گئے اور آج اس گھر میں ان کی پہلی رات تھی۔ وہ ایک مشہور رائٹر تھا اور خاص طور پر پراسرار کہانیاں لکھنے میں وہ ایک خاص مقام رکھتا تھا۔ اب بھی ایک ڈائجسٹ کے خاص نمبر کے لیے اسٹوری لکھنے میں مصروف تھا جو کہ اسے کل دفتر پہنچانا تھی۔ ایک لمحے میں یہ سب سوچیں اس کی ذہن میں کسی فلم کی طرح گزر گئیں۔ اس نے دانیال کو پکارا مگر کوئی جواب نہ پا کر دوسرے کمرے میں دانیال کے پاس جانے کے لیے صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اوہ شِٹ" وہ دروازے تک بھی نہ پہنچا تھا کہ لائٹ چلی گئی، ابھی یو پی ایس کی فٹنگ نہیں ہوئی تھی، اس لیے سارا گھر اندھیرے میں ڈوب گیا اور وہ اپنے کام کا سوچ کر جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہو گیا۔ "دانی...... دانی بیٹا کہاں ہو؟" جیب سے لائٹر نکال کر جلاتے ہوئے اس

نے ایک بار پھر دانیال کو پکارا، مگر اس بار بھی دوسری طرف خاموشی رہی جس نے اس کی جھنجھلاہٹ میں اضافہ کر دیا۔ لائٹر کی مدھم روشنی میں احتیاط سے آگے بڑھتے ہوئے اس نے اس کمرے میں جھانکا، جدھر سے دانیال کی آواز آئی تھی، وہاں سامان سے بھرے وہ کارٹن



رکھے تھے جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے، انہی میں سے ایک کارٹن کے ساتھ ٹیک لگائے دانی کھڑا تھا، اگرچہ روشنی مدھم تھی، پھر بھی اسے دانی کے چہرے پر چھائی ناراضگی کا احساس ہوگیا تھا۔

''یار تم ادھر کیا کر رہے ہو، اوپر چل کر اپنی ماما کے پاس لے... وہاں روشنی [illegible] لگ رہی گی۔'' دوسری منزل پر دو ہی کمرے تھے جن میں سے ایک کمرے کو انہوں نے فی الحال اپنا بیڈ روم بنایا تھا، کیوں کہ نیچے کے کمروں کی نسبت یہ کمرہ زیادہ صاف ستھرا تھا شاید یہ استعمال میں نہیں رہا تھا، ورنہ نیچے کا حال تو بہت برا تھا، اس کمرے کا دروازہ اچھی طرح بند تھا۔ عدنان نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور کمرے میں داخل ہوگیا، اس کے پیچھے ہی دانی بھی تھا مگر اس وقت ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی، جب انہوں نے دانی کو بیڈ پر لیٹے ہوئے دیکھا۔ وہ بے اختیار پیچھے کی طرف مڑے، مگر ان کے ساتھ آنے والا دانیال

غائب تھا۔ ''یہ سب کیا ہے؟ کیا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں......؟ مگر یہ خواب کیسے ہوسکتا ہے خواب دیکھنے کے لیے سونا ضروری ہے، جبکہ میں جاگ رہا ہوں۔''

''کیا ہوا آپ کو ایسے کیوں کھڑے ہیں، کتنی رات ہوگئی ہے سو جایئے'' وہ اپنے ساتھ گزرے واقعے پر سوچ رہا تھا، تبھی کروٹ بدلتے ہوئے اس کی بیوی فوزیہ کی نظر ساکت کھڑے عدنان پر پڑی تو وہ اس کو سونے کا کہتے ہوئے پھر سے آنکھیں موند گئی۔ عدنان کا ذہن منتشر ہو چکا تھا، اس لیے وہ واپس ڈرائنگ روم میں آیا اور سونے کے لیے جا لیٹا۔

☆☆☆

رات کا پچھلا پہر تھا، دور کہیں کسی مسجد سے فجر کی اذان کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ سرِ شام سونے والی فوزیہ انگڑائی لیتے ہوئے بستر سے اٹھ بیٹھی، ویسے بھی وہ ہمیشہ سے سحر خیز رہی تھی۔ چائے کی طلب نے بے قرار کیا تو وہ بچوں پر کمبل اچھی طرح پھیلا کر نیچے کی منزل پر آگئی۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے کچن سے آتی آوازوں نے اسے بتا دیا کہ عدنان بھی جاگ رہا ہے۔ وہ مسکراتے ہوئے کچن کی طرف بڑھی، کچن کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کچن میں چولہے پر چائے کا پانی رکھا تھا، قریب ہی دو کپ اور پلیٹ میں کچھ بسکٹ رکھے ہوئے تھے ''ناشتا تو سمجھو ریڈی ہے'' فوزیہ کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ اس نے ابلتے ہوئے پانی میں چائے کی پتی ڈالی اور منتظر نگاہوں سے کچن کے دروازے کی طرف دیکھا، مگر عدنان کا ابھی تک کچھ پتا نہ تھا۔ چائے تیار کر کے کپوں میں ڈال کر وہ ٹرے سجائے عدنان کے کمرے میں چلی آئی۔ کمرہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور عدنان گہری نیند میں تھا۔

''لو جی چائے کا پانی رکھ کر خود سو گئے'' وہ بڑبڑائی، عدنان کے بھلکڑ پن سے وہ پوری طرح آگاہ تھی۔

''عدنان اٹھ جائیں چائے پی لیں'' کمرے کی لائٹ آن کرتے ہوئے اس نے عدنان کو پکارا۔

''واہ جی مجھے نہیں پتا تھا گھر بدلنے سے انسان کی عادتیں بھی بدل جاتی ہیں، ورنہ میں پہلے ہی گھر بدل لیتا'' نیند سے بیدار ہوتے ہی عدنان نے فوزیہ کی طرف دیکھتے ہوئے شرارتی لہجے میں کہا۔ ''کیا مطلب ہے آپ کا؟ کیا میں پہلے آپ کو چائے بنا کر نہیں دیتی تھی۔''

فوزیہ نے مصنوعی غصے سے کہا۔

''دیتی تو ہو مگر اتنی صبح صبح نہیں دیتیں نا۔'' عدنان کے بے چارگی سے کہنے پر وہ ہنس پڑی۔ عدنان نے بھی مسکراتے ہوئے چائے کا کپ اٹھا لیا۔

''ویسے آدھا کام تو آپ کر ہی چکے تھے باقی کا آدھا میں نے کر کے کریڈٹ لے لیا'' فوزیہ بھی ٹرے میں سے اپنا کپ اٹھاتے ہوئے بستر میں آبیٹھی۔

''کون سا آدھا کام؟'' عدنان کے پوچھنے پر فوزیہ نے اسے کچن میں جانے اور وہاں پر جو دیکھا اس کی تفصیل بتا دی۔ عدنان خاموشی سے سب سنتا رہا۔ جب فوزیہ نے اپنی بات مکمل کرلی تو وہ بولا۔

''میں تو رات کا سویا ابھی اٹھا ہوں، جب تم نے مجھے آواز دی۔''

''اچھا جی تو پھر یہ چائے کسی جن بھوت نے بننے کو رکھی ہوگی۔''

''ہوں...... ہو بھی سکتا ہے، پتا ہے رات کو بھی......'' عدنان سنجیدگی سے کہتے ہوئے رات کا واقعہ بتاتے بتاتے رک گیا، شاید وہ فوزیہ کو خوامخواہ پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''بولیے نا رک کیوں گئے، کیا ہوا تھا رات کو، کسی بھوتنی سے ملاقات تو نہیں ہوگئی تھی جناب کی؟''

''بھوتنی سے ملاقات کا کیا پوچھتی ہو محترمہ، بھوتنی تو عرصہ دراز سے ہمارے ساتھ رہ رہی ہے۔'' فوزیہ کے مذاق کرنے پر وہ بھی بات کو مذاق میں لے گیا، مگر درحقیقت وہ اچھا خاصا الجھن میں پڑ گیا تھا، کیوں کہ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ رات نیچے آنے کے بعد اس کمرے میں آلیٹا تھا جہاں ایک چارپائی ڈال کر اس نے اپنا عارضی بیڈ روم بنایا ہوا تھا اور اس کے بعد وہ کمرے سے نکلا ہی نہیں تھا، چائے بنانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ باتوں میں لگ کر فوزیہ رات کا واقعہ پوچھنا بھول گئی اور چائے پی کر وہ دونوں نماز پڑھنے کے لیے اٹھ گئے۔

☆☆☆

نماز کے بعد عدنان اپنی اسٹوری والی فائل لے کر بیٹھ گیا تو اسے مصروف دیکھ کر فوزیہ واپس اوپر بچوں کے پاس چلی آئی۔ بچوں کے جاگنے میں ابھی بہت وقت تھا،

کیوں کہ اس نے اسکول سے چھٹی لی ہوئی تھی۔

''ابھی گرم بستر کے مزے لیے جاسکتے ہیں فوزیہ سوچتے ہوئے بستر پر دراز ہوگئی، پھر اس کا ذہن گھر کی طرف چلا گیا۔ وہ سوچنے لگی نیچے کی منزل پر تین کمرے، کچن اور ڈرائنگ روم ہے اور اوپر کی منزل پر دو کمرے اور ایک اسٹور۔ اگر اوپر کے کمروں کو مہمانوں کے لیے سیٹ کرلیا جائے اور نیچے ایک کمرے کو اپنا بیڈروم اور ایک کو بچوں کا کمرہ بنا دیا جائے تب بھی ایک کمرہ بچ جائے گا، اسے بچوں کا اسٹڈی روم بنا سکتے ہیں یا پھر شاید عدنان اسے اپنا اسٹڈی روم بنانا چاہیں۔ کمروں کے بارے میں فیصلہ کرنے کے بعد وہ سامان کی سیٹنگ کا سوچنے لگی۔ یہ سب سوچنے میں وہ اتنا مگن ہوئی کہ بہت سارا ٹائم گزر گیا۔ روشن دان سے جھانکتی روشنی کی کرن بتا رہی تھی کہ نئے دن کا سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ آسمان کے سینے پر جلوہ افروز ہو چکا ہے۔

''ماما'' تین سالہ نادیہ نے نیند میں اسے پکارا اور اس سے لپٹ کر پھر سے نیند کی وادیوں میں اتر گئی۔ فوزیہ نے بے ساختہ اس کے ماتھے پر بوسہ دے ڈالا۔ ان کے دو بیٹے دانیال اور شہزاد تھے، جب کہ نادیہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اکلوتی اور سب سے چھوٹی ہونے کے باعث وہ ماں باپ کی کچھ زیادہ ہی لاڈلی تھی، یہی نہیں بلکہ دونوں بھائی بھی اس چھوٹی سی کیوٹ گڑیا کے دیوانے تھے۔ نادیہ نے کروٹ لیتے ہوئے کمبل بھی ساتھ ہی کھینچ لیا تھا، نادیہ کو اپنے بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے فوزیہ نے دانیال اور شہزاد پر کمبل ٹھیک کرنا چاہا تبھی اسے احساس ہوا کہ شہزاد وہاں نہیں تھا، نائٹ بلب کی ہلکی روشنی کے باعث پہلے فوزیہ کا دھیان اس طرف نہیں گیا تھا، نادیہ کو ایک طرف لٹا کر وہ گھوم کر بیڈ کے دوسری طرف آئی، کیوں کہ پہلے بھی کئی بار شہزاد سوتے میں بیڈ سے لڑھک جایا کرتا تھا اور نیچے گرنے کے باوجود بھی بے خبر سویا رہتا تھا۔ بیڈ کی سائیڈ پر بھی شہزاد نہیں تھا۔ فوزیہ نے بیڈ کے نیچے ہاتھ مارتے ہوئے شہزاد کو تلاش کرنا چاہا، شہزاد تو اسے نہیں ملا لیکن اس کا ہاتھ گاڑھے مائع سے لتھڑ گیا۔

''یہ کیا ہے؟'' اپنے ہاتھ کو غور سے دیکھتے ہوئے اس نے جاننے کی کوشش کی کہ وہاں نیچے کیا پڑا تھا، لیکن کمرے میں روشنی ناکافی تھی، وہ جلدی سے اٹھ کر بورڈ کی طرف بڑھی اور بائیں ہاتھ سے لائٹ کا بٹن دبا دیا، دوسرے ہی لمحے اس کے منہ سے چیخ بلند ہوئی، اس کا ہاتھ خون سے لتھڑا ہوا تھا، وہ خوف زدہ نگاہوں سے کچھ لمحے اپنے ہاتھ کو گھورتی رہی، تبھی بیٹے کا خیال آنے پر بیڈ کی طرف پلٹی اور جلدی سے بیڈ کے نیچے جھانکا، لائٹ آن ہونے کے باعث اب سب کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ایک طرف شہزاد پڑا تھا، اس کی گردن پر گہرا زخم تھا، جیسے کسی نے بیدردی سے گردن پر چھری چلا دی ہو۔ گردن سے بہتا خون چھوٹے سے تالاب کی صورت اس کی سائیڈ پر جمع ہو رہا تھا، یہ منظر اتنا ناقابلِ یقین اور خوف ناک تھا کہ فوزیہ گنگ ہو کر رہ گئی، دوسرے ہی لمحے وہ دوڑتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ایک تواتر سے بہہ رہے تھے اور چہرے پر وحشت چھائی ہوئی تھی، مگر اس کے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکل رہا تھا۔ زور سے دروازہ کھولے جانے پر عدنان دروازے کی طرف متوجہ ہوا جہاں فوزیہ کھڑی بری طرح ہانپ رہی تھی، اس کی حالت نے عدنان کو پریشان کر دیا۔

''کیا ہوا تمہیں؟ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔'' وہ فوزیہ کی طرف بڑھا۔ فوزیہ نے خون میں تر ہاتھ آگے بڑھا دیا، جسے دیکھ کر عدنان بھی بے تحاشا پریشان ہوگیا۔

''کیا ہوا ہے، یہ خون کیسا ہے بتاؤ مجھے؟'' اس نے بے اختیار فوزیہ کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

''وہ......وہ......'' فوزیہ نے بولنے کی کوشش کی، مگر اس کی زبان نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا، الفاظ آپس میں گڈمڈ سے ہو کر رہ گئے۔ اس نے اوپر کی طرف ہاتھ اٹھا دیا۔ عدنان اسے وہیں چھوڑ کر اوپر کی طرف دوڑا، کمرے میں جا کر اس کی پہلی نظر بیڈ پر پڑی جہاں دانیال اور نادیہ سو رہے تھے، مگر شہزاد وہاں نہیں تھا، اس وقت میں فوزیہ بھی اوپر آگئی۔

''شہزاد کہاں ہے؟'' عدنان کے بے تابی سے پوچھنے پر فوزیہ نے بیڈ کے نیچے اشارہ کیا، تب پہلا خیال عدنان کے ذہن میں یہی آیا کہ شہزاد نیند میں بیڈ سے گر کر زخمی ہوگیا ہے۔ اس نے بیڈ کے نیچے جھانکا، مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

''یہاں تو نہیں ہے۔''

''نہیں ہے......'' عدنان کے کہنے پر فوزیہ نے بے یقینی سے دہرایا اور تیزی سے بیڈ کی طرف بڑھتے ہوئے نیچے جھانکا مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

''وہ ابھی یہیں تھا میں نے اسے......خون......یہ......''

''فار گارڈ سیک فوزیہ مجھے پوری بات بتاؤ، شہزاد کہاں ہے اور تمہارے ہاتھ پر یہ خون کیسا ہے؟'' فوزیہ کے بے ربط جملے نے عدنان کی بے قراری میں اضافہ کر دیا تھا۔ وہ کچھ غصے سے بولا، پھر جیسے اسے فوزیہ کی حالت پر ترس آ گیا اور اسے بیڈ پر بٹھا کر سائیڈ ٹیبل پر رکھے جگ میں سے گلاس میں پانی ڈال کر اس کے لبوں سے لگا دیا۔

''ریلیکس......میں ہوں نا تمہارے ساتھ، آرام سے بتاؤ شاباش کیا ہوا تھا۔''

پانی پی کر اور بیڈ کے نیچے کا فرش صاف دیکھ کر فوزیہ کے اوسان بحال ہوئے اور اس نے ساری بات عدنان کو بتا دی جسے سن کر وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ ایک رائٹر اور خاص طور پر پرسرار کہانیاں لکھنے والا رائٹر ہونے کے ناتے وہ اس سے بھی کہیں زیادہ خوف ناک واقعات اپنی کہانیوں میں لکھ چکا تھا مگر یہ کوئی کہانی نہیں تھی۔ یہ اس کی زندگی تھی اور جو کچھ ہو رہا تھا وہ سچ میں ہو رہا تھا۔ ''تم بچوں کے پاس ٹھہرو میں شہزاد کو ڈھونڈتا ہوں۔''

''میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔'' عدنان کے اٹھتے ہی وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''نہیں تم بچوں کے پاس رکو، انہیں اکیلا چھوڑنا ٹھیک نہیں ہے، ڈونٹ وری میں ابھی شہزاد کو ڈھونڈ کر لاتا ہوں۔''

''اپنا خیال رکھنا پلیز۔'' فوزیہ کے کہنے پر وہ ہونٹوں پر زبردستی کی مسکراہٹ سجاتے ہوئے اسے حوصلہ دیتا کمرے سے نکل گیا اور فوزیہ بچوں کے پاس بیٹھ کر عدنان اور شہزاد کی خیریت کے لیے دعائیں کرنے لگی۔

☆☆☆

عدنان نے سب سے پہلے اوپر کا دوسرا کمرہ اور اسٹور اچھی طرح دیکھ ڈالا۔ کمرہ بالکل خالی تھا، البتہ اسٹور میں مالک مکان یا شاید پرانے کرایہ داروں کا کچھ سامان ابھی تک موجود تھا جو انہوں نے دو دن بعد اٹھا کا وعدہ کیا تھا۔ تلاش کرنے کے ساتھ ساتھ وہ شہزاد کو آواز بھی دیتا جاتا تھا اوپر کی منزل دیکھنے کے بعد وہ نیچے آ گیا، مگر شہزاد وہاں بھی نہیں تھا، سب جگہ دیکھنے کے بعد وہ شکستہ چال چلتا اپنے کمرے کی طرف بڑھا مگر دروازے پر ہی اسے رک جانا پڑا، کیوں کہ شہزاد اس کے بستر پر مزے کی نیند لے رہا تھا، بے اختیار اس کے منہ سے اطمینان کا گہرا سانس خارج ہوا اور شہزاد کو بازوؤں میں اٹھاتے ہوئے وہ اوپر کے کمرے کی طرف بڑھا، جہاں فوزیہ شدت سے اس کی منتظر تھی۔

☆☆☆

عدنان شہزاد کو اٹھائے کمرے میں داخل ہوا تو فوزیہ جلدی سے اس کی طرف بڑھی۔

''کہاں تھا یہ، یہ ٹھیک تو ہے نا۔'' اس نے ایک ہی سانس میں دو سوال کر دیے۔

''ٹھیک ہے، یہ میرے کمرے میں سو رہا تھا۔'' شہزاد کو بستر پر لٹاتے ہوئے عدنان نے فوزیہ کی طرف دیکھا۔ ذرا سی دیر میں وہ کیا سے کیا ہو گئی تھی۔ گلابی رنگت زرد پڑ گئی تھی اور چہرے پر ابھی تک وحشت اور خوف پھیلا ہوا تھا فوزیہ کی طرف دیکھتے ہوئے عدنان کی نظر اس کے خون سے لت پت ہاتھ پر پڑی۔

''ہاتھ دھو لو فوزی'' اس نے نرم لہجے میں کہتے ہوئے اس کا کندھا تھپتھپا کر گویا اسے ریلیکس کرنے کی کوشش کی۔ عدنان کے کہنے پر فوزیہ کی توجہ پھر سے اپنے ہاتھ کی طرف ہوئی تو اس کے چہرے پر پھیلے خوف میں اضافہ ہو گیا۔

''مجھے یہاں اس گھر میں نہیں رہنا عدنان، پلیز یہاں سے چلیں۔''

''چلتے ہیں پہلے تم ہاتھ دھو کر آ جاؤ'' اس کے باتھ روم میں جانے کے بعد عدنان نے اپنے بچوں کے معصوم چہروں کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں گہری سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔

☆☆☆

''چلیں......'' باتھ روم سے آتے ہی فوزیہ نے اپنا مطالبہ دہرایا۔

''ہاں ٹھیک ہے میں تمہیں اور بچوں کو کچھ دن کے لیے امی جان کی طرف چھوڑ آتا ہوں۔'' عدنان کی امی

اپنے بڑے بیٹے اور بہو کے ساتھ رہتی تھیں۔
''کیا مطلب ہے ہمیں چھوڑ آئیں گے یعنی آپ ہمارے ساتھ نہیں چلیں گے؟''
''نہیں یار میں ابھی کچھ دن یہیں رہوں گا''
''اتنا سب کچھ ہونے کے بعد بھی آپ یہاں رہنا چاہتے ہیں۔ میں آپ کو یہاں کبھی نہیں رہنے دوں گی، آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا اور وہ بھی ابھی۔''
''ایسے بچوں کی طرح ضد نہیں کرتے۔ فوزیہ تم جانتی ہو پر اسرار کہانیاں لکھنا میرا جنون ہے اور یہاں اس گھر میں مجھے ایک کہانی نظر آرہی ہے، جو یقیناً میری بہترین کہانیوں میں سے ایک ہوگی اور لمبے عرصے تک یاد رکھی جائے گی۔ جب تک میں اس گھر کی کہانی معلوم نہیں کر لیتا میں یہیں رہوں گا۔'' عدنان کے فیصلہ کن انداز میں کہنے پر فوزیہ کی پریشانی میں اضافہ ہوگیا۔ شادی کے اتنے سالوں میں وہ اس کا ہر لہجہ، ہر انداز اچھی طرح پہچاننے لگی تھی، اسی لیے وہ جان گئی تھی کہ اب چاہے وہ کتنی بھی ضد کرلے مگر عدنان وہی کرے گا جو اس نے کہا ہے۔
''تو پھر ٹھیک ہے ہم بھی یہیں آپ کے ساتھ رہیں گے۔'' فوزیہ نے بھی اپنا فیصلہ سنا دیا۔
''دیکھو یہ مناسب نہیں تم لوگ......''
''ہم آپ کے ساتھ رہیں گے'' اس نے عدنان کی بات کاٹ کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا تو وہ خاموش ہوگیا۔
''او کے جیسے تمہاری مرضی'' اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ تبھی دانی کسمساتے ہوئے اٹھ بیٹھا شاید ان دونوں کی باتوں کی آواز نے اسے جگا دیا تھا، ورنہ ہر صبح اسے اٹھانا فوزیہ کا ایک عظیم کارنامہ ہی سمجھا جاسکتا تھا۔ ''میرا خیال ہے کہ آپ بازار جا کر بریڈ اور انڈے وغیرہ لے آئیں، جب تک میں ناشتا تیار کرلوں میں ان دونوں کو بھی جگاتی ہوں، کافی سو گئے ہیں'' اس کا اشارہ یقیناً نادیہ اور شہزاد کی طرف ہی تھا۔
''ٹھیک ہے تم انہیں جگا کر منہ ہاتھ دھلواؤ، میں بازار ہو آتا ہوں اور کچھ تو نہیں لانا؟''
''لانا تو کافی کچھ ہے مگر وہ لسٹ بنا کر بعد میں شاپنگ کرلیں گے، فی الحال ناشتے کا سامان لے

ایک قطعہ

اتنی ہے صرف میری محبت کی داستاں
اِک شخص تھا جو زخمِ شناسائی دے گیا
بخشا ہے ٹھوکروں نے سنبھلنے کا حوصلہ
ہر حادثہ خیال کو گہرائی دے گیا

شاعر: ملک ضیاء الرحمٰن اعوان، خانیوال

آئیں۔'' فوزیہ کے کہنے پر عدنان اثبات میں سر ہلاتا وہاں سے چلا گیا اور فوزیہ بچوں کی طرف متوجہ ہوگئی۔

☆☆☆

ناشتے کے بعد باقی کا سارا ٹائم گھر کی صفائی اور سیٹنگ میں لگ گیا تھا۔ دوپہر میں ان دونوں نے تو ایک ایک کپ چائے ہی لی تھی، مگر بچوں کے لیے دن میں کھانا بازار سے لے لیا گیا تھا، شام تک دونوں کا تھکن سے برا حال تھا، اسی لیے انہوں نے رات کا کھانا بھی باہر سے لانے کا فیصلہ کیا تھا، اگرچہ فوزیہ کو بازار کے کھانے بالکل بھی پسند نہ تھے لیکن صبح ہونے والے واقعے اور پھر دن بھر کے کام نے اسے بے جان کر دیا تھا، اسی لیے عدنان کی تجویز پر اس نے ہاں کر دی۔ وہ دونوں لاشعوری طور پر کوئی اور واقعہ ہونے کے منتظر تھے، اسی لیے ہر آواز پر چونک چونک جاتے، مگر باقی کا دن اور آنے والی رات خیریت سے گزر گئی تھی جس پر وہ دونوں کافی پرسکون ہوگئے تھے۔

☆☆☆

اگلی صبح فوزیہ کی آنکھ کھلی تو اس نے عدنان کو کہانی لکھنے میں مگن پایا، گھر کی تبدیلی کے بارے میں بتا کر اس نے ایڈیٹر سے دو تین دن مزید لے لیے تھے۔ اسے اپنے کام سے عشق تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دن بھر کی تھکن کے باوجود صرف ایک گھنٹہ آرام کرکے وہ پھر سے لکھنے بیٹھ گیا تھا اور رات بھر لکھتا رہا تھا، بچے بھی پرسکون نیند لے رہے تھے۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک دیکھ کر فوزیہ کے دل میں خوشگوار احساس جاگا، آہٹ سن کر عدنان نے اس کی طرف دیکھا تو فوزیہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آ

جواب میں عدنان بھی مسکرایا اور کچھ بھی کہے بنا دوبارہ سامنے رکھی فائل پر جھک گیا۔ فوزیہ نے بیڈ کی سائیڈ سے اترتے ہوئے چپل کی تلاش میں نیچے نظر دوڑائی اور چپل پاؤں میں اڑستے ہوئے باتھ روم کی طرف بڑھی، ابھی اس کو اندر گئے دو چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ باتھ روم سے اس کی چیخ بلند ہوئی، عدنان کے ہاتھ سے پین چھوٹ کر قالین پر جا گرا۔ وہ تیزی سے باتھ روم کی طرف بڑھا، جہاں سے ابھی تک فوزیہ کے چیخنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ باتھ روم میں فوزیہ واش بیسن کے سامنے کھڑی تھی، اس کے چہرے پر سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں اور اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں سامنے لگے آئینے پر جمی ہوئی تھیں، جیسے ہی عدنان کی نظر آئینے پر پڑی، اس کے حلق سے بھی دبی دبی چیخ نکل گئی۔ آئینے میں دکھائی دینے والا منظر ہی کچھ ایسا تھا آئینے میں کسی عورت کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا جو بری طرح جھلسا ہوا تھا اور وہ اپنی لال لال آنکھوں میں غصہ لیے انہیں گھور رہی تھی، اچانک اس نے ایک خوف ناک قہقہہ لگایا اور غائب ہوگئی، اب وہاں سب کچھ نارمل تھا۔ عدنان نے آگے بڑھ کر فوزیہ کو تھاما جو ابھی تک چیخے جا رہی تھی، پھر یکدم اس نے چیخنا چھوڑ دیا اور ہوش کھوتے ہوئے عدنان کے بازوؤں میں جھول گئی۔ باہر سے بچوں کی آواز آرہی تھی جو یقیناً فوزیہ کی چیخیں سن کر اٹھ بیٹھے تھے اور ان دونوں کو کمرے میں نا پاکر پریشانی سے رونے لگے تھے۔ بے ہوش فوزیہ کو دیکھ کر بچوں کے رونے میں اضافہ ہوگیا تھا۔ فوزیہ کو بستر پر لٹا کر ہوش میں لانے کی کوشش کرتے ہوئے عدنان ساتھ ساتھ بچوں کو بھی دلاسا دیے جا رہا تھا، آخر فوزیہ نے آنکھیں کھولیں تو عدنان کی جان میں جان آئی اور بچوں نے بھی رونا بند کیا۔

☆☆☆

عدنان کا اب بھی اس گھر سے جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ایک کہانی کے ملنے کی امید اسے پرجوش کر رہی تھی، مگر وہ فوزیہ اور بچوں کے لیے کوئی رسک نہیں لے سکتا تھا، ویسے بھی وہ چاروں بہت پریشان اور خوف زدہ تھے اور انہیں اس طرح دیکھ کر وہ اپنے آپ کو مجرم محسوس کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اسے کل ہی ان سب کو وہاں سے لے جانا چاہیے تھا۔ ”ہم امی جان کی طرف چل رہے ہیں اپنا اور بچوں کا ضروری سامان اٹھا لو، باقی بعد میں آجائے گا“ عدنان کے کہنے پر فوزیہ نے اسے شکر گزار نظروں سے دیکھا اور کچھ ہی دیر میں وہ اپنا مختصر ترین سامان اٹھائے اس گھر سے رخصت ہو رہے تھے۔

”السلام علیکم“ عدنان رکشا روکنے کے لیے آگے بڑھ گیا تھا، جب کہ فوزیہ بچوں کے ساتھ تھوڑا پیچھے تھی تب سلام کی آواز پر متوجہ ہوئی۔

’کالی چادر میں لپٹی وہ عورت یقیناً اسی سے مخاطب تھی۔ ”آپ فاضل صاحب کے نئے کرائے دار ہیں نا؟“ عورت نے گویا تصدیق چاہی۔

”جی......“

”میں تمہیں ایک مشورہ دوں گی، بہتر ہے اس پر عمل کر لینا اگر اپنی اور اپنے گھر والوں کی جان پیاری ہے تو دوبارہ اس گھر میں مت آنا اور اگر یہاں آنا چاہو تو پہلے پچھلے کرائے داروں کے بارے میں ضرور معلوم کر لینا کہ ان کے ساتھ کیا ہوا؟“ عورت کے لہجے میں دھمکی محسوس کر کے فوزیہ نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جو چادر میں چھپا ہوا تھا لیکن اس کی لال لال آنکھیں دیکھ کر فوزیہ کے ذہن میں آئینے والی عورت کا خیال تازہ ہوگیا، تبھی عدنان نے انہیں پکار لیا۔ وہ رکشا روک چکا تھا۔

”یاد رکھنا......“ عدنان کو اس طرف آتا دیکھ کر وہ عورت تنبیہ کرتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

”کون تھی؟ کیا کہہ رہی تھی؟“

”کچھ نہیں...... محلے دار تھی“ بچوں کو متوجہ دیکھ کر فوزیہ بات ٹال گئی، مگر اس کے چہرے کی اڑتی رنگت نے عدنان کو احساس دِلا دیا تھا کہ بات کچھ اور ہے مگر بچوں کا خیال کر کے وہ بھی بات کو ختم کر گیا۔ رکشے میں بیٹھ کر فوزیہ نے خوف زدہ نظروں سے گلی کی طرف دیکھا، وہاں دور دور تک اس عورت کا نام و نشان تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

☆☆☆

گھر پہنچ کر تنہائی ملتے ہی فوزیہ نے عدنان کو ساری بات بتادی۔

”چلو ہم تو وہاں سے آگئے ہیں نا، اب سب ٹھیک ہے، پریشان مت ہو، سب کچھ بھول جاؤ...... اوکے؟“

عدنان نے کہنے پر اس نے اثبات میں گردن ہلادی۔

☆☆☆

''یار میں شاید آج رات گھر نہ آسکوں پریشان مت ہونا۔''

''خیریت تو ہے نا؟''

''خیریت ہے بھی اور نہیں بھی، میں نے تمہیں بتایا تھا نا آصف کے ہاں بچے کی ولادت ہونے والی ہے۔ اسے آج ہی دفتر کا کام سے شہر سے باہر جانا پڑا ہے اور پیچھے اس کی بیوی کی طبیعت خراب ہوگئی، ملازمہ اسے ہسپتال تو لے گئی ہے اور صبح تک ڈیلیوری کی امید ہے، تم تو جانتی ہو کہ اس کی سسرال اور میکہ دونوں اس شہر میں نہیں ہے۔ ان کے آنے میں وقت لگے گا، اسی لیے آصف نے مجھ سے اسپتال رکنے کی درخواست کی ہے۔'' عدنان نے اپنے بیسٹ فرینڈ کا حوالہ دیتے ہوئے تفصیل سے سب بتا دیا تو فوزیہ مطمئن دکھائی دینے لگی، ''کیا میں بھی ساتھ چلوں؟ بھابی اکیلی ہیں۔''

''نہیں تمہارے جانے کی ضرورت نہیں، تم آرام کرو ملازمہ ہے ان کے پاس۔ تم جانتی تو ہو کہ وہ ان کی بہت پرانی اور با اعتماد ملازمہ ہے، خیال رکھ لے گی اور پھر میں بھی تو جا رہا ہوں، تم کل کسی وقت چکر لگا لینا''

''ٹھیک ہے، مگر اسپتال پہنچ کر فون ضرور کر لینا، ہمیشہ کی طرح بھول نہ جانا، میں انتظار کروں گی۔''

''بھول بھی گیا تو تم ہو نا یاد کرانے کے لیے۔''

عدنان کے کہنے پر فوزیہ نے اسے مصنوعی غصے سے گھورا اور پھر دونوں ہنس پڑے، اسی خوشگوار موڈ میں وہ گھر سے رخصت ہوگیا، مگر اس کا رخ اسپتال کی طرف نہیں تھا۔

☆☆☆

وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے فوزیہ اسے ان حالات میں چھوڑ کر کبھی نہیں جائے گی، اسی لیے وہ ان کے ساتھ وہ گھر چھوڑنے پر راضی ہوگیا تھا، مگر اس کا ارادہ تھا کہ وہ رات کو کسی بھی بہانے اس گھر میں آجائے گا اور ان واقعات کا راز جاننے کی کوشش کرے گا۔ فوزیہ اور بچوں کی غیر موجودگی میں وہ زیادہ بے فکری سے یہ کام کر سکتا تھا اور اب وہ اس گھر میں موجود تھا۔ پچھلے دو دنوں میں ہونے والے واقعات کو یاد کر اس کے بدن میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی، پھر وہ سب کچھ ذہن سے جھٹک کر ہیٹر آن کرتا بستر پر آبیٹھا، تھوڑی ہی دیر میں کمرہ خوشگوار حرارت سے بھر گیا تو اس نے جیکٹ اتار کر سائیڈ پر رکھ دی اور اپنی رائٹنگ ٹیبل پر آبیٹھا، کچھ دیر سامنے رکھے کاغذوں کو بے مقصد دیکھتے رہنے کے بعد وہ کچھ سوچ کر باتھ روم کی طرف بڑھا، تبھی اسے یاد آیا کہ یہ وہی کمرہ تھا جہاں سے پہلی رات دانیال کی آواز آئی تھی اور وہ اسے لے کر اوپر کے کمرے میں گیا تھا۔ باتھ روم میں داخل ہو کر وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا اور بغور آئینے کی طرف دیکھنے لگا، پھر اس نے دیوار پر لٹکے آئینے کو کیل سے ہٹا دیا، پیچھے سپاٹ دیوار کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ رات بارہ کے قریب اس گھر سے بھیانک چیخوں کی آوازیں سنائی دی جانے لگیں، ان آوازوں نے اردگرد کے لوگوں کو تجسس آمیز خوف میں مبتلا کر دیا، کچھ دیر بعد وہ چیخیں خاموشی کے ساگر میں ڈوب کر گم ہوگئی تھیں۔ محلے کے لوگ گھر کے باہر جمع تھے، لیکن کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اس گھر میں داخل ہونے کی کوشش کرتا، نہ جانے کس نے پولیس کو فون کر کے بلا لیا تھا، پولیس کے ساتھ محلے کے کچھ لوگ بھی گھر میں داخل ہوئے تھے جہاں ایک کمرے میں موجود عدنان کی لاش کو دیکھ کر سب پر دہشت طاری ہوگئی تھی، کچھ کمزور دل کے لوگوں کی طبیعت بھی خراب ہوگئی تھی۔ پولیس نے سارے غیر متعلقہ لوگوں کو گھر سے باہر کر دیا۔ کمرے میں عدنان باتھ روم کے دروازے کے قریب کمرے میں گرا ہوا تھا، اس کی آنکھوں کی جگہ سوراخ تھے، کیوں کہ آنکھیں نوچ کر نکال لی گئی تھیں، چہرہ بھی خون میں لتھڑا ہوا تھا اور سب سے بھیانک بات یہ تھی کہ اس کا جسم کئی ٹکڑوں میں بٹا ہوا تھا۔ سب کے ذہنوں میں ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا کہ وہ اس انجام تک کیسے پہنچا؟ مگر اس سوال کا جواب انہیں کبھی نہیں ملنا تھا، کہانیوں کی تلاش میں نکلنے والا خود ایک ڈراؤنی کہانی کا مرکزی کردار بن گیا تھا۔

☆☆☆



کالا انڈا

صدف آصف

کراچی سے، ایک ڈاکٹر پر ہونے والے کالے جادو کا قصہ خاص

کالی اندھیری رات کا سینہ چیرتی ہوئی ٹارچ کی مدہم روشنی، گھپ اندھیرے کا مقابلہ کرنے میں ناکام ثابت ہوئی۔ چاند بادلوں میں جا چھپا، رات پر مردہ لاش کی طرح سکوت طاری، قطار در قطار درختوں پر اندھیرے کی دبیز تنی چادر نے انہیں بھیانک بھوت کی شبیہ دے دی، درختوں پر قیام پذیر پرندے بھی ڈرے سہمے چونچ پروں میں چھپائے بیٹھ گئے، ماحول پر عجیب سی دل کو کپکپا دینے والی ویرانی، نحوست اور ڈر کی حکمرانی چھا گئی، آئش کا دل اس ماحول سے بھاگنے پر تل گیا، پر وہ جب بھی احتشام کے بارے میں سوچتی، اس کی محبت ڈر وخوف کے غلبے پر حاوی ہو جاتی، وہ تیز قدموں سے قبرستان میں قبروں سے بچتی بچاتی آگے بڑھنے لگی۔

آئش نے ٹھہر کر اس اجاڑ جگہ کا ارد گرد سے جائزہ لیا۔ یہ ان کے علاقے کا بہت پرانا قبرستان تھا، جو اب جگہ نہ ہونے کی وجہ سے تدفین کے لیے بند کر دیا گیا تھا، مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے یہاں ٹوٹی پھوٹی اور ادھڑی ہوئی قبروں کی تعداد زیادہ ہو گئی تھی۔

فضا میں ہونے والی لرزہ براندام سرسراہٹ نے آئش کا دل دہلا دیا، اس نے جلدی جلدی اپنا کام ختم کیا اور واپسی کے لیے مڑ گئی، اچانک نیم کے اونچے درخت پر سے عجیب سی شکل والا پرندہ کرخت آواز میں چلاتا ہوا آیا اور اس پر حملہ آور ہوا، اس کی جان جیسے حلق میں پھنس گئی، وہ قبرستان سے الٹے پیروں بھاگ نکلی، اس کا جوتا پاؤں سے نکل گیا، مگر اس کی رفتار میں کمی نہ آئی، دوپٹا ایک جھاڑی میں اٹکا تو اس نے کھینچ کر نکالا، اس وقت اسے کسی بھی چیز کا ہوش کہاں تھا؟ گو کہ قبرستان سے داخلی دروازے تک کا راستہ پانچ منٹ پر محیط تھا، مگر آئش کو لگا جیسے اسے راستہ پار کرنے میں پانچ صدیاں بیت جائیں گی، وہ بڑی مشکل سے لکڑی کے دروازے کو دھکیل کر قبرستان سے باہر نکلی، عجیب وغریب آوازوں سے ماحول کانپ اٹھا، آئش نے اپنے موی ہاتھوں سے کانوں کو بند کیا اور سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا، ایسا محسوس ہوا جیسے پورے آسمان کو سرخ روشنی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہو، ایک دم اس کا سر چکرانے لگا، وہ کب گری، کب ہوش وحواس سے غافل ہوئی، اسے کچھ پتا نہیں چلا۔

☆☆☆

شادی سے ایک سال قبل ہی احتشام انصاری کی پوسٹنگ نصیر پور میں ہوگئی، وہ ایک سرکاری ڈاکٹر تھا۔ شادی کے لیے اپنے شہر آیا ہوا تھا۔ چھٹیاں ختم ہونے کے بعد جب اس نے اپنی نئی نویلی دلہن آئش سے نوکری پر



جانے کی بابت بات کی تو، اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے، ان دونوں کی یہ پسند کی شادی تھی۔ احتشام کی چھوٹی بہن کرن اور آتش ایک ہی کالج میں ساتھ پڑھتے تھے، اکثر کمبائن اسٹڈی کی وجہ سے دونوں کا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا لگا رہتا، وہیں احتشام کا آتش سے ٹاکرا بھی ہوجاتا، من موہنی سی کھلے گلاب جیسی آتش احتشام کے دل میں اترتی چلی گئی۔ اس نے بہن اور ماں کو آتش سے شادی کا عندیہ دیا، اس کی ماں مریم انصاری کو بھی بھولی فطرت کی یہ لڑکی بہت بھائی۔

ان دونوں کے بیچ میں نہ کوئی سماج کی دیوار آئی، نہ ہی کسی ولن نے بڑھک ماری، دونوں طرف سے باہمی رضامندی کے بعد ان کی منگنی کردی گئی۔ شادی ایک سال کے بعد ٹھہرائی گئی۔ ایک سال کے بعد احتشام آیا اور بڑی دھوم دھام سے ان دونوں کی شادی ہوگئی۔ اب جب کہ اسے واپس نوکری پر جانا تھا تو، آتش کی ساتھ جانے کی ضد اس کا خون خشک کیے دے رہی تھی۔

''بیٹا...... لے جاؤ نہ، ویسے بھی میں اس بات کے حق میں نہیں کہ میاں بیوی الگ الگ رہیں'' مریم، آتش کے لیے کبھی روایتی ساس نہیں بنی، اسی لیے انہوں نے بیٹے سے بہو کی سفارش کردی۔

''مگر...... امی...... مشکل ہوجائے گی۔'' احتشام اٹک اٹک کر ماں کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔

''ارے لڑکے مشکل یا آسانی؟ سرکاری گھر تو تجھ کو ملا ہوا ہے، کھانے پینے کی جو تنگی ہوتی تھی وہ اب بہو کے جانے سے دور ہوجائے گی۔ کوئی حرج نہیں ہے، جب بچی ضد کررہی ہے تو ساتھ لے جاؤ۔'' انہوں نے بیٹے کا ایک کان پکڑا اور بولیں۔ آتش نے میاں کو زبان چڑائی، مگر وہ اس کی شرارت پر ہمیشہ کی طرح مسکرانے کے بجائے سنجیدہ صورت بنائے کھڑا رہا۔

''امی...... سوری...... میں آتش کو ساتھ نہیں لے جاسکتا'' احتشام کے چہرے کے نقوش بگڑے بگڑے سے تھے۔ مریم نے تو اتنا محسوس نہیں کیا، مگر آتش کے سارے جذبے ماند پڑ گئے۔ آتش کا واسطہ اس احتشام سے پہلی دفعہ پڑا تھا۔ وہ تو سوچ رہی تھی کہ شوہر خود ساتھ جانے کی ضد کرے گا، مگر یہاں تو ساری باتیں الٹی ثابت ہوئیں۔

''بس...... میں نے تمہارے پاپا سے کہہ

دیا ہے، وہ تم دونوں کی کل صبح کی بکنگ کراتے ہوئے آئیں گے'' مریم کا انداز اتنا فیصلہ کن تھا کہ احتشام کو خاموش ہونا پڑا، تاہم اس کی رنگت متغیر ہوگئی۔

☆☆☆

یہ کوئی بہت بڑا قصبہ نہیں تھا، بلکہ چند سو گھروں پر مشتمل ایک پہاڑی بستی تھی۔ آئش اپنے شہر سے دور اس علاقے میں آکر بہت خوش ہوئی۔ وہ ہمیشہ سے شہر کے دھوئیں اور کثافت زدہ ماحول سے گھبراتی تھی۔ قصبہ بہت ترقی یافتہ نہ سہی پر یہاں کے سرسبز وشاداب ماحول اور تازہ ہوا نے اس کا دل خوش کر دیا۔ پر جانے کیا بات تھی کہ جب سے احتشام یہاں آیا، بجھا بجھا سا رہنے لگا تھا، راتوں کو باہر نکل جاتا اور خوب سگریٹ پیتا۔ اس نے آئش کو یہ بھی بتایا کہ وہ واپس اپنے شہر کے اسپتال میں ٹرانسفر کی کوشش کر رہا ہے، مگر آئش اتنی جلدی یہاں سے جانا نہیں چاہتی تھی۔

انہیں یہاں آئے ہوئے تیسرا دن تھا کہ دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ وہ گھر میں اکیلی تھی، ویسے بھی احتشام نے اسے گھر سے باہر نکلنے کو سختی سے منع کیا ہوا تھا، بقول اس کے کہ اس کے لیے علاقہ نیا ہے، یہاں عورتوں کا باہر گھومنا پسند نہیں کیا جاتا، یہ نہ ہو کہ وہ کسی بڑی مشکل میں گرفتار ہو جائے'' اسی لیے وہ محتاط تھی۔

احتشام اسپتال سے لوٹا نہیں تھا، حالاں کہ وہ اس وقت تک آجاتا تھا، مگر شدید سردی کی وجہ سے علاقے میں نزلہ و بخار کی وباء پھیل گئی تھی، آج کل اس کے اسپتال میں مریضوں کا جم غفیر رہتا، اسی لیے اسے شاید معمول سے زیادہ دیر ہوئی۔

آئش نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا تو حیران رہ گئی۔ سامنے انتہائی خوبصورت لڑکی، ایک چنگیر تھامے کھڑی تھی۔

''آپ کون ہو جی، یہاں کیا کر رہی ہیں؟'' اس کا مخصوص علاقائی لہجہ پھر یہ سوال آئش کو غصہ ہی آگیا۔

''عجیب بے وقوف لڑکی ہو، گھر کی مالکن سے پوچھ رہی ہو، کہ آپ کون ہیں؟'' آئش کے پراعتماد انداز اور لہجے کی تیزی نے لڑکی کا اعتماد ڈانواڈول کر دیا، وہ ایک دم گھبرا سی گئی۔

''آپ کا گھر؟ بی بی...... یہ تو ڈاکٹر شام جی کا گھر ہے نا؟'' اس نے ادھر ادھر نگاہیں گھمانے کے بعد دھیمے لہجے میں پوچھا۔ آئش کو ایک بات ماننی پڑی۔ اس کی آنکھوں کی سحر انگیزی اچھے اچھوں کے چھکے چھڑا سکتی تھی۔ لڑکی اندر جھانک جھانک کر دیکھنے لگی تو آئش کی ناگواری عود آئی۔

''ہونہہ...... ان ہی کا ہے، میں ان کی بیوی ہوں، اس طرح یہ گھر میرا بھی ہوا نا'' آئش نے بے زاری سے سر ہلایا اور چبا چبا کر بولی۔

''بیوی...... آپ کیا بول رہی ہو، ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' برتن زوردار آواز سے اس کے ہاتھوں سے گر گئے، جن میں موجود سوجی کا حلوہ دہلیز پر بکھر گیا، جو شاید وہ احتشام کے لیے لائی تھی۔ آئش کو اس کے چہرے پر ایسی اذیت دکھائی دی، جیسے اس نے کوئی دھاکا کیا ہو اور اس کے وجود کے پرخچے اڑ گئے ہوں۔ کٹورا سی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں، اس کی حالت کوئی اور ہی کہانی سنا رہی تھی۔

''ہاں...... میں ان کی بیوی ہوں، دو مہینے پہلے ہماری شادی ہوئی ہے، مگر تم نے کون ہو؟'' وہ سوال جو اس کے دل میں کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا، اس نے پوچھ ہی لیا۔

اس نے آئش کا جواب دینے کی بجائے چنگیر اور برتن سمیٹے اور اپنے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھتی وہاں سے بھاگ نکلی۔ آئش حیران و پریشان جہاں تھی وہیں جم گئی، اس کے دل کو جیسے وحشتوں نے جکڑ لیا۔

☆☆☆

''آئش...... پلیز...... مجھے معاف کر دو میں بھٹک گیا تھا'' احتشام نے گھر آکر جب بیوی کی بری حالت دیکھی تو سچ بولتے ہی بنی۔

''شامی...... میری محبت میں ایسی کیا کمی دیکھی، جو تم گندگی کے دلدل میں اتر گئے'' آئش نے روتے ہوئے سوال کیا۔ اس نے شوہر کی واپسی پر اس لڑکی کی بابت بتا کر سوال جواب کی بوچھاڑ کر دی۔

''نہیں...... نہیں...... ہم دونوں کا تعلق آلودہ نہیں...... بس تم سے اور گھر والوں سے دوری کی وجہ سے میں بہت ٹوٹ پھوٹ گیا تھا، زندگی میں پہلی بار

نوکری کی وجہ سے سب سے الگ رہنا پڑا، اس لیے تنہائی کی کوفت سے بچنے کے لیے بس شانزے سے دوستانہ روابط قائم کر لیے۔ وہ ایک دفعہ اسپتال اپنی ماں کی کھانسی کی دوا لینے آئی تھی، پھر روزانہ بہانے سے آنے لگی، اکثر اس کی ماں میرے لیے کچھ پکا کر بھیج دیتی، مگر میں نے کبھی اسے گھر کے اندر نہیں بلایا۔ مجھے اس کی بھولی بھالی باتیں اور اس کے ساتھ وقت گزارنا اچھا لگتا تھا۔ وہ اسپتال میں عملے کی موجودگی میں آتی اور چھیڑ چھاڑ کر کے چلی جاتی، مگر اس کے علاوہ کچھ اور نہیں...... میں جانتا تھا کہ تمہارا پابند ہوں، اسی لیے کبھی خیانت نہ کی، پلیز...... اس کے علاوہ کوئی دوسری بات نہیں'' احتشام کا اعتماد لوٹ آیا، وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا، پر اس کے آدھے سچ نے شانزے کی زندگی میں آگ لگا دی تھی۔

''ٹھیک ہے...... آپ کا دل صاف ہوگا، مگر وہ معصوم لڑکی...... اس کا سوچیں...... آپ کی ذرا سی توجہ نے اس کے دل میں محبت کا پھول کھلا دیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دکھوں کے طوفان کروٹیں لیتے دیکھے ہیں، مجھے کسی کا دل دکھانے سے بہت ڈر لگتا ہے۔ یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔'' آئش اس کا بازو تھام کر رو دی۔

''اگر...... وہ میرے خلوص کو غلط رنگ دے بیٹھی ہے تو اس میں میرا کیا قصور؟'' احتشام اس کے رونے سے زچ ہو کر بولا۔

''اچھا...... اچھا...... یہ بتائیے کہ آپ نے اس کو ہماری منگنی کے بارے میں کچھ بتایا تھا؟'' آئش نے شوہر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

''وہ...... وہ...... ہمارے بیچ...... ایسا کوئی ذکر ہی نہیں آیا'' احتشام گڑبڑا گیا۔

''واہ...... واہ احتشام صاحب...... یہ آپ کے دل کا چور تھا نا...... آپ یہ بولیے کہ آپ نے جان کر ایسا کوئی ذکر بیچ میں آنے ہی نہیں دیا، جب اتنی خوب صورت لڑکی کی توجہ حاصل ہو رہی ہو تو کون پاگل ہوگا جو سچ اور جھوٹ کے چکر میں پڑے گا...... آپ بھی ہیں نا مرد ذات!'' آئش کی طنزیہ نظروں نے احتشام کو پانی پانی کر دیا اور اس کا بیوی سے نظریں ملانا مشکل ہو گیا۔

☆☆☆

''ارے...... احتشام کو جلدی آئیے، یہ انڈا کہاں سے آیا'' آئش کے چیخنے پر وہ بستر سے اتر کر بھاگا، دیکھا تو دہلیز پر ایک عجیب سا سیاہ رنگ کا انڈا پڑا تھا، آئش خوف زدہ سی اس کے پاس کھڑی تھی۔ اس نے بیوی کا ڈر دور کرنے کے لیے وہ انڈا اٹھایا تاکہ پھینک سکے۔ اچانک کسی پرندے کی عجیب سی کرخت آواز صحن میں گونجی، احتشام کا دل جیسے ڈوبنے لگا۔ اس نے فوراً وہ انڈا گھر سے باہر دور لے جا کر پھینک دیا، لیکن واپس آتے آتے اس کے قدم جیسے من من بھر کے ہو گئے۔ اتنی کمزوری طاری ہوئی کہ دروازے پر پہنچ کر اس نے بیوی کو آواز دی اور اس کے سہارے سے اپنے بستر تک گیا۔

آئش شوہر کی حالت پر متوحش ہو گئی، وہ اچانک بہت کمزور نظر آنے لگا تھا، شام تک اسے بخار چڑھ گیا۔ اس دوران ایک اور عجیب بات یہ ہوئی کہ اس کے ہونٹوں کے نیچے ایک کالے رنگ کا دانہ نکل آیا۔ آئش کو اس کو دہلیز با[illegible] انڈے کا خیال آ رہا تھا۔ وہ پوری رات اس پر قیامت بن کر گزری۔ احتشام کی حالت دنوں میں نہیں لمحوں میں بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ آئش نے گھبرا کر اپنے سسرال فون کر دیا۔ اس کے سسر اور دیور نے اسے تسلی دی اور خود نصیر پور پہنچنے کا عندیہ دیا۔

قصبے کے لوگ اور اسپتال کا عملہ ڈاکٹر صاحب کی حالت سے پریشان تھے، لوگ کئی بار احتشام کو دیکھنے آتے، اسپتال سے دوا بھی آ جاتی، مگر احتشام کی حالت میں رتی برابر فرق نہیں آیا۔ ایک بات اور عجیب ہو رہی تھی کہ اس کا دانہ مسلسل بڑھ رہا تھا۔

آئش کھانا پینا بھول گئی، اسے تو صرف اپنے شوہر کی بیماری نے ہولایا ہوا تھا۔ وہ بخار کوئی عام بخار نہیں تھا، اس نے جیسے احتشام کو اندر سے توڑ کر رکھ دیا، اس نے بات چیت کرنا بھی چھوڑ دیا تھا، وہ چپ چاپ پڑا چھت کو گھورتا رہتا۔ اس کی آنکھوں کے گرد گہرے حلقے پڑ گئے تھے۔ اب وہ آئش سے بری طرح چڑنے لگا تھا، مگر وہ مشرقی عورت صبر کا دامن تھامے سب کچھ برداشت کر رہی تھی۔

آئش کے سسر کا اس سے مسلسل رابطہ تھا۔ بیٹے کی بری حالت کا سن کر وہ قریبی شہر کے بڑے اسپتال سے اپنے ساتھ ایمبولینس بھی لیتے ہوئے آئے، روانگی کے وقت جہاں دوسرے لوگ چھوڑنے آئے، وہیں شانزے بھی دور کھڑی، احتشام کو اسٹریچر پر لیٹا دیکھ رہی تھی۔ شوہر کی بیماری میں آئش اس لڑکی کو بھول چکی تھی، مگر اسے کھڑا دیکھ کر اسے ساری بات یاد آ گئی۔

وہ ایمبولینس سے اتر کر اس سے معافی مانگنے کا ارادہ کر ہی رہی تھی کہ شانزے چہرے پر عجیب پراسرار سی مسکراہٹ سجائے وہاں سے تیز تیز قدموں سے مندر کی جانب چل دی۔ آئش حیرانگی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ اس نے شوہر کی طرف دیکھا تو وہ مڑ مڑ کر شانزے کو مندر کی کٹیا کے پاس کھڑا دیکھ رہا تھا۔ آئش کے دل میں عجیب وہم آنے لگے، جانے کیوں اسے لگ رہا تھا کہ احتشام کی بیماری کا شانزے اور اس مندر سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔ ایمبولینس چل پڑی تو اس نے سکون کا سانس لیا۔

☆☆☆

''شنکر بابا...... آپ کی مہربانی...... آپ نے میرا بدلہ اس دغاباز آدمی سے لے لیا۔ اب میں اپنی جان دینے کو تیار ہوں۔'' شانزے نے مکروہ چہرہ والے ہندو جوگی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''ارے...... نہیں بٹیا۔ وہ تو ہم تمہاری بدلہ لینے کی بھاؤنا کو جانچ رہے تھے۔ کوئی ہمارے قصبے کی لڑکی کے ساتھ وشواس گھات کرے اور شنکر چپ رہے!! نہیں...... بٹیا۔ اسی کارن ہم نے بدلہ لیا...... یہ ہمارے مان سمان کا معاملہ بن گیا تھا۔ اب تم گھر جاؤ اور سکھ شانتی سے جیون بتاؤ، ایسے پاپیوں کے لیے ہی تو برسوں تپسیا کے بعد ہم نے یہ علم سیکھا ہے۔ مہینوں اکیلے قبرستانوں کی مٹی چاٹی ہے، تب جا کر اس قابل ہوئے ہیں کہ ایسے راکھشس کو دنیا میں ہی نرکھ کا مزہ چکھا دیں۔'' ہندو شنکر بابا نے اپنی مالاؤں کو جھٹکے سے اچھالا اور اپنے پیلے پیلے دانتوں کو دکھاتے ہوئے قہقہہ لگایا، ان کے موٹے موٹے اودے ہونٹ مزید خوف ناک لگنے لگے تھے۔

''اچھا بابا...... مہربانی میں چلتی ہوں۔'' اس نے بڑی عقیدت سے اس ہندو بابا کو دیکھا، جو برسوں سے اس پرانے مندر کے قریب ایک جھونپڑی میں رہتا تھا۔

''جا...... رام کرپا کرے گا۔'' اس نے کالا گندا ہاتھ اٹھا کر اسے اجازت دی اور خود اٹھ کر مندر کی سیڑھیوں پر جا بیٹھا۔ وہ پرانی باتوں کے بارے میں سوچتی ہوئی وہاں سے چل پڑی۔

شانزے کا دل جو ٹوٹا، اس کی محبت ایک دم نفرت میں بدل گئی۔ یہ سچ تھا کہ شام بابو نے اس سے کبھی کچھ نہیں کہا، مگر وہ اس کے جذبوں سے ناآشنا بھی نہ تھا، شانزے نے باتوں باتوں میں اس پر اپنے دل کی بات واضح کر دی تھی۔ اگر وہ چاہتا تو اسی وقت اسے روک دیتا، مگر وہ تو اس کی محبت اور بے قراریوں سے چپ چاپ لطف اٹھاتا رہا۔

اس کی بیوی سے ملنے کے بعد تو جیسے شانزے کی دنیا ہی اندھیر ہو گئی، شام بابو کی بے وفائی نے اس پر قیامت توڑ ڈالی تھی۔ وہ پرانے مندر پر بیٹھے بابا کو روزانہ کھانا دینے جاتی تھی۔ وہ شکر گزار نگاہوں سے اسے دیکھتا، پھر سر جھکا کر کھانا کھا لیتا، پر منہ سے کچھ نہ بولتا۔

آج کل اس کی بدلی بدلی حالت پر اس نے خود ہی شانزے سے وجہ معلوم کی تو وہ بابا کے سامنے بری طرح سے رو دی۔

''ایک بات بتا بٹیا، تُو ایسے پاپی سے بدلہ لینا چاہے گی، جس نے تیرے ساتھ اتنا بڑا وشواس گھات کیا؟'' سارا واقعہ سننے کے بعد بابا کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے شانزے کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

''ہاں...... بابا...... پر میں کیا کر سکتی ہوں، ایک مجبور لڑکی ہوں؟'' اپنی لاچاری کا سوچ کر اسے مزید رونا آیا۔

''تُو کمزور نہیں...... بابا کی بٹیا کمزور نہیں ہو سکتی ہے، یہ بتا اس راکھشس سے بدلہ لینے کے لیے تُو ہر حد سے گزر سکتی ہے؟'' ہندو بابا نے اپنی جھولی میں سے ایک کھوپڑی کی شکل والی موتیوں کی مالا پر ایک جاپ کرتے ہوئے پوچھا۔ شانزے کا دل ایک لمحے کو سکڑا، اسے لگا کہ کچھ غلط ہونے جا رہا ہے، پھر اس کے اندر کی اچھائی پر بدی غلبہ پا گئی، اس نے عزم سے حامی بھری۔

''میں...... اس لڑکے پر ایک برا عمل کروں گا...... اس کی کامیابی کے لیے تیری جان کی بلی بھی چڑھائی جا سکتی ہے، بول منظور ہے'' بابا کی آنکھوں میں عجیب وحشی

سی چمک ابھری۔

''شام بابو...... کے دھوکے کے بعد جینے کی آرزو نہیں، اگر مر بھی جاؤں تو افسوس نہیں، پر اس کو سبق دینا ضروری ہے، تا کہ کل کو وہ کسی اور لڑکی کو دھوکا دینے کے قابل نہ رہے'' اس کا چہرہ نفرت سے نیلگوں ہوگیا۔ بابا نے گردن ہلائی اور آنکھیں بند کر کے جاپ تیز کر دیا۔

پانچ منٹ بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور جھولی میں ہاتھ ڈال کر ایک سفید انڈا اور چاقو نکالا، اس کے بعد اپنی انگلی میں ہلکا سا چیرہ لگایا، جب خون کی بوندیں ٹپکنے لگیں، تو سارا خون انڈے پر مل دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انڈے کا رنگ سفید سے کالا ہوگیا۔ شانزے کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''یہ لو بٹیا...... یہ احتیاط سے تھام لو۔ اسے لے جا کر اس پاپی کے دروازے کے بیچ میں میں رکھ دینا، یہ کام رات گئے کرنا، تا کہ کوئی اور نہ دیکھ سکے، اس کے بعد تمہاری ساری چنتا ختم، بابا نے سارا کام کر دیا، جلد ہی تمہیں خوش خبری ملے گی۔'' شنکر بابا نے اس کے ہاتھوں میں وہ انڈا تھما کر دھیرے دھیرے کہا۔

شانزے نے جیسے ہی وہ انڈا دوپٹے میں لپیٹا، اس کے اندر ایک وحشت سی ابھرنے لگی، دل چاہ رہا تھا کہ انڈا بابا کو واپس کر کے اس گورکھ دھندے سے دور بھاگ جائے مگر بابا سے نظریں ملتے ہی، اس کا ارادہ ڈانواڈول ہوگیا۔

''یہ بات یاد رکھنا...... اس معاملے کی خبر تمہارے گھر میں کسی کو نہیں ہونی چاہیے۔'' بابا نے جیسے اس پر سحر طاری کر دیا۔ وہ متوالی سی چال چلتی وہاں سے چل دی۔

رات گئے اپنے گھر سے چپ چاپ نکلی اور دوسری گلی میں واقع احتشام کے گھر کے دروازے پر جا کر وہ انڈا رکھ آئی۔

''شام بابو...... آج آپ کی یہ حالت دیکھ کر مجھے دکھ نہیں بلکہ آپ پر ترس آرہا ہے، اسی شان دار شخصیت پر ناز تھا نہ، جو آج اپنے پیروں پر چلنے کے قابل بھی نہیں رہی۔'' شانزے آنسو پونچھتی، خود سے باتیں کرتی تھکی تھکی سی اپنے گھر کی طرف چل دی۔

☆☆☆

احمد انصاری نے شہر کے جانے مانے ڈاکٹروں کی ٹیم جمع کرلی، مگر احتشام کی حالت دن بہ دن بگڑتی چلی گئی، ہونٹوں کے نیچے ہونے والا دانے کا سائز بڑھ کر مرغی کے انڈے کے برابر ہو چکا تھا۔ اس کی رنگت بھی کالی ہو چلی تھی، اس کی وجہ سے احتشام کے ہونٹ تقریباً بند ہوگئے۔ اب اسے چمچے کے ذریعے پتلی غذائیں دی جاتیں۔ وہ بہت اذیت میں تھا۔ پورا گھرانہ حالات سے پریشان تھا۔ ایک دن آتش کو خیال آیا کہ شوہر کا روحانی علاج ضروری ہوگیا ہے۔ اس نے کسی اللہ والے بزرگ کی تلاش شروع کر دی، جو ایسے کالے علم کی کاٹ کرنا جانتے ہوں۔

اس کے بھائی کے دوست نے روحانی تو نہیں بلکہ ایک ہندو بنگالی بابا کا پتا دے دیا، جو خود بھی کالا علم رکھتے تھے۔ آتش اپنی ساس سسر سے چھپ کر بھائی کے ساتھ اس بابا کے پاس پہنچی۔

''ہوں ں...... معاملہ بہت گمبھیر ہے۔ یہ کسی بڑے ہندو مہاراج کی کارستانی ہے۔ مجھے اس میں ایک بے انتہا خوبصورت لڑکی کا چہرہ بھی نظر آرہا ہے'' بنگالی بابا رام دیال نے احتشام کی بیماری کی تفصیل سننے کے بعد ایک آئینہ منگوایا، اس پر ایک منتر پڑھ کر پھونکا، اس کے بعد ساری تفصیل گوش گزار کی۔ اس کی بات سن کر آتش کے ذہن میں شانزے کا خیال آیا، اس کا یقین پختہ ہوگیا کہ اس کے شوہر کی حالت کی ذمے دار وہی ہے۔

''بابا...... اب میں کیا کروں؟ کچھ بھی کریں، میرے شوہر کی جان بچ جائے'' آتش نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

''دیکھو بیٹی...... یہ کام بہت مشکل ہے، جس نے یہ عمل کیا ہے وہ بہت پہنچا ہوا لگتا ہے، میں ایک کوشش ہی کر سکتا ہوں'' وہ کچھ سوچ کر بولا۔

''کچھ تو کریں...... میں بہت پریشان ہوں'' وہ رو دی۔

''جس دن اماوس کی رات ہو...... کسی بہت پرانے قبرستان میں جا کر ایک قبر میں یہ دبانا ہوگا'' انہوں نے ایک کالا انڈا نکال کر آتش کو دیا اور بولے۔

''یہ کام تو میں کر دوں گا'' آتش کا بھائی ایک نڈر لڑکا تھا، فوراً حامی بھر لی۔

''نہیں...... نہیں...... تم نہیں، کیوں کہ اس کارستانی کے پیچھے کسی عورت کا ہاتھ ہے، اس لیے یہ کام اس بی بی کو ہی کرنا ہوگا، وہ بھی تن تنہا، کسی کو بتائے

کولوزیئم، روم، اٹلی

کولوزیئم دنیا بھر میں روم کی پہچان ہے۔اس خوب صورت اسٹیڈیم کا ڈیزائن آج بھی ہر جدید اسٹیڈیم میں نظر آتا ہے۔فلموں اور تاریخی کتب سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میدان میں ناظرین کی تفریحِ طبع کے لیے ظالمانہ لڑائیاں اور کھیل ہوا کرتے تھے۔کولوزیئم کا نام نیرو کے ایک قریبی چالیس میٹر اونچے کولوسس (مجسمے) سے آیا ہے، جسے نیرو کے جانشینوں نے سورج دیوتا اپالو کے مجسمے میں بدل دیا تھا۔عہدِ وسطیٰ میں وہ مجسمہ کہیں غائب ہوگیا۔کولوزیئم 48 میٹر لمبا اور 156 میٹر چوڑا ہے۔پہلی ہر تین سطحوں پر 80 محرابیں تھیں اور لکڑی کا فرش ریت سے ڈھکا ہوتا تھا۔اس کی گولائی نما شکل کھلاڑیوں کو کونوں میں جانے سے روکتی اور ناظرین کے قریب رکھتی تھی۔یہ نہایت ہوشیاری سے بنایا گیا۔اسٹیڈیم کی تعمیر کے کئی جدید گُر پہلی مرتبہ اس میں استعمال کیے گئے۔نشست گاہ دو سطحوں پر بنائی گئی۔پہلی سطح پوڈیم تھی، جو بادشاہ اور سینیٹروں کے لیے مخصوص تھی۔دوسری سطح رومی اعلیٰ طبقے کے امراء کے لیے تھی، جب کہ تیسری سطح تین حصوں میں منقسم تھی۔یہ کولوزیئم 1217ء تک استعمال میں رہا، پھر آسمانی بجلی کی وجہ سے آتشزدگی کا شکار ہوا۔442 عیسوی سے 1349ء تک آنے والے چار بڑے زلزلوں نے بھی اسے شدید نقصان پہنچایا جس کے بعد اسے ایک چھوٹے رقبے پر مختصر سا قلعہ بنا دیا گیا، جس میں چرچ بھی تھا۔ اب یہ کولوزیئم بیک وقت لطف اور تکلیف کی زندہ علامت ہے۔

بغیر، ورنہ سارا عمل بے کار ہو جائے گا'' انہوں نے انگلی اٹھا کر تنبیہ کی۔ ان کے چہرے کے نقوش بگڑ گئے، آنکھیں سرخ ہو گئیں۔آتش نے شوہر کی جان بچانے کے لیے فوراً حامی بھرلی۔

☆☆☆

آتش کی آنکھ کھلی تو وہ اپنے کمرے کے بستر پر لیٹی تھی، قبرستان سے اسے کون اٹھا کر یہاں لایا، اس کے دل میں پہلی سوچ یہی آئی۔پاؤں میں پتھر چبھنے کی وجہ سے چھالے پڑ گئے تھے۔اس نے جلدی سے احتشام کے کمرے کی طرف دوڑ لگائی، وہ بستر پر لیٹا تھا، قریب گئی تو اسے مایوسی ہوئی، اس کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، پھر اس نے غور سے دیکھا تو حیران رہ گئی۔ہونٹوں کا دانہ غائب ہو چکا تھا، اب احتشام کھا پی سکتا تھا، مگر اس کے اندر کی ہر خواہش جیسے مٹنے لگی تھی۔آتش نے زبردستی اسے سوپ پلایا، پھر اپنے کمرے میں آکر بھائی کو فون ملایا۔

''آپی...... بابا نے منع تو کر دیا تھا اور آپ نے بھی تاکید کی تھی کہ میں آپ کو قبرستان چھوڑ کر وہاں سے چلا جاؤں، پر میرا دل نہیں مانا، وہ تو جب آپ باہر آکر بے ہوش ہوگئیں تو میں گاڑی میں ڈال کر گھر لے کر آیا، آپ کی ساس سے بہانہ کیا کہ چلتے چلتے آپ کو چکر آگئے اور گرنے سے یہ چوٹیں لگی ہیں'' منیر نے آتش کے پوچھنے پر تفصیلات سے آگاہی دی۔

''میں...... بابا کے پاس مزید علاج کے لیے جانا چاہتی ہوں، تم مجھے لے چلو پلیز'' آتش نے رازدارانہ انداز میں بھائی سے درخواست کی۔

''آپی جی......کوئی فائدہ نہیں، آنٹی نے جب فون پر ہمیں احتشام بھائی کا دانہ صحیح ہونے کی اطلاع دی، تو میں بھاگا بھاگا بابا کے پاس مٹھائی کا ڈبا لے کر پہنچ گیا، ان سے مزید علاج کی درخواست بھی کی، مگر انہوں نے معذرت کرلی اور کہا کہ ان کی حد یہیں تک تھی، انہوں نے ایک بات یہ بھی بتائی کہ تمہاری کتاب میں تو خود ہر بیماری کا علاج ہے۔قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو

لامحدود ہے،اس میں علم وعمل کا خزانہ چھپا ہوا ہے، پھر تم یہاں وہاں کیوں ماتھا ٹیکتے پھر رہے ہو۔اس لیے جاؤ اور اسی میں بھائی کا علاج ڈھونڈو، کامیابی حاصل ہوگی۔آپی ہماری محلے کی مسجد میں ایک بزرگ مکے شریف سے آ کر ٹھہرے ہوئے ہیں، وہ روزانہ لوگوں کو دین کی اچھی اچھی باتیں بتاتے ہیں۔سب کہتے ہیں نور بابا ایک بڑی بزرگ ہستی ہیں۔کل آپ پانچ بجے تک تیار رہیے گا۔ میں آپ کو ان کے پاس لے چلوں گا۔''اس نے بہن کو ساری تفصیل بتائی۔آتش سوچ میں پڑ گئی، شوہر کی طبیعت کی خرابی کے بعد سے اس نے ویسے بھی اللہ سے لو لگالی تھی، پھر بھی ایمان ڈانواڈول ہوجاتا تھا، اسی لیے اِدھراُدھر پھرتی رہی۔وہ فوراً وضو کرنے چل دی۔

☆☆☆

وہ دونوں جب نور احمد سے ملے جنہیں سب بابا جی کہتے تھے، تو کئی مہینوں سے جاری بے چینی کا خاتمہ ہوگیا۔سادہ لباس میں موجود نور احمد نماز سے فارغ ہوئے تو ان دونوں پر بھی دم کیا، ان کے دل میں سکون کی ایک لہر دوڑ گئی۔

ان کا سارا مسئلہ سن کر بابا جی نے حساب کتاب کے ذریعے بتایا کہ احتشام پر کالا علم کرایا گیا ہے۔

''بابا جی......اس علم کی کوئی کاٹ نہیں؟'' بابا کا چہرہ بہت نورانی تھا، مگر ان کے جلال کے سامنے نگاہیں نہیں اٹھ رہی تھیں، آتش نے پھر بھی ہمت کر کے پوچھا۔

''ہاں، میری بچی تمہاری آزمائش ختم ہونے والی ہے......میں کل تمہارے گھر آؤں گا......تمہارے شوہر کا علاج خود کروں گا۔'' ان کی نرم آواز نے آتش کے دل پر پڑے گھاؤ پر جیسے مرہم رکھ دیا۔

دوسرے دن انہوں نے احتشام کے کمرے میں بیٹھ کر با آواز بلند قرآن شریف کی تلاوت شروع کردی، اپنے سامنے ایک جگ میں پانی بھی رکھا، وہ تھوڑی تھوڑی دیر میں اس پانی پر پھونکتے جاتے، آہستہ آہستہ احتشام نے آنکھیں کھولیں، بابا جی پڑھا ہوا پانی احتشام پر چھینکتے جاتے اور تلاوت کرتے جاتے، احتشام نے کانوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ایسا لگ رہا تھا کہ وہ نہیں چاہ رہا کہ کچھ سنے ،اتنے میں بابا نے پانی کا پورا جگ اس کے سر پر الٹ دیا، وہ ایسے چیخنے لگا جیسے بکرا ذبح ہونے کے بعد چیختا ہے، آتش اور دوسرے گھر والے احتشام کی اس حالت پر زاروقطار رونے لگے۔مریم انصاری نے کمرے میں داخل ہونا چاہا، مگر بابا جی انہیں ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔آدھے گھنٹے میں احتشام کی حالت سنبھلنا شروع ہوگئی۔

''اچھا...... بیٹا...... اب میں چلتا ہوں...... تمہارا شوہر بالکل ٹھیک ہے، اس پر سے ہر طرح کا اثر ختم ہوگیا ہے۔'' بابا جی نے آتش کے سر پر ہاتھ پھیر کر شفقت سے کہا۔

''بابا جی...... ایسے نہیں...... کھانا کھا کر جایئے گا۔'' احتشام نے کھڑے ہوکر مؤدبانہ انداز میں کہا۔سارا گھر اس کی بہتر حالت پر خوش ہوگئے۔

''نہیں...... بیٹا...... میرا روزہ ہے۔میں نے تمہارے علاج سے قبل روزہ رکھا تھا، میرے اللہ نے مجھے سرخرو کیا، اب گھر جا کر شکرانے کے نفل ادا کروں گا، بس ایک درخواست ہے۔'' انہوں نے مسکرا کر احتشام کے کاندھے پر ہاتھ دھر کر کہا۔

''ارے...... بابا جی...... کیوں شرمندہ کرتے ہیں، حکم کیجیے......'' احتشام نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

''بس...... بیٹا...... نماز کی پابندی تم دونوں خود بھی کرو اور گھر والوں کو بھی اس طرف راغب کرو۔'' انہوں نے بڑی سنجیدگی سے نصیحت کی۔

''بابا جی...... وہ شانزے؟'' آتش نے بڑی نفرت سے اس ناگن کا نام لیا، جس کی وجہ سے اس کا گھر تباہ ہوتے ہوتے بچا۔

''بیٹا...... ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا، جو شخص اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیتا ہے، وہ خود اس کا بدلہ لیتا ہے، بے شک اللہ بہترین بدلہ لینے والا ہے۔'' بابا جی کے کہنے پر دونوں نے سر ہلا دیا۔

''ہاں...... احتشام بیٹا...... آپ کے لیے ایک اور نصیحت ہے کہ زندگی میں پھر کبھی آزمائش میں نہیں پڑنا چاہتے ہو، تو آدھے سچ سے بچنا، کیوں کہ کبھی کبھی آدھا سچ پورے جھوٹ سے بھی زیادہ نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔'' احتشام ان کا اشارہ سمجھ گیا اور اس کا سر شرمندگی سے جھک گیا۔

☆......☆